

بلوچستان میں اردو

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

مرکزی اردو بور

بلوچستان میں اُردو

فرحت ایم حسنی

جامعہ بلوچستان۔ کوئٹہ

بلوچستان میں اُردو

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

مرکزی اُردو بورڈ

گلبرگ ، لاہور

بار اول : نومبر ۱۹۶۸ع

تعداد اشاعت : گیارہ سو

قیمت : دس روپے -

☆

ناشر

اشفاق احمد

ڈائرکٹر ، مرکزی اُردو بورڈ ،

۳۶ جی ، گلبرگ ، لاہور

☆

طابع

محمد زرین خاں

زرین آرٹ پریس

۶۱ - ریلوے روڈ ، لاہور

ترتیب

پیش لفظ

اُردو زبان کی ماہیت اور صلاحیتِ اظہار قابل داد ہے کہ یہ برِصغیر کے ہر اُس خطے کو راس آ گئی جو براہِ راست عرب حاملینِ اسلام سے فیض یاب ہؤا تھا یا بالواسطہ اسلامی تہذیب و تمدن سے متاثر ہؤا تھا، لہٰذا بلوچستان جو برصغیر میں سب سے پہلے آفتابِ اسلام کی ضیا باریوں سے منور ہؤا، اُردو زبان سے کیونکر بے بہرہ ہو سکتا تھا ؟ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ جب تک سلطنتِ دہلی کی گرفت برصغیر پر مضبوط و مؤثر تھی یا خوانینِ قلات اپنی داخلی اور خارجی پالیسی میں آزاد و خود مختار تھے اور اُن کے ماہتابِ اقتدار و اختیار پر کسی قسم کے گرہن کا کوئی اثر نہ تھا، اُس وقت تک اُن کے دفاتر و مدارس، تجارت و صنعت، سیاست و ادب اور کشور و عسکر میں فارسی زبان و ادب کا ڈنکا بجتا تھا ۔ عوام اور قبائلی اپنی اپنی مقامی بولیوں پر اکتفا کرتے تھے، لیکن جونہی برصغیر انگریزی سامراج کے گھناؤنے سائے کی لپیٹ میں آنے لگا تو ہر خطے کے مسلمانوں کو، بالخصوص اُن مسلمانوں کو جو انگریزوں کی آمد سے پہلے برصغیر کے اطراف و اکناف پر حکمران و فرماں روا تھے، ایک دوسرے سے وابستگی اور پیوستگی کا احساس ہونے لگا ۔ چنانچہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے شعرا اور ادیب فوراً اُردو کی طرف متوجہ ہو گئے، کیونکہ یہی برصغیر کے مسلمانوں کی وحدتِ ملی کی مظہر اور اُن کے ربطِ باہمی کی ضامن تھی ۔

اہل بلوچستان کے لیے اُردو زبان کی طرف مائل ہونا صرف اس زبان کے اساسی مزاج ہی کے باعث آسان نہ تھا بلکہ خود اہل بلوچستان کا مزاج بھی لسانی تغیر کے لیے برصغیر میں سب سے زیادہ موزوں تھا ۔ یہ خصوصیت صرف اسی خطے کے لوگوں کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت ذوالالسان ہیں ۔ قلات ڈویژن میں اکثر لوگ بلوچی اور براہوئی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت

رکھتے ہیں - مغربی بلوچستان میں بلوچی اور پشتو بولنے والے کثیر تعداد میں ملتے ہیں - جنوبی و مشرقی بلوچستان میں سندھی اور براہوئی دونوں بولی اور سمجھی جاتی ہیں - شمالی و مشرقی بلوچستان میں سرائیکی ، بلوچی اور پشتو تینوں بولی جاتی ہیں اور کوئٹہ ، جو بلوچستان کا مرکز ہے ، لسانی تنوع کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے - اس میں براہوئی ، بلوچی اور پشتو کے علاوہ فارسی ، اُردو ، سرائیکی اور پنجابی بولنے والے افراد بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور قریب قریب ہر فرد تین تین چار چار زبانیں بیک وقت نہایت آسانی و روانی سے بول سکتا ہے -

اہل بلوچستان کی یہ کثیراللسانی انھیں دیگر اہل پاکستان سے ممیز کرتی ہے ، اورجہاں اُن کی ذہنی اُپج اور ذہانت کی مظہر ہے ، وہاں پاکستان جیسے مختلف اللسان ملک میں اُن کی اہمیت کی بھی غماز ہے ، لہٰذا اہل بلوچستان کے لیے اُردو کو اپنا لینا قطعاً مشکل نہ تھا -

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مُلا محمد حسن وغیرہم نے نہایت روانی سے اپنے خیالات کا اظہار اُردو زبان میں کیا حالانکہ اُس وقت کسی اُردو تدریسی سکول کا ہمیں پتا نہیں چلتا - گو وہ زبان آج خاصی حد تک متروک ہو چکی ہے ، الفاظ و تراکیب اور پیرایہ ہائے بیان بدل چکے ہیں لیکن انھوں نے جو اُردو زبان لکھی ہے وہی مرزا رفیع سودا وغیرہ کے ہاں بھی ملتی ہے اس لیے کہ ابتدائی اُردو زبان ایسی ہی تھی -

لیکن بلوچستان چونکہ جغرافیائی طور پر ایک بے آب و گیاہ علاقہ ہے اور اس میں بظاہر کوئی معاشی کشش بھی نہیں لہٰذا عام نظریہ یہ تھا کہ سابقہ بلوچستان نہ صرف جغرافیائی بلکہ تاریخی و تمدنی اور ذہنی و علمی لحاظ سے بھی چٹیل اور بے ثمر ہے - یہ نظریہ کیسے پیدا ہؤا ؟ ایک تو اُن حضرات کی وجہ سے جو باہر سے آئے تھے اور یہاں کی تاریخ سے ناآشنا تھے ، دوسرے وہ لکھے پڑھے مقامی حضرات جو اپنی تاریخ منظرعام پر لانے کی بجائے محض انگریزی تحقیقات و تالیفات ہی پر قناعت کرتے تھے - نتیجہ یہ تھا کہ مقامی اور سکونت پذیر حضرات میں اسی نظریے کی دھوم تھی -

جب میرے محترم ڈاکٹر این اے بلوچ صاحب نے ''مرکزی اُردو بورڈ لاہور'' کی جانب سے مجھے ''بلوچستان میں اُردو'' پر لکھنے کے لیے کہا تو میں کچھ دن تو مذکورہ نظریے ہی کی وجہ سے متامل رہا لیکن اُن کے بار بار اصرار پر :

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

کے مصداق میں نے ہامی بھر لی ۔ اب سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو کچھ فراہم کر سکا ، وہ آیندہ صفحات میں پیش کر رہا ہوں ۔ لیکن کیا عرض کروں ان معلومات کے لیے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ۔ قرۃالعین کے الفاظ میں :

از پیٔ دیدنِ رخت ، ہم چو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ ، در بدر ، کوچہ بکوچہ ، کو بکو

مجھے بھی ایک ایک دروازے پر دستک دینی پڑی ، ایک ایک فرد کے پاس پہنچنا پڑا اور ایک ایک دفعہ نہیں ، بیس بیس دفعہ جانا پڑا ۔ سینکڑوں خطوط مختلف اصحاب کو لکھے گئے ۔ حقیقتہً یہ ایک طویل اور تکلیف دہ داستان ہے لیکن بے انتہا مسرت ہے کہ میری کوششیں بالآخر بارور ہوئیں :

از دست و زبان کہ بر آید
کز عہدۂ شکرش بدر آید (سعدی)

تائید ایزدی سے نہ صرف مذکورہ نظریۂ بے ثمری باطل قرار پایا بلکہ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ بلوچستان کے باشندے بھی دوسرے پاکستانیوں کی طرح اُردو میں اظہار خیال پر اُتنے ہی قادر ہیں جتنے خود اپنی زبانوں میں ہو سکتے ہیں ۔

علاوہ ازیں اس خطے میں اُردو زبان اور اس کے اسلوب بیان کے تمام ارتقائی مراحل بھی منظر عام پر آ گئے ۔ ملا محمد حسن سے عطا شاد تک زبان و اظہارِ بیان کا وہی تغیر اور ارتقا ہمیں ملتا ہے جس کا نقشہ محمد قلی قطب شاہ سے فیض احمد فیض تک ہمارے سامنے ہے ۔

میں مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اصحاب کا خاص طور

پر ممنون ہوں : جناب میر شیر علی خاں ، انوار الحق چودھری ، جناب گل حسن خاں حریم اوستوی ، جناب ماہر افغانی ، جناب خلیل الرحمٰن خلیل ، جناب رشید نثار ، جناب مولانا محمد عبداللہ ، جناب جمیل ملک ، جناب عبدالکریم شورش ، جناب عطاء اللہ خاں سگسی ، جناب بشیر احمد غوری ، اور جناب فقیر بخش بُگٹی - لیکن میرے کرم فرماؤں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جنھوں نے میری حوصلہ افزائی اور راہنمائی میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا - میں دل کی عمیق گہرائیوں سے ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں :

احوال دل بدوست چہ محتاج گفتن است
بر شمع سوزش پر پروانہ روشن است

کوثر منزل ، پٹیل روڈ کوئٹہ
۲ - فروری ۱۹۶۸ع

انعام الحق کوثر

دفتری مسودات و مراسلات

بلوچستان میں دفتری خط کتابت کے لحاظ سے اُردو کی وسعت کا سلسلہ خصوصاً ۱۸۷۷ع اور اس کے بعد ہوا جب ایجنسی بلوچستان کا قیام عمل میں آیا ۔ اس سے پہلے موجودہ کوئٹہ اور قلات ڈویژن کی حیثیت ایک آزاد و خود مختار ریاست یعنی ریاست قلات کی تھی ، جس میں نصیرآباد اور لس بیلہ بھی شامل تھے اور ریاست قلات کی دفتری زبان فارسی تھی ۔[1]

''عدالت چیف کورٹ پنجاب کے قواعد و احکام[2]'' کا تیسرا باب ''قواعد و احکام مرتبہ بموجب خاص ایکٹ ہائے متعلق ملک پنجاب'' پر مشتمل ہے ۔ اس باب میں داد و گرفت مجرسان و اختیار بریاست غیر کے عنوان سے حصہ (و) میں وہ اختیارات درج ہیں جن سے انگریزی افسر علاقہ جات غیر میں کام لیتے تھے ۔ ان میں نمبر ۱ بلوچستان ہے ۔ کتاب مذکور کے ساتویں صفحے پر زبان مروجہ عدالت ہائے پنجاب کے عنوان سے ایک حکم درج ہے جو حسب ذیل ہے :

''اُردو زبان عدالت ہائے ماتحت

بحوالہ دفعہ ۶۴۵ مجموعہ ضابطۂ دیوانی اس امر کی اطلاع دی جاتی ہے کہ زبان اُردو کو لوکل گورنمنٹ نے عدالت ہائے ماتحت تک پنجاب کی زبان قرار دیا ہے ۔''

اسی طرح صفحہ ۹۴ پر حسب ذیل حکم درج ہے :

''زبان عدالت ہائے فوجداری نمبر ۱۰۳ بموجب احکام دفعہ ۵۵۶ ایکٹ ۱۱ ، ۱۸۸۲ع مجموعہ ضابطہ فوجداری نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر

۱۔ ہتو رام : تاریخ بلوچستان ، صفحہ ۵۳۶ ۔
اورینٹل کالج میگزین لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ع ، صفحہ ۳۵ ۔

۲۔ مترجم مسٹر طامس جارج میر مترجم چیف کورٹ ۱۸۹۳ع ۔ یہ کتاب یکم اکتوبر ۱۸۹۳ع کو مرتب ہوئی اور اسی سال طبع ہوگئی ۔

یہ قرار دیتے ہیں کہ اُس علاقے کے اندر جس پر پنجاب گورنمنٹ حکمران ہے ، عدالت ہائے فوجداری کی زبان اُردو متصور ہوگی ۔''

اسی کتاب میں ''بلوچستان'' کے تحت مندرج ہے :[1]

''نمبر ۸۱۳ (ای) با استعمال اُن اختیارات کے جو بروئے دفعہ ٦ ایکٹ متعلق اختیار بریاست غیر داد و گرفت مجرمان نمبر ۲۱ ، ۱۸۷۹ع عطا کیے ہیں ۔

نواب گورنر جنرل بہادر با اجلاس کونسل افسران مفصلہ ذیل کو جو رعایا برطانیہ اہل یورپ ہوں ، اندر علاقہ عالی جناب خان قلات اور اندر اُس علاقہ کے جس میں صاحب ایجنٹ گورنر جنرل مقیم بلوچستان بحیثیت ایجنٹ مذکور حکمران ہیں ، صاحبان جسٹس آف دی پیس مقرر فرماتے ہیں اور نفاذ حکم فرماتے ہیں کہ عدالت چیف کورٹ پنجاب وہ عدالت ہے جس میں صاحبان جسٹس آف دی پیس مذکور رعایا برطانیہ اہل یورپ کے واسطے تجویز کی تفویض کیا کریں گے ۔

افسران محولہ بالا ـــــ

صاحب ایجنٹ گورنر جنرل مقیم بلوچستان

صاحبان پولٹیکل ایجنٹ مقیم (أ) کوئٹہ (ب) زھوب (ج) درۂ قلات و بولان (د) جنوب مشرق بلوچستان (ہ) ضلع لورالائی و ریلوے ۔''

ان اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ انگریزوں کی آمد (۱۸۷٦ع کے لگ بھگ) کے بعد جلد ہی اس خطے کے اندر دفاتر میں اُردو بروئے کار آنے لگی تھی ۔ یہاں چند پرانے نمونے پیش کیے جاتے ہیں جن سے قریباً پون صدی پہلے کے انداز کا علم ہو سکے گا ۔ یہ تحریریں بلوچستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتی ہیں ۔

یہ ہے ۱۸۸۷ع کا نمونہ ؛ اس میں مدعی کس نہج پر اپنی شکایت پیش کرتا ہے اور اس پر کیا کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے ؟ ملاحظہ فرمائیے :

۱- صفحہ ۳۳۸ ۔

"بحضور جناب قاضی محمد جلال الدین خان صاحب تحصیل‌دار پشین

سید تمر ولد سید شیرو قوم سید سکنہ موضع پائیند علاقہ پشین۔۔۔مدعی

بنام

سید محمد حسن ولد سید پائیند ذات شکرزئی سکنہ ایضاً۔۔مدعا علیہ

دعوی ملکیت اراضی خشکابہ مالیتی ۵۷ روپے

واقع موضع سید پائیند علاقہ پشین

جناب عالی

مدعی حسب ذیل عارض ہے

۱۔ اراضی متنازعہ خشکابہ ہے اور مدعی باپ دادا سے قابض ہے، اس کو کاشت کرتا آیا ہے، محصول سرکار معاف ہے، حق ملکیت و ملکی بھی کسی کو نہیں دیا جاتا۔

۲۔ مدعا علیہ زبردست ہے۔ ۲ سال ہوئے کہ مدعی ہندوستان بتقریب سوداگری گیا ہؤا تھا۔ مدعا علیہ نے عدم موجودگی مدعی کے قلبہ رانی کرکے قبضہ کر لیا۔ سال گذشتہ جب مظہر مدعی واپس آیا اور عندالتحریر سخت بیمار ہوگیا تب سے مدعا علیہ نے کاشت کیا۔ اب پھر قلبہ رانی شروع کر دی ہے۔ مدعا علیہ کا کچھ غرض نہیں صرف سینہ زوری سے قبضہ کرتا ہے۔ امید وار ہوں کہ مدعی کی حق رسی فرمائی جاوے۔

۳۔ ۲ سال ٹکڑہ اراضی خشکابہ جو بلا اشتراک ہے جملہ باشندگان حصہ دار ہیں، اس میں بھی مدعا علیہ حصہ نہیں دیتا۔

مورخہ یکم فروری ۱۸۸۷ء

از عدالت

آج یہ عرضی مدعی نی عدالت ہذا میں پیش کی لہٰذا
حکم ہؤا کہ
مقدمہ درج رجسٹر کیا جاوے مدعا علیہ باخذ طلبانہ
باجرای سمن ضابطہ طلب کیاجاوے مقدمہ ۷ فروری ۱۸۸۷
پیش ہووے

المرقوم یکم فروری ۱۸۸۷
دستخط :۔

آج یہ عرضی پیش ہوئی چونکہ مدعی حاضر نہیں آیا حالانکہ تاریخ پیشی سے اس کو بخوبی اطلاع تھا لہٰذا حکم ہوا کہ مقدمہ بعدم پیروئے مدعی زیر تجویز سے خارج ہوکر مثل بعد ترتیب و تکمیل داخل دفتر ہووے۔
۷ ماہ فروری ۸۲ء

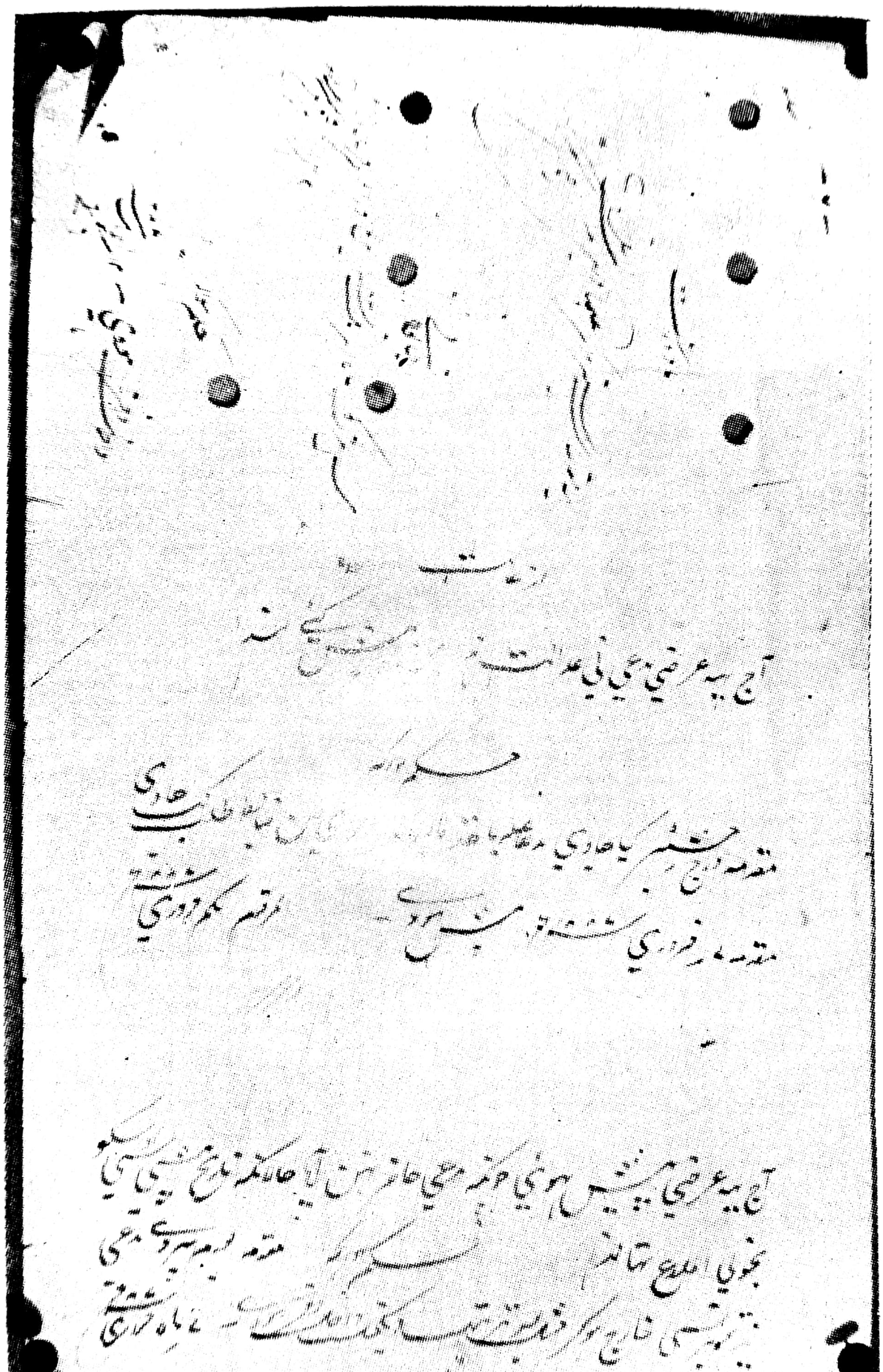
ملزم کس طرح اپنا بیان قلم بند کراتا ہے؟ اور اس کے بعد کی بھی مختصر کارروائی کا نمونہ دیکھیے:

بیان[1] ـــــ

میں جب بلوغت کو پہنچا ہوں تو میرا ارادہ غزا کا تھا مگر کوئی موقع نہ ملا۔ ہر چند کوشش کی، جب موقع نہ ملا تو چپ کر رہا۔ پھر گھر میں کچھ تکرار ہو گیا اور میں نے ایک مردان زئی کو زخمی کیا اور میں بھی زخمی ہؤا۔ پھر تحصیل دار صاحب کی پیشی کے لیے آیا مگر تحصیل دار صاحب نہیں تھا اور دورہ پر گیا، تو اس وقت میں نے ایک صاحب کو ترکھان کے دوکان پر دیکھا مگر میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی جو میں واپس اپنے گھر چلا گیا اور تلوار اور چھرہ لے کر پھر واپس تحصیل میں آیا اور بازار میں پھر رہا تھا جو یہ صاحب بازار میں آیا اور میں نے اس کو اول چھرہ سے مارا اور پھر تلوار سے مارنا شروع کیا، جو کہ ایک شخص نے آکر مجھ کو لکڑی سے مارا اور میں بے ہوش ہو گیا اور تلوار مجھ سے چھین لی اور مجھ کو قید کیا۔ اور اس وقت جب انگریز بہادر نمودار ہؤا تو بہت لوگ غزا غزا کرتا تھا اور اچھا ظاہر کرتے تھے۔

ازاں جا کہ یہ چٹھی نہایت تنگ وقت میں آیا، ہم نے بیانات ازاں رشتہ داراں غازی کے لیے اور دستی پہنچا دیے ہیں ـــــ

۱۔ نقل تحریر ۱۸۹۱ء



پچاس سال قبل کی ایک تحریر

لہٰذا حکم ہؤا کہ

اصل ہذا ہمراد مشمول مسل و اطلاعاً واپس بخدمت جناب صاحب بہادر ممدوح مرسل ہووے

بخدمت اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صاحب مرسل ہو کر تحریر ہووے کہ جب تک بازار ملزم کے بھائی اور رشتہ دار نہیں آویں گے تب تک حضور یہ مقدمہ سماعت نہ کریں گے - چاہیے کہ براہ مہربانی رشتہ داراں و بھائی ملزم کو جلدی طلب فرمایا جاوے - مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۹۱ع -

حسب الحکم صاحب بہادر کہ وہ اس وقت بیمار ہیں یہ دستخط کیے گئے اور صاحب بہادر دستخط نہیں کر سکتا -

غزا کا مقدمہ جو کل واقعہ ہؤا تو ملزم کا بیان اس وقت تحریر کیا - آفیسر صاحب مجروح کا اب چونکہ مسل مرتب کرنا ہوگا اور کامل تحقیقات کرنا ہو گا پس اگر آپ تحقیقات کرنا چاہیں تو ہم ملزم کا بیان آپ کی خدمت میں ارسال کر دے گا ، آپ باقی کاروائی کریں گے -"

۱۸۸۷ع میں سمن جاری کرنے کے لیے کس قسم کی عبارت استعمال کی جاتی تھی ، ملاحظہ فرمائیے :

"نقل

نمبر ۱۱۸

سمن بغرض قرار داد امور تنقیح طلب دفعات ۶۴ و ۶۸ مجموعہ ضابطہ دیوانی بنام . . . .

واضح ہو کہ . . . . نے تمہارے نام ایک نالش بابت ——— کے دائر کی ہے لہٰذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ . . . . . . وقت سنہ قبل دوپہر . . . . . . گھنٹہ پر اصالتاً یا معرفت وکیل عدالت مجاز حسب ضابطہ کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف

کیا گیا ہو اور کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ جواب دے سکے حاضر ہو اور جواب دہی دعوے مدعی مذکور کی کرو اور تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوئے تو امور تنقیح طلب تمہاری غیرحاضری میں قرار دیے جائیں گے اور تم کو چاہئے کہ اپنے ساتھ دستاویز کو جس کا معاینہ مدعی چاہتا ہے اور کسی دستاویز کو جس پر تم بہ تایید اپنی جواب دہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو اپنے ساتھ لاؤ یا معرفت اپنے وکیل کے بھیج دو۔

بہ ثبت دستخط اور مہر عدالت کی آج تاریخ یکم ماہ فرورے ۸۷ کو جاری کیا گیا۔

اطلاع : اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تمہارے گواہ اپنی مرضی سے حاضر نہ ہوں گے تو تم عدالت ہذا سے ثمن بایں مراد جاری کرا سکتے ہو کہ جو گواہ نہ حاضر ہو وہ جبراً حاضر کرایا جاوے اور جس دستاویز کو کسے گواہ سے پیش کرانے کا تم استحقاق رکھتے ہو وہ اس سے پیش کرائی جاوے بشرطیکہ تم تجویز سے پہلے کسی وقت اوس کے واسطے زر خوراک جو ضروری ہو عدالت میں داخل کر کے اس امر کی درخواست گذرانو۔

۲- اگر تم مطالبۂ مدعی کو تسلیم کرتے ہو تو تم کو لازم ہے کہ روپیہ معہ خرچۂ نالش عدالت میں داخل کرو تا کہ سرسری اجراے ڈگری کا جو تمہارے ذات یا مال یا در صورت ضرورت دونوں پر ہو کرنا نہ پڑے۔''

دفتری خط کتابت کے سلسلے میں ۱۸۹۵ع کا ایک مختصر سا نوٹ یہ ہے :

''از پیش گاہ جناب پولٹیکل ایجنٹ صاحب بہادر جنوب و شرقی بلوچستان

کرانچی ۵ جنوری ۱۸۹۵ع

دستخط بحروف انگریزی

صداقت نشان تہور عنوان عالیشان وکیل لس بیلہ

بہ نسبت پروانہ نمبر ۷ محکمۂ ہٰذا مورخہ ۴ جنوری ۱۸۹۵ع درباره بلوچی

امتحان اور ایک انگریزی کاغذ اطلاعاً آپ کے پاس بیجا جاتا ہے تحریر صدر ڈاک نمبر ۱۱"

۱۹۰۷ء میں مستونگ (قلات ڈویژن) کے چند صاحبان نے پولٹیکل ایڈوائیزر ریاست قلات کے حضور ایک دعویٰ دائر کیا تھا ، اُس کی نقل درج کی جاتی ہے :

"نقل درخواست معتبرین
بحضور والا شان جناب صاحب بہادر پولٹیکل ایڈوائیزر ریاست قلات

مسل متفرق ۹۸۰ مرجوعہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۷ء منفصلہ ۱۸ جولائی ۱۹۱۰ء سید جمن شاہ ولد سید محمود شاہ و سید لعل شاہ ولد سید بدلشاہ و سید محمود شاہ ولد سید جمن شاہ ذات سید سکنہ مستونگ بنام سید شاہ وکیل خاں صاحب بہادر والی قلات

دعوے ٹھک شش کیلہ پشکرم

جناب عالی دام اقبالہ'

بہ معاملہ مندرجہ صدر ابتداء میں دور آب پاشی رود پشکرم ۲۴ کیلہ تھا جس پر سلطان سمرقند علیہ‌الرحمۃ اور خواجہ ابراہیم علیہ‌الرحمۃ کا ٹھک خیرات بحصہ برابر مقرر تھا ۔ ۱۲ کیلہ کا ٹھک گل محمد جھنڈا خان وغیرہ اقوام یعقوب زئی سلطان صاحب کے لیے وصول کرتے تھے اور ۱۲ کیلہ ثانی میں سے ۶ کیلہ کا ٹھک مدعیان اور ۶ کیلہ کا ٹھک مدعاعلیہ خواجہ ابراہیم صاحب کے واسطے وصول کرتے تھے ۔ بعد ازاں بہ زمانہ نیابت فیض محمد ڈپٹی ۶ کیلہ دیگر سرکار کے واسطے دور کو بڑھا کر بجائے ۲۴ کے ۳۰ کیلہ کیا گیا ۔ اس ۶ کیلہ ایزاد شدہ کا ٹھک برادر مدعا علیہ اور مدعا علیہ وصول کرتا تھا ۔ مدعیان نے اس کے ساتھ بعہد حکومت جناب والا شان میر خدا داد خاں صاحب بہادر سابق والی قلات مدعا علیہ کے ساتھ دعوے برپا کیا کہ جس صورت میں پہلے سے ٹھک خواجہ ابراہیم درمیان میرے اور آپ کے مشترک ہے یعنے نصف آپ اور نصف میں لیتا ہوں تو

اس ایزاد شدہ ۶ کیلہ کا بھی نصف ٹھک تم لو اور نصف مجھ کو دو مگر مدعا علیہ کا بھائی نہیں مانتا تھا جن کا تنازعہ بحضور جناب خان صاحب بہادر ممدوح پیش ہو کر یہ فیصلہ ہؤا کہ اس ۶ کیلہ ایزاد شدہ متدعویہ کا ٹھک سید رستم شاہ برادر مدعا علیہ کا ہوے مدعیان کو دعوے نہ ہوگا۔ چنانچہ جناب خان صاحب بہادر ممدوح نے بمہر خود و بمہر بزرگان ہم معتبران مستونگ اس کو سند عطا کی۔ چنانچہ اس حساب سے مدعی کا وہی ۶ کیلہ کا ٹھک رہا اور مدعا علیہ کا ۱۲ کیلہ کا ٹھک اس کو قابل وصول ہؤا مگر اس نے مدعیان کے حقوق میں دست انداز ہو کر اُس ۶ کیلہ حقی مدعیان میں دست انداز ہؤا ہے جس پر ان کا تنازعہ ہے اس لیے ہم فی سبیل اللہ اپنی گواہی کے طور پر درخواست ہٰذا پیش بحضور انور کرتے ہیں کہ مدعا علیہم کو کوئی حق اٹھارہ کیلہ کی ٹھک کی وصولی کا نہیں ہے۔ ۶ کیلہ اصلی اور ۶ کیلہ ایزاد شدہ جن پر بھی مدعی کا دعوے ہے اون کا ہے اور ۶ کیلہ از قدیم الایام از وقت آباو اجداد حق مدعیان ہے۔ آئندہ حکام مالک ہیں کہ ان کو دلا دیں یا نہ، اطلاعاً عرض رہا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۷ع - مکرر عرض آں کہ جب بہ عہد خان صاحب بہادر کے فیصلہ ہؤا بعد ازاں بھی مدعیان اپنے اس ۶ کیلہ کے ٹھک پر قابض تھے۔ یہ سہ چار سال ہوتے ہیں کہ مدعا علیہم اور مدعیان کے درمیان دعوے ہوئے، مدعا علیہم کو جناب خان صاحب بہادر حال نے وہ ٹھک بھی دلایا۔

عـــرضـــــــــــــــــــــے

ارباب امام بخش	سردار عزیز خان	مہراب علیم خان
مُہر و دستخط	مُہر	"مُہر"
وغیرہ	وغیرہ	

اُردو میں تحریر شدہ دو دعوت نامے پیش کیے جاتے ہیں ؛ ایک قریباً نصف صدی پیشتر کا ہے اور دوسرے کو اٹھارہ سال ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں سرکار کی جانب سے معتبرین کو کیسے مدعو کیا جاتا تھا :

دعوتی کارڈ کا نمونہ

"سبی ۵ فروری ۱۹۱۸ء

جناب جلالتمآب آنریبل مسٹر ایچ - آر - سی - ڈابس صاحب بہادر سی - ایس - آئی - سی - آئی - ای - آئی - سی - ایس ایجنٹ گورنر جنرل و چیف کمشنر بلوچستان بتاریخ ۹ فروری ۱۹۱۸ء بروز شنبہ بوقت ۵ بجے بعد دوپہر باغیچہ رزیڈنسی سبی میں مجلس چاء نوشی منعقد فرماویں گے اور خوش ہوں گے اگر

سید غلام حیدر شاہ

تشریف آوری اور شمولیت سے محظوظ فرماویں

Aziz ud din

پرسنل انڈین اسسٹنٹ"

دعوتی کارڈ کا نمونہ

"بتقریب جشن استقلال دولت خداداد پاکستان ۱۹۴۹ء

دعوت نامہ چاء پارٹی

بوقت ۵ بجے شام تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۴۹ء

واقعہ بنگلہ ریذیڈنسی مستونگ

بخدمت سید غلام حیدر شاہ

المتکلف

امضاء جناب پولیٹیکل ایجنٹ صاحب بہادر

ریاست ہاء[۱] بلوچیہ

برائے[۱] مہربانی یہ دعوت نامہ ہمراہ خود لائیں -"

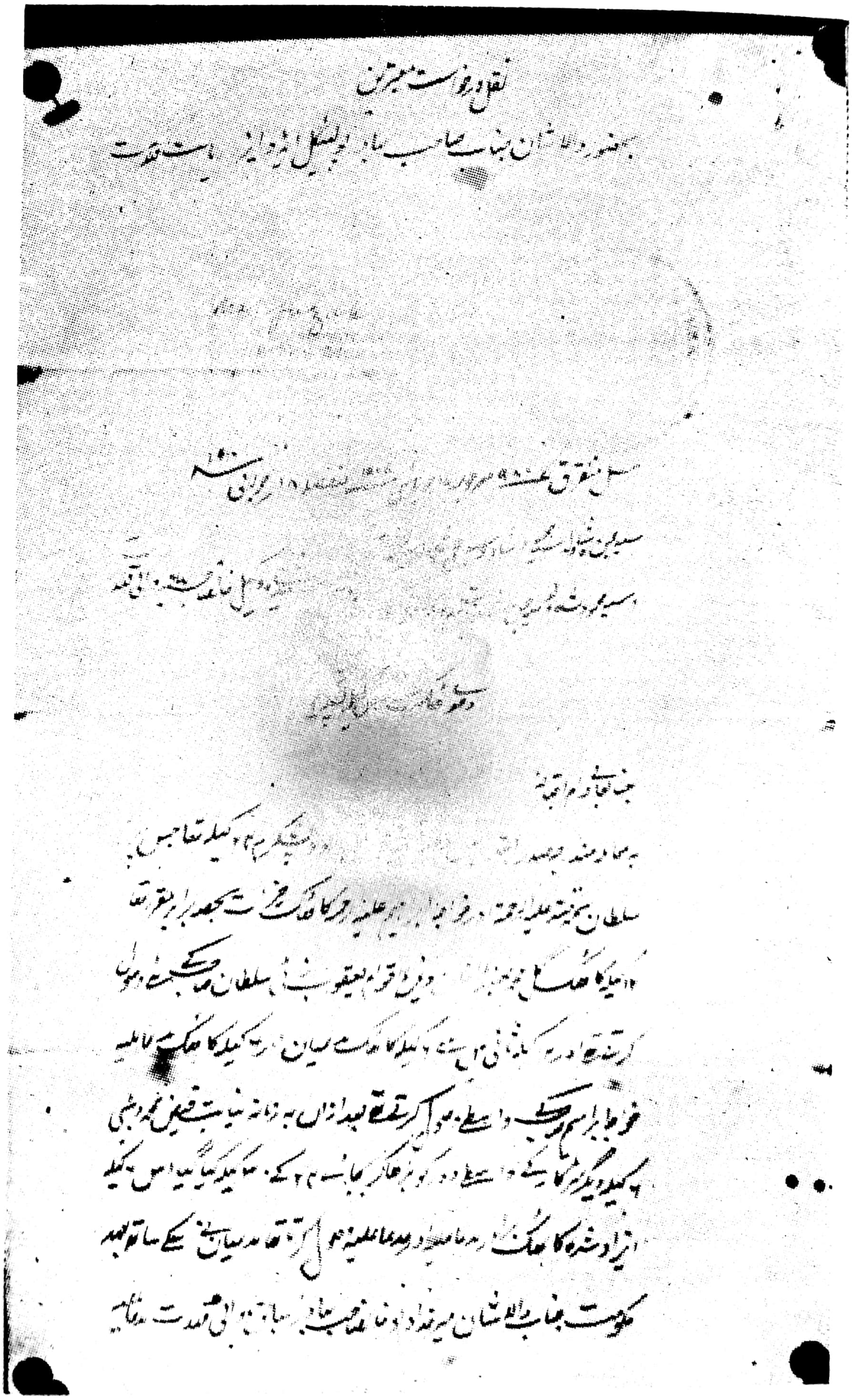
سر رابرٹ سنڈیمن ۱۸۶۶ء سے ڈیرہ غازی خاں کا ڈپٹی کمشنر تھا - وہ ۱۸۷۵ء میں پہلا مشن لے کر بلوچستان آیا - بعد میں اسی کو بلوچستان میں ایجنٹ گورنر جنرل مقرر کیا گیا - ہتو رام جو اُس کے ہمراہ تھا ، اُس

۱- ظاہر ہے کہ "ریاست ہاء" میں ے کی جگہ ہمزہ محل نظر ہے اور "برائے مہربانی" بالکل غلط ہے - صحیح براہ مہربانی ہے -

نے اپنی تاریخ میں ''یادداشت ڈائری دورۂ کوہستان از ابتدا'' (یعنی ۱۹ نومبر ۱۸۷۵ع سے) لکھی ہے جس میں سیاسی حالات کے علاوہ مختلف مقامات کے بارے میں معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہیں ۔ یہ ڈائری اُردو میں تحریر کی گئی ہے ۔ اُس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس سے بلوچستان میں سرکار کی جانب سے حالات و واقعات قلمبند کرانے کا انداز معلوم ہوسکتا ہے ۔ یہ تحریریں قریباً ایک صدی پرانی ہیں ۔ ان سے اس امر کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اُن دنوں اُردو کا اسلوب نگارش کیا تھا :

''۱۴ و ۱۵ دسمبر ۱۸۷۵ع ۔ کرتہ[1] ۔ ۲ یوم ۔ ۳۰ میل ۔ صبح کوچ ہؤا ۔ بوقت کوچ سلامی اتواپ کی ہوئی ، مولاداد جمعدار معہ پندرہ سواران واسطے پہنچانے کے ہمرکاب چلا ۔ درۂ بولان شہر ڈاڈہر[2] سے ایک میل بجانب غرب و جنوب کے ہے ۔ رود بولان کی بڑی فراخ رود ہے ، جس کا شکم مثل دریا چناب ہوگا ۔ پانی کالا صرف بقدر ایک چھوٹے نالہ کے جاری ہے ۔ بموسم بارش تمام رود پُر آب ہوکر جاری ہوتی ہے ۔ رود میں کچھ ریتی ہے کچھ تھوڑا پتھر ہے لیکن راستہ بالکل صاف ہے ۔ قطع نظر شتران اور اسپان کے صرف تھوڑی غور سے گاڑی بھی چل سکتی ہے ۔ ڈاڈہر سے قریب تین میل پر خانقاہ پیر ابراہیم شاہ کی ہے ، جو اُس موقعہ کا نام پیر مشہور ہے اُس سے گذرکر تین میل پر درخت کیکر کا ہے ، جو اس جگہ پر فیس قافلہ جات کے ملازمان خانصاحب لیا کرتے تھے ۔ پھر ان کو اجازت ملتی تھی کہ قافلہ کو آگے لے جاویں ۔ اس کے مقابل ایک راستہ طرف علاقہ مری کے نکلتا ہے جس کا نام پھوندی ہے ۔ اگرچہ آمد رفت شتران کے واسطے مشکل ہے مگر بلوچی لشکر کے واسطے مشکل نہیں ۔ اس راستہ سے کبھی کبھی مری لوگ قافلہ پر تاخت کرتے تھے یا ڈاڈہر سے جنوبی دیہات پر غارت‌گری کرتے تھے ۔ اُس سے آگے ایک مقام کا نام جہاں چند درختان

۱۔ ہتو رام : تاریخ بلوچستان ، صفحات ۳۹۷ ۔ ۳۹۸ ۔
۲۔ اس سے مراد اصل درہ نہیں بلکہ درے کا جنوبی دروازہ ، جہاں سے پہاڑوں میں داخل ہوتے ہیں ۔



۱۹۰۷ء کی ایک دفتری تحریر کا عکس

چھوٹے چھوٹے ہیں کندلائی بولتے ہیں - یہ موقع ڈاڈہر سے قریب ۱۵ میل ہوگا - قافلہ کے واسطے ایک یہ منزلگاہ ہے - اس جگہ لکڑی فی‌الجملہ ہے - گھاس کی قلت ، پانی عام اور رود جاری تھی - بہ لحاظ قلت گھاس یہاں مقام نہ ہوا ، کرتہ پر آئے -

کرتہ ایک بستی کا نام ہے جس جگہ اقوام کچک بلوچ آباد تھے- قریب دو سو خانہ ہوگا - پانی کالا رود بولان کا یہاں تک برابر جاری چلا آیا - درمیان راہ چند موقعوں پر آب میں پایاب گذرنا ہوا - اس جگہ گھاس اور لکڑی عام پائی گئی - موضع کرتہ بالفعل ویران اور سوختہ دیکھا گیا - ایسا معلوم ہوا کہ پہلے اس موقعہ پر واسطے حفاظت قافلہ جات از جانب خان صاحب کچھ فوج رہا کرتی تھی - چنانچہ لین سواران و پلٹن ملاحظہ ہوئی - پھر جب مری متواتراً قافلہ جات پر دست انداز ہوا ، فوج نے مقاوست نہ دیکھی ، اُٹھائی گئی- بعد اُس کے مری نے خاص بستی کرتہ کے لوگوں پر چند دفعہ حملہ کیا ، اُن کا سب مال غارت کیا- آخر بستی میں داخل ہو کر غارت کیا اور بعد غارتی شہر کو آگ لگا دی - تب سے لوگ کوچ کر کے طرف ڈاڈہر چلے گئے- خاص کرتہ کے سر پر ایک راستہ بنام ٹکری طرف مری کے نکلتا ہے - بستی سے دو تین میل ہوگا - ایک دن اور بھی اس جگہ مقام ہوا کہ کپتان ویلی صاحب بہادر واسطے نقشہ کمپاس طرف پنیر بند و کوہستان مری تشریف لے گئے -''

علاوہ اس کے رائے بہادر ہتو رام سی - آئی - ای نیٹو اسسٹنٹ گورنر جنرل میجر سنڈیمن صاحب بہادر نے ''رپورٹ کاروائی گذرنے افواج براہ تھل چوٹالی قلعہ خوشدل خان سے وٹا کری تک'' اُردو میں پیش کی - اُس میں سے یہ اقتباس دیکھیے :

(نمبر ۹) - ۲۱ و ۲۲ و ۲۳ مارچ ۱۸۷۹ء سنجاوی[1] - ۱۷ میل - راستہ ہموار میدان صاف مابین راہ دو تین موقعوں پر پانی مل سکتا ہے - گھاس پہاڑی بھی ہے جب متصل کوہ اغبرگ درہ کندسل کے پہنچے تو

۱- ہتو رام : تاریخ بلوچستان ، صفحات ۲۰۷ - ۲۰۸ -

معلوم ہوا کہ بعضے مفسدان مسلحہ بہ خیال بند کرنے درہ کے پہاڑ کے اُوپر نمودار ہیں ۔ اول ان کو واسطے نیچے آنے یا چھوڑنے راہ کے اطلاع ہوا ۔ اکثر وہاں سے ہٹ گئے مگر کچھ باقی رہ گئے تھے ۔ پھر اُن کے اُوپر توپ چلایا گیا جس سے سب بھاگ گئے اور راستہ کھل گیا ، بغیر کسے تکالیف کے گذر ہوا ، متصل درہ مذکور کچھ توقف ہوا ۔ اتنے میں ملکان ساعلن و سنجاوی مسمیان برخ و عالم خاں وغیرہ نے حاضر ہو کر سلام کیا اور پیشوا ہو کر منزل گاہ پر لے گئے ، لیکن جب ریر گارد نے درہ مذکور سے گذر کیا تو مفسدان نے ایک سپاہی پلٹن کا قتل کیا ، مفسدان سے بھی کئی مارے گئے ۔ ارادہ تھا کہ ان مفسدان پر جو اوپر کوہ اغبرگ سکونت رکھتے ہیں حملہ کر کے اُن کو سزا دیجاوے مگر ملکان نے وعدہ دیا اور کہا کہ جو ملک سرکردہ اقوام مسکونہ کوہ مذکور کا ہے کل تک حاضر کر کے صفائی دیویں گے ۔ ملک کوٹ جو سرکردہ اقوام مذکور کا تھا ، حاضر ہوا اور حلفاً بیان کیا کہ یہ لوگ مرتکب واردات مختلف غیر قوم و غیر وطن لوگ تھے ۔ جیسا ایک سپاہی سرکار کا قتل ہوا ، اُن لوگوں نے بھی نقصان اُٹھایا ۔ ہمارے پہلے کے لوگ شامل نہیں تھے اور آئندہ کے واسطے اس درہ کی ذمہ واری ہم اُٹھاوے گا ۔

بخیال کشائیش راہ و جمع آوری رسد مطلوبہ افواج پسنیہ یہ عذر قبول کر کے اس کو حلف دیا گیا اور معرفت ملکان اقوام دوبمڑ کے چھار مواقع ذیل پر برائے آمد رفت ڈاک و بھوسہ و حفاظت مسافران چوکیات مقرر ہوئی ۔

چوکی بیانی ـــــ درہ کندہل متصل کوہ اغبرگ ـــــ سنجاوی ـــــ بغاد

ذاتی خطوط

اب ذاتی خطوں کے چند نمونے درج کیے جا رہے ہیں، جو بلوچستان میں اُردو میں تحریر کیے گئے۔ ویسے اس خطے میں نجی خط فارسی میں لکھے جاتے رہے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ بہرحال اُردو نے یہاں اپنا اثر دکھایا تو اسے اپنے ذاتی خیالات اور حالات کے اظہار کے لیے اپنا لیا گیا۔ ان میں بعض مندرج باتیں بالکل ذاتی نوعیت کی ہیں اور بعض میں اجتماعی مفاد کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ بلوچستان کے مجاہد اعظم اور مرد قلندر نواب زادہ یوسف علی خاں عزیز[1] کے خطوط بلند خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ وہ حالات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے جو تڑپ رکھتے اور کسک محسوس کرتے تھے، اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ان نجی خطوں میں آدمی بالکل بے تکلف نظر آتا ہے، اور ان میں ہمیں شگفتہ طرز ادا ملتا ہے۔

ان خطوں کے مطالعے کے بعد کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اُردو کو بلوچستان نے ویسے ہی اپنے سینے سے نہیں لگایا جیسے یہ دوسرے علاقوں میں شدت سے اثر پذیر ہوتی رہی ہے؟

''بخدمت فیضدرجت فیضرساں جناب سید شاہ وکیل صاحب زاد عنائیتہ

بعد سلام بخیریت انجام آنکہ۔ کہ آپ کا خط ہم کو ملا، احوال معلوم ہوا۔ بدرجہ کمال خوشی ہوئی اور وجہ دیری جواب یہ ہے کہ جس وقت آپ کا خط پہنچا

۱- آپ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے خوفناک زلزلے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کا مفصل حال ''تحریکات آزادی'' کے تحت آئے گا۔

تھا ، اُوس وقت میں بیمار تھا ، اس واسطے جواب دے نہ سکا اور آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ ہمارا یکصد روپیہ بہت جلدی روانہ کر دو ، اوس کی بابت یہ عرض ہے کہ ہم نے اپنے لڑکے کی شادی موضع وڈھ قرضہ کرکے کیا ہے اور مبلغ پانچ سو روپیہ اپنے تنخواہ سے نیٹو اسسٹنٹ سے قرضہ پیشگی اوٹھا کر شادی پسر خود کیا ہے ، اور وغیرہ قرضہ بھی اُوٹھایا گیا ہے - تاحال ہم کو تنخواہ کا روپیہ سرکار سے ایک پائی تک نہیں ملا ہے ، وہاں ہی میری تنخواہ سے وضع ہو رہا ہے - اس وقت میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور وڈھ سے آتے ہی میں بیمار ہو گیا تھا ، میری بیماری پر اور شادیٔ پسر پر قرضہ اوٹھا کر آج تک خرچ ہو رہا ہے - اور ابھی شادی میر پسند خان پسرم در پیش ہے ، اس کی بھی شادی کہیں سے قرضہ اوٹھا کر کی جاوے گی - بعد فراغت شادی پسر خود آپ کی قرضہ کی صورت دینے کے کی جاوے گی - زیادہ خیریت ہے - مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۱۰ع - اور بیرنگ خط اس واسطے لکھا گیا ہے کہ ٹکٹ پیدا نہیں ہے -

الراقم

میر عالم خان تھانیدار - تھانہ ساروہنہ''

مکتوب نواب یوسف علی خان مرحوم بنام مولانا عبدالکریم
سابق ناظم جامعہ[1] عزیزیہ جھل

''اللہ اکبر

مکرم بندہ—

خطر تاب و تواں را امتحانست
عیار ممکنات جسم و جانست

اے خالق کائنات کی تخلیق کی ایک بہترین چیز ! سلامتی ہو اوپر تمہارے اور اوپر دیگر مومن بھائیوں کے - آپ کے خط نے بے حد محظوظ کیا ، شکریہ -

ایبٹ آباد صوبہ سرحد میں ہوں ، موسم معتدل ہے - بارش کا بلا ناغہ روزانہ برسنا ، ہواؤں کا چلنا ، شہر کی پاکیزیت اس خطہ کے مکینوں کے

۱- الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۰ اگست ۱۹۳۷ع ، صفحہ ۲۶ -

جنتی ہونے کا ثبوت دے رہی ہے - بایں ہمہ میری سوختہ سامانی میں کوئی فرق نہیں آیا - ''زمیندار'' ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۳۲ع کا پرچہ دیکھیے جس میں میری تصویر ہے - آپ کی تکلیف نے مجھ پر کیا اثرات ڈالے اس کی تشریح کو کسی اور موقعہ پر رکھے دیتا ہوں - کسی وقت مسلم سے میں نے ایک اپیل کی تھی جس کا ایک شعر ہے :

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اب اس کا اطلاق عین مجھ پر ہوتا ہے - اگر میں یہ عرض نہ کروں کہ بندہ بھی عمل اعداد کے لیے حاضر ہے - دو تین یوم سے طبیعت پر ایک خاص حالت طاری ہے جس کے تحت ''پیغام عمل و احسانات سرور کائنات کے'' زیر عنوان بہت کچھ کہہ چکا ہوں -

'زمیندار' اور 'سیاست' کی معرفت آپ دیکھ سکیں گے - چودھری صاحب نے مجھے اب تک کچھ نہیں لکھا - تکلیف فرما کر ان کو اگر یہ پیغام پہنچا دیں کہ ''بندۂ خدا تمھیں علم نہیں کہ ایک غریب الوطن کے لیے اس قدر استغنا کس قدر اذیت دہ ہوا کرتا ہے'' تو شکریہ ہوگا - بھائی فیض کو بہت بہت السلام علیکم -

میں ہوں اور ''بے مہری اہل وطن[1]'' غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

آپ کا محمد یوسف علی خان مگیسی''

نواب یوسف علی خاں عزیز مرحوم کا مکتوب بنام محمد امین خان کھوسہ[2] بی - اے ، ایل ایل بی

''سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا ، سر تو کھو سکا

۱- یہ نواب مرحوم کا تصرف ہے - اصل میں یوں ہے :
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل

۲- الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۰ اگست ۱۹۳۷ع ، صفحہ ۴۷-۴۹ -

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

بھائی امین ! اللہ قادر ہمارے قدموں کو صراط مستقیم پر ثابت رکھے ۔
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ آپ کا عنایت نامہ ملا ۔ شکریہ ۔ جناب کے والد محترم نے بندہ کو ایک تحریر لکھی ہے کہ بندہ آپ کو اخباروں میں مضمون نویسی سے منع کرے ۔ میں حیران ہوں کہ کیا کروں ۔ اگر تعمیل کرتا ہوں تو ترغیب کتمانِ حق کے جرم عظیم کا مرتکب ہوتا ہوں ، اور اگر نہیں کرتا تو اپنے پیارے دوست کے پیارے باپ کو ناراض ہونے کا موقعہ دیتا ہوں ۔ فریضۂ عظیمہ ''دفاع'' کی اہمیت کے متعلق ایک روایت عرض ہے ۔ کہ

ہجرت کے نویں سال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہو رہی ہے ۔ یہ سن کر آپؐ نے بھی تیاری کا حکم دیا اور بیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینے سے کوچ کر دیا ۔ چونکہ یہ فوج بڑی تھی ، تنگ دستی اور بے سرو سامانی کی حالت میں نکلی تھی ، اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری آتی تھی ۔ جنگل کے پتے کھا کر مجاہدین نے گزارہ کیا تھا اس لیے اس فوج کا نام جیش العسرۃ مشہور ہوا ۔ ''الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ[۱] ۔'' حضرت ابوبکرؓ نے اس دفاع کے لیے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا تھا ۔ جب ان سے پوچھا گیا : ''ما ابقیت لاھلک[۲]'' تو اس پیکر ایمان و مجسمۂ عشق نے جواب دیا : ''ابقیت لھم اللہ و رسولہ'' (ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول رکھے) :

آں کس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند ؟
فرزند و عیال و خان و ماں را چہ کند ؟

۱۔ جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں اس (نبی صلعم) کا ساتھ دیا ۔ (سورۃ توبہ آیۃ ۱۱۷) ۔
۲۔ اپنے اہل و عیال کے لیے کیا رکھا ؟

دیوانہ کنی ہر دو جہاں می بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند؟

تبوک نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی دلیرانہ تیاریوں سے مرعوب ہو کر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر کی گئیں۔ آپؐ نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔ اس دفاع میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک ہوئے تھے۔ صرف تین مسلمان نہ جا سکے۔ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن الربیع۔ کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں اور ان تین سے سابقین اولین میں ہیں جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کا شریک نہ ہونا کسی بُری نیت سے نہ تھا۔ سستی اور کاہلی کے باعث فوج کے ساتھ ملنے کا موقعہ نکل گیا۔ بہ ایں ہمہ کہ یہ مجاہد اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظروں میں اس درجہ اہم ہیں، اتنی سستی اور کاہلی بھی سخت جرم قرار پائی۔ معذرت کے لیے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی۔ حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور وحی کا انتظار کرو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات ان سے ترک کر دیں۔ پھر ان کی بیبیوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور ان سے کوئی بھی واسطہ نہ رکھیں۔ غسان کے عیسائی بادشاہ نے یہ حال سنا تو بہت خوش ہوا اور کعب کے نام اس مضمون کا خط لکھا کہ تمہارے آقا نے تمہاری ساری خدمتوں کا جو معاوضہ دیا ہے، وہ دیکھ چکے ہو۔ اب میرے پاس چلے آؤ، دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے۔ کعب بن مالک کو خط پہنچا تو ایلچی کے سامنے آگ میں پھونک دیا اور کہا جواب میں کہہ دینا ہم نے جس آقا کی چوکھٹ پر سر رکھا ہے، اس کی گیرائیوں اور دلربائیوں کا حال تمہیں کیا معلوم۔ اس کی بے التفاتی بھی دوسروں کی محبت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ان مؤمنین صادق کی آزمائش پورے پچاس دن تک رہی، بالآخر سورۃ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی اور توبہ معاف ہوئی: ”وعلی الثلثۃ الذین خُلفوا۔“[۱]

۱۔ اور ان تین پر جو پیچھے رہ گئے تھے۔

سمجھے بھائی امین ! فرض ''دفاع'' کی اہمیت ؟ حملہ و ہجوم کی صورت میں ایسا نہیں - ایک جماعت کے جہاد سے (جہاد کے معنی ہیں کمال تندہی سے راہ حق میں سعی کرنا) دوسرے مسلمان ہو سکتے ہیں مگر جب غیر مسلموں کی جماعت مسلمانوں کو کمزور پا کر مسلمانوں کے ملک یا حکومت یا آزادی پر قبضہ کرنا چاہے یا ایسی صورت در پیش آئے کہ غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں کی عزت و ناموس و ملک تباہ ہونی چاہتی ہے ، تو اس وقت دفاع کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو جانا سب پر فرض ہے - بچوں اور معذوروں کو چھوڑ کر باقی سب پر اس فرض کا اطلاق عائد ہوتا ہے - ماں ، باپ ، بہن ، بیوی ، بچے ، رشتہ ناتے اپنی اپنی جگہ سب کے حق ہیں لیکن خدا اور اس کی سچائی کا حق سب سے بڑا حق ہے - ''قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموالن اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفاسقین -''

یعنی اگر والدین ، تمھاری اولادیں ، بھائی ، بہن ، بیویاں ، تمھارا خاندان کے تمام رشتے اور یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے اور یہ کاروبار تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو ، یہ تمھارے رہنے کے محل جن میں تمھارا دل لگا ہوا ہے ، اگر تمھیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں اور تمھارے پاؤں ان زنجیروں سے بندھ گئے ہیں کہ اللہ کی پکار بھی اسے ہلا نہیں سکتی تو جان لو کہ اللہ کا کام بھی تمھارا محتاج نہیں - نتائج کا انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ دے دے - اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمان پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا - کیا آپ کو اس امر کے تسلیم سے انکار ہے کہ اس وقت ''جہاد دفاع'' یعنی ''ڈیفنسیو'' ہے - اگر نہیں تو پھر قطعیت فرض بھی معلوم - میرا خیال ہے کہ مجھ سے زیادہ آپ ان فرائض کو محسوس کرتے ہوں گے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جوش تکمیل فرض میں شامل ہونے کے لیے کوئی ایسی راہ اختیار کریں جو دوسری راہوں کی بہ نسبت کم پسندیدہ ہو - مثلاً اپنے

والد کو مل کر بہ دلائل اور خدا کی کتاب کے حکم کی روشنی میں سمجھا کر اپنی اجازت پر راضی کر لینے کی بہ نسبت بغیر ملے اور سمجھائے میدان میں کود پڑو ۔ اگرچہ وہ بے اختیار کودنا بھی اللہ کے نزدیک قابل صد ہزار ستائش ہے اور تیری ہزار سالوں کی تسبیح گردانی اس ایک لمحہ کا اجر حاصل نہیں کر سکتی جو جہاد فی سبیل اللہ میں ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بغیر جہاد میں شریک ہوئے خدا نخواستہ تیری موت آ جائے ۔ خوش ہے وہ رات جو انتظار میں کٹے ، خوش وہ دن جو ان باتوں میں گذرے ، خوش قسمت ہے وہ قوم جو اس انتظار میں گرد آلود ہو ، خوش ہے وہ آدمی جو اس انتظار میں مر جائے ـــ مگر جب دوسرا راستہ ایک ہے یعنی امکان ہے کہ آپ کے والد آپ کی ملاقات اور سمجھانے اور اپنے مقاصد معصوم مقدس بتلانے پر خوشی سے آپ کو اجازت دیں تو کیوں دوسرا راستہ اختیار کیا جائے ؟ کاش آپ ہوتے تو آپ کو اس امر کی نسبت قرآن حکیم کی اس وقت چالیس سے زائد آیتیں اور حدیث کی پچاس سے زیادہ روایتیں جو اس وقت میرے سامنے کھلی پڑی ہیں دکھاتا ۔ آپ کو امام احمد بن حنبل کے واقعات غیر محدود دعوت یاد ہوں گے کہ تازیانہ کی ہر ضرب کے ساتھ ”قرآن غیر مخلوق“ کی صدا بلند ہوتی تھی ۔ اگرچہ شریعت نے ایسی صورتوں میں رخصت دی ہے کہ حفظ جان کی خاطر جابر و ظالم حاکم کا کہنا مان لیا جائے مگر یہ شرعی حیلے اور رخصتیں تو ان کے لیے ہیں جو بچنا چاہیں سزائے عشق سے ۔ لیکن صاحب عزیمت و دعوۃ تو ایسی رخصت کو حکمت کی موت اور ایمان کی تباہی کے مترادف سمجھتا ہے اور وہ مجتہد وقت اور خالق زمانہ ہوتا ہے ، وہ زمانہ کی مخلوق نہیں ہوتا بلکہ وہ زمانہ اور وقت کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا ساتھ دیں ۔ وہ فرشتوں کو اپنے ساتھ لیتا ہے ۔ زمین ناموافق ہو تو آسمان کو اترنے کا حکم دیتا ہے اور اگر آدمی ساتھ نہیں ہوتا تو فرشتوں کو چیخنے کو کہتا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

میری مزخرفات سے اگر رنجش محسوس ہو تو معاف کیا جاؤں ۔ کبھی

دیوانے کی بکواس سننا بھی اچھا ہوتا ہے -

بدقسمت بلوچستان کا ایک بد نصیب مسلمان عزیز"

خان عبدالصمد کا خط بنام محمد امین خان کھوسہ بی - اے ، ایل ایل بی

"اللہ اکبر

رفیق محترم !

السلام علیکم - بخیرم و خیر خواہ - تھوڑی دیر کے لیے اپنی خشکی کو بالائے طاق رکھ کر اس عرض پر غور کیجیے کہ اگر آپ بدولت کو تکلیف نہ ہو اور مجھ سے تکلف کی امید نہ ہو تو ضرور اس خط کے دیکھنے کے ساتھ گاڑی ، موٹر گاڑی ، گھوڑا گاڑی یا کسی گاڑی پر رونق افروز ہو کر تھوڑی دیر یعنی صرف ایک یوم کے لیے جھونپڑی بمعنی حقیقی کو منور فرمائیں ، تا کہ گلستان کو یہ فخر حاصل ہو کہ کبھی خشک بلوچ صاحب یہاں تشریف لا کر دماغ معلٰے کو طراوت پہنچاتے تھے - جواب بجائے زبان برق کے پشت کارڈ پر اس لیے لکھا کہ آپ کے کارڈ کے پڑھنے کے بعد جب وقت دیکھا تو پوسٹ ماسٹر کے ہڑتال کا وقت ہو چکا تھا اور آج کارڈ اور تار انشاء اللہ ایک ہی وقت پہنچیں گے یعنی گاڑی کے روانہ ہونے کے بعد ، اس لیے ضرور آنجناب کو کل ہی تشریف لانی پڑے گی - میں ۷ اور ۸ ہر دو تاریخوں کی ٹرین پر انتظار کروں گا [۱] -

آپ کا عبدالصمد"

ایڈیٹر ہفت روزہ 'استقلال' کوئٹہ کے نام

نوشکی

۵۰-۲-۱۱

پیارے ساتھی !

اتنا تو ہے کہ زندہ ہوں ، اگرچہ مُردوں سے گندہ - کل رفیقی اعظم جان کے خط میں ملفوف خان صاحب کا خط ملا ، متواتر اُسے پڑھ رہا ہوں ،

۱- الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۰ اگست ۱۹۳۷ع ، صفحہ ۵۷ -

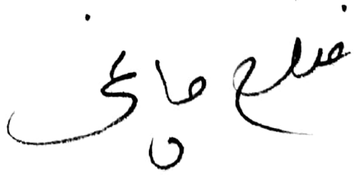
رمز و اشارے کی باتیں ہیں اور خان کی تحریر بہت کم سمجھ آ رہا ہے - خیر اس سے اتنا تو ہوا کہ ریگستان میں پڑے پڑے جو دماغ بیکار ہو چکا تھا ، کچھ کچھ جاگ اُٹھا ، جس کا پہلا ثبوت پال نیک یا فال نیک بلوچی نظم ہے - آج صبح ہی گھر سے ریتوں کی طرف نکلتے ہی موزوں ہوئی اور اس خط کے ساتھ بمعہ ترجمہ آپ کی طرف چل پڑی - پسند آئے تو ' استقلال ' میں شائع فرما دیجیے ورنہ ردی کی ٹوکری تو میز کے نیچے ہی پڑی ہے ، اُس کی نذر کرا دیں -

میں یہ مانتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ وفا نہ کر سکا - بھلا یہ تو بتائیے کہ آپ نے اپنا وعدہ کہاں تک نبھایا ، یعنی وہ بلوچی مجموعہ کے لیے گرد پوش والی گذارش کہاں تک پوری ہوئی ؟

اُمید ہے ، اگر کیسہ جواب نہ دے ، ۲۰ فروری کے بعد کوئٹہ آ جاؤں گا - آپ اور اعظم جان کی دید کو ترستا ہوں اور وہ " خدا کا بیل " تو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتا ، والسلام

ارباب صاحب اور ملک صاحب کی خدمت میں آداب عرض

آپ کا گل خان نصیر[1]



۱- میر گل خان نصیر مصنف تاریخ بلوچستان جلد اول مطبوعہ ۱۹۵۲ع جلد دوم مطبوعہ ۱۹۵۷ع از کوئٹہ -

صحافت

کوئٹہ اور قلات ریجن میں اُردو اور انگریزی کا ورود ایک ساتھ ہوا۔ سب سے پہلے یہاں دو اخبار انگریزی ہی میں جاری ہوئے جو حکمرانوں کی زبان تھی۔ پھر بھی اُردو اپنے مخصوص انداز کے ساتھ یہاں کی صحافت پر چھا گئی اور ایک آدھ اخبار کو چھوڑ کر سبھی اخبار اُردو میں شائع ہونے لگے۔

انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں یہاں کی صحافت کو مختلف ناروا پابندیوں اور حوصلہ شکن رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا۔ بلوچستان کے اندرونی حصوں میں حمل و نقل کی سہولتوں کا فقدان، تعلیم کے زیور سے بے بہرہ ہونا، جمہور کی پس ماندگی، آبادی کا کم اور دور دور تک بکھرا[1] ہوا ہونا تو ایک طرف تھا، دوسری طرف حکومت وقت کی سخت سے سخت پابندیوں کے شکنجے تھے۔ انھی پابندیوں کے تحت انگریزی حکومت نے سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی نشر و اشاعت پر بھی پابندی عاید کر رکھی تھی۔ حکومت پہلے تو یہ چاہتی تھی کہ اس خطے میں کوئی اخبار جاری ہی نہ ہو اور اگر جاری ہو بھی تو فقط حکومت کا نقیب اور اس کی پالیسی کا علم بردار رہے۔

ہندوستان کے دوسرے شہروں سے جو اخبار اس حصے میں پہنچتے تھے، ان کے پڑھنے والے سی۔ آئی۔ ڈی کی نظروں میں رہتے تھے۔ اُن دنوں سیاسی گفتگو کی بھی اجازت نہ تھی۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کانگریس،

۱۔ جعفر علی، شیخ: جغرافیۂ بلوچستان، صفحہ ۳۱۔
احمد، کمال الدین: صحافتِ وادیِ بولان، ''میزان''، کوئٹہ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۶ع۔

مسلم لیگ ، خلافت ، خاکسار ، نیلی پوش وغیرہ سے متعلق اگر کوئی شخص کوئٹہ میں وارد ہو جاتا ، یا تو اُسے فوراً واپس جانے کا حکم ملتا یا پھر اُس کی زبان بندی ہو جاتی - یہ تھی ۱۹۳۵ء کے روح فرسا زلزلے سے پہلے کی کیفیت - ''زمیندار[۱]'' میں چھپی ہوئی اس خبر سے ان حالات کی یوں تصدیق ہوتی ہے -

''حکومت بلوچستان کے تشدد کی انتہا

پچھلے دنوں وزیر ہند نے بھی اپنی شہادت کے دوران میں سیلکٹ کمیٹی کے روبرو بلوچستان کو پس ماندہ ہونے کا خطاب دے کر اصلاحات سے محروم رکھنے کی سفارش کی تھی -

بلوچستان کے تمام صوبے میں کوئی قومی اخبار نہیں ہے - اس

۱- زمیندار، لاہور- ۱۶ شعبان المعظم ۱۳۵۲ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۳۳ء—— عبید اللہ خاں بلوچ ، سلتان سے یوسف علی عزیز مگسی کے ایما پر پہلی مرتبہ ۱۹۳۴ء میں بلوچستان وارد ہوئے تاکہ یہاں ایک تعلیمی ادارہ اور ہفت روزہ اخبار جاری کریں لیکن وہ لکھتے ہیں کہ اُن دنوں اس خطے میں پریس اور پلیٹ فارم عوام کے لیے بند تھے - مزید اُن کی زبان سے سنیے :

''کوئٹہ سٹیشن پر کیا اُترے ، جیسے جیل خانہ میں قدم جا پڑا ہو- میری عمر اُس وقت ۲۲ سال کی تھی - سی آئی ڈی کے ایک آفیسر نے جنگلے میں کھڑا ہونے کا حکم دیا - کچھ اور بھی نووارد ہمارے ساتھ تھے - نام اور پتے لکھے گئے - شہر میں بھی اُن کا تعاقب لگا رہا - بار بار بلاتے اور پوچھتے ''یہاں کیوں آئے ہو؟ کب تک رہو گے ؟ ''جان مصیبت میں آ گئی - حالت یہ کہ نہ تقریر کی اجازت ، نہ تحریر کی آزادی - صرف جمعہ کے دن جامع مسجد میں دینی موضوع پر اُردو میں کچھ کہنے کا موقع ملتا ، وہاں بھی حکومت کی سی آئی ڈی موجود رہتی -''

(عبید اللہ خاں : ''بلوچستان میں اُردو'' غیر مطبوعہ مضمون ، ۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء کراچی) -



کوئٹہ سے جاری ہونے والے بعض اخبارات اور رسائل کے سرورق
(کمال الدین احمد کی غیر مطبوعہ کتاب 'صحافت وادی بولان' سے)

کمی کو محسوس کر کے کئی درد دل رکھنے والے اصحاب
نے اجرائے اخبار کے لیے کوشش کی، مگر اُس کے جواب
میں حکومت کے مطلق العنان حکام نے منظوری دی تو
اس شرط پر کہ کوئی خبر یا آرٹیکل جو سیاسی، مذہبی
اور فرقہ وارانہ نوعیت کا ہو، شائع نہ ہو سکے گا، جس
کے بعد ایک اخبار نویس کے لیے کوئی چیز لکھنے کے
قابل نہیں رہتی -
اُس کے بعد گزشتہ اکتوبر میں خان عبدالصمد خان اچکزئی
نے پولیٹیکل ایجنٹ کو ایک ہفتہ وار اُردو اخبار ''بلوچستان''
نامی کے اجرا کے لیے درخواست دی جو بلوچستان کی
سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اصلاح کے لیے کام کرتا مگر
اس مہینے کے آخر میں اُنھیں صاف جواب دیا گیا کہ
منظوری نہیں مل سکتی -''

ان حالات میں یہاں اخبارات کا پنپنا آسان نہ تھا - تاہم بقول کمال الدین[۱] احمد: ''ان کٹھن حالات کے باوجود یہاں کی صحافت کی تاریخ بہت شاندار ہے اور قیام پاکستان کے بعد تو اخباروں، اخبار نویسوں اور قومی اخباروں کے نمائندوں کی تعداد میں ایسا حیرت انگیز اضافہ ہوا کہ شاید دنیا کے کسی ملک میں ایسا اضافہ نہ ہوا ہو''- اس کی وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان سے آزادیٔ گفتار و تحریر فراوانی سے میسر آ گئی - اس سلسلے میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ اس خطے کی عزیز ترین درسگاہ ہونے کی بدولت بلوچستان کے اکثر صحافیوں اور نگارندوں کا گہوارہ بن گیا -

سابق بلوچستان (کوئٹہ اور قلات ریجن) کی صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے -

(۱) انگریزی حکومت کی ابتدا سے ۳۱ مئی ۱۹۳۵ع تک (۲) زلزلے سے ایک سال بعد یعنی ۱۹۳۶ع سے قیام پاکستان تک (۳) قیام پاکستان (۱۹۴۷ع) سے اب تک (۱۹۶۷ع) -

۱- احمد، کمال الدین: ''صحافت وادیٔ بولان'' (قلمی) -

پہلا دور

اس میں نو اخبار اور رسالے جاری ہوئے [1] جن میں سے چھ انگریزی زبان میں تھے اور تین اُردو زبان میں ۔ معلوم ہوا ہے کہ ''دی منتھلی بلوچستان ایڈور ٹائزر'' اور ''بارڈر ویکلی نیوز'' ۱۸۸۸ع سے پہلے جاری ہوئے تھے ۔ مزید معلومات دستیاب نہیں ہوئیں ۔ ہفتہ وار ''بلوچستان گزٹ'' ۱۸۸۸ع میں انگریزی میں چھپنے لگا تھا ۔ اس کے ایڈیٹر مسٹر منچر جی تھے ، جو ۱۹۰۸ع تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ اس ہفتہ وار کے ایڈیٹر متعدد انگریز (جن میں دو خواتین مسز بریکٹ اور مسز نامی تھیں) رہے ۔ مسٹر اینسکومب بھی مدیر مقرر ہوئے جن کے نام پر سنڈیمن ہسپتال کے مغرب میں ایک سڑک کا نام ''اینسکومب روڈ'' ہے ۔ انگریزوں کے بعد مسٹر فیروز سنچر جی اس کے ایڈیٹر تعینات ہوئے اور وہ ۱۹۳۵ع کے زلزلے تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے ۔

ڈیلی بلوچستان گزٹ : جس روز ۱۹۱۴ع کی جنگ عظیم کا آغاز ہؤا اُس کے دوسرے دن ''بلوچستان گزٹ'' روزنامے کی حیثیت سے شائع ہونے لگا ۔ جن دنوں جنگ زوروں پر تھی اس کے دو ایڈیشن (مارننگ اور ایوننگ) منظر عام پر آتے تھے ۔ ۱۹۱۵ع میں خلیل الرحمٰن صدیقی نے اس کا انتظام اپنے ذمے لیا ۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو اس خطے کی صحافت میں وارد ہوئے ۔

راست گو کے نام سے جنگ عظیم کے آغاز سے دوسرے روز جنگ کے حالات اور پرچار کے لیے پہلا اُردو روزنامہ جاری ہؤا ۔ اس کے لیے بمبئی سے بذریعہ تار خبریں منگانے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا ۔ یہ اخبار ۱۹۱۸ع میں بند ہؤا ۔ اس کے بعد ''بلوچستان گزٹ'' کو سہ روزہ کردیا گیا ۔

۱۹۱۸ع میں البرٹ پریس کوئٹہ نے ایک روزنامہ **بلوچستان ہیرلڈ** کے نام سے انگریزی میں جاری کیا جو زیادہ دنوں تک چل نہ سکا ۔ اُسی

۱- اُردو رسائل کا ذکر اخبارات کے بعد آئے گا ۔

زمانے میں بلوچستان گزٹ کو سہ روزہ سے ہفت روزہ کر دیا گیا اور وہ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء تک برابر شائع ہوتا رہا ۔

بلوچستان ہیرلڈ کے کچھ دن بعد کرزن پریس کے مالکوں نے بھی ایک ہفت روزہ انگریزی اخبار کوئٹہ نیوز چھاپنا شروع کیا لیکن وہ بھی اپنے لیے راستہ ہموار نہ پا کر خاموش ہوگیا[۱] ۔

۱۹۳۲ء میں کراچی سے مولوی محمد عثمان ، مولانا عبد الصمد سربازی اور میر غلام محمد نور الدین وغیرہ نے پہلا قومی ترجمان ہفت روزہ اخبار البلوچ[۲] کے نام سے جاری کیا ۔ ادھر اس کے ساتھ ہی جیکب آباد کے مولوی محمد حسین کھادڑ نے اپنے اخبار الحنیف کو بلوچستان کی بے لاگ ترجمانی کے لیے وقف کر دیا ۔ محمد حسین عنقا نے انگریزی ملازمت تیاگ کر کراچی کی راہ لی اور البلوچ سے منسلک ہو گئے ۔ یہ جولائی ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے ۔ چند ماہ کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا ۔ اسی دوران میں پیر بخش نسیم تلوی بھی ملازمت سے علیحدہ ہو کر کراچی پہنچ گئے ۔ عنقا اور نسیم نے مل کر بلوچستان جدید جاری کیا ۔ یہ بھی چند ماہ کے بعد البلوچ کے نقش قدم پر چلا ۔

رحیلِ کوہ میں ''بلوچستان جدید کا مویہ[۳]'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے :

عدوؤں میں ہے یہ گفت و شنید آج
کہ مرتا ہے ''بلوچستان جدید'' آج

نہیں دیتا ہے بسنے کو کہیں بھی
حسین ابن علی کو پھر یزید آج

بعد ازاں ۱۹۳۷ء تک کراچی سے یکے بعد دیگرے ینگ بلوچستان ، کلمۃالحق ، آفتاب ، نجات ، حقیقت ، بلوچستان اور بولان کے نام سے ایسے

۱- روزنامہ قاصد ، کوئٹہ ، ۲۹ فروری ۱۹۶۴ء ۔
۲- ایلم ، مستونگ (استقلال نمبر) ۱۷ اگست ۱۹۶۶ء ۔
۳- رحیل کوہ ، صفحات ۷۲ ، ۷۳ ۔

صحیفوں کا اجرا ہوا جو حقیقی معنوں میں بلوچستان کی زبان کہلانے کے مستحق تھے ۔ اس دوران میں ایک وقت وہ بھی آیا جبکہ بلوچستان میں ان اخبارات کا پڑھنا جرم تھا اس لیے انھیں بڑے لفافوں میں بند کر کے ایک خط کی صورت میں بلوچستان بھجوایا جاتا تھا ۔ اگر ان اخبارات کے پڑھنے والوں کا پتا چل جاتا تو اُنھیں بلا کر دھمکایا جاتا اور بعض کو ضمانت بھی دینی پڑتی[1] ۔

دوسرا دور

۱۹۳۵ء کے جان لیوا اور تباہ کن زلزلے نے کوئٹے کی اسّی ہزار آبادی میں سے ستر ہزار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ باقی ماندہ افراد یا تو خیمہ نشیں ہو گئے یا ہندوستان کے دوسرے شہروں میں چلے گئے ۔ ایک سال کے بعد جب کوئٹہ دوبارہ بسا تو یہاں کے مکین واپس آئے ۔ ان کے ساتھ ساتھ اور لوگ بھی مختلف شہروں سے آ موجود ہوئے ۔ انگریزی راج کی عاید کردہ پابندیوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی تھی ۔ لیکن سیاسی بیداری کو روکنا مشکل ہو گیا ۔ آخر بلوچستان میں بھی سیاسی سرگرمیوں کا زور شور ہؤا ۔ نئے نئے اخبارات منظر عام پر جلوہ افروز ہونے لگے ۔ یوں تو حکومت کی جانب سے خاصی پابندیاں تھیں ، پھر بھی پہلے دور کی کسی قدر سنگین صورت حال میں کمی آ گئی ۔ مولانا ظفرعلی خاں اور سر عبداللہ ہارون کی قابل ذکر مسلسل امداد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۶ء میں بلوچستان کو پریس اور پلیٹ فارم کا حق ملا ۔ دوسرے دور کو پہلے دور میں جاری ہونے والے اخبارات یا رسائل میں سے ایک بھی ورثے میں نہ ملا اور صرف دس سال کے عرصے میں پہلے دور کے مقابلے پر دگنے سے زیادہ اخبارات جاری ہوئے۔

اُن میں دو اخبار انگریزی کے تھے ؛ اول **ایڈورٹائزر** : زلزلے کے بعد سب سے پہلا ہفت روزہ اخبار ۱۹۳۶ء میں البرٹ پریس سے جاری ہؤا۔ یہ زیادہ تر اشتہارات پر مشتمل تھا ۔ کچھ عرصے بعد بند ہو گیا ۔ دوم

۱۔ تحریک آزادی ، محمد حسین عنقا ۔ ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ء ۔

ہفتہ وار کوئٹہ ٹائمز بھی البرٹ پریس ہی سے ۱۹۳۸ع میں چھپنے لگا اور اب تک جاری و ساری ہے - باقی اخبار جو اُردو میں شائع ہوئے ، اُن کی تفصیل یوں پیش کی جا سکتی ہے -

استقلال : جنوری ۱۹۳۸ع میں عزیز پریس سے جاری ہؤا - یہ ہفت روزہ تھا - عزیز پریس کی کہانی یہ ہے کہ اُن دنوں کوئٹہ میں ایک یا دو ہینڈ پریس تھے اور انگریزی ٹائپ کے بھی دو ہی پریس تھے - لیتھو پریس موجود نہ تھا - نواب زادہ یوسف علی خاں عزیز مگسی نے لیتھو پریس خریدا تھا - وہ ۱۹۳۵ع کے زلزلے میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہی پریس ۱۹۳۷ع کے آخر میں ''عزیز پریس'' کے نام سے قائم ہؤا - ''استقلال'' میں بلوچستان کی سیاسی ، اقتصادی اور تمدنی ضروریات پر سیر حاصل اور جامع تبصرے کیے جاتے تھے - بلوچستان ، افغانستان اور ایران کے متعلق تازہ ترین اور مستند خبریں فراہم کرنے کے لیے خاص اہتمام تھا - یہ اخبار مختلف اصحاب کے زیرادارت شائع ہوتا رہا جن کے نام یہ ہیں : قدوس صہبائی ، عبدالصمد اچکزئی ، اللہ بخش سلیم ، شیر محمد خاں ، محمد یعقوب غلزئی ، محمد حسن نظامی ، اور عبدالصمد درانی (۱۹۴۶ع سے ۱۷ اگست ۱۹۵۰ع تک) - یہ اخبار ۱۹۵۱ع میں بند ہؤا -

اس کے ایک اداریے میں سے ابتدائی حصہ پیش کیا جاتا ہے - عنوان ہے : ''سماجی ، اقتصادی اور مذہبی انقلاب کی سالگرہ -''

عید الفطر کیا اور کیوں کر ؟

''آج عید ہے - اطراف و اکناف عالم میں کروڑوں مسلمان اگر کلیۃً نہیں تو یقیناً جزوی طور پر ، اور اگر لمبے عرصے کے لیے نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے لازماً اپنی تمام مصیبتوں اور دکھوں کو بھول کر ایک عالمگیر خوشی میں شامل ہوئے ہیں - ان کا ایک حصہ اس مبارک دن کے لیے بہت پرانے زمانے میں مقرر شدہ پروگرام نماز عید میں شامل ہوتا ہے اور ایک حصہ اس مذہبی تقریب کو تمام ممنوعہ اور ناجائز امور کے لیے لائسنس بنا کر لہو و لعب ، نشہ اور جوا بازی میں مصروف ہوتا ہے ، اور ایک

بہت بڑا حصہ اس روز سعید کو لباس ، خوراک وغیرہ کے بے فائدہ
اور اکثر اوقات ناجائز مصارف کا نادر موقع سمجھ کر خوب اصراف
کیا کرتا ہے اور ہر ایک گروہ سمجھتا ہے کہ عید یہی ہے اور
اسی لیے ہے - بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات سے آگاہ ہیں
کہ عیدالفطر کیا ہے اور کیونکر منائی جائے . . . . .[۱]"

اس کے بعد اس اداریے میں عید کے ساجی اور معاشی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اُن دنوں اس خطے کے اخبارات ہمارے اجتماعی مسائل کو کتنی اہمیت دیتے تھے اور ان کے نزدیک معاشرتی اور اقتصادی پہلوؤں کا کیا مقام تھا ؟

ایک دوسرے طویل اداریے "بلوچستان اور تعمیرات بعد از جنگ[۱]" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو 'فضول خرچی' کے ضمنی عنوان سے لیا گیا ہے - اس میں بلوچستان کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے تنقید کی گئی ہے :

"فضول خرچی کے ضمن میں ہمارے خیال میں سب سے اول
انجمن ہائے امداد باہمی (کواپریٹو سوسائٹیز) کو رکھا جانا چاہیے
جو آج تک تمام ہندوستان میں کہیں بھی کامیاب نہیں ہوئی ہیں
اور ہر جگہ چند ملازمین اور افراد کی ذاتی منفعتوں اور فضول
چپقلشوں کے سوا کوئی اور خاص نتیجہ نہیں دے سکی ہیں - مگر
اس بدنصیب صوبے میں نہ صرف آزمودہ را آزمودن کے طور پر
انہیں چلانے کا خیال اور تجویز ہے بلکہ اس سلسلے میں بھاری
بھرکم تنخواہوں کے ساتھ دفتر اور افسر مقرر ہو چکے ہیں ، اور
اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں روپے اس سلسلے میں خرچ بھی ہو
چکے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے جس سے صوبے کا عام آدمی تو
کجا ، درمیانے درجے کا تاجر ، زمیندار اور تعلیم یافتہ آدمی بھی

۱- استقلال ، کوئٹہ ، ۳ نومبر ۱۹۴۰ع -
۲- استقلال ، کوئٹہ ، یکم اپریل ۱۹۴۶ع -

فائدہ نہیں اٹھا سکتا کیونکہ یہاں وہ حالات مہیا نہیں جو افسر تعمیرات کے اپنے وطن انگلستان میں لوگوں کی عام تعلیم، بہتر تربیت وغیرہ کی صورت میں سالہا سال سے موجود ہیں۔ مگر افسر ترقیات کو یہ فرق نہ خود سوجھا اور نہ کسی اور مشیر نے ان کے سامنے رکھا اس لیے ہمارے خیال میں اس مد پر جو خرچ ہؤا ہے یا ہوگا اُس سے صوبے کے لوگوں کو رتی بھر فائدہ نہ ہوگا۔''

'استقلال' میں چھپنے والی خبروں میں سے ایک خبر بطور نمونہ دیکھیے:

''عیسیٰ کا گواہ موسیٰ

نوشکی ۲۳ مارچ۔ معلوم ہؤا ہے کہ پولٹیکل ایجنٹ صاحب بہادر نے 'رود گلی' کے اس متنازعہ امر کو جو سہینوں سے پنی اور مینگل قبائل کے مابین ہے حاجی ...... اور اس کی پارٹی کو منصف کر کے فیصلہ کرنے کے لیے دیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود حاجی صاحب موصوف ایک فریق ہیں (نامہ نگار)۔''

پاسبان: یہ ہفت روزہ جون ۱۹۳۹ع میں جاری ہؤا۔ بعد میں پانزدہ روزہ ہو گیا۔ اب تک باقاعدگی سے طلوع ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے اس خطے کا سب سے پرانا اخبار ہے۔ اس کے مدیر مولانا محمد عبداللہ اور نائب مدیر مولوی عبدالواحد ہیں۔

ایک 'اداریہ' مکمل صورت میں پیش کیا جاتا ہے جس میں معاشرے کی ایک اہم دقت کا جائزہ لیا گیا ہے، گو یہ تکلیف اب بھی عام ہے۔ دیکھیے قریباً اٹھائیس سال پیشتر اس اخبار نے کس طرح اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی تھی جو معاشرے کی جانب سے اُس پر عاید ہوتا تھا:

کوئٹہ میں مکانوں کا بڑھتا ہؤا کرایہ[1]

کوئٹہ میں مکانوں اور دوکانوں کا کرایہ ناقابل برداشت صورت

۱- پاسبان، کوئٹہ، ۲۸ جون ۱۹۳۹ع۔

اختیار کر گیا ہے اور عوام کے لیے حد درجہ پریشانی اور فکرمندی کا باعث بنا ہؤا ہے -

شہر کی آبادی آج کل ۴۱ ہزار نفوس سے کچھ زیادہ ہے - اس میں گنتی کے متمول اصحاب کو چھوڑ کر بقیہ آبادی مزدوروں، غریبوں، کلرکوں اور درمیانی حیثیت کے لوگوں پر مشتمل ہے - عالمگیر اقتصادی بدحالی ہندوستان کے اس دور دراز گوشے میں بھی چھائی ہوئی ہے - بازار سرد ہے، کاروبار میں تنزل آ گیا ہے، چاروں طرف بے روزگاری کا رونا ہے اور اس کشمکش حیات میں روح اور جسم کے تعلقات کو قائم رکھنا مشکل ہو گیا ہے -

اقتصادی واماندگی کی اس صورت حال میں چاہیے تو یہ کہ کرایہ کم کیا جاوے، لیکن افسوس ہے کہ کمی تو علیحدہ رہی، اُلٹا ان میں زیادتی کی جا رہی ہے - زلزلے سے پہلے ہر قسم کے مکانات آسانی سے مل جاتے تھے لیکن آج کل بارونق حصوں میں ۲۵ روپے دیے بغیر مکان کرایہ پر نہیں ملتا اور پندرہ روپے تو عام کرایہ ہے، دکانوں کا کرایہ اس سے بھی زیادہ ہے -

یہ صورت حال حد درجہ افسوس ناک ہے - ضرورت ہے کہ حکومت اس طرف فوری توجہ دے اور عوام کی بڑھتی ہوئی تکلیف اور پریشانی کا خیال کرتے ہوئے کرایوں کو نہ صرف اعتدال پر لائے بلکہ اس کے لیے کوئی ضابطہ بنائے اور اس تکلیف کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے -

کوئٹہ ایک پر فضا پہاڑی مقام ہے - پھولوں، پھلوں اور مرغزاروں کا شہر ہے، ایک اہم تجارتی مرکز ہے، اس لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور افغانستان سے بھی لوگ خاصی تعداد میں یہاں آتے رہتے ہیں، اس لیے اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ دوکانوں کے کرایے کو اعتدال کی حد تک لایا جائے تاکہ مسافروں اور اجنبیوں کو غیر ضروری تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے - ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ حکومت ہماری ان سطور پر ضرور غور کرے گی اور اس

سلسلے میں وہ جلدی قدم اُٹھائے گی اور پبلک کی اس دیرینہ تکلیف کو دور کرے گی ۔

آخیر پر ہم مالکان اراضی سے بھی کہیں گے کہ موجودہ اقتصادی زبوں حالی کے پیش نظر وہ عوام کی تکلیفوں کا خیال کریں اور اپنے کرایوں کو کم کر دیں ۔

اس بیسویں صدی کی مصیبتوں میں سے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے قریباً تمام کے تمام امیروں اور دولت مندوں کو غریبوں کی ضرورت و احتیاج کا بالکل احساس نہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اور عوام کے درمیان دن بدن دوری حائل ہوتی چلی جا رہی ہے اور نہیں معلوم یہ دوری آگے چل کر کن نتائج پر ختم ہوتی ہے ۔ آؤ ہم تاریخ کی عبرتوں سے سبق لیں جو ہمیں صاف اور واضح طور پر بتاتی ہیں کہ دنیا میں نہ غریب ہمیشہ غریب رہا ہے اور نہ امیروں کی امارت ہمیشہ برقرار رہی ہے ۔ سمجھنے والے تاریخ کی ان لافانی عبرتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور وہی طریق عمل اختیار کرتے ہیں جو حالات کے عین جائز اقتضاء کے مطابق ہوتا ہے ۔

ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ ہماری یہ دردمندانہ آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی اور جہاں حکومت ان سطور پر توجہ دے گی وہاں خود ہمارے ہندو مسلم مالکان اراضی بھی لوگوں کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے اپنے مکانوں اور دوکانوں کے کرائے میں مناسب تخفیف کر دیں گے ۔"

چشمہ : ۱۹۳۹ء میں یہاں کے محکمۂ تعلیم نے یہ پانزدہ روزہ اخبار پرائمری سکولوں کے بچوں اور بچیوں کے لیے جاری کیا ۔ یہ ۱۹۴۳ء میں بند ہؤا ۔ اس کے ایڈیٹر مسٹر سالک ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے ۔

الاسلام : یہ ہفت روزہ ۱۹۳۹ء میں مولانا عبدالکریم کے زیر ادارت جاری ہؤا ۔ اُن دنوں ہندوستان کے مسلمان غلامی کے ماحول میں زندگی گزار رہے تھے ۔ اس اخبار کا نصب العین مسلمانان بلوچستان کو لیگ کے

پیغام سے آگاہ کرنا تھا ۔ اس کا ماٹو تھا :

خدا و مصطفیٰؐ کا نام لے اور کام کرتا جا
مبارک ہے یہ خدمت ، خدمتِ اسلام کرتا جا

مولانا عبدالکریم نے ۱۹۴۷ء میں اپنا علیٰحدہ پرچہ ہفتہ وار ''میزان'' جاری کر لیا ۔ اُن کے بعد ایوب احمد ایوبی ، صالح شاہ ہاشمی ، شبیہ الحسنین اور غازی فضل احمد (نائب مدیر ، سلیم جہانگیر) اس کے ایڈیٹر رہے ۔ اس کے بانی قاضی محمد عیسیٰ خاں تھے ۔

ایک ایسا اداریہ ملاحظہ فرمائیے جو ہند کے مسلمانوں کے اہم ترین مطالبہ ''پاکستان'' سے متعلق ہے ۔ یہ اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ بلوچستان کے اخبارات اس عظیم مقصد کے حصول میں کسی سے فروتر نہ تھے :

''حکومت قلات کا پمفلٹ اور مسلمان پبلک !'[1]

ملال عالمیاں دم بدم دگرگون است
منم کہ مدتے عمرم بیک ملال گزشت

اگر یہ حقیقت دہرا دی جائے کہ ہندوستانی مسلمان کی عمر ایک خاص مدت سے صرف اس ایک ہی ملال اور فکر (پاکستان) میں گزر رہی ہے تو بے جا نہ ہوگا ۔ جب تک کہ مسلمانان ہند اپنے اس واحد محبوب نصب العین کو حاصل نہیں کر لیتے تب تک یہ ملال اور فکر مسلمان کی زیست کا ایک ایسا جزو لاینفک بن چکا ہے کہ اس سے یہ جدا ہی نہیں ہو سکتا اور نہ ہو سکے گا ۔

پاکستان کے حصول کا جذبہ یا تڑپ آج ہندوستان کے ہر مسلمان بچے سے لے کر بوڑھے ، مرد ، عورت ، امیر ، غریب ، مزدور ، سوداگر غرضیکہ کون وہ ہے ادنیٰ یا اعلیٰ جس کے سینے میں موجزن نہیں ؟ پاکستان یا آزاد اسلامی سلطنت کا حصول بچوں کا کھیل نہیں یا منہ مانگا نوالہ نہیں کہ اِدھر سے نام لیا یا مطالبہ کیا اور اُدھر ہمیں

۱۔ الاسلام ، کوئٹہ ، ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء ۔

مل گیا یا کسی نے دے دیا ۔ یہ خیرات نہیں جو بٹ رہی ہو اور ہمارے مانگنے سے ہمیں بھی دے دی جائے ۔
یاد رکھیے جب تک کہ اس کے لیے صحیح معنوں میں بقول علامہ اقبال :

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل ! نہ جل ترنگ

جان و مال کی قربانی نہ دی جائے ، جب تک کہ ہم اپنے منتشر قومی افراد اور ملی جسم کے پراگندہ اجزاء و اعضاء کو متحد کر کے آپس میں جوڑ نہیں لیتے ، تب تک کچھ نہیں ہو سکتا ۔ اس راہ میں جو ذمہ داری ایک غریب سے غریب مسلمان پر عاید ہوتی ہے ، میں کہوں گا کہ اس سے کہیں زیادہ یہ قومی ذمہ داری اُس مسلمان پر عائد ہوتی ہے جو نسبتاً کشادہ دست ، ذی استطاعت اور جانی و مالی قربانی دینے کے زیادہ اہل ہے ۔ جب تک ملت کے تمام بکھرے ہوئے عناصر و اجزاء خلوص دل سے متحد و منظم ہو کر پاکستان کے لیے قربانی دینے کا پورا اور پکا تہیہ نہیں کر لیتے پاکستان ایسے قومی رفیع الشان مقصد کا حصول امر محال ہی نہیں ، مجھے کہنے دیجیے کہ ناممکن بھی ہے ۔

بقول قائد اعظم ہمیں اپنی تنظیم ، ڈسپلن ، عزم اور استقلال کو مضبوط تر بنانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی سخت ضرورت ہے ۔ ہماری تنظیم جس قدر ٹھوس اور مضبوط ہوگی ، ہماری سوچ جس قدر زیادہ گہری ، صحیح اور سلیم ہوگی ، اُسی قدر ہم اپنے مقصد سے زیادہ جلدی قریب ہوں گے اور اغیار یا منافقین کے پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہوں گے ۔

مسلمانوں پر یہ موجودہ نازک دور ایسا گزر رہا ہے جو فیصلہ کن دور ہے اور ہماری دس سالہ پاکستان سے متعلق تمام جد و جہد کا آخری دور ہے ۔ جنگ کے آخری دور اور آخری منزل میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ذرا بھی اس میں غفلت

ہو جائے یا انسان اغیار کے پروپیگنڈے کا شکار ہو جائے تو تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے اور سارا کیا کرایا دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اس لیے پاکستان کی اس آخری لڑائی اور جنگ کی نازک گھڑیوں میں ہر مسلمان کا یہی فرض ہے کہ وہ زیادہ محتاط رہے، غلط پروپیگنڈے کا شکار نہ ہو، منافقوں کی چالوں میں نہ آئے اور سوجھ بوجھ سے اپنے قائد اعظم کے ہر اشارے اور حکم کا پابند رہے۔ ڈسپلن اور تنظیم میں زیادہ سخت بنے اور تمام تفرقہ انداز اثرات سے بالاتر رہ کر اپنے اسی ایک ہی نصب العین (قومی آزادی) کے حصول کے ٹھوس امکانات اور ذرائع مضبوط بنائے۔

صوبۂ بلوچستان کے سو فیصدی مسلمان، یہ حقیقت مسلّم ہے کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر متحد ہو چکے ہیں اور وہ آج تک اپنے قائد اعظم کے ہر حکم پر پابند چلے آ رہے ہیں۔ اسی یقین اور حقیقت کے پیش نظر ہم مسلمانانِ بلوچستان اور بالخصوص مسلمانانِ کوئٹہ سے یہ التماس کریں گے کہ حکومت قلات کے تازہ ترین پمفلٹ (جس میں پاکستان کی پُر زور حمایت و تائید کا یقین دلا کر جانی و مالی قربانی دینے کا غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے) سے مضطرب و پریشان نہ ہوں۔ اس اہم معاملے پر قائد اعظم کی ہدایات حاصل کرنے کے لیے قاضی محمد عیسیٰ خاں صاحب صدر بلوچستان مسلم لیگ، دہلی چلے گئے ہیں۔ جب تک کہ وہ واپس تشریف لا کر اس کے متعلق ہدایات نہیں دیتے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خاموش رہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس پمفلٹ پر پبلک حلقوں میں عجیب قسم کی متضاد چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے اہم قومی مقصد کے پیش نظر ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے طبقے کے مسلمان کا متحد محاذ پر جمع ہونا نہایت ہی ضروری امر ہے۔

ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی آزاد اسلامی حکومت کے لیے صوبۂ بلوچستان اور اسلامی ریاست قلات ایک ایسا بہترین پارٹ طے کریں

جو صوبے کے مسلمانوں اور صوبے کی اس اسلامی ریاست کے لیے صحیح معنوں میں مایۂ ناز اور وجہ افتخار بن سکے ، یا جو صحیح معنوں میں پاکستان کا بازوے شمشیر زن کہلانے کے مستحق ہو جائیں ۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا یہ محاذ صرف مسلمانان ہند کے لیے ہی نہیں بلکہ اسلامیان عالم تک کے لیے ایک صحیح متحدہ اسلامی محاذ اور عالم اسلام کے جسم الجمہر کی ریڑھ کی ہڈی بن سکے ۔

بعض تخریبی عناصر اس راہ میں عجیب قسم کی شوشہ ریزیوں میں مصروف ہو گئے ہیں ۔ جہاں ہمیں ان تخریبی عناصر کی شوشہ ریزیوں سے بالکل غیر متاثر رہنے کی ضرورت ہے ، وہاں ہم محتاط رہ کر اس معاملے میں قائداعظم کے حکم کا انتظار کریں اور کسی قسم کا عاجلانہ اقدام نہ کرنے پائیں ۔ ہمیں اپنی مجموعی طاقت کو زیادہ مضبوط اور ٹھوس بنانے کی ضرورت ہے ، اسے پراگندہ کرنے کی نہیں ۔ اس قومی معاملے میں کسی کے ذاتی سود و بہبود یا کسی کی آمریت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا ۔ ذاتی سود و بہبود یا آمریت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے مسلمان پبلک بیدار ہے ۔ جمہوری اسلامی نظام حکومت کے بغیر پاکستان میں ہو یا پاکستان سے متعلق تمام صوبوں یا ریاستوں میں ، کوئی دوسرا نظام چل ہی نہیں سکتا ۔ اگر مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں حکومت قلات کا یہ مذکورہ اعلان کانگریسی عناصر کے لیے پیام موت اور مسلمان قوم کے قومی مقصد (پاکستان) کے حصول کے لیے ایک مزید ذریعہ کہلایا جا سکتا ہے ، تو اپنے قائد اعظم کے حکم کے منتظر رہ کر کیوں اس اعلان پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں ۔ وما علینا الا البلاغ ـــ ایڈیٹر ۔"

کلمۃ الحق : اس کے مالک اور ایڈیٹر مولانا عبیداللہ خان تھے ۔ آپ پہلی مرتبہ ۱۹۳۴ع میں بلوچستان میں وارد ہوئے[1] ۔ زلزلے کے تین سال بعد

۱- نواب زادہ یوسف علی خاں عزیز مگسی نے بلوچستان کے عوام کی بیداری

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پھر کوئٹہ واپس آئے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق ''اس وقت کچھ اخبارات نکل رہے تھے اور تقریر کی بھی آزادی تھی۔'' اُنھیں ہفت روزہ **کلمة الحق** کی اجازت مل گئی۔ اس اخبار کی پیشانی پر یہ حدیث مبارک لکھی ہوئی ہوتی: ''افضل الجہاد عنداللہ **کلمة الحق عند سلطان الجائر**۔'' ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا جہاد افضل ہے۔ یہ اخبار بالکل اسی کا حامل تھا۔ اسی دوران میں مولانا کا دہلی جانا ہؤا، جہاں نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم اور ڈاکٹر سر ضیاءالدین مرحوم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اخبار کے لیے عطاءاللہ خاں بی اے کو مقرر کیا تھا کہ باقاعدہ نکالتے رہیں۔ اُنھوں نے زبردست آرٹیکل لکھے جن سے بلوچستان اور اس سے باہر تہلکہ مچ گیا۔ سنٹرل گورنمنٹ کے حکم سے اخبار ضبط کر لیا گیا۔ ہندوستان ٹائمز میں اس طرح خبر درج ہوئی تھی:

''کوئٹہ بلوچستان سے شائع ہونے والا پہلا چلتا ہوا اخبار **کلمة الحق** حکومت نے ضبط کر لیا۔''

اس اخبار میں عطاء اللہ خاں بی اے نے ایک آرٹیکل لورالائی کے سکھ پولٹیکل ایجنٹ مسٹر بیدی کے خلاف بھی لکھا تھا۔ اس پر اس نے مولانا کے خلاف سمن جاری کر دیے تھے۔ مولانا عبیداللہ خاں کا ارشاد ہے[۱]:

'' بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچستان کے اس بے باک اُردو جریدے نے اپنی ہنگامہ خیز تحریروں کے ذریعے اُردو زبان کی بلوچستان میں ترویج کے لیے اچھا خاصا کام کیا ہوگا۔''

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

اور ان کے حقوق کے لیے بلوچستان سے باہر بھی تحریک چلائی تھی۔ یہ اُن کا خلوص تھا کہ انھوں نے ملتان میں مولانا عبیداللہ خاں کو ایک ہی ملاقات کے بعد بلوچستان میں کام کرنے پر آمادہ کر لیا۔

۱۔ عبیداللہ خاں: بلوچستان میں اُردو۔ (غیر مطبوعہ مضمون، تحریر ۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء، کراچی)۔

دہلی سے کوئٹہ واپس آ کر مولانا عبیداللہ خاں بلوچ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ پھر کسی طرح اخبار جاری کریں ۔ ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان اور پولٹیکل ایجنٹ کوئٹہ مسٹر سیوج آئی ۔ سی ۔ ایس دونوں انگریز افسر اُن کے خلاف ہو چکے تھے۔ اُدھر دوسری جنگ عظیم کے باعث انگریز روس سے سخت خائف تھا ۔ بلوچستان کی سرحد روس سے قریب تھی اور کچھ پتا نہیں تھا کہ کل کون کس کا اتحادی ہوگا ۔ ایک پوسٹر جس کا عنوان تھا ''سرخ خطرے کا الارم'' کوئٹہ کی سڑکوں اور بازاروں پر صبح سویرے ہر ایک نے چسپاں دیکھا ۔ اس حکمت عملی کا یہ اثر ہؤا کہ پولٹیکل ایجنٹ نے مولانا کو ملاقات کے لیے بلایا ۔ انھیں جریدہ ''الفاروق'' جاری کرنے کی اجازت بھی مل گئی[۱] ۔

الحق : یہ ہفت روزہ بستی ولہاریخاں سبی سے ۱۹۴۰ء کے قریباً وسط میں جاری ہؤا ۔ اس کے مالک اور مدیر میر عطا محمد خاں مرغزانی تھے ۔ چند سال کے بعد بند ہؤا ۔ عطاءاللہ بخاری اور میر خدا داد خاں بھی علی الترتیب مدیر اور نائب مدیر رہے ۔

الفاروق : یہ روزنامہ ۱۹۴۱ء میں جاری ہؤا ۔ اس کا ہفتہ وار ایڈیشن بھی منظر عام پر آتا تھا جس میں اس ترتیب سے خبروں کے لیے کالم وقف تھے : جنگی مطلع ، بلاد اسلامیہ ، ہندوستان ، بلوچستان ، قلات ، کوئٹہ ، نسائیات ، بچوں کی دنیا ۔ علاوہ ازیں ''بصائر و عبر'' کے عنوان کے تحت بعض تکالیف کا ذکر ہوتا تھا جو زیادہ تر انفرادی نوعیت کی ہوتی تھیں ۔ ''جرس کارواں'' میں بعض معاصر اخباروں کی خبروں پر تبصرہ ہوتا تھا ۔ اس میں سرد و گرم کی چاشنی بھی ہوتی تھی ۔ سرورق پر یہ شعر درج تھا :

انجمن میں تری اے شوخ تغافل پیشہ
جاں نثاروں کا بڑی دیر میں نام آیا ہے

---

۱ - عبیداللہ خاں بلوچ : 'بلوچستان میں اردو' (غیر مطبوعہ مضمون) ۔

خبر کا نمونہ یہ ہے :

کوئٹہ میں کبوتر کے انڈے جتنے اولے پڑے[1]

۲۵ مارچ کو سہ پہر کے وقت شدید ژالہ باری ہوئی جو چند منٹ تک ہوتی رہی - اولے تقریباً کبوتر کے انڈے جتنے تھے جس سے فصلوں کو ناقابل برداشت نقصان پہنچا ہے - چند آدمی اور بچے زخمی ہو گئے- اس قسم کی ژالہ باری پہلے کوئٹہ میں کبھی نہیں ہوئی - آیندہ خداوند تعالیٰ اپنا رحم کرے -''

وحدت ، کائنات کا ایک حسین و جمیل تقاضا ہے - ریت کے ذرے ایک دوسرے میں مدغم ہوکر بگولے پیدا کرنے والا ریگزار بنتے ہیں - سنگریزے اکٹھے ہوکر ہیبت ناک پہاڑ بن جاتے ہیں - کرنیں بے قرار ہوکر آفتاب و ماہتاب میں ڈھلتی ہیں - اور انسان ـــــ صدیوں سے اسی وحدت کی جستجو میں ہے ـــ انھی خیالات پر مبنی اداریے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے[2]- ان خیالات پر عمل پیرا ہونے کی آج بھی ضرورت ہے :

''اسلامیوں نے کبھی اپنے آپ کو نہ کسی نسل و لباس سے وابستہ کیا ہے ، نہ کسی لسان و زاد بوم سے - جب اُن سے نسل پوچھی گئی تو انھوں نے کہا ''ابن الاسلام'' جب ان کا وطن پوچھا گیا کہہ دیا : ع

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

یہ وطنی اور غیر وطنی تفریق کا فتنہ مغرب کی پیداوار ہے جس کے خطرناک اثرات کا اندازہ کرتے ہوئے اقبال مرحوم فرماتے ہیں :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب کا نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری

۱- روزنامہ الفاروق ، کوئٹہ (ہفتہ وار ایڈیشن) ۳۰ مارچ ۱۹۳۱ء -
۲- روزنامہ ضمیمہ الفاروق ، کوئٹہ ، ۲۲ جون ۱۹۳۱ء -

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمّعیت کہاں
اور جمّعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی''

اسی اخبار کے ایک شمارے میں ''برادر وطن سے'' کے عنوان کے تحت اُردو سے متعلق سترہ اشعار درج ہیں ۔ چند یہ ہیں[1] :

یہی اردو کی شان ہے پیارے
میری تیری زبان ہے پیارے

آبیاری میں اس کی کب سے شریک
سارا ہندوستان ہے پیارے

صرف ملکی زبان ہی یہ نہیں
بلکہ قومی نشان ہے پیارے

غلط الزام ہے بدیشی کا
یہ سدیشی زبان ہے پیارے

آ میں تیری بلائیں لے لوں شمیم
تو مرا ہم زبان ہے پیارے

اخبار بلوچستان : اسے محکمۂ اطلاعات شائع کرتا تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے ایڈیٹر محمد اقبال سلطان مقرر ہوئے ۔ یہ اخبار وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے بعد بند ہو گیا ۔

کوہستان : ۱۹۴۷ع میں خان قلات نے اسے جاری کرایا ۔ اس کے مدیر محی الدین قائد تھے ۔ چند پرچوں کے بعد ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا ۔

تنظیم : یہ ہفت روزہ میر جعفر خان جمالی نے جاری کیا تھا ۔ اس کے پہلے ایڈیٹر معروف ناول نگار نسیم حجازی تھے ۔ پھر اس کی ادارت کے فرائض رشید بھٹی نے ادا کیے ۔ بعد ازاں محمد حسن نظامی ایڈیٹر اور مالک بن گئے ۔ اب تک یہ اخبار جاری ہے ۔

جمہور : ۱۹۴۵ع میں یہ ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا ۔ اس کے مالک محمد اعظم خان تھے اور یہ مسلمان طلبہ کی فیڈریشن کی ترجمانی کرتا تھا ۔ یہ مسعود غزنوی اور محمد رفیق پراچہ کی زیر ادارت چھپتا رہا ۔ بالآخر ۱۹۵۳ع

۱- الفاروق ، کوئٹہ ، ۳۰ مارچ ۱۹۴۱ع -

میں بند ہو گیا ۔ اس کے ایک اداریے[1] سے ایک حصہ پیش خدمت ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے طلبہ ایک نہایت اہم مسئلے کے بارے میں کس نہج پر سوچ رہے تھے ۔

کشمیر کی انڈین یونین میں شمولیت

''مسلمانان کشمیر کے لیے اس وقت نازک ترین موقع ہے ۔ اس وقت ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا ہے ۔ اس وقت ان پر بہت بڑی ذمہ داریاں عائد ہو رہی ہیں ۔ ان کا کام اس وقت صرف نعروں اور جلسوں تک محدود نہیں ۔ وہ مجاہد ہیں ، اُن کے ہاتھ میں تلوار ہے ۔ بلاشبہ وہ طاقت کا جواب طاقت سے دے رہے ہیں ۔ پھر بھی اُن کا مقابلہ انڈین ڈومینن سے ہے ، ایک بہت بڑا مقابلہ اور اس کے لیے پاکستان کو جلد از جلد اس معاملے کے بیچ پڑنا چاہیے ورنہ خطرناک حالات کا رونما ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ۔ مجاہدین کا حوصلہ بڑھانا ہر طرح ضروری ہے ، ان کی ہر طرح مدد لازمی ہے ۔

سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ کشمیر کے عوام کسی قیمت پر بھی کشمیر نہ چھوڑیں ورنہ ان کے لیے نہ خدا ہوگا ، نہ وصال صنم ۔ ہمیں اُمید ہے کہ پاکستان گورنمنٹ اس کی بغل میں چھرا گھونپنے والے کی کوشش کرنے والے سے بے خبر نہیں ہوگی اور بر وقت اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دانشمندی کا ثبوت دے گی ۔''

خورشید : مسلمان طلبہ کی فیڈریشن کا دوسرا ترجمان یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو منظر عام پر آیا ۔ ۱۹۴۹ء میں بند ہوًا ۔ اس کے مدیر فضل احمد غازی تھے ۔ سر ورق پر یہ شعر رقم تھا :

پریشان ہو چکا تاریکی افکار سے عالم
تو ہنگامِ سحر خورشید کی پہلی کرن ہو جا

۱- جمہور ، کوئٹہ ، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء ۔

اس کے متعلق مذاق العیشی نے کہا تھا :

ارباب نظر چار طرف پیدا ہیں
اک جلوہ پئے دید نکل آیا ہے
آثار سحر چار طرف پیدا ہیں
وہ دیکھیے خورشید نکل آیا ہے

قیام پاکستان کے بعد اس کے مقاصد کے بارے میں مدیر نے لکھا تھا[۱]:

''ہم اُن مختلف فلسفہ ہائے تعلیم کے خوشہ چیں نہیں بننا چاہتے جو اہل مغرب نے ہمارے ہاں رائج کر کے ہماری قوت عمل کو سلب کر لیا ، بلکہ ہم اُس فلسفۂ تعلیم کے داعی ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ، امام غزالی ، ابن رشد اور حکیم الامۃ علامہ اقبالؒ سے منسوب ہے ، جس میں ہماری تمام بیماریوں کا علاج مضمر ہے اور جس پر عمل پیرا ہوکر ہی ہم فلاح پا سکتے ہیں اور خیرالامۃ کہلا سکتے ہیں ۔''

بولان : یہ ہفتہ وار پرچہ مچھ (قلات ڈویژن) سے جاری ہؤا مگر دیر تک جاری نہ رہ سکا ۔ اس کے ایڈیٹر محمد حسین عنقا تھے ۔

دولت : اسے ایک ہندو نوجوان دولت رام نے ۱۹۴۶ء میں جاری کیا اور جلد ہی بند ہو گیا ۔ یہ کانگرس کا نقیب تھا ۔

بلوچستان سماچار : اسے گورچرن داس (مالک سول ملٹری پریس[۲]) نے شائع کیا ۔ یہ ہندوؤں اور سکھوں کا ترجمان تھا ۔ ۱۹۴۶ء میں جاری ہو کر قیام پاکستان پر بند ہؤا ۔

زمانہ : اسے مارچ ۱۹۴۷ء میں برکت علی آزاد نے جاری کیا ۔ بعد میں سید فصیح اقبال نے سنبھالا ۔ یہ ہفت روزہ سے روز نامہ بنا ، پھر سہ روزہ اور دوبارہ ہفت روزہ ہوگیا ۔ یوں اس نے کئی روپ بدلے ۔ آخر میں ۲۴ جون ۱۹۶۰ء سے باقاعدہ روز نامہ کی صورت اختیار کی جو اب تک

۱- خورشید ، کوئٹہ ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء ۔
۲- احمد ، کمال الدین : ''کوئٹہ اور قلات کے اخبارات ۔'' قاصد ، کوئٹہ ۲۹ فروری ۱۹۶۴ء ۔

قائم ہے ، اس کا اپنا پریس ہے ۔

تیسرا دور

(۱۴ اگست ۱۹۴۷ع سے ۱۴ اگست ۱۹۶۷ع تک)

بلوچستان کی تاریخ صحافت میں یہ دور بہت زیادہ پیش رفت کا دور ہے ۔ مندرجہ ذیل اخبارات دوسرے دور سے تیسرے دور کے ورثے میں آئے : ''پاسبان'' ۔ ''الاسلام'' ۔ ''اخبار بلوچستان'' ۔ ''تنظیم'' ۔ ''جمہور'' ۔ خورشید ''۔ ''زمانہ'' ۔

اس دور میں پہلے دور کی نسبت کئی گنا زیادہ اخبارات شائع ہونے شروع ہوئے جن میں سے چار روزناموں کے درجے پر پہنچ چکے ہیں ۔ توقع ہے کہ اب وہ دور بھی جلد آ جائے گا جب یہاں کے اخبارات ہمارے عزیز وطن کے دوسرے حصوں کے اخبارات کا مقابلہ کریں گے ۔

اس دور میں سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار یکم ستمبر ۱۹۴۷ع کو مولانا عبدالکریم نے **میزان** کے نام سے جاری کیا ۔ دسمبر ۱۹۴۸ع سے جون ۱۹۵۳ع تک کمال الدین احمد اسؔ کے نائب مدیر رہے ۔ بعد میں اُن کی جگہ جمیل الرحمان نے سنبھال لی ۔ یہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۶ع سے روزنامہ بن چکا ہے ۔ اس کا یہ ریکارڈ ہے کہ روز اشاعت سے آج تک ایک بھی ناغہ اس نے نہیں کیا ۔

اس دور میں ایک انگریزی ہفت روزہ اخبار ''پاکستان مرر'' کا اجرا ہوًا تھا ۔ اس کے ایڈیٹر مطیع الرحمان تھے لیکن چار پرچوں کے بعد ہی بند ہو گیا ۔ دوسرا ''بولان ایکسپریس'' سید فصیح اقبال نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۰ع کو مستونگ سے جاری کیا تھا مگر اب بند ہے ۔ تیسرا اکیڈیمی علوم اسلامیہ کوئٹہ کا ایک ''نیوز بلیٹن'' انگریزی میں جولائی ۱۹۶۲ع میں ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی کے زیر نگرانی شائع ہوًا ۔ ویسے اب بند ہے کیونکہ اکیڈیمی بہاول پور منتقل ہو چکی ہے ۔

پکار : یہ ہفت روزہ خواجہ عبدالکریم بٹ نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ع

کو جاری کیا ۔ یہ خاکسار اصول کی ترجمانی کرتا ہے ۔ پانچ ماہ بند رہا[۱] ۔ ویسے اب تک منظر عام پر آ رہا ہے ۔

کلمۃ الحق : اس کا اجرا سبی سے ہؤا ۔ یہ ہفت روزہ تھا ۔ اس کے مالک اور مدیر عطا محمد مرغزانی تھے ۔ خدا داد بھی مالک و مدیر مسئول رہے ۔ اب خاموش ہے ۔

نوائے بلوچستان : اس ہفتہ وار پرچے کی ابتدا فروری ۱۹۴۹ع میں ہوئی ۔ اس کے مالک میر نبی بخش خان زہری تھے ۔ یہ کمال الدین احمد ، میر گل خان نصیر اور غلام محمد شاہوانی مرحوم کے زیر ادارت چھپتا رہا ۔ اب بند ہے ۔

ترجمان : قاضی نورالحق[۲] نے ۱۹۴۹ع میں ہفتہ وار جاری کیا ۔ ۱۵ مارچ ۱۹۵۵ع تک وہی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ۔

صداقت : اس کا آغاز رشید ملک نے ۱۹۵۰ع میں کیا ۔ کئی صاحبان نے اس ہفت روزہ کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کیے ۔ اُن میں عبدالصمد درانی ، شمیم مسعود اور ایس ایچ شاہ شامل ہیں ۔ اب یہ نظر نہیں آتا ۔

۲۸ ، ۲۹ دسمبر ۱۹۵۶ع کو پہلی پاکستان اورینٹل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی جس کے صدر اعظم جسٹس ڈاکٹر ایس اے رحمان ، جنرل سیکرٹری ڈاکٹر سید عبداللہ اور سیکرٹری ڈاکٹر محمد باقر تھے ۔ اس میں

۱۔ پکار ، کوئٹہ ، ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ع ۔

۲۔ قاضی نورالحق کو نہ صرف بلوچستانی صحافت کی صف اول میں نمایاں حیثیت حاصل ہے بلکہ اُنھیں اس خطے میں جدید مزدور تحریک کا بانی مبانی بھی کہا جا سکتا ہے ۔ آپ فورٹ سنڈیمن (وادی ژوب) کے مقام پر علی خیل قبیلے کے ایک اعلیٰ اور اہل علم خاندان میں پیدا ہوئے ۔ والد پشتو ، فارسی اور عربی کتب کے مصنف تھے ۔ تاریخ پیدائش ۱۱ اگست ۱۹۲۵ع ہے ۔ ۱۹۵۰ع میں آپ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور کے مقامی نمائندے مقرر ہوئے ۔
(قاصد ، کوئٹہ ، فروری ۱۹۵۹ع)

راقم الحروف بھی کوئٹہ قلات ریجن کے مندوب کی حیثیت سے شامل ہوُا تھا اور مقالہ بھی پیش کیا تھا[1]، واپسی پر کانفرنس کے بارے میں یہاں کے لوگوں کو آگاہ کیا تھا۔ ''صداقت'' میں وہ روداد شائع ہوئی۔ اُسی شمارے میں جو اداریہ بعنوان ''تعلیم اور مادری زبان'' چھپا تھا[2]، اُس کا آخری حصہ پیش خدمت ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں لکھا تھا[3]: ''ایڈیٹوریل بھی سلجھا ہوُا معلوم ہوتا ہے، اچھا لکھا ہے۔''

''انگریزی زبان کوئی ڈیڑھ سو برس تک ہمارے یہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں مشترکہ زبان کی حیثیت رکھتی رہی ہے لیکن اعلیٰ طبقے کی ثقافت تو کسی قوم کی ثقافت نہیں کہلا سکتی۔ اس کے برعکس مختلف اللسان لوگوں کے درمیان اُردو کسی نہ کسی شکل میں ذریعۂ اظہار رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اہل زبان کہلانے والوں نے اس کی راہ میں وہی رکاوٹیں حائل نہ کر دیں، جو بدھ مت کی آمد سے قبل برہمنوں نے سنسکرت کو عوامی زبان بننے کی راہ میں حائل کر دی تھیں، جس کی وجہ سے سنسکرت سخت گیرانہ قواعد میں محبوس ہو کر مزید نشو و نما سے محروم ہوگئی، تو یقین کر لینا چاہیے کہ اُردو اپنے مستقبل کی ارتقائی صورت میں پورے پاکستان کی مشترکہ زبان بنے گی۔ اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ چند شرائط کی کڑی پابندی کر کے ہم اس زبان کی ہمہ گیر صلاحیتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اُردو کے مضمرات کا مشرق اور مغربی پاکستان کے اہل نظر کو یکساں اعتراف ہے۔''

حقیقت: یہ پانزدہ روزہ ۱۹۵۰ء میں پہلے سبی سے، پھر بھاگ سے طلوع ہوُا۔ مالک اور مدیر محمد شریف تھے۔ اب بند ہے۔

۱۔ نوائے وقت، لاہور، ۷ دسمبر ۱۹۵۶ء۔ صداقت کوئٹہ، ۱۴ دسمبر ۱۹۵۶ء۔
۲۔ صداقت، کوئٹہ، ۱۴ جنوری ۱۹۵۷ء۔
۳۔ خط مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۵۷ء۔

مبلغ : اسے مولانا عبدالباقی درخانی نے ۱۹۵۰ع میں شروع کیا۔ جلد ہی بند ہو گیا۔

کاروان : اسے عبدالحیٔ بابر نے ۱۹۵۰ع میں پانزدہ روزہ کی حیثیت سے شروع کیا۔ ایک مرتبہ اشاعت رک گئی تھی، پھر جاری ہو گیا تھا اور اب تک شائع ہو رہا ہے۔ اس کا ایک خصوصی[1] نمبر بھی چھپ چکا ہے جو یہاں کے ایک ممتاز صحافی "غلام محمد شاہوانی" کی یاد میں تھا۔ سلام جہانگیر اس کا نائب مدیر رہا ہے۔

تعمیر بلوچستان : گل محمد ایروی نے ۱۹۵۰ع میں مستونگ (قلات ڈویژن) سے اس کا اجرا کیا۔ اب تک تعطل پیدا نہیں ہؤا۔

ریاست : گور بخش لال کالڑا نے ۱۹۵۰ع میں ابتدا کی۔ ۱۹۵۱ع میں اس کا نام تبدیل کر کے **چلتن** رکھا گیا۔ ہفتہ **وار چلتن ۱۹۵۶**ع تک قائم رہا۔

پیغام : اس کا آغاز ۱۹۵۱ع میں ہؤا۔ مدیر مسئول میر شہباز خان نوشیروانی اور مدیر معاون عزیز اللہ خان تھے۔ دو تین سال تک جاری رہا[2]۔

پیغام جدید : ۱۹۵۲ع میں یہ ہفت روزہ عبدالصمد خان درانی کی ادارت میں شروع ہؤا اور ۱۹۵۴ع میں بند ہو گیا۔

نعرۂ حق : یہ پرچہ اپریل ۱۹۵۲ع میں سکھر سے کوئٹہ آیا۔ ایک ساتھ کوئٹہ اور سکھر سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر محمد گلزار تھے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ع سے یہ روزنامہ ہؤا۔ اس کے مدیر مسئول محمد گلزار اور منیجنگ ایڈیٹر افتخار یوسف ہیں۔

ساربان : اسے ملک محمد رمضان بلوچ نے ۱۹۵۳ع میں مستونگ (قلات ڈویژن) سے ہفتہ وار جاری کیا۔ اب تک چھپ رہا ہے۔

نوائے وطن : غلام محمد شاہوانی نے ۱۹۵۳ع میں اس ہفت روزہ کی ابتدا

۱- کاروان، کوئٹہ، ۷ اکتوبر ۱۹۶۵ع۔
۲- پیغام، کوئٹہ، ۳۰ اپریل ۱۹۵۳ع۔

کی۔ اُن کی وفات (۲ ستمبر ۱۹۵۷ء) کے بعد بند ہو گیا۔

اتحاد : اس روزنامہ کا آغاز یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ اس کے منیجنگ ایڈیٹر خلیل الرحمٰن صدیقی تھے اور مدیر کمال الدین احمد۔ ادارۂ تحریر میں غلام محمد شاہوانی، شمیم مسعود اور ضیا صدیقی شامل تھے۔ اس کی اشاعت دو ہزار تک پہنچ گئی تھی[1]۔ ۳۱ اگست ۱۹۵۴ء میں اس کے دونوں ایڈیٹروں نے استعفٰی دے دیا تھا۔ بعد میں قیوم راشد بی اے اس کے مدیر رہے۔

ہلال : ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر صلاح الدین نے ہفت روزہ جاری کیا۔ چند سال تک طلوع ہوتا رہا۔ اس کے کئی ایڈیٹر رہے۔ اُن میں سے ایک کے ایم فاروق تھے[2]۔

خاور : انھی دنوں آثم ملک نے ابتدا کی۔ ہفتہ وار اور مہاجروں کی ترجمانی کرتا تھا۔ کامل القادری اس کے مدیر رہے، اب خاموش ہے۔

ایثار : اسے بھی آثم ملک ہی نے شروع کیا۔ اس کی مدیرہ بیگم آثم ملک تھیں۔ انوار الھدیٰ نے بھی ادارت کے فرائض ادا کیے، اب بند ہے۔

قاصد : اس کا آغاز ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ اس کے پہلے مدیر فتح محمد خان اور تاج نعیم تھے۔ ۱۹۵۶ء میں ابراہیم خلیل اس کے ایڈیٹر اور مالک بنے اور وہ اسے ہفتہ وار ہی شائع کرتے رہے۔ اُنھوں نے اس کے چند اہم نمبر بھی نکالے۔ اُن میں سے ایک گورنمنٹ کالج کوئٹہ نمبر (۱۱ جولائی ۱۹۵۹ء) تھا۔ بعد ازاں ۱۰ مئی ۱۹۶۳ء سے روزنامے کا روپ دھار لیا[3]۔

دشمن : اسے عزیز اللہ خاں حیدر آبادی نے ۱۹۵۳ء میں جاری کیا تھا۔ اب بند ہے[4]۔

صبح نو : کوثر علی زیدی نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو شروع کیا۔ کچھ عرصہ خاموش رہ کر پھر جاری و ساری ہے۔ یہ بھی ہفت روزہ ہی ہے۔

۱۔ احمد، کمال الدین : "صحافت وادیٔ بولان" (غیر مطبوعہ)۔
۲۔ ہلال، کوئٹہ، ۳ اپریل ۱۹۵۷ء۔
۳۔ اس کی فائل پیش نظر رہی۔
۴۔ دشمن، کوئٹہ، ۳۰ جون ۱۹۵۳ء۔

یونین : ۱۹۵۶ء میں مسٹر جعفری نے مستونگ سے ہفتہ وار جاری کیا ۔ جلد ہی بند ہو گیا ۔

غازی : محمد قاسم ملک غازی نے ۱۹۵۷ء میں اس کی ابتدا کی ۔ اس کی اشاعت پندرہ روزہ تھی ۔ ان دنوں کہیں نظر نہیں آتا ۔

عقاب : غلام حسین مرحوم نے ۱۹۵۷ء میں عوامی لیگ کی ترجمانی کی خاطر ہفتہ وار شروع کیا ۔ کچھ دن بعد بند ہو گیا ۔

نوائے بولان : عبدالرحمٰن کُرد نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پہلے مستونگ سے ، پھر کوئٹہ سے شائع کیا ۔ آج کل دکھائی نہیں دیتا ۔

جہالستان : ایم یو قمبرانی نے ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء میں اوستہ محمد سے جاری کیا تھا ۔

میثاق الحق : اس کی ابتدا ۲۸ جولائی ۱۹۵۸ء کو عبدالرحمٰن غور کے ہاتھوں ہوئی تھی ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو بند ہو گیا ۔ اس کا ایک خصوصی نمبر غلام محمد شاہوانی کی یاد میں چھپا تھا[۱] ۔

پیواد : پشتو کا یہ ہفتہ وار پرچہ سلطان محمد صابر نے ۲۷ اگست ۱۹۵۹ء کو جاری کیا ۔ اب تک شائع ہو رہا ہے ۔ اس میں ایک حصہ اُردو خبروں اور مضمونوں کے لیے وقف ہے ۔

پرچم اتحاد : سیلانی شریفی کے ہاتھوں اس کا اجرا مستونگ کے مقام پر ہوا ۔ چند ماہ شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا ۔

ایلم : براہوئی زبان میں پہلا پندرہ روزہ اخبار نور محمد پروانہ نے مستونگ سے ۲۴ فروری ۱۹۶۰ء کو شروع کیا ۔ بعد میں ہفت روزہ چھپنے لگا ۔ آج تک باقاعدگی سے منظر عام پر آ رہا ہے ۔ اس میں اُردو کے لیے بھی چند صفحے مخصوص ہیں ۔ اس کے اب تک کئی کارآمد نمبر شائع ہوئے ہیں ، جن میں سے چند ایک یہ ہیں :

آزادی نمبر ۱۷ اگست ۱۹۶۴ء ، استقلال نمبر ۱۷ اگست ۱۹۶۶ء ، انقلاب نمبر ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء ، استقلال نمبر ۱۷ اگست ۱۹۶۱ء ،

۱- میثاق الحق ، کوئٹہ ، ۸ اکتوبر ۱۹۵۹ء -

(اس میں ایک گراں قدر تحقیقی مقالہ ''براہوئی زبان اور اس کی لغت'' از پروفیسر انور رومان چھپا ہے) ۔ اس میں ادبی ، اخلاق ، تعمیری ، دینی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے ہیں[1] ۔

بولان ایکسپریس : اس ہفتہ وار کو انگریزی زبان میں سید فصیح اقبال نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۰ع کو مستونگ سے جاری کیا تھا ۔ اب بند ہے ۔

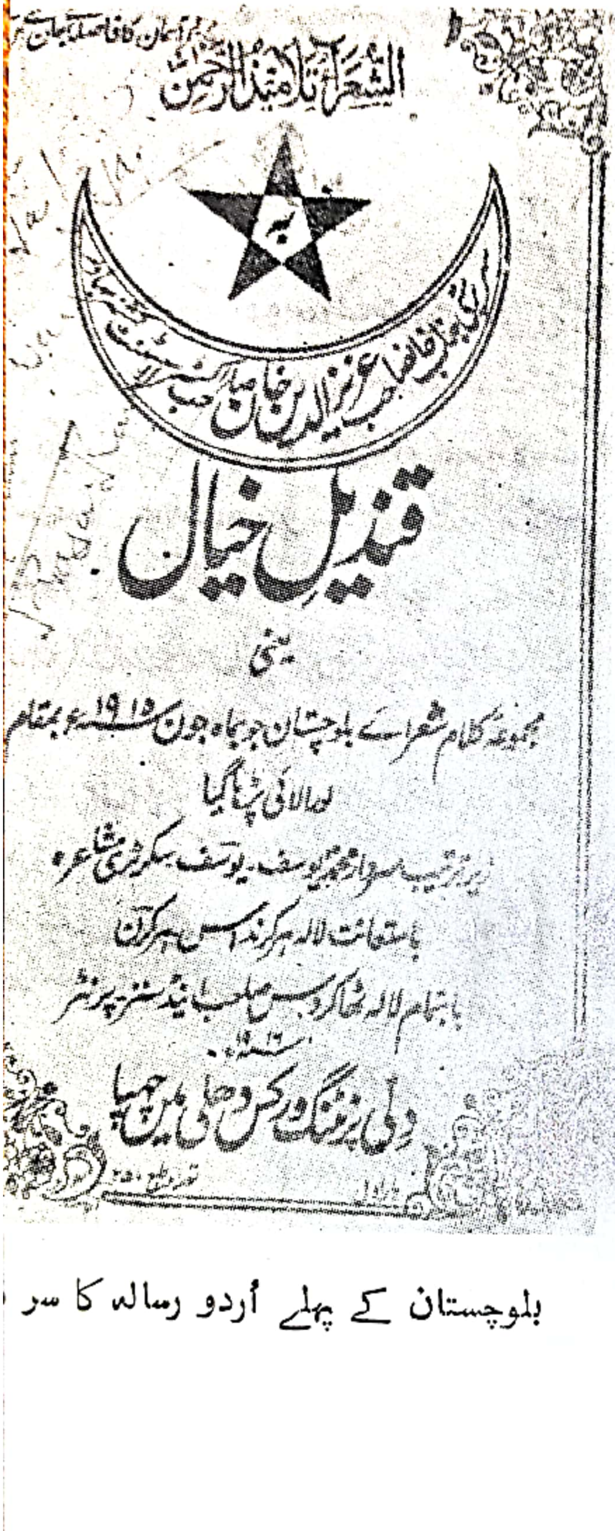
بلوچستان جدید : یہ روزنامہ کراچی سے مارچ ۱۹۶۰ع میں یہاں آیا ۔ اس کے مدیر نسیم تلوی تھے ۔ ان کی وفات کے بعد یہ پرچہ بند ہو گیا ۔

نوکین دور : بلوچی زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار ۸ جون ۱۹۶۲ع کو عبدالکریم شورش نے جاری کیا[2] ۔ اس کے ادارۂ تحریر سے عبداللہ جمالدینی ، کریم بخش دشتی ، غوث بخش صابر اور کامل القادری منسلک رہے ہیں اور بعض ہیں ۔ اس میں اُردو میں خبریں اور مضامین بھی شامل ہوتے ہیں ۔ اس کے بعض نمبر مفید اور معلومات افزا ہوتے ہیں مثلاً سالنامہ ۸ جون ۱۹۶۵ع ، غلام محمد شاہوانی نمبر، یکم ستمبر ۱۹۶۶ع ۔ یوسف عزیز مگسی نمبر مئی ۱۹۶۵ع ۔ علاوہ ازیں سال رواں (مارچ ۱۹۶۷ع) میں اس کا ایک مکران نمبر چھپا ہے جو قابل تعریف ہے ۔ اس کی تقطیع $15\frac{1}{2} \times 10$ انچ ہے اور ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے ۔ دو تہائی اُردو مضامین کے لیے وقف ہے ۔ اُن میں سے چند ایک یہ ہیں :

مکران ــــ ما قبل تاریخ (پروفیسر انور رومان) ، تاریخ مکران (محمد خان مری) ، نخلستان کی سرزمین (عطا شاد) ، مغربی بلوچی (ایک لسانی مطالعہ) (کامل القادری) ، مکران اور قومی تحریکیں (عبدالکریم شورش) ، کوہ مراد (کامل القادری) ، علامہ سید محمد جونپوری (فقیر بخش بگٹی) ، مکران کے فارسی گو شعرا ، (عبدالغفار ندیم) ناطق مکرانی (ڈاکٹر انعام الحق کوثر) ، مکران اعظم اور عظیم مکران (نور احمد خان آفریدی) ۔

ڈیلی گروپ : یہ کسی اخبار کا نام نہیں بلکہ یہ ایک سکیم تھی جو

۱- ایلم کی فائل میرے سامنے ہے ۔
۲- نوکین دور کی فائل موجود ہے ۔


الشعراء تلامیذ الرحمٰن

جناب قاضی عزیزالدین خان صاحب

قندیل خیال

یعنی

مجموعہ کلام شعرائے بلوچستان جو بماہ جون ۱۹۱۵ء بمقام

لورالائی چھپا گیا

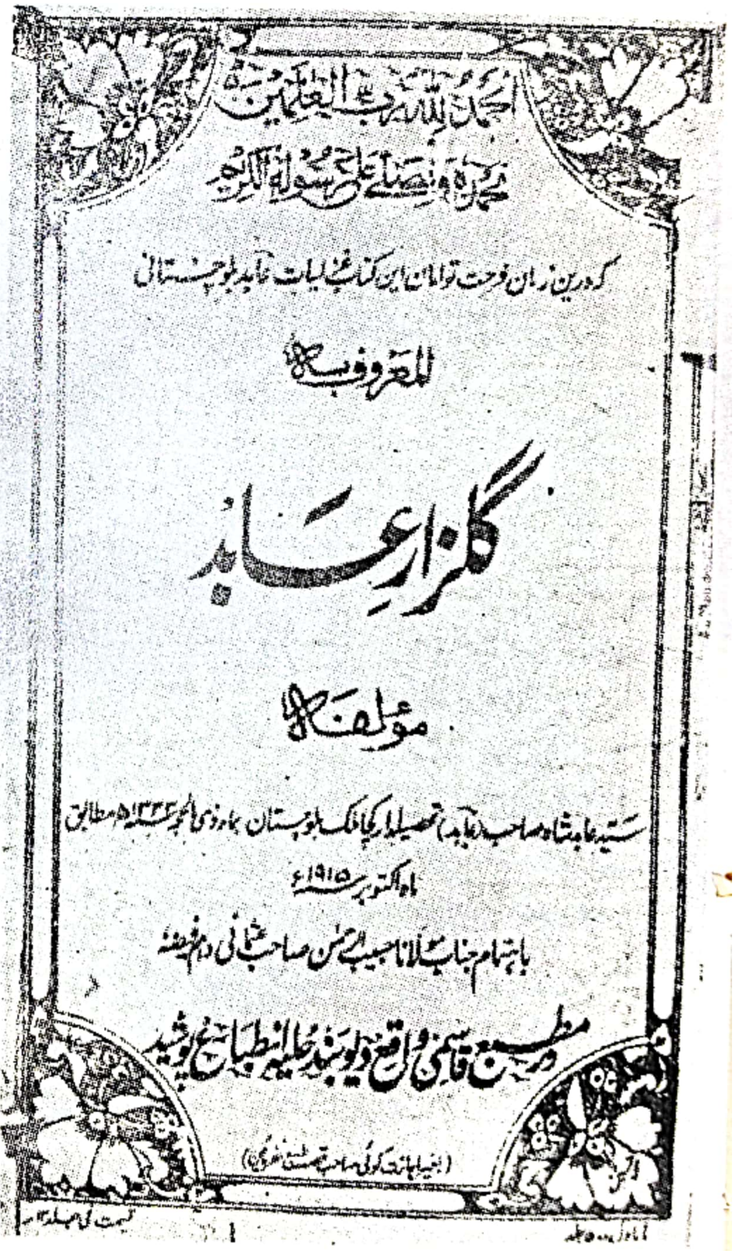
زیر ترتیب محمد یوسف یوسف سیکرٹری مشاعرہ

باستعانت لالہ ... داس ...

باہتمام لالہ ٹھاکر داس صاحب ... پرنٹر

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا

بلوچستان کے پہلے اُردو رسالہ کا سر


الحمد للہ رب العالمین

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

کہ درین زمان فرحت توامان این کتاب غزلیات عابد بلوچستانی

المعروف بہ

گلزارِ عابد

مؤلفہ

سید عابد شاہ صاحب (عابد) تحصیلدار ... بلوچستان بماہ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق

ماہ اکتوبر ۱۹۱۵ء

باہتمام جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دام فیضہ

مطبع قاسمی واقع دیوبند ... الطباع ...

بلوچستان کے ایک اُردوگو شاعر کے پہلے
مطبوعہ دیوان کا سرورق

۱۵ اگست ۱۹۵۹ع کو بنائی گئی ، جس کے تحت کوئٹہ کے سات ہفتہ وار اخبارات (تنظیم ، کوہسار ، باغ و بہار ، قاصد ، نعرۂ حق ، زمانہ اور صداقت) میں سے ہر روز ایک اخبار چھپتا تھا ۔ کچھ عرصہ یہ سکیم کامیابی سے چلی ، بعد میں روزنامہ اخبار شائع ہونے پر یہ سکیم جاتی رہی ۔ ان اخبارات کے ہفتے میں جدا جدا روزانہ نکلنے پر گورنر اختر حسین نے کہا تھا : ''میدان صحافت میں تاریخ بنا کر رہو گے[۱]۔''

رسائل

پہلا دور

(۳۱ مئی ۱۹۳۵ع تک)

قندیل خیال : چونکہ بلوچستان میں بیسویں صدی کے آغاز میں کوئی لیتھو پریس نہ تھا اس لیے یہاں کی علمی ، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی منظر عام پر نہ آتی تھیں ۔ ویسے اُن دنوں اُردو ان خطوں میں سرعت کے ساتھ اپنا اثر دکھا رہی تھی، اس لیے ادبی ذوق رکھنے والے چند صاحبان نے شعرا کے طرحی اور غیر طرحی کلام ، ادبی اور علمی خبروں کی اشاعت کی غرض سے ۱۹۱۴ع میں لورالائی (کوئٹہ سے براہ زیارت ۱۳۵ میل ، براہ ہندو باغ ۱۵۹ میل) سے ایک رسالہ بنام ''قندیل خیال'' (طول ۹ انچ اور عرض ۵$\frac{1}{2}$ انچ ، صفحات ۴۰ کے قریب) جاری کیا ۔ اس کے سرپرست خان عزیز الدین خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے ۔ یہ لالہ ٹھاکر داس اینڈ سنز پرنٹر کے زیر اہتمام دلی پرنٹنگ ورکس دہلی سے چھپتا تھا اور تعداد اڑھائی سو ہوتی تھی ۔ اس کے روح رواں سردار محمد یوسف خاں یوسف پوپلزئی تھے ۔ یہ رسالہ دو سال تک شائع ہوتا رہا ۔[۲]

۱- ہفت روزہ قاصد ، کوئٹہ ، ۲۰ اگست ۱۹۵۹ع ۔
۲- اس کے بارے میں مزید معلومات ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' کے تحت درج کی گئی ہیں ۔

نوشیروان : یہ ادبی ، علمی اور تعلیمی ماہنامہ ۱۹۳۴ء میں جاری ہؤا۔ اس کے مدیر صحرائی سروری تھے جن کا نام طوطا رام تھا۔ اس رسالے کی ترتیب و تدوین میں مسٹر مدحت زبیری اور الماس کا بہت حصہ تھا۔ یہ ماہنامہ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے زلزلے کی نذر ہو گیا۔

دوسرا دور

(۱۹۳۶ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک)

دی نیو کوئٹہ : یہ ماہنامہ ۱۹۳۸ء میں اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ سے طلبہ کی خاطر اُردو اور انگریزی میں شائع ہونے لگا۔ اس کے مدیر اور نگران خواجہ عبدالحی اور نائب مدیر اور منیجر کمال الدین احمد تھے۔ دو سال بعد یہ رسالہ بند ہو گیا کیونکہ خواجہ عبدالحی اور کمال الدین احمد نے علی الترتیب ملٹری سروس اور گورنمنٹ سروس اپنا لی۔

دبستان : یہ ماہنامہ ۱۹۳۹ء میں مڈل اور ہائی سکولوں کے طلبہ اور طالبات کے لیے منظر عام پر لایا گیا۔ اس کے مدیر اور نگران سید انور علی شاہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس تھے۔ یہ جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا[۱]۔

تیسرا دور

(۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک)

اس دور میں پہلے دو ادوار کے مقابلے میں زیادہ رسائل جاری ہوئے اور زیادہ دیر تک قائم رہے۔

رہبر نسواں : اللہ رکھا جالی نے ۱۹۴۸ء میں یہ ماہنامہ شائع کرنا شروع کیا۔ یہ خواتینِ بلوچستان کے لیے آسمانِ صحافت پر ایک درخشندہ ستارہ تھا۔ یہ مسز رشید جان ، بیگم رفیع الدین ، شیریں درانی ، ذکیہ فضل الٰہی اور صفیہ ایوب وغیرہ کی ادارت میں چھپتا رہا۔ اس کے کئی ایک نمبر

۱۔ قاصد ، کوئٹہ ، ۲۹ فروری ۱۹۶۴ء۔

بھی شائع ہوئے ۔ اُن میں سے یہ اہم ہیں : آزادی نمبر (اگست و ستمبر ۱۹۴۹ع) ، میلاد النبی کی تقریب (جنوری ۱۹۵۲ع) ، یوسف عزیز نمبر (یکم جون ۱۹۵۳ع) ۔ چند سال کے بعد اس کی اشاعت پندرہ روزہ ہو گئی ۔ آج تک جاری ہے ۔

معلم : اس مذہبی ، علمی اور ادبی ماہوار رسالے کی ابتدا مولانا عبدالباقی[1] درخانی کے ہاتھوں نومبر ۱۹۵۰ع میں ہوئی ۔ یہ مدرسہ عربیہ ملیہ[2] سریاب کوئٹہ بلوچستان کا آرگن تھا ۔ اس کے پہلے اداریے ''معلم کا پہلا قدم'' میں مندرج ہے : ''رسالۂ معلم کے اجرا کا مقصد ملک میں اسلامی تعلیم کی طرف رغبت دلانے کے ساتھ ساتھ ادب ، مذہب وغیرہ کو بھی فروغ دینا ہے ۔ ہم نے اسلامی تعلیم سے لگاؤ چھوڑ دیا ہے جس کی روشنی میں ہمارے اسلاف نے حیرت انگیز انداز میں دنیا پر غلبہ پایا تھا ۔ اگر آج مسلمان خود اسلامی تعلیمات کے حصول پر کمربستہ ہو جائیں ، اپنی اولاد کو صحیح اسلامی تعلیم دلائیں ، اپنی قوم کے مفلس و نادار طبقے کی پوری طرح امداد کر کے انھیں علم دین کے زیور سے مزین ہونے میں مدد دیں ، تو تمام مشکلات آن واحد میں حل ہو سکتی ہیں ۔''

۱۔ آپ بلوچستان کے مصلح مولانا محمد فاضل درخانی (المتوفٰی ۱۸۹۲ع) کے نواسے ہیں ۔ اُن کے متعلق سید علی نظامی فرماتے ہیں :

وہ فاضل شخصیت وہ منبع انوار روحانی
دلِ افسردہ کو جس کی نظر اک لطف ربانی
وہ جس کی زیست تھی تبلیغ تعلیمات اسلامی
وہ جس کی مرگ بھی ہے قاسم انوار روحانی
حیات حرّیت کی قدر و قیمت آشکارا کی
کیا مفقود ذہن قوم سے ذوق تن آسانی

۲۔ بقول سید نظامی :

مستقبلِ جمیل کا ضامن ترا وجود
اب تیرے ہاتھ عقدۂ ملی کی ہے کشود
(معلم ، سالنامہ نومبر ۱۹۵۲ع)

انھی نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ رسالہ آٹھ سال سے زیادہ قائم رہا۔ بعد میں ہفت روزہ کا روپ دھارا اور جاری نہ رہ سکا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں عبدالرحمٰن غور اور ملک محمد رمضان بلوچ خاصی دیر تک رہے۔ کچھ دنوں تک موسیٰ طور اور پیر محمد زبیرانی لہڑی بھی اس سے منسلک رہے۔ اس کے قلمی معاونین میں مولانا شمس الحق افغانی وزیر معارف قلات، آغا صادق، عبدالرحمٰن کرد، جمیل اختر، مولائی شیدائی، فانی مراد آبادی، سید علی نظامی، فقیر بخش بگٹی، پروفیسر سندھے خاں (ناظم جسمانیات قلات۔۔۔یہ فروری ۱۹۵۱ء سے لگاتار مضامین لکھتے رہے، جن کا مقصد پاکستانی نوجوانوں کی صحت کو درست رکھنا اور جسم کو مضبوط بنانا تھا) اور عارف عبدالرشید[1] وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بھی کئی نمبر شائع ہوئے۔ جن میں آزادی نمبر (اگست ۱۹۵۱ء)، سالنامہ (نومبر ۱۹۵۲ء)، دستور نمبر (مارچ ۱۹۵۳ء) وغیرہ تھے۔

کوہسار: مولانا عبدالعزیز خاں نے دسمبر ۱۹۵۱ء میں اس علمی، ادبی اور سیاسی ماہنامے کا اجرا کیا۔ پھر پندرہ روزہ ہؤا۔ اب ہفتہ وار ہے اور باقاعدگی سے منظرعام پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر اس کا موٹو تھا:

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بےباک است

اس رسالے کا نصب العین تھا ''ہم بلوچستان کے کوہساروں سے ایسی صدا بلند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو ملک بھر میں ایسی فضا پیدا کرے جس سے قوم میں عالمگیر جذبۂ اخوت، سچی جمہوریت، باہمی تعاون، اخلاق اعلیٰ، محبت، روا داری، ایثار، تنظیم اور یقین محکم کے جذبات اُجاگر ہوں گے۔

سفینۂ برگ گل بنائے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

۱۔ 'معلم' سریاب کوئٹہ میں رشید سنزر کے نام سے افسانے اور مضامین لکھتے رہے ہیں۔ پٹھان (اور وہ بھی سنزر خیل) ہونے کے باوجود اچھی اردو لکھتے ہیں۔۔معلم۔ سالنامہ نومبر ۱۹۵۲ء۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اس ماہنامے کے اجرا پر ایک خصوصی پیغام میں فرمایا تھا[1] :

''مجھے آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کوئٹہ سے ''کوہسار'' نامی ایک ماہانہ رسالہ شائع کر رہے ہیں جس کا ایک بڑا مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت ہے۔ یہ بہت مبارک خیال ہے۔ اردو کی خدمت بہت بڑی قومی خدمت ہے۔

بلوچستان تعلیم میں بہت پیچھے ہے۔ یہ گذشتہ نظم و نسق کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی طرف توجہ ہوئی ہے اور ابھی سے اس میں ترقی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اس ترقی میں اچھے اخبار اور رسالے بہت کچھ معاون ہو سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا رسالہ صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں مدد دے گا۔ اردو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کر لی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عملی طور پر یہ ثابت کر دکھائیں کہ یہ در حقیقت ہماری قومی زبان ہے اور یہ اُسی وقت ہوگا جبکہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو اور دفتروں اور عدالتوں میں تمام کاروبار اسی زبان میں انجام پائے۔ اس طرف اب توجہ ہوئی ہے لیکن رفتار سست ہے۔

ہم لسانی سے ہم خیالی پیدا ہوتی ہے اور ہم خیالی سے یک جہتی اور اتحاد رونما ہوتا ہے۔ اردو نے پہلے بھی یہ خدمت انجام دی ہے اور اب پاکستان میں بھی اس مبارک اور اہم فرض کو انجام دے گی۔ اس کی قوت میں پاکستان کی قوت اور اس کی زندگی میں پاکستان کی زندگی ہے۔

اردو مثل ایک شیرازے کے ہے جو پاکستان کے مختلف عناصر کو ایک سلسلے میں منسلک کر کے ان میں اتحاد و یک جہتی کی

۱- کوہسار ، کوئٹہ ، دسمبر ۱۹۵۱ء -

روح پھونکے گی -

آپ اپنے رسالے کے ذریعے سے اپنے ہم وطنوں کے لیے ایسی معلومات بہم پہنچائیں جو زندگی میں ان کے لیے کارآمد ہوں - ان میں وسعت نظر اور روا داری پیدا کریں - یہ تمام باتیں آپ ایسی سادہ اور دل کش زبان میں ادا کیجیے کہ لوگ شوق سے پڑھیں اور یہ سمجھیں کہ جو وقت انھوں نے اس کے پڑھنے میں صرف کیا ہے وہ رایگاں نہیں گیا بلکہ کچھ حاصل کیا ہے -''

اس کے قلمی معاونین میں سید ناظم علی دریا بادی ایم - اے ، ماہر افغانی ، اخگر سہارنپوری ، آغا صادق ، ارشد امروہوی ، طاہرہ نقوی وغیرہ شامل تھے -

شاہین : ۱۹۵۲ء میں محشر رسول نگری نے اس ادبی ماہنامے کی ابتدا کی - صرف دو تین پرچے شائع ہوئے -

بچوں کا شاہین : اس باتصویر ماہنامے کا اجرا کمال الدین احمد نے مارچ ۱۹۵۱ء میں کیا - چند ماہ کے لیے تعطل پیدا ہؤا اور تیسرا شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء میں چھپا - جولائی ۱۹۵۳ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ، بعد میں کمال الدین احمد نے روزنامہ 'اتحاد' کی ادارت سنبھال لی اور یہ رسالہ جاری نہ رہ سکا - اس کے معاونین صفیہ ایوب ، قدسیہ ، صادقہ سلطانہ ، غلام محمد شاہوانی ، شمیم مسعود صدیقی ، صلاح الدین خاں اور جمیل تھے - اس میں ''شاہین'' ٹارزن کی کہانی تصویروں سے وضاحت کے ساتھ چھپا کرتی تھی - اس کے آرٹسٹ ضیا صدیقی اور نیک محمد خاں عاطفی تھے -

''شاہین لیگ'' بھی قائم کی گئی تھی جس میں وہ بچے شامل ہوتے تھے جن کی عمر آٹھ اور اٹھارہ سال کے درمیان ہو - ممبری کی فیس چار آنے تھی جو ڈاک کے ٹکٹوں کی صورت میں بھی وصول کی جاتی تھی - اس لیگ کا مقصد یہ تھا کہ بچوں میں ایسی عادتیں پیدا کی جائیں کہ وہ اپنا وقت بیکار نہ کھوئیں - اس میں کوئٹہ قلات ریجن کے بچے خاصی دلچسپی لیتے تھے - ''بچوں کے شاہین'' کا ستمبر ۱۹۵۲ء میں سالنامہ بھی شائع ہؤا تھا - اس کا سرورق ہمیشہ آرٹ پیپر پر رنگین تصویروں کے ساتھ چھپتا تھا -

شرارت نمبر (جون ۱۹۵۳ء) بھی منظر عام پر آیا تھا ۔ اس میں ایک طرحی مشاعرے کے اشعار درج ہیں ۔ مصرعہ طرح تھا :

"ماسٹر جی کو ہے بے حد پیار مولا بخش سے

چند شعر یہ ہیں[1] :

دیکھنا ، رہنا ذرا ہشیار مولا بخش سے
کانپتے رہتے ہیں تھانیدار مولا بخش سے
جب بھی دیکھو پھر رہے ہیں بس بغل میں داب کر
ماسٹر جی کو ہے بے حد پیار مولا بخش سے
ایسے لڑکے مدرسے میں پھول پھل سکتے نہیں
جو کبھی ڈرتے نہیں سردار مولا بخش سے

بعض نظموں میں مقامی رنگ کی جھلکیاں ملتی ہیں ، جیسے "ہنے کی وادی"[2] :

شاخوں میں جس دم ننھے پرندے
گاتے ہیں مل کر گانے رسیلے
دل کھینچتے ہیں اُن کے ترانے
ہنے کی وادی جنت ہے گویا (کمال)

پھر بہار دیکھیے[3] :

بہار آئی گیا سردی کا موسم
درختوں نے اُٹھائے سبز پرچم
بہت خوش رنگ ہیں بادام کے پھول
نکلتے ہیں ہمیشہ حسب معمول
پھلے پھولے کھڑے ہیں زرد آلو
چلی آتی ہے بھینی بھینی خوشبو

۱- بچوں کا شاہین ، کوئٹہ ، جون ۱۹۵۳ء -
۲- ایضاً ، مارچ ۱۹۵۱ء -
۳- ایضاً ، مارچ ۱۹۵۲ء -

ذرا دیکھو تو قدرت کا تماشا
زمیں گویا ہے جنت کا نمونا (ارشد)

یا پھر ''وادی بولان میں انگور'' ملاحظہ فرمائیے ۱ :

کیا حسن کی تصویر ہیں انگور کی بیلیں
بادام کی ہمشیر ہیں انگور کی بیلیں

نوخیز ، دلآویز ، لچکدار ، ملائم
پُر شیرہ و پُر شیر ہیں انگور کی بیلیں

معلوم یہ ہوتا ہے کہ لب کھول رہی ہیں
آمادۂ تقریر ہیں انگور کی بیلیں

اُس خطۂ دلکش میں ہیں قدرت کا عطیہ
بولان کی تقدیر ہیں انگور کی بیلیں (صادق)

مجید لاہوری کی ایک نظم ''بچوں کے شاہین'' کوئٹہ میں چھپی تھی۔ نظم ملاحظہ فرمانے سے پہلے مجید لاہوری کا ایک تشریحی نوٹ بھی پڑھ لیجیے :

''بچوں کو شکایت ہے کہ میں ان کے لیے کچھ نہیں لکھتا۔ آنے والے دور کے ان وزیروں اور گورنروں سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ کہیں یہ بڑھاپے میں محض اس لیے مجھے ''سیفٹی ایکٹ'' کے تحت نہ گرفتار کر لیں کہ میں نے اُن کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ اسی خدشے نے مجھ سے یہ نظم لکھوائی ۲ :

مرغی کو تم نے کیوں چھیڑا ؟
اور بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا ؟
ننھے کی مٹھائی کیوں چھینی ؟
بسکٹ کا ڈبّا کیوں کھولا ؟
کپڑوں پہ ''سیاہی'' کیوں پھینکی ؟
چینی کا پیالہ کیوں توڑا ؟

۱- بچوں کا شاہین ، کوئٹہ ، جون ۱۹۵۲ء -
۲- ایضاً ، دسمبر ۱۹۵۲ء -

اور پیالہ توڑ کے کیوں ناچے؟
یہ فلم کا گانا کیوں گایا؟
اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا''

باغ و بہار : فیض اللہ خان نے بچوں کے لیے ماہنامہ جاری کیا ۔ بعد ازاں ہفت روزہ کی صورت میں بھی زیادہ دنوں تک شائع نہ ہو سکا ۔

ارتقا : پہلے ہفت روزہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا ۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں ماہانہ ہوا ۔ اس کے مدیر سید علی نظامی تھے ۔ اس میں ان موضوعات جمیل کا حسین امتزاج تھا[1] :

تفسیر حیات ، ادب ، اخلاق ، ملکوتی رفعتیں ، فلسفہ ، نظری موشگافیاں ، تاریخ ، وقت کی اندھی رفتار ، نفسیات ، احساسات کی بوقلمونی ۔ اس کے لکھنے والوں میں خلیل صدیقی ، سعید احمد رفیق ، ناز ، تراب اور عابد رضوی وغیرہ شامل تھے ۔ 'ارتقا' کی اٹھان اچھی تھی لیکن چند پرچوں کی اشاعت کے بعد سید علی نظامی نے اسے 'روزنامہ' بنا لیا اور کراچی لے گئے ۔

پشتو : اس ماہوار رسالے کو کمال خان شیرانی نے ۱۹۵۷ء میں شروع کیا ۔ ایک سال کے بعد بند ہو گیا ۔ زیادہ مضامین پشتو میں ہوتے تھے ، پھر بھی اُردو کو نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا ۔

گلستان : ۱۹۵۷ء میں فضل احمد غازی نے ابتدا کی ۔ اب بند ہے ۔

ظفرالاسلام : اس نام سے یہ دوسرا پشتو زبان کا ماہوار رسالہ ستمبر ۱۹۵۹ء میں ظفر اللہ خان نے جاری کیا ۔ بعد میں ہفت روزہ ہو گیا اور اسی صورت میں ٦ نومبر ۱۹۶۲ء سے یہ کوئٹہ اور پشاور سے ایک ساتھ چھپنے لگا مگر یکم اگست ۱۹۶۳ء کو خاموش ہو گیا ۔

خبرونہ : پشتو کا ایک رسالہ محکمۂ اطلاعات نے نومبر ۱۹۵۹ء میں جاری کیا اور پہلے پرچے سے آگے نہ بڑھ سکا ۔

کارکن : یہ سہ ماہی رسالہ محکمۂ ترقی دیہات نے جولائی ۱۹۵۹ء میں

۱- ارتقا ، کوئٹہ ، شمارہ نمبر ۲ ، فروری ۱۹۵۵ء ۔

راجہ احمد خاں کی نگرانی میں جاری کیا۔ اس میں اُردو، پشتو اور بلوچی کے مضامین چھپتے تھے۔ یہ ۳۰ جون ۱۹۶۱ء تک جلوہ گر رہا۔

ہمارا اسکول: یہ رسالہ قلات ڈویژن میں گورنمنٹ ہائی سکول مستونگ سے ماہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر محمد اسحاق اختر تھے[1]۔

اولس پشتو: ستمبر ۱۹۶۱ء میں محکمۂ قبائلی نشر و اشاعت کوئٹہ نے امیر عثمان کی زیر نگرانی جاری کیا۔ اس کے موجودہ مدیر عنایت اللہ ریاض ہیں۔

اولس بلوچی: اسے بھی دسمبر ۱۹۶۱ء میں محکمۂ قبائلی نشر و اشاعت کوئٹہ نے شروع کیا۔ امان اللہ گچکی اور غفار ندیم اس کے ایڈیٹر رہے۔ آج کل عبدالحکیم بلوچ کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔

اسلامیہ ہائی سکول میگزین: یہ سہ ماہی مجلہ اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ نے زیر نگرانی چودھری محمد سلطان ہیڈ ماسٹر جون ۱۹۵۴ء میں جاری کیا۔ ایڈیٹروں کا ایک بورڈ اس کی نگرانی کرتا تھا۔ چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ پھر دوبارہ دسمبر ۱۹۶۱ء سے شائع ہونے لگا۔ آج کل نظر نہیں آتا۔ یہ رسالہ تعلیمی اور تربیتی پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ اس میں اساتذہ اور ادبا کے علاوہ مدرسے کے طلبا کی بھی نگارشات ملتی ہیں۔ اس کا ماٹو تھا:

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سر فرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

مجلہ اکیڈیمی علوم اسلامیہ کوئٹہ: یہ مجلہ اکیڈیمی کے ہر سہ ماہی کورس کے اختتام پر زیر نگرانی ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک ادارتی بورڈ کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اُس کے ممبر ہر سہ ماہی کے بعد بدل جاتے تھے۔ اس کے مدیر ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی اور معاون مولانا شمس الحق افغانی تھے۔ یہ علمی اور مذہبی مضامین کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اکیڈیمی کے بند ہونے پر یہ اُردو مجلہ بھی بند ہو گیا۔

۱۔ قاصد، کوئٹہ، ۲۹ فروری ۱۹۶۴ء۔

بولان : گورنمنٹ کالج کوئٹہ کا ترجمان ہے ۔ خاصی ضخامت رکھتا ہے ۔ اس کے اُردو حصے کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اس کی ابتدا ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی ۔ اُس وقت اس کے مدیران اقبال الرحیم ، مسعود الرؤف[1] اور لطیفہ صدیقی تھے ۔ اب تک باقاعدگی سے چھپ رہا ہے ۔ اس مجلہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ طلبا کا علمی و ادبی ذوق نکھارا جائے ۔ مشق و ممارست کے موقعے بہم پہنچا کر ان میں ترسیل خیال و ابلاغ کی صلاحیت پیدا کی جائے اور بالواسطہ سماجی شعور پیدا کیا جائے ۔ اسی لیے اس کا محض معیار بڑھانے کے لیے ملک کے ادیبوں اور فنکاروں کا سہارا نہیں لیا جاتا ۔ اس کا مطمح نظر ملک کے علمی و ادبی رسالوں کی مسابقت نہیں بلکہ طلبا میں صحت مند ادبی ذوق پیدا کرنا ، ان کی ادبی مساعی کو نکھارنا اور سنوارنا ہے ۔ اب تک اسے اس سلسلے میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے ۔ اس کے لکھنے والوں میں سے بعض اپنی علمی و ادبی زندگی میں کامرانی سے ہم کنار ہوئے ہیں اور اب وہ علم و ادب کی خدمت میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں ۔

بالعموم مضامین کی ترتیب مختلف عنوانات کے تحت کی جاتی ہے جیسے تحقیق و تنقید ، طنز و مزاح ، ساز و آہنگ ، حرف و حکایت اور فکر و خیال وغیرہ ۔ کارٹونوں کی مقبولیت اور اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کے ذریعے سے معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے ۔ کالج کے طلبا کے منتخب کارٹون بھی اس مجلے کی زینت کا باعث بنتے ہیں ۔

اساتذۂ کرام بھی اپنی تخلیقات سے اس رسالے کو نوازتے رہتے ہیں ۔ جن صاحبان نے اس کی نگرانی کی ہے ، ان میں خلیل صدیقی اور رشید احمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ خان سرور ، خورشید احمد چشتی ، ڈاکٹر اطہر رشید ، چودھری عطا محمد ، ڈاکٹر گیلانی اور پروفیسر کرار حسین اس مجلے کی سرپرستی فرماتے رہے ہیں[2] ۔

مینار : اُردو انگریزی ماہوار رسالہ مسلم پبلک سکول نے جنوری

۱- آپ ان دنوں مغربی پاکستان کے محکمۂ اطلاعات کے سیکرٹری ہیں ۔
۲- بولان کی فائل ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۶ء تک پیش نظر ہے ۔

۱۹۶۳ء میں جاری کیا جو اب نظر نہیں آتا۔

بورانیر ڈاکہ : اُردو، بنگالی اور انگریزی سہ ماہی رسالہ ماہتھیہ سمیلانی کوئٹہ کے زیر اہتمام جون ۱۹۶۳ء میں چھپنا شروع ہوا۔ اس کی چیف ایڈیٹر خانم شمی احمد تھیں۔ آج کل بند ہے۔

خبرنامہ : یہ سہ ماہی مختصر رسالہ گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول مستونگ (قلات ڈویژن) کا ترجمان ہے جس کی ابتدا ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی۔ اس کے سرپرست رشید احمد اور مرتب عبدالحکیم علوی ہیں۔

یہ تھیں بلوچستان سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل کی جھلکیاں۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں اُردو صحافت ہی کا دور دورہ رہا ہے اور اب تک ہے۔ آیندہ اس میں ترقی کے امکانات موجود ہیں۔ اس وقت یہاں سے چار روزنامے، بارہ ہفت روزہ اور پندرہ روزہ، اور تین سالانہ جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ ان اخبارات اور رسائل نے اس خطے میں اُردو کو فروغ دینے میں یقیناً گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

علاوہ ازیں ۱۹۶۲ء میں کوئٹہ میں صحافت کے بارے میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی جس میں چند اہم مقالے پیش کیے گئے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں ماہ فروری کے آخر میں سبّی کے مقام پر علاقائی صحافیوں کے کنونشن میں یہاں کے اخباری مسائل اور ان کے حل کرنے کے لیے غور و خوض کیا گیا۔ ۱۹۶۳ء سے ٹیلی پرنٹر سروس کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ سروس اے پی پی کی ہے۔ ۱۹۵۵ء سے کوئٹہ قلات پریس کلب موجود ہے۔ مقامی صحافیوں کی ایک تنظیم ایڈیٹرز ایسوسی ایشن بھی ہے۔ قومی اخبارات کے نمائندوں کے علاوہ نیوز ایجنسیوں اے پی پی اور پی پی اے کے نمائندے بھی موجود ہیں۔

درس و تدریس

جب انگریزوں کو بلوچستان کی فوجی اہمیت کا احساس ہؤا تو اُنھوں نے شروع میں چند علاقوں پر قبضہ جما لیا ۔ بعد میں اس سارے علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کر کے ترقیاتی کاموں میں کوئی دلچسپی نہ لی ۔ بہرحال انگریزوں سے پہلے[1] اور انگریزوں کے ابتدائی زمانے میں اس خطے کی تعلیم ''مُلاؤں'' (مُلا کا لفظ بڑا قابل احترام تھا) کے ہاتھ میں تھی جو مکاتب میں عربی و فارسی کی تعلیم دیتے تھے ۔ مکتبوں کا یہ نظام مسجدوں میں قائم تھا ۔ اساتذہ کسی قسم کا معاوضہ وصول نہیں کرتے تھے بلکہ زکواۃ (جو زمین کی پیداوار اور پالتو جانوروں پر مشتمل تھی) خیرات اور بیاہ شادی کے نذرانے اس نظام تعلیم کو چلانے میں معاون تھے ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جو سروے کیا گیا ، اُس کے مطابق اس علاقے میں (کوئٹہ ڈویژن) اُس وقت دو تین سو کے قریب ایسی مسجدیں تھیں ، جن میں درس و تدریس کا کام انجام پا رہا تھا ۔ ۱۹۰۳ء میں ان مسجدوں کے تمام طلبہ کی تعداد نو سو اور طالبات کی تعداد نوے کے لگ بھگ تھی ۔ اسی طرح قلات ڈویژن میں بھی صرف مسجدوں کے اندر محدود پیمانے پر مکتبوں کے نظام تعلیم کے مروج ہونے کا پتا چلتا ہے ۔ ان مساجد سے صرف وہی بچے فیض یاب ہو سکتے تھے جو فکر معاش سے آزاد سرداروں ، امیروں اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔

برطانوی حکمرانوں نے اس علاقے میں اپنی گرفت مضبوط کر لی تو اپنی

۱۔ کوئٹہ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ، صفحہ ۲۸۶ ۔
''بلوچستان کی تعلیمی ترقی پر ایک ناقدانہ نظر'' از خواجہ عبدالحی ۔
مطبوعہ ''پاسبان'' کوئٹہ ، ۴ دسمبر ۱۹۴۲ء ۔

فوجی اور نو آبادیاتی مصلحتوں کے پیش نظر سکولوں کا نظام رائج کیا۔ تاہم اپنے ہفتاد سالہ دور اقتدار میں کوئٹہ ڈویژن کے وسیع و عریض علاقے کے اندر سکولوں کی تعداد نوے سے نہ بڑھائی۔

سر رابرٹ سنڈیمن یہاں کا پہلا اے جی جی (گورنر جنرل کا ایجنٹ) تھا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں (۱۸۸۱ع) ٹاؤن فنڈ سے ایک چھوٹی سی عمارت کی تعمیر عمل میں آئی۔ دو سال بعد یہ عمارت اینگلو ورنیکلر مڈل سکول میں تبدیل ہوگئی۔ یہ بلوچستان میں پہلا سکول تھا۔ تینتالیس لڑکوں کے داخلے سے اس کا افتتاح ہوا۔ ان لڑکوں میں سے صرف چھ ملکی تھے۔ ۹۱—۱۸۹۰ع میں یہ سکول "سنڈیمن سکول" کے نام سے موسوم ہوا۔ ۹۴—۱۸۹۳ع میں اسے مستقل طور پر ہائی کے درجے تک ترقی دے دی گئی۔ نصاب تعلیم پنجاب یونیورسٹی کا رکھا گیا۔ ۸۷—۱۸۸۶ع تک بلوچستان میں صرف تین سکول تھے۔ کوئٹہ، سیوی اور کڑک [ضلع سیوی (سبی)]۔ ان میں طلبہ کی تعداد علی الترتیب پچپن، تینتالیس اور تیرہ تھی۔ کوئٹہ کے اس سکول سے صرف ایک لڑکا مڈل کے امتحان میں شامل ہوا تھا اور وہ فیل ہو گیا۔ امتحان لاہور میں ہوا تھا۔ ۱۸۸۹ع اور ۱۹۰۲ع کے مابین سنڈیمن سکول کوئٹہ سے ایک سو چوبیس طلبہ مڈل کے امتحان میں اور پچاس طلبہ انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۲۹ نومبر ۱۸۸۹ع کو کوئٹہ میں "لیڈی سنڈیمن گرلز سکول" کی بنا ڈالی گئی۔ عمارت کے لیے ایک پارسی سوداگر برجور جی ڈی پٹیل نے پانچ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ سکول کا سنگ بنیاد لیڈی سنڈیمن نے رکھا۔ فورٹ سنڈیمن میں ۱۸۹۲ع میں لڑکوں کا سکول اور ۱۸۹۶ع میں لڑکیوں کا سکول قائم ہوا۔ ۹۳—۱۸۹۲ع میں ان تمام سکولوں میں ایک سو چھیانوے مسلمان طلبہ تھے جن میں سے ایک سو چار بلوچستان کے رہنے والے تھے۔

قلات ڈویژن میں پہلی مرتبہ ۱۹۰۴ع میں بمقام مستونگ طلبہ کے لیے ایک پرائمری سکول قائم ہوا۔ ۱۹۱۸ع میں اسے مڈل سکول بنایا گیا اور ۱۹۳۷ع میں ہائی سکول کا درجہ دیا گیا۔ سب سے پہلا ہائی سکول ہونے کی حیثیت سے اس سکول کو یہ فخر حاصل ہے کہ قلات ڈویژن کے

اکثر تعلیم یافتہ حضرات اسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں ۔ اسے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ سابق بلوچستان میں یہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جس میں قائد اعظم محمد علی جناح ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۵ع کو تشریف لائے اور اپنے قلم سے وزیٹرز بک میں اپنے تاثرات رقم فرمائے ۔ ۱۹۶۱ع میں یہ سکول پائلٹ سیکنڈری سکول کا درجہ حاصل کر کے صوبے کے چند چیدہ مدارس کی صف میں داخل ہو گیا ۔[۱]

مکران میں جدید نمونے کا سکول شاہی تمپ میں بنام کیچ سکول مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۲ع کو کھولا گیا تھا ۔ اس سکول کے بانی پنشن یافتہ سب انسپکٹر پولیس جناب غلام حسین شاہ تھے ۔ ۱۹۲۵—۲۶ع میں پنجگور ، کلاتک اور نصیر آباد میں پرائمری سکول کھل گئے ، اور ۱۹۳۷ع میں تربت پرائمری سکول کو مڈل بنا دیا گیا ۔[۲]

۱۹۳۰ع میں کوئٹہ میں محکمۂ تعلیم کا ایک الگ سپرنٹنڈنٹ متعین ہؤا ،

۱- کتابچہ متعلقہ بہ گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول مستونگ ؛ مطبوعہ مارچ ۱۹۶۵ع ۔

۲- مکران میں اشاعت تعلیم ۔ ''نوکین دور'' کوئٹہ ، مکران نمبر مارچ ۱۹۶۷ع ص ۶۹- میر محمود خان (۱۸۹۳ع - ۱۹۳۱ع) جب انگریزوں کے اشارے پر بحالی امن کے لیے دورۂ مکران پر گئے تو اُن کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا ۔ تربت سے تمپ اور مند جاتے ہوئے جب آپ کلاتک پہنچے تو وہاں کے لڑکوں نے آپ کا استقبال کیا اور ایک نظم پڑھی :

مبارک ہو مبارک ہو تجھے یہ نعمت عظمٰی!

ارے مکراں مبارک ہو

جب نظم ختم ہوئی تو والی قلات میر محمود خاں ایک لڑکے کے قریب گئے اور دریافت کیا کہ تمھارے پڑھنے کا مقصد کیا ہے ؟ بچے نے جواب دیا ''میں پڑھ کر منشی بن جاؤں گا'' (اُن دنوں عدلیہ کا منشی ہونا بہت بڑا اعزاز اور منصب سمجھا جاتا تھا) ۔ ''منشی بنے گا ؟'' خان معظم نے حیرت سے کہا ۔ ''اتنے منشیوں کے لیے جگہ کہاں ہے ؟ تو پڑھنے کے بجائے جنگل سے کاہ لایا کر ۔''

نوکین دور ، کوئٹہ ، مکران نمبر ، مارچ ۱۹۶۷ع ، صفحہ ۷۰ ۔

جس کے تحت برٹش بلوچستان کا سارا علاقہ تھا ۔ قلات کا جداگانہ انتظام تھا ۔ اُس سے قبل سنڈیمن ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر ہی سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن کے فرائض سر انجام دیتا تھا ۔ ۱۹۲۸ء میں پہلی بار مڈل کا امتحان بلوچستان کے محکمۂ تعلیم نے خود لیا ۔ دو سو سات اُمیدواروں میں سے ایک سو سینتالیس کامیاب ہوئے جنھیں محکمے کی جانب سے سندیں دی گئیں اور نارمل سکول میں تیرہ امیدواروں نے تربیت حاصل کی ۔

یوں بدیشی حکومت کے تحت اس اہم ترین شعبے میں رینگ رینگ کر آگے بڑھنے کا جذبہ کارفرما رہا ۔ حتٰی کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا ۔ ۱۹۳۵ء کے زلزلے نے سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ کی عمارت کو تہ و بالا کر دیا ۔ چنانچہ اس حادثۂ عظیم کے بعد یہ سکول کوئٹہ سے تیس میل دور پشین میں منتقل کر دیا گیا اور کوئٹے میں سات سال تک حکومت کا کوئی تعلیمی ادارہ نہ تھا ۔ بالآخر عوام کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر سارجنٹ سکیم کے تحت جولائی ۱۹۴۲ء میں بروس روڈ (موجودہ جناح روڈ) پر سنڈیمن ہائر سیکنڈری سکول کا قیام عمل میں آیا ۔ محکمۂ تعلیم کے انگریز سپرنٹنڈنٹ جے لیچ ولسن نے اس علاقے کے لیے علیٰحدہ انٹر کالج کی بھی اجازت نہ دی ۔ اس سکول کی ہیئت ترکیبی حیران کن اور مضحکہ خیز تھی ۔ اس میں چھٹی سے لے کر بارھویں تک جماعتیں تھیں ۔ گویا یہ مڈل سکول ، ہائی سکول اور انٹر کالج کا ایک عجیب و غریب مجموعہ تھا ۔ تعلیمی لحاظ سے بھی یہ اتحاد نقصان دہ تھا ۔ اساتذہ ایک جانب سکول ٹیچر تھے تو دوسری طرف لیکچرار (کاغذی کارروائی میں اُنھیں سینئر انگلش ٹیچر کہتے تھے) ۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے، کہاں ثانوی مدارس کا انداز تعلیم اور کہاں کالج کے رنگ ڈھنگ ۔ ضبط کے بارے میں بھی یہ دو عملی اکثر ناکامی کا منہ دیکھتی تھی کیونکہ سکول کے بچوں اور کالج کے نوجوانوں کو ایک ہی سطح پر لانا دانشمندی کے خلاف تھا ۔

۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے بعد خوابیدہ آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگیں اور اس ہائر سیکنڈری سکول نے بھی سہانے خواب دیکھنے شروع کیے ۔

چنانچہ سکول کا لبادہ اُتار دیا گیا اور کالج کا لباس زیب تن کرایا گیا ۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں آرٹس کے شعبے میں تھرڈ ایر کلاس کا اجرا ہؤا اور کالج انٹر سے ڈگری ہوگیا ۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی دفعہ اس کالج کے طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان میں شامل ہو کر سات میں سے پانچ کامیاب ہوئے ۔ پرنسپل چودھری عطا محمد کے زمانے (۱۹۵۸ء) میں بی ایس سی جماعتوں کا آغاز ہؤا اور اس طرح یہ کالج مکمل ادارے کا روپ دھارنے میں کامیاب ہوگیا ۔ پرنسپل کرار حسین کے زمانے (۱۹۶۳ء) میں تین مضامین (اُردو ، انگریزی اور معاشیات) میں ایم اے کی کلاسوں کی بھی ابتدا ہوگئی ۔ ۲۲ اگست ۱۹۶۶ء سے یہ کالج دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ۔ انٹر کالج پہلی عمارت (جو جناح ، رضا شاہ پہلوی اور پٹیل سڑکوں کے مقام اتصال پر واقع ہے) میں رہا اور ڈگری کالج سریاب روڈ پر نئی شاندار عمارت میں منتقل ہو گیا جو شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے ۔

گورنمنٹ کالج اس خطے کی علمی ، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور رہا ہے ۔ اس کی متعدد مجالس نے اُردو زبان اور ادب کی ترویج کے لیے خاطر خواہ کام کیا ہے ۔ کالج کے متعدد اساتذہ کی تخلیقات ملک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ اُن میں سے بعض اصحاب مصنفین کی صف میں شامل ہو چکے ہیں ۔

اس درس گاہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے متعدد انجینیئر ، ڈاکٹر ، پروفیسر ، صحافی ، اعلیٰ فوجی اور سول حکام کی حیثیت سے ملک و ملت کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں ۔

چند سال سے کوئٹے کے باہر بھی کالج قائم ہوگئے ہیں ۔ خضدار کا انٹر کالج اسی سال (۱۹۶۷ء) سے ڈگری بن گیا ہے ، باقی چار (مستونگ ، لورالائی، فورٹ سنڈیمن اور سبی) انٹر کالج ہیں ۔

کوئٹہ میں ۱۹۵۱ء میں لڑکیوں کے لیے کالج بنا تھا ، جہاں اب ڈگری تک آرٹس اور سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے ۔

مختصر یہ کہ جب تقسیم ملک ، ون یونٹ اور موجودہ صورت حال کی ایک روشن اور واضح تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو میدان تعلیم

میں پورے بلوچستان کی ترقیات چونکا دینے والے درجے پر پہنچتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے متعدد شواہد موجود ہیں؛ مثلاً بلوچستان بھر میں ہر قسم کے سکولوں نیز آرٹس اور سائنس کے کالجوں کا قیام، عمارتوں کی تعمیر و مرمت پر لاکھوں روپے کا خرچ، تجربہ گاہوں میں ہر طرح کے جدید سامان کی فراہمی، باہر کے فنی کالجوں میں یہاں کے طلبہ کے لیے نشستوں کی تخصیص، تعلیمی وظائف کا فراخ دلی سے بندوبست، خانہ بدوش قبائل کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے متعدد گشتی سکولوں کا افتتاح جو قبائل کی نقل و حرکت کے ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ عملے کا انتظام۔ تقسیم ملک کے وقت کا چار پانچ لاکھ کا سالانہ تعلیمی بجٹ قریباً اٹھارہ بیس گنا ہو گیا ہے۔ طلبہ اور طالبات کی تعداد میں ہزاروں کے حساب سے اِضافہ ہؤا ہے۔ کیا یہ روشن شہادتیں غیر معمولی پیش رفت کا یقین افروز ثبوت نہیں[۱]؟

یوں تو اس خطے کی تعلیمی ترقی میں محکمۂ تعلیم کے مختلف اربابِ حل و عقد نے حصہ لیا لیکن ان سب میں شیخ عبدالصمد (والد بزرگوار جناب شیخ اکرام الحق چیف سیکرٹری حکومت مغربی پاکستان)، شیخ نجم الدین، سید انور علی شاہ، مسٹر بشیر احمد ہاشمی، خان سرور، چودھری محمد صادق، چودھری عطا محمد، شیخ جعفر علی اور ملک عبدالمجید کی خدمات بطور خاص قابل تعریف ہیں۔

بلوچستان کی واحد قومی درسگاہ "اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ" انجمن اسلامیہ نے قائم کی۔ یہ کوئٹہ میں سب سے پہلی اور ثقافتی و مجلسی بہبود

۱- Sadiq, C.M., A note on the Development of Education in Quetta - Region, Quetta 1963.
یہ کتابچہ چوّن (۵۴) صفحوں پر مشتمل ہے۔
"کوئٹہ ریجن میں تعلیمی ترقی" ـــــ نوکین دور، کوئٹہ، یکم جون ۱۹۶۶ء۔

کی قدیم انجمن ہے[1] جو ۱۸۸۸ع اور ۱۸۹۰ع کے درمیانی عرصے میں بنی ۔ انجمن کی داستان بھی بڑی عجیب ہے : اُس زمانے میں جامع مسجد فروٹ مارکیٹ کے سامنے اسی مقام پر تھی جہاں آج بھی ایک جامع مسجد ہے ۔ یہ سب لوگوں کی مشترکہ مسجد تھی مگر رفتہ رفتہ مسجد کے کارکنوں میں بعض مقامی جھگڑوں کی وجہ سے ناچاقی پیدا ہو گئی اور کچھ لوگوں نے ان جھگڑوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے نئی جامع مسجد بنانا چاہی ۔ اس مقصد کے لیے انجمن اسلامیہ حنفیہ اہل پنجاب و ہند کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی ۔ اس کے قیام میں انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر بارنس کا بھی ہاتھ بتایا جاتا ہے ۔ انگریز مقامی باشندوں کے اکثر باہمی تنازعات میں چودھری بن کر آتے اور ایسے فیصلے کراتے جن سے ابتداً ہر طبقے کی تسکین ہوتی ، مگر انھی فیصلوں سے آیندہ کے لیے ناچاقی کی مزید راہیں کھل جاتیں ۔ سابق میونسپل کمشنر حافظ سلیم احمد کے والد محترم حافظ سعید احمد[2] انجمن میں بڑے بارسوخ بزرگ تھے ۔ چنانچہ ان کی کوشش سے انجمن کو مسجد کے لیے زمین دی گئی اور پرانی تحصیل میں منصفی روڈ پر وقف کے طور پر چند دکانیں دی گئیں ۔ بعد میں مسجد کے علاوہ انجمن نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کیا ۔ مسجد کے اندر دینی کتابوں کی ایک عمدہ لائبریری قائم کی گئی ، توغی روڈ پر عیدگاہ تعمیر کرائی گئی اور کانسی

۱۔ ''کوئٹہ میں پون صدی پہلے کی ثقافتی زندگی'' (پمفلٹ) ۔ ۸ جنوری ۱۹۵۹ع صفحات ۸—۱۰ ۔

۲۔ آپ کے دادا میاں فیض محمد علاقۂ مالوہ سے نقل مکانی کر کے جالندھر (مشرقی پنجاب ۔ بھارت) محلۂ قاضیاں میں آ مقیم ہوئے ۔ قاضی صاحب ۱۸۷۳—۷۴ع میں گم شدہ بھائی کی تلاش میں سبی آئے ۔ پہلے وہاں ساجی بہتری کے کاموں میں لگے رہے ، پھر کوئٹہ منتقل ہو گئے اور وادیٔ شال میں گرانقدر خدمات انجام دیں ۔ ۱۹۲۴ع میں انگریز نے انھیں بلوچستان سے چلے جانے کا حکم دیا ۔ ۱۹۲۶ع میں واپس ہوئے ۔ زلزلے کے بعد جالندھر گئے اور ۲۹ جون ۱۹۳۶ع کو فوت ہوئے (پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ فروری ۱۹۴۰ع) ۔

میں قبرستان کے لیے کئی قطعے زمین کے دیے گئے ۔ بعد میں مقامی لوگوں نے اپنے باہمی تنازعے نمٹا لیے اور انجمن کے نام سے 'حنفیہ' اور اس کے بعد 'اہلِ پنجاب و ہند' جاتا رہا ۔ غرض یہ سب لوگوں کی مشترکہ ثقافتی اور مجلسی بہبود کی انجمن بن گئی اور اس کا نام صرف 'انجمن اسلامیہ' رہ گیا ۔ اب تک وہ اسی نام سے مشہور ہے ۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں ''مدرسۃ القرآن'' کے نام سے عین الدین سٹریٹ پر اسلامیہ ہائی سکول کی بنیاد پڑی ۔ پہلے یہ سکول پرائمری درجے تک تھا ، بعد میں موجودہ مقام پر مڈل سکول کی حیثیت سے مسلمانان بلوچستان کی تعلیمی اور مذہبی ضرورتیں پوری کرتا رہا ۔ ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ ہائی سکول قائم ہؤا اور اس کی عمارتوں میں توسیع کی گئی ۔ عربک کالج دہلی کے ایک اُستادِ ریاضی حافظ قطب الدین صاحب اسلامیہ ہائی سکول کے پہلے صدر مدرس تھے ۔

اُس زمانے میں کوئٹے میں نہ تو کوئی سیاسی جماعت تھی اور نہ کسی سیاسی جماعت کا وجود برداشت کیا جا سکتا تھا ۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاسی تربیت اور اخلاقی سدھار کے فرائض بھی انجمن اسلامیہ ہی بجا لاتی تھی ۔ سال میں دو مرتبہ انجمن کے عام جلسے ہوتے تھے ؛ ایک یوم تاسیس پر اور دوسرا میلاد النبیؐ کے موقع پر ۔ یوم تاسیس پر سکول کا جلسۂ تقسیمِ اسناد منعقد ہوتا تھا ۔ یہ تقریب بڑے پُر شکوہ طریقے پر منائی جاتی تھی ۔ میلاد النبیؐ کے جلسے کئی کئی روز تک ہوتے تھے اور ملک کے جیّد علما ان جلسوں سے خطاب کرتے تھے ۔ انھی میں سے ایک میں ''ہمایوں'' کے بانی ، مدیر اور ترکی میں سابق سفیرِ پاکستان میاں بشیر احمد کے والدِ بزرگوار جسٹس شاہ دین مرحوم اور سر سلطان احمد مرحوم نے بھی تقریریں کی تھیں ۔

اُس زمانے میں کوئٹہ میونسپلٹی تو تھی مگر اُس کے ارکان نامزد ہوتے تھے ۔ پہلی منتخب میونسپل کمیٹی ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی ۔ تاہم نامزدگی کے سلسلے میں انجمن اسلامیہ سے باقاعدہ مشورے طلب کیے جاتے تھے ۔ انجمن اسلامیہ نے میکانگی روڈ پر مسافروں کے لیے سرائے بھی بنوائی تھی ۔ آج کل اس سرائے کی زمین پر لیڈی ڈفرن ہسپتال ہے ۔ انجمن

نے سٹورٹ روڈ پر مسلمانوں کے لیے مسلم جیم خانہ تعمیر کرایا ، کیونکہ براؤن جیم خانہ پر زیادہ تر با رسوخ ہندو اور سکھ افسروں کا تسلط تھا ۔ میک موہن پارک بنوانے میں بھی انجمن اسلامیہ نے خاطر خواہ حصہ لیا ۔ لیاقت پارک اور میونسپل پارک بعد میں بنے ۔ اُس زمانے میں اسلامیہ سکول کے طلبہ میک موہن پارک میں کھیلتے تھے ۔

انجمن اسلامیہ نے ایک مرتبہ بازاری عورتوں کے ہسپتال کے سلسلے میں حکومت سے جھگڑا کیا ۔ یہ ہسپتال پیر بخاری کی مسجد کے قریب بنوایا گیا تھا ۔ انجمن نے اس نوعیت کے فواحش کی سرکاری حوصلہ افزائی کے خلاف شدید احتجاج کیا ۔ حکومت نے معاملہ بھانپ لیا اور یہ شرط پیش کی کہ ساڑھے چھ ہزار روپے دے کر زمین اور عمارت خرید لو ، ہسپتال ہٹا لیا جائے گا ۔ انجمن نے اس رقم کے لیے نصیر آباد کے زمینداروں سے چندہ جمع کیا اور مطلوبہ رقم دے کر ہسپتال خرید لیا ۔ بعد میں یہ ہسپتال چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا ۔ انجمن نے سکول کا کاروبار چلانے کے لیے چندے کی رقم سے اوقاف بھی خریدے اور سکول کو خوش اسلوبی سے چلاتی رہی ۔

غرض بلوچستان کی یہ واحد قومی درسگاہ ''اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ'' ۱۹۳۵ء[1] کے زلزلے سے قبل تکمیل کے تمام مدارج طے کر چکی تھی ، لیکن زلزلے نے اس کی عمارت کے ساتھ ہر چیز برباد کر دی ۔ ۱۹۳۹ء میں ایک عارضی عمارت بنا کر اسے از سر نو جاری کیا گیا ۔ چند سال پیشتر عمارت کی حالت نا گفتہ بہ تھی ۔ چنانچہ چودھری محمد سلطان[2] ہیڈ ماسٹر نے انتہائی کاوش سے کام کیا اور اب یہ سکول مختلف اصحاب اور ڈویژنل ترقیاتی بورڈ کے تعاون سے نئی پختہ عمارت میں جاری و ساری ہے ، جو زلزلہ پروف ہے ۔ اس درسگاہ میں جماعت دہم تک دینی تعلیم لازمی ہے جس کی تدریس کے لیے جیّد عالم مقرر ہیں ۔ نصاب میں اسلامی تاریخ ، ضروری

۱- الاسلام ، کوئٹہ ، ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء ۔
۲- یوم آزادی کے موقع پر آپ کو صدارتی میڈل بمعہ تین ہزار روپے نقد دینے کا بھی اعلان ہؤا ہے ، حریت کراچی ، ۲۰ اگست ۱۹۶۸ء ۔

مسائل ، سیرت اور اسلامی تعمیرِ کردار جیسی چیزیں شامل ہیں ۔ دینیات کی تعلیم کے لیے دوسرے مضامین کی طرح سالم پیریڈ وقف کر دیا گیا ہے ۔ صبح کے اجتماع میں وعظ ہوتا ہے ۔ سکول میں انجمن اسلامیہ کی جانب سے اس شعبے کے ذریعے سیرت النبی صلعم پر جلسے ہوتے رہتے ہیں جن میں مقامی اور بیرونی علما شرکت فرماتے ہیں اور سکول کے طلبہ بھی حصہ لیتے ہیں ۔ سکول میں درجہ وار ادبی مجلسیں قائم ہیں جو اساتذہ کے زیر نگرانی ہفتہ وار تربیتِ تحریر و تقریر کے فرائض انجام دے رہی ہیں ۔ ان مفید سرگرمیوں سے یقیناً اردو زبان و ادب کی خدمت بھی ہو رہی ہے ۔

۱۹۳۳ء سے پہلے علاقہ جھل مگسی میں تعلیم کا کوئی خاص انتظام[1] نہ تھا ۔ صرف چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ، جو قاضیِ جھل سے صرف فارسی پڑھے ہوئے ہوتے تھے ۔

جب سردار محمد یوسف علی خان ، قوم مگسی کے سردار ہوئے تو علاقے کی تعلیمی پستی کو محسوس کرتے ہوئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جھل میں "جامعۂ یوسفیہ" کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔ پنجک اور کوٹ یوسف علی میں پرائمری سکول جاری کیے ، غریب اور نادار بچوں کے لیے دارالاقامہ قائم ہؤا ، جہاں قیام اور خوراک کا انتظام جامعہ کی طرف سے تھا ۔ پانچ سے نو سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے جبری تعلیم کا حکم جاری کیا اور آمدنی کا دسواں حصہ تعلیم پر خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ۔ علاقے کی تعلیم کے انتظام کے لیے ایک علیحدہ افسر مقرر ہؤا جسے "ناظم جامعہ یوسفیہ جھل" کہتے تھے ۔ "ینگ بلوچستان" کراچی[2] میں "جامعہ اسلامیہ عزیزیہ اور جھل کا شاندار مستقبل" کے تحت مندرج ہے :

"عرشیاں را صبح عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشم ملتے
عرب کے زمانۂ جاہلیت کی یاد تازہ کرنے والا جھل ، نہ صرف

۱- جغرافیۂ علاقۂ مگسی ، مرید حسین خان مگسی ، لاہور ۱۹۳۹ء ، صفحات ۲۴ ، ۲۵ ۔

۲- سہ روزہ ینگ بلوچستان ، کراچی ، ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء ۔

جہل بلکہ حقیقی معنوں میں جہل مرکب تھا ۔ یہاں کے باشندے شراب ، بھنگ ، افیون اور چرس جیسی نجس و ناپاک منشیات کے علاوہ دنیا جہان کی برائیوں میں مبتلا تھے ، لیکن قدرت کے نہ بدلنے والے قانون نے ان کو تحت الثریٰ تک پہنچنے سے پہلے چونکا دیا ۔ علاقے کا بچہ بچہ اپنی کھوئی ہوئی اور زنگ آلود قوتوں کو صیقل کرنے کے لیے میدان عمل میں کود پڑا ۔ بھلا قدرت کا اس سے بڑھ کر اُن پر اور کیا احسان ہو سکتا تھا کہ اُن کو نواب محمد یوسف علی خاں جیسے مرد مجاہد کی قیادت نصیب ہوئی ۔ انھوں نے ان تمام خلافِ شرع رسموں کو ، جن کے باعث قوم کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں ، اس احتیاط کے ساتھ پیوند خاک کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک سر نہ اُٹھا سکیں گی ۔ آپ نے (نواب یوسف علی خاں نے) اپنی قوم کو مہذب اور شائستہ بنانے کے لیے نصف لاکھ کے ذاتی مصرف سے جامعہ کی بنیاد رکھی ، جہاں قوم کے بچے دینی اور دنیاوی تعلیم کے علاوہ علوم جدید سے بھی خاطر خواہ طور پر بہرہ مند ہو رہے ہیں ۔''

یوسف عزیز بذات خود جامعہ میں معائنے کے لیے جاتے ، تعلیمی حالت کا جائزہ لیتے اور رائے بک میں عملی ترقی اور عام معیار کی بلندی کے لیے تجاویز قلم بند فرماتے ، جن کا مطالعہ آج بھی مفید ہو سکتا ہے اور وہ موجودہ نظام تعلیم میں بروے کار لائی جا سکتی ہیں ۔ اس جامعہ کے لیے نصاب ، پنجاب کی طرح تیار کرائے گئے ، دینیات کو ضروری مضمون قرار دیا گیا ۔ مولانا عبدالکریم ایڈیٹر ''میزان'' کوئٹہ بھی اس جامعہ کے ناظم رہے ۔ مشہور عالم دین حاجی کینجہ ساکن ہرات (افغانستان) بھی یہاں اُستاد تھے ۔

اس جامعہ کے ''ابتدائی مدارس کا نصاب[1] تعلیم'' یا تخیل ، دستور العمل

۱۔ ''جامعۂ اسلامیہ عزیزیہ کے ابتدائی مدارس کا نصاب تعلیم'' ۔ کراچی اگست ۱۹۳۴ء ۔

اور نظام مولانا عبدالکریم ناظم تعلیمات جھل نے مرتب کیا تھا۔ یہ دستور العمل ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ پمفلٹ (سائز "8.2 × "6.1) چوالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔

"ابتدائے مدارس" کے تحت مرتب نے لکھا ہے:

"نصاب تعلیم کی تجویز فنِ تعلیم کا ایک اہم اور مشکل ترین معاملہ ہے۔ اس کی عقدہ کشائی کے لیے بعض صورتوں میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مجوزہ نصاب تعلیم کو ناخن تدبیر کی حیثیت دے کر کوشش کی گئی ہے کہ باوجود اختلافِ کوائف ملکی اور تباینِ فضائے ادبی و اخلاق جامعۂ عزیزیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی تطبیق جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نصاب سے ہو جائے۔"

"تعلیم" کے عنوان سے جامعہ کے اساتذہ سے خطاب کیا گیا ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے:

"تعلیم کا زبردست مدعا تربیت اخلاق، اصلاح اعمال و عادات، تصحیح عقائد، متانت نفس اور حسن عمل ہے۔ عالمِ بے عمل مثل کورِ مشعلہ دار اسی لیے کہا گیا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی اس رباعی سے انسان درس حکمت حاصل کر سکتا ہے:

علم چندانکہ بیشتر خوانی چوں عمل در تو نیست نادانی
نہ محقق شود نہ دانشمند چار پائے برو کتابے چند"

اس حصے میں اُستاد کے فرائض بتائے گئے ہیں، پھر یہ کہ اُسے کس طرح طلبہ کی اصلاح کرنی چاہیے؟ اس کے مختلف طریقے درج ہیں۔ مثلاً:

"سچ کی عادت پیدا کرنے کے لیے سچ بولنے والے بچے کو انعام دیا جائے تاکہ دوسرے بچوں میں بھی سچ کی ترغیب اور رشک پیدا ہو۔ ہم مکتب اور ہم جماعت بچوں میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کرنی چاہیے۔ اس کے لیے وقتاً فوقتاً کسی بیمار بچے کی عیادت کے لیے اُستاد کا مع اپنی جماعت کے طلبہ کے جانا مفید نمونہ رہے گا یا میدانِ کھیل میں کسی پیاسے بچے کو خود اپنے ہاتھ سے پانی پلائے یا کسی چوٹ کھائے ہوئے بچے کو خود اُٹھا لے، اپنے

دامن سے ہوا دے ، اس کی دل جوئی کرے ۔ اس طرح بچوں میں ہمدردی اور محبت پیدا ہوگی ۔

نماز کی پابندی میں بچوں کو پختہ کیا جائے ۔ نماز سے ظاہر و باطن کی صفائی حاصل ہوتی ہے ۔ اس سے بڑھ کر نماز کی تعریف بچوں کے دلوں میں یہ بٹھا دی جائے کہ ''ان الصلٰوۃ تنہٰی عن الفحشاء و المنکر ۔'' اس کام کے لیے صرف دینیات کا اُستاد خاص توجہ نہ کرے بلکہ تمام اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ مل کر ہر وقت اس فکر میں محو رہیں اور اس کی طرف خاص توجہ دے کر دینی و دنیوی سرخروئی حاصل کریں ۔''

نصاب جامعہ کی چند کتابیں یہ تھیں :

۱۔ ''اُردو قاعدہ'' ۔ مرتبہ محمد عبدالرحمٰن ضیا ۔۔ خاص کوشش سے جامعہ کی ابتدائی جاعت کے بچوں کے لیے تیار کیا گیا تھا جو پچاس صفحوں پر مشتمل تھا

۲۔ ''اُردو کی پہلی کتاب درسیہ عثمانیہ'' ۔ مرتبہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) ۔ (مختلف جاعتوں میں مختلف حصے)

۳۔ '' ہمارے نبیؐ''۔ شائع کردہ جامعہ ملیہ دہلی ، بطور اُردو علم ادب ۔

۴۔ ''مخزن حساب''۔ (مختلف حصے مختلف جاعتوں میں) خواجہ دل محمد ایم اے

۵ ، ۶۔ ''اتالیق'' (اچھی نظموں کا مجموعہ) اور رسالۂ دینیات (سلسلہ وار) شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۷۔ ''جغرافیۂ عزیزیہ'' ، مرتبہ محمد عبدالرحمٰن ضیا

۸۔ ''جغرافیۂ بلوچستان'' ، مصنفہ شیخ عبدالصمد

۹۔ '' گلدستۂ قواعد '' ، مصنفہ محمد عبدالرحمٰن ضیا

۱۰۔ '' پہاڑہ عزیزیہ '' ، مرتبہ ضیا

۱۱ ، ۱۲۔ '' گلدستۂ جغرافیہ'' ، (مختلف حصے) ''جغرافیۂ ہندوستان''۔ مرتبۂ محمد عبدالرحمٰن ضیا ۔

۱۳۔ '' جغرافیۂ ہند و دُنیا '' ، مرتبۂ محمد دین بی اے

۱۴۔ ''چار یار''، مرتبہ الیاس مجیبی
۱۵۔ ''کمک اُردو''، مولوی محمد اسماعیل
۱۶۔ ''سرکار دو عالمؐ''، (بطور تاریخ اسلام)
۱۷۔ ''خلفائے اربعہ''، (بطور اُردو و ادب)
۱۸۔ ''قرآن کریم'' کے ایک منتخب حصے کا ترجمہ، مرتبۂ سعید انصاری، شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
۱۹۔ ''اچھی باتیں'' یعنی خلاصۂ حدیث، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی

علاوہ ازیں جامعہ کے اس دستور العمل[۱] میں عمارات جامعہ، حاضری، دار الاقامہ، ناظر کے فرائض، جامعہ کا سال تعلیم اور تعطیلات، اوقات تعلیم جامعہ، فرائض مدرسین جامعہ، فرائض ناظر جامعہ، بچوں کی مرکزی دکان، کھیلیں، مہتمم و ناظر جامعہ کے فرائض، وظائف، سالانہ جلسہ اور امیر الجامعہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

جامعہ میں انگریزی، عربی اور فارسی مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ یہاں دو پرچوں کے نمونے دیے جاتے ہیں[۲] جن سے جامعہ کی کارکردگی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ پرچے ۱۵ اپریل ۱۹۳۴ء کے آزمائشی امتحان میں دیے گئے تھے:

پرچۂ تاریخ۔ جماعت ابتدا سوم

وقت دو گھنٹے — نمبر ۵۰

۱۔ اصحاب فیل کا واقعہ بیان کرو؟ کب ہؤا؟ کہاں ہوا؟ قرآن شریف سے اس واقعے کا استنباط کرو۔
۲۔ اپنے مذہب کے بانی کا مختصر حال بیان کرو؟ نیز یہ بھی بیان کرو کہ آپؐ کے والد اور والدہ کا انتقال کب ہؤا؟ والدین کے

۱۔ جامعہ اسلامیہ عزیزیہ کا دستور العمل۔ صفحات ۴۲–۴۴۔
۲۔ بلوچستان جدید، کراچی، ۸ جون ۱۹۳۴ء۔

انتقال کے بعد آپؐ کی پرورش کس نے کی ؟

۳- بی بی خدیجۃ الکبریٰ کا نکاح ہمارے نبی (علیہ الصلوٰۃ و السلام) سے کیوں کر ہوا ؟ یا کیسے ہوا ؟

۴- تاریخ کسے کہتے ہیں ؟ تاریخ سے کیا فائدے ہیں ؟ ثبوت دے کر بیان کرو - ''لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا مطلب ایسی آسان عبارت میں لکھو کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ جائے ؟ نیز یہ بھی بیان کرو کہ ہمارے نبی صلعم نے دنیا میں رہ کر کیا کیا کام کیے -

۵- نبی صلعم پر درود و سلام بھیجنے کا قصہ قرآن شریف سے ثابت کرو - نیز آپ کے خاتم النبیین ہونے کے ثبوت میں قرآنی آیات پیش کرو -

پرچہ تاریخ - جماعت پنجم

وقت دو گھنٹے　　　　　نمبر ۵۰

۱- حضرت محمدؐ کی پیدائش کا حال مفصل بیان کرو اور صحیح تاریخِ پیدائش کا حوالہ دو -

۲- حضرت محمد صلعم نے تجارت کب شروع کی ؟ کیونکر شروع کی ؟ تجارت سے آپ کو کون سا ایسا فائدہ ہوا جس کو اگر تاریخی فائدہ کہا جائے تو بجا ہے ؟ آپ کی تجارت سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ؟

۳- انجمن حلف الفضول کا مقصد کیا تھا ؟ یہ انجمن کہاں بنائی گئی ؟ اس انجمن کے مقاصد مفصل طور پر بیان کرو -

۴- خانۂ کعبہ کی دیواروں کی تعمیر پر کون سا تاریخی واقعہ وقوع میں آیا ؟ حجر اسود کو کونے میں کس نے لگایا ؟ اس کے متعلق مفصل بیان کرو -

۵- آپ کو پہلا الہام کس وقت ہوا اور کہاں ہوا ؟ اس کا آپ پر کیا اثر ہوا ؟ پہلا الہام کیا تھا ؟

۶- بی بی خدیجۃ الکبریٰ کون تھی ؟ پہلے الہام کے وقت بی بی صاحبہ نے حضرت رسول مقبول صلعم سے کیا بیان کیا ؟

۷- ورقہ بن نوفل کون تھے ؟ الہامِ اول پر اس نے حضرت رسول مقبول صلعم کی کیسے تسلی کرائی ؟ مفصل بیان کرو۔

۱۹۳۴ء میں ایک نظم بہ عنوان ''جامعۂ عزیزیہ'' جھل کے طلبہ[1] سے چھپی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے :

شعاعِ علم سے روشن کرو تم اپنے سینے کو
تمھیں ہے ڈھونڈنا اک گم شدہ قومی دفینے کو

عزیزی جامعہ ہے در حقیقت دولتِ نایاب
کچھ اس کے سامنے سمجھو نہ قاروں کے خزینے کو

نہ جانے پائے ہاتھوں سے ذرا ہشیار ہو رہنا
کہ وہ انمول ہے، پایا ہے تم نے جس نگینے کو

یہ پُر اعجاز صنعت ہے، اسے اچھی طرح سیکھو
بنانا ہے تمھیں گوہر بلوچوں کے پسینے کو

کرو صد جانفشانی سے سبق اسلام کے ازبر
اسی توشے کو لے کر چل سکوگے تم مدینے کو

چھپا کب تک رہے گا آہ ! جھل کے تنگ گوشے میں
سرِ بازار لاؤ حسن ''یوسف'' کے خزینے کو

سردار محمد یوسف علی خاں عزیز نے ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں وفات پائی۔ پھر ان کے بھائی میر محبوب علی خاں تمندار مگسی بنائے گئے۔ اُنھوں نے جامعۂ عزیزیہ (یا یوسفیہ ــــــ یوسف کے نام پر یا اُن کے تخلص عزیز کے نام پر) کی سرپرستی فرمائی۔

میر مرید حسین خاں مگسی موضع شیر گڑھ (ضلع ملتان) میں پیدا ہوئے - ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ملتان سے میٹرک پاس کیا۔ جب یوسف عزیز ملتان میں قیام پذیر تھے تو مرید حسین ایمرسن کالج ملتان

۱- ینگ بلوچستان، کراچی، ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء -

میں تعلیم پا رہے تھے ۔ یوسف عزیز سے تعارف کا نتیجہ یہ ہؤا کہ میر صاحب آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے اجلاس منعقدہ جیکب آباد (۱۹۳۲ع) میں رضاکارانہ طریق پر پیش پیش رہے اور مذکورہ کانفرنس کی پوری روداد ضبط تحریر میں لا کر شائع کرائی ۔ اُن دنوں میر مرید حسین اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے کے طالب علم تھے ۔ آپ نے عزیز مرحوم کی تحریک پر لاہور میں بلوچستانی بلوچ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے قیام میں حصہ لیتے ہوئے مذکورہ ایسوسی ایشن کی سیکرٹری شپ کے فرائض انجام دیے ۔ ۱۹۳۴ع میں آپ نے بی اے کا امتحان دے کر ۱۹۳۷ع میں ایل ایل بی کی ڈگری لاء کالج لاہور سے حاصل کی ۔ چونکہ آپ عزیز مگسی مرحوم کے دست راست تھے ، اس لیے اُن کی وفات کے بعد آپ جھل مگسی میں مقیم ہو گئے اور سردار محبوب علی خاں مگسی کے انتظامی امور میں ان کے مشیر کار رہے ۔ ساتھ ہی ''جامعہ یوسفیہ جھل'' کے ناظم بھی رہے ۔ اسی دوران میں آپ نے علاقۂ جھل کا جغرافیہ مرتب کیا جس کا نام ہے ''جغرافیہ ـــــ علاقۂ مگسی ریاست قلات (بلوچستان) مع اصطلاحات جغرافیہ و تاریخی حالات قوم مگسی ۔'' یہ ۱۹۳۹ع میں لاہور میں چھپا ۔ پینتالیس صفحوں پر مشتمل ہے ۔ اس کے ملنے کا پتا مکتبۂ جامعۂ یوسفیہ جھل بلوچستان تھا ۔ علاقۂ مگسی کا نقشہ ، نیز ''بانیِ جامعہ یوسفیہ'' یعنی سردار محمد یوسف علی خاں مگسی مرحوم کا فوٹو بھی (اچکن اور ٹوپی میں) شامل کتاب ہے ۔ کتاب انھی کے نام نامی سے معنون ہے ۔ مطالب کو سلیس اور آسان لفظوں میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

مرید حسین خاں مگسی علم و ادب ، خصوصیت سے تاریخ کے نہایت دلدادہ ہیں اور اپنی تاریخی تحقیقات کے نتیجے میں ''مگسی قبائل'' پر ایک مبسوط مقالہ بھی لکھ چکے ہیں جو ''بلوچی دنیا'' ملتان میں ماہ جون ۱۹۶۳ع کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے ۔

جہاں ''جامعۂ یوسفیہ'' نے اس پس ماندہ علاقے کے تعلیمی سلسلے میں ایک عام بیداری پیدا کر دی اور تعلیم کو اتنا ہی لابدی سمجھا جانے لگا جتنا کھانے پینے ، نہانے اور دھونے کو تصور کیا جاتا تھا ،

وہاں اس جامعہ نے اُردو زبان و ادب کی اشاعت میں بھی اپنا حق ادا کیا۔
زلزلے سے پیشتر مولانا عبیداللہ خان بلوچ نے محلہ اسلام آباد کوئٹہ میں ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی تھی جس کا نام مدرسۃ البنات تجویز ہؤا - چھوٹے بچے اور بچیوں کا یہ مدرسہ دینی اور علمی نقطۂ نگاہ سے قائم کیا گیا تھا - نصاب ایسا کہ بچوں میں تہذیب اور احساس کو فروغ ہو اور پورا نصاب یکسر اُردو کتب پر مشتمل تھا - مولانا عبیداللہ خاں بلوچ کو نواب یوسف علی خاں عزیز سے والہانہ اُنس تھا - آپ انگلینڈ سے واپسی پر کوئٹہ آئے تو ''مدرسۃ البنات'' میں بھی آنا منظور فرمایا - بچیوں نے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے ان اشعار سے اُن کا خیر مقدم کیا :

مبارک ہو یوسف علی خاں کی آمد
گلستاں میں فصل بہاراں کی آمد
گل و لالہ و ارغواں کو مبارک
برستے ہوئے ابر نیساں کی آمد
بلوچوں سے کہہ دو کہ ڈالے گی ہلچل
شغالوں میں شیرِ نیستاں کی آمد

مدرسے میں بچیوں کو اپنے مشاہیر کی کئی ایسی عمدہ نظمیں یاد تھیں جن کی گونج کوئٹہ کے گلی محلوں میں سنی جانے لگی تھی - دفعتہً ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو زبردست زلزلہ آیا جس سے انسانوں کی یہ جیتی جاگتی آبادی چشم زدن میں کھنڈروں کا وسیع انبار بن گئی -

زلزلے کے بعد توغی روڈ (بالمقابل عید گاہ) پر مدرسۃ البنات کا دوبارہ اجرا اپنی عمارت میں ہؤا - ذریعۂ تعلیم اُردو تھا - اس مدرسے کے ذریعے سے بھی بلوچستان میں اُردو کی اشاعت کو فائدہ پہنچا - یہ سرگرمیاں ۱۹۴۲ء کے اوائل تک رہیں[1] - آج کل یہی مدرسہ کراچی میں جاری ہے -

یہ ایک خالص اصلاحی ادارہ تھا جس کے مقاصد بقول بیگم مولانا عبید اللہ

۱- بلوچستان میں اردو (غیر مطبوعہ مضمون) از عبیداللہ خاں ، کراچی ، تحریر ۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء -

یہ تھے : ''ہم مسلمانوں کے گھروں کو پھر اسلامی گھرانے بنانا چاہتی ہیں ۔ اسی لیے دختران اسلام میں قرآن کی عملی تعلیمات کی روح پھونکنا نہایت ضروری ہے ۔'' محترمہ اہلیہ سید انور علی شاہ ایجوکیشن انسپکٹر نے آپ کو مشورہ دیا تھا : ''سرکاری امداد سے اصل مقصد فوت ہو جائے گا کیونکہ سرکاری سکولوں کا نصاب تعلیم رائج کرنا پڑے گا جس سے خالص اسلامی تعلیم نہ ہو سکے گی ، اس لیے پبلک سے امداد کی کوشش کریں[۱] ۔''

بلوچستان میں انگریزوں کے زمانے ہی سے ان تعلیمی اداروں میں اُردو زبان پڑھائی جا رہی ہے ۔ اس سلسلے میں بعض اساتذہ نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ۔ اُن میں سے ابتدائی دور کے دو اُستادوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے :

۱ ۔ مولانا ممتاز علی صاحب[۲] قصبہ انبیٹھ ضلع سہارنپور سے ۱۸۸۵ع میں کوئٹہ تشریف لائے تھے ۔ عالم دین تھے ، سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ میں السنۂ شرقیہ کے مدرس تھے ۔ اس کے علاوہ گھر پر بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا ۔ جنگ کا زمانہ تھا ، جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے ۔ اُن کا خاندان اب تک یہیں آباد ہے ۔

---

۱ ۔ الفاروق ، کوئٹہ ، ۷ اگست ۱۹۴۱ع ۔

۲ ۔ مولانا ممتاز علی صاحب کے فرزند مولانا منیر الدین احمد نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود علم و ادب کی بڑی خدمت انجام دی ۔ وہ کوئٹہ کی انجمن اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے ۔ ان کی وجہ سے یو پی (انڈیا) سے ہر سال چوٹی کے علماء کوئٹہ آتے تھے اور ہزاروں لوگوں کے مجمع میں اردو میں تقریریں کرتے تھے ۔ ویسے بھی گھر پر ملنے کے لیے ہر پیشے و ہر طبقے کے لوگ آتے تھے اور ان کے علم کے ساتھ ان کی زبان سے بھی متاثر ہوتے تھے ۔

مولانا ممتاز علی کے پوتے مسعود احمد انصاری نے ۱۹۴۵ع میں ''علی گڑھ بک سٹال'' کے نام سے مشن روڈ کوئٹہ پر کتابوں کی ایک دکان قائم کی اور اس دکان نے شائقین علم کو اردو کی معیاری کتابیں ملک کے کونے کونے سے تلاش کر کے مہیا کیں ۔ آپ یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں ۔

۲ - مولانا ممتاز علی کے ریٹائر ہونے پر مولانا حکیم عبدالرحیم انصاری سنڈیمن سکول میں عربی اور اردو کے مدرس مقرر ہوئے - مولوی صاحب پچھلے سال (۱۹۶۶ع) تک کوئٹہ میں طبابت کرتے رہے - وہ ۱۹۴۲ع سے پنشن پا رہے تھے - اُن کے شاگردوں میں بعض بڑے اونچے عہدوں پر فائز ہیں اور بعض مجلسی و سیاسی زندگی میں اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں - ان میں مغربی پاکستان کے موجودہ گورنر جناب محمد موسیٰ خاں اور ان کے دو بھائی مرحوم سردار محمد عیسیٰ خاں اور سردار محمد اسحاق خاں ، سابق مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری قاضی محمد عیسیٰ اور ان کے دو بھائی قاضی موسیٰ مرحوم اور قاضی محمد اسماعیل مرحوم قابل ذکر ہیں -

بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں جو کورس رائج رہے ، وہ وہی تھے جو پنجاب یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں اور اسکولوں میں مروج تھے (ویسے اب تک کم و بیش یہ سلسلہ جاری ہے) - پھر بھی اردو میں جو چند نصابی اور[1] غیر نصابی کتابیں یہاں لکھی گئیں ، ان کا ذکر کیا جاتا ہے -

۱ - **کام کی باتیں :** مرتبہ خان محمد سرور خاں ، اٹھاسی صفحات - بی اے ہاشمی سپرنٹنڈنٹ سر رشتہٴ تعلیم بلوچستان نے فیروز پرنٹنگ ورکس ۳۶۵ سرکلر روڈ لاہور سے چھپوا کر کوئٹہ سے شائع کی -

بی - اے ہاشمی نے تعارف میں لکھا ہے :

> ”یہ کتاب اس غرض سے نہیں لکھی گئی کہ بچوں کو محض نصاب کے طور پر پڑھائی جائے ، پھر الماری کی زینت بن جائے ، بلکہ اس کی اشاعت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ اساتذہ اسے وقتاً فوقتاً ہدایت نامے کے طور پر پڑھتے اور پڑھانے رہا کریں اور اس کے اسباق کو روزمرہ کا معمول بنا لیں - ایسا معمول جو بچوں کے لیے نمونہ ثابت ہو سکے- یہی نہیں بلکہ فرصت کے اوقات میں اگر اساتذہ ان باتوں کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے اور اُنھیں سمجھانے کو

۱- دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جناب بشیر احمد ہاشمی سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن ، بلوچستان نے اس جانب خصوصی توجہ کی تھی -

بھی اپنے دیگر تعلیمی فرائض میں سے ایک نہایت ضروری اور خوش گوار فرض قرار دے لیں تو یہ چیز یقیناً بلوچستان کی پسماندہ آبادی کی ایک اہم خدمت ہو گی۔''

اس کتاب میں بلوچستان کی گھریلو زندگی، عادات، رسم و رواج اور طریقِ حکومت کے متعلق بچوں کو ضروری اور کار آمد باتیں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ جسمانی صحت اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی ضروری ہدایات درج کی گئی ہیں۔

''ہماری رسمیں'' کے تحت چند اہم اچھی بری رسموں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان بری رسموں کے مٹانے کا سب سے زیادہ موزوں علاج یہ بتایا ہے کہ علم پھیلایا جائے۔ مصنف نے جن مختلف رسوم کا ذکر کیا ہے، اُن میں سے دو تین کا ذکر یوں ہوتا ہے:

عیادت

''عیادت، یعنی بیمار پُرسی بہت اچھی رسم ہے، مگر جس طرح ہمارے ملک میں جاری ہے وہ حد درجہ نقصان دہ ہے۔ مریض کے عزیز اور دوست اکٹھے ہو کر جاتے ہیں۔ اکثر حسب توفیق شیرینی وغیرہ ہمراہ لے جاتے ہیں اور مریض کے ارد گرد اُس کی چارپائی کو گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اول تو ہمارے مکانوں میں ہوا کی آمد و رفت کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا اور جو تھوڑی بہت ہوا ہوتی ہے، وہ بھی رک جاتی ہے جس سے مریض کو گھبراہٹ ہوتی ہے اور بیماری کے بڑھنے کا خوف۔ اس بھیڑ کے شور و شر سے بھی مریض کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ بیماری کے متعلق ان کی مختلف رائیں بیمار کی قوت ارادی کو کمزور کر دیتی ہیں اور اس کے تندرست ہونے کی صلاحیت کو مٹا دیتی ہیں۔ یہی نہیں، اگر مریض چھوت کی کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ بیماری گھر سے نکل کر سارے گاؤں کو گھیر لیتی ہے۔ تمھیں (طلبہ سے خطاب) اس بد رسم کے روکنے میں کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن روکنے کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ لوگ بیمار پُرسی ہی

چھوڑ دیں - نہیں ، بلکہ اُنھیں چاہیے کہ شیرینی کے بغیر الگ الگ جائیں - اس کا ترک کرنا ملک کی غریبی کے لحاظ سے بھی ضروری ہے[1] -"

حال پُرسی

بلوچستان کے لوگ دور دور کے مقامات پر رہتے ہیں - ملکی اور قومی حالات معلوم کرنے کے لیے کوئی خاص ذریعہ نہیں - نہ چٹھی ، نہ خط ، نہ ڈاک ، نہ تار - ان حالات میں قبائلی لڑائیوں ، موسمی حالات ، مثلاً بارش باراں ، غلہ اور دوسری چیزوں کے نرخ وغیرہ کے حالات وہ حال احوال کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں - چنانچہ بلوچ قوموں میں یہ رواج اس قدر عام ہے کہ راہ چلتے ہوئے مسافروں کو بھی "حال لینے" کے بغیر چھوڑا نہیں جاتا - مقامی ضروریات کے تحت یہ رسم یقیناً مفید ہے ، لیکن بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی جو اس رسم سے آگاہ نہیں ہوتے "حال دینے" پر مجبور کیا جاتا ہے اور بعض اوقات یہ امر تضیع اوقات کا باعث بھی بن جاتا ہے[2] -"

ننوات یا مَرکہ

"جہاں بلوچستان کے قبائلی لوگوں میں انتقام لینے کا جذبہ موجود ہے وہاں رواداری اور فراخ دلی کی بھی کوئی کمی نہیں - بعض اوقات قتل اور خون کے معاملوں میں قاتل اور خونی مقتول کے وارثوں اور عزیزوں کے گھر جا کر معافی کے خواستگار ہوتے ہیں - اندازہ کیجیے کہ ایک شخص کے عزیز بھائی ، باپ یا بیٹے کا قاتل خون کا جرم تسلیم کرکے معافی کا طالب ہوتا ہے -"

بلوچستانی لوگوں کی اس انسانیت اور بلند حوصلگی کا اندازہ کیجیے کہ اُس خونی اور اُس قاتل کو بھی ، جس کا خون پینے

۱- کام کی باتیں ، صفحہ ۶۸ -
۲- کام کی باتیں ، صفحہ ۷۱ -

کے لیے اُس کے عزیز و اقرباء ہر وقت بیتاب رہتے ہیں، معاف کر دیا جاتا ہے[۱]۔"

اس کتاب کا انداز بیان اُلجھاؤ سے پاک ہے۔ سادگی اور دل نشینی کا مرقع معلوم ہوتی ہے۔ "کام کی باتیں" سلسلۂ مطبوعات محکمۂ تعلیم بلوچستان کی پہلی کتاب ہے۔ یہ طلبہ اور والدین کے علاوہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ہے۔

۲۔ **ابتدائی تدریس**: از سید انور علی شاہ۔ ایک سو دس صفحات۔ اقبال سٹیشنری مارٹ شارع لیاقت کوئٹہ نے شائع کی۔

بی۔ اے ہاشمی سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن بلوچستان (جو بعد میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے) نے مارچ ۱۹۴۴ء میں دیباچے میں لکھا: "زبان کی تدریس کے لیے ہر علاقے کی ضرورت کو زیر نظر رکھ کر طریقۂ تدریس کا تعین ضروری ہوتا ہے، لیکن بالعموم ہمارے مدرسین کی توجہ ابھی تک اس امر کی طرف مبذول نہیں کی گئی۔

یہ کتابچہ اسی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معرضِ تحریر میں آیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ صوبۂ بلوچستان کے پرائمری مدارس میں اُردو پڑھانے والے مدرسین کی راہنمائی کرے[۲]۔"

اس کتاب کے پہلے باب[۳] میں اُردو کی اہمیت اور اُس کو سکھانے کے لیے صحیح طریقۂ تعلیم کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ بلوچستان کے مختلف حصوں میں مختلف قومیں آباد ہیں جن کی زبانیں جدا جدا ہیں۔ صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو سب قوموں اور سب حصوں میں ایک جیسی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہ زبان بہت وسیع ہے اور اس میں ہر قسم کے علوم کے لیے بہت سے الفاظ موجود ہیں۔ اسی لیے لوگوں کو اس کے سیکھنے کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔ جبھی ملکی علما یہ کہتے ہیں کہ "آج کل اردو کا سیکھنا دنیاوی کاروبار کے لیے ہی نہیں بلکہ دینی تعلیم کے لیے بھی

۱۔ کام کی باتیں، صفحہ ۲۷۔
۲۔ ابتدائی تدریس، صفحہ ۳۔
۳۔ ابتدائی تدریس، صفحات ۷، ۹۔

ضروری ہے''، کیونکہ جس قدر دینی کتابیں آئے دن اردو میں چھپتی رہتی ہیں، اتنی شاید ہی کسی اور زبان میں چھپتی ہوں - دفتری کاروبار، لین دین، خط و کتابت کے علاوہ تعلیمی نصاب میں بھی اسے ایک اہم رتبہ حاصل ہے - اسی لیے اساتذہ کو یہ زبان سکھانے کے لیے اس کے صحیح طریقۂ تدریس سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تا کہ تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں طلبہ میں اردو کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کر سکیں -

دوسرے باب[1] میں مصنف نے لکھا ہے کہ کسی زبان کے طریقۂ تدریس کو صحیح طور پر معین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے متعلق اول یہ دریافت کر لیں کہ :

ا- آیا وہ علاقے کی مادری زبان ہے ؟ یا

ب- وہ اجنبی زبان ہے ؟ یا

ج- وہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود اجنبی زبان نہیں -

ان تینوں حالتوں میں سے جو حالت اردو کی بلوچستان میں ہے اسی کے مطابق اس کے سکھانے کا طریقہ بھی ہونا چاہیے - صاف ظاہر ہے کہ اُردو بلوچستان کے کسی علاقے کی مادری زبان نہیں لہٰذا بلوچستان بھر کے سکولوں میں اُردو کی تدریس کا طریقہ وہ ہوگا جو ایک غیر زبان کو سکھانے کے لیے ہوتا ہے، یعنی اُردو پڑھنے لکھنے کی ترکیب سکھانے کے ساتھ ساتھ زبان سکھانے پر بھی زور دیا جائے گا - رہا زبان کی اجنبیت کا سوال تو اس بارے میں بلوچستان کے شہری اور دیہاتی علاقوں میں یہ فرق ہے کہ شہری علاقوں کے لیے اُردو غیر زبان ہونے کے باوجود اجنبی نہیں ہے، لیکن دیہاتی علاقوں کے بچوں کے لیے یہ بہت حد تک اجنبی زبان ہے، کیونکہ ان کو اس کے سننے اور بولنے کے موقعے بہت کم ملتے ہیں - چنانچہ شہری اور دیہاتی علاقوں کے طریقۂ تدریس میں یہ فرق ہوگا کہ دیہاتی علاقوں میں اُردو گفتگو پر نسبتاً زیادہ وقت صرف کیا جائے گا اور نئے الفاظ پڑھانے کی رفتار ذرا سست، اور ہر سبق میں نئے الفاظ کی تعداد کسی قدر کم ہوگی -

---

۱- ابتدائی تدریس، صفحات ۱۰، ۱۱ -

تیسرے (اُردو کی تعلیم کا مقصد)، چوتھے (الفاظ سیکھنے کا عمل)، پانچویں (پانچ چھ برس کے بچے کا ذخیرۂ الفاظ اور مدرس کا ابتدائی کام)، چھٹے (گفتگو) باب کے بعد سید انور علی شاہ[1] نے ساتویں باب میں ''بلوچستان میں اُردو گفتگو کا مسئلہ'' پر بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''ہم لگاتار اور بار بار کی مشق سے بچوں میں اتنی استعداد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ ضروری الفاظ نہ صرف شناخت ہی کر سکیں بلکہ اُن کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنا سکیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کسی چیز یا حالت اور اس کے لیے جو لفظ ہے، اُس میں تعلق پیدا ہونے کا نام زبان سیکھنا ہے، اور یہ عمل اسی طرح پیدا ہوتا ہے کہ چیز اور وہ لفظ، جو اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے، بچے کے سامنے بیک وقت آئیں اور بچہ مشق سے اُس چیز کے لیے وہ لفظ بولنا سیکھ لے۔

مدرس بھی ملکی بچوں کو اُردو زبان سکھانے کے لیے یہی طریقہ استعمال کر سکتا ہے، یعنی چیز دکھائے یا چیز کی تصویر دکھائے اور ساتھ ہی اس چیز کا نام اُردو میں بتائے۔ اس کے علاوہ چونکہ کئی چیزوں یا حالتوں کے لیے بچہ اپنی زبان میں الفاظ سیکھ چکا ہوتا ہے، اس لیے ایسے الفاظ سکھانے کی غرض سے، جن کی تصویر یا نمونہ پیش نہ کیا جا سکے، اُن کی زبان میں ترجمہ کرنے کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کئی نئے الفاظ، بچے محض قرینے سے سیکھ جاتے ہیں؛ مثلاً ایک

۱- آپ نے ۱۹۵۵ع کے اوائل میں وفات پائی جبکہ آپ گورنمنٹ نارمل سکول قصور ضلع لاہور کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ آپ نے زندگی بھر جن اصولوں کو اپنانے کی کوشش کی، وہ ان شعروں سے مترشح ہوتے ہیں:

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تری
وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں
جس جا پہ تیرا ذکر ہو، ہو ذکر خیر ہی
اور نام تیرا لیں تو ادب سے لیا کریں

لڑکا احمد ، جو ذہین اور چالاک ہو اور سوچ سمجھ کر کام کرنے کا عادی ہو ، مدرس اُس کا نام لے کر کہے کہ "احمد بہت عقل مند ہے" تو اس فقرے میں بچے "عقل مند" کے معنی قرینے سے معلوم کر لیں گے ۔

جب بچے اُردو کے چند لفظ بولنا سیکھ لیں تو پھر مدرس خیال رکھے کہ جس وقت بھی اُن الفاظ کے استعمال کا موقع سکول میں آئے ، بچے اُردو ہی میں بیان کریں ۔ مدرس خود بھی محتاط رہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، بچوں کے ساتھ اُردو میں گفتگو کیا کرے ، کیونکہ ایسا کرنے سے سکول اور کمرے میں اُردو کی فضا پیدا ہو جائے گی جو زبان سیکھنے میں بہت ممد ثابت ہوگی[۱]"۔

ابتدائی تدریس کے دوسرے ابواب یہ ہیں : آٹھواں (اُردو گفتگو کے ایک ابتدائی سبق کا نمونہ) ، نواں (اُردو گفتگو کا پڑھنے لکھنے اور دیگر مضامین سے ارتباط) ، دسواں (پڑھنا کیا ہے؟) ، گیارھواں (مبتدیوں کو پڑھنا سکھانے کے طریقے) ، بارھواں (مطلوبہ طریقے کی تفصیل) ، تیرھواں (مشکلات اور ان کی تسہیل) ، چودھواں (اقسام اسباق) اور پندرھواں (لکھنا) ۔

چودھویں باب میں سید انور علی شاہ مرحوم نے ایک نہایت اہم مسئلہ حل کرنے کا طریقہ بتایا ہے ۔ لکھتے ہیں[۲] :

"بروہی ، پشتو اور فارسی بولنے والے بچوں کے لیے اُردو کی تانیث ، تذکیر اور جمع واحد بہت مشکل مسئلے ہیں ۔ اسماء کی تانیث و تذکیر کے اصول کے ساتھ افعال کی تذکیر و تانیث کے اصول کی مشق بھی نہایت لازمی ہے ۔ اس کے علاوہ جمع اور واحد بنانے کے طریقے سکھانا اور اُن کا عملی استعمال بھی ضروری ہے ۔ سلکی بچے 'کا' 'کے' 'کی' اور 'نے' کے استعمال میں اکثر غلطی کرتے ہیں ۔ ان کا صحیح استعمال سکھانا چاہیے ۔ یہ تمام باتیں اُس وقت ممکن ہیں جب مدرس خود صحیح اُردو بولے اور بچوں کو

۱۔ ابتدائی تدریس ، صفحات ۳۱—۳۲ ۔
۲۔ ایضاً ، صفحہ ۹۵ ۔

شروع ہی سے صحیح اُردو بولنے کی مشق کرائے ۔''

''اُردو کی ابتدائی تدریس'' مطبوعات محکمۂ تعلیم بلوچستان کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کا ہر حصہ مسلسل غور و خوض اور بار بار کے تجربات کے بعد تحریر کیا گیا ہے تا کہ بلوچستان کے اُستاد صاحبان عام طور پر اور دیہاتی مدارس کے اُستاد صاحبان خاص طور پر اس کے مطالعے سے مستفید ہوں اور روزمرہ کی تدریس میں عمل پیرا ہو سکیں ۔

۳۔ **تدریسی کھیل :** مرتبہ چودھری عطا محمد ۔ ایک سو بیس صفحات ۔

اقبال سٹیشنری مارٹ شارع لیاقت کوئٹہ نے اشاعت کا بندوبست کیا ۔ بی اے ہاشمی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ تعلیم بلوچستان نے مارچ ۱۹۴۴ع میں اس کا دیباچہ[1] رقم فرمایا ۔ اُن کی زبان سے سنیے :

''بالعموم بچے کو اپنے گھر سے ایک ایسی محبت ہوتی ہے جو اُسے مدرسے سے نہیں ہوتی ۔ اس کی وجوہ کیا ہیں ؟ اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کے لیے ایک کتاب درکار ہے ۔ یہ مختصر کتابچہ مدرسین کو چند کھیلوں سے آشنا کرانے کے لیے تیار کیا گیا ہے تا کہ وہ اپنی روزمرہ کی تدریس میں اسے کام میں لائیں ۔ شاید اس کوشش سے گھر اور مدرسے کا فرق کچھ کم ہو جائے اور ہمارے بچوں کو تحصیل علم میں آسانی ہو ۔''

تمہید[2] میں ان پر واضح انداز اور شستہ زبان میں بحث کی گئی ہے ۔ (ا) سکول بچے کو کس طرح اپنا بنا سکتا ہے ؟ (ب) بچہ کھیل کیوں کھیلتا ہے ؟ (ج) کھیل اور کام (د) کھیل سے جبلتوں کی نشو و نما و دیگر فوائد درج ہیں ۔ مصنف کی زبان سے سنیے[3] :

''یہ حقیقت ہے کہ بچہ صرف گھر ہی میں ''ماسٹر'' ''سکول'' کے بے کیف رٹ کو بھول کر سکول کو گھر سمجھتا ہے اور صرف

۱۔ تدریسی کھیل ، صفحہ ۳ ۔

۲۔ ایضاً ، صفحات ۵ ۔ ۲۲ ۔

۳۔ ایضاً ، صفحات ۸ ۔ ۹ ۔

کھیل ہی سے بچے کو اپنا بنایا جا سکتا ہے مگر یہاں تو دو مخالف قوتیں بر سر پیکار ہیں : ایک طرف تو بچہ، جس کے لیے خود قدرت نے کھیل ہی بطور طریقۂ تعلیم موزوں کیا ہے۔ اُدھر ماسٹر جی ہیں کہ کھیل کے 'دشمن'۔ بچے کی ہر بے باکانہ حرکت کو جماعت کے نظم و نسق کے لیے پیام مرگ سمجھنے والے، اپنے تحکم کی جڑ پر ضرب کاری گرداننے والے اور بچے کے شور کو، جسے کانوں والے ایک قسم کی موسیقی و شاعری سمجھیں — ناتراشیدہ ہی سہی — جماعت کی خاموش فضا کے پرخچے اڑانے والا خیال کرتے ہیں —— بچے کو اپنا بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ کھیل ہے۔

کھیل ایک تو فطری جذبہ اور قدرتی طریقۂ تعلیم ہے اور پھر کھیل گزرے[1] ہوئے واقعات کی یاد تازہ کرنے والا بھی ہے۔ گویا بچہ کھیل میں اُن تمام حرکات کا اعادہ کرتا ہے جو خاص طور پر اُس کے آبا و اجداد نے، اور عام طور پر بنی نوع انسان نے کی ہوں۔ بلوچستان میں پٹھان بچوں کا من بھاتا مشغلہ چھوٹے چھوٹے مورچے بنانا ہے۔ چھوٹی عمر کے گلہ بان شاہراہوں کو مسدود کر دیتے ہیں۔ اسی طرح آنکھ مچولی، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا، شکار کھیلنا، مچھلی پکڑنا، پہاڑوں کے غاروں میں گھر بنانا، ان سب میں ابن آدم اپنے پیشروؤں کی نقل اتار کر ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اُسے کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔"

کھیل اور کام کے بارے میں فاضل مصنف نے لکھا ہے[2] :

"در اصل کھیل اور کام لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں تفریق کا باعث ہے تو وہ سپرٹ جو کام کرنے والے کے ارادے کی تہ میں کارفرما ہو۔ کوئی بھی سرگرمی جو تخلیقی، بے ساختہ اور

۱- تدریسی کھیل، صفحہ ۱۳ -

۲- ایضاً، صفحات ۱۵—۱۶ -

پُر تکلف ہو ، بیرونی دباؤ ، مجبوری اور مزاحمت سے پاک ہو ، جو ہماری جبلتوں اور جذبات کی ترجمانی کرکے اُن کو مطمئن کر سکے ، کھیل کہلاتی ہے ۔ اس لیے اگر وہ سرگرمی ، جسے ہم کام کہتے ہیں ، مندرجہ بالا معیار پر پوری اُترے اور کھیل کی سپرٹ میں نبھ جائے تو کھیل ہی کہلائے گی ورنہ بیگار کے نام سے منسوب ہوگی ۔

سائنس کی معلومات ، آرٹ ، علم ، ادب اور مصوری سب اسی سپرٹ کی مرہون منت ہیں ۔ موسیقی اور ڈرامے کو ، جہاں مغنی یا ناٹکی کی وساطت سے سامعین کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے ، اکثر کھیل ہی کے نام سے معنون کیا جاتا ہے ۔ بچہ ان جذبات کا اظہار ''جھوٹ موٹ'' کھیل میں کرتا ہے ۔''

''کھیل سے جبلتوں کی نشو و نما و دیگر فوائد[۱]'' کے تحت ان فوائد کی تشریح کی گئی ہے : (ا) شوق تجسس ، (ب) تعجب ، (ج) تخیل ، (د) خوف ، (ہ) تعمیر ، (و) تحصیل یا اکتساب ، (ز) نزاع پسندی ، (ح) سکول کی مدنی یا سماجی زندگی اور (ط) خود انتظامی ۔

'' تدریسی کھیل '' میں کل اڑسٹھ کھیل ہیں ۔ نمونے کے طور پر ایک کھیل ملاحظہ فرمائیے[۲] :

''مکان بنانا

مقصد : ا۔ ذخیرۂ الفاظ کی فراہمی
ب۔ قوتِ تخیل کا بڑھانا
ج۔ قوتِ اظہار پیدا کرنا

اُستاد کہے ''آؤ بھائی آج ایک کمرہ بنائیں ۔'' چند ایک بچوں کو گارا بنانے کا کام سونپیں ، چند ایک کو لکڑیاں جمع کرنے کا ، کچھ بچے پتھر جمع کریں ۔ اب ٹیچر بچوں کے ساتھ شامل ہو اور

۱۔ تدریسی کھیل ، ۱۷—۲۱ ۔
۲۔ ایضاً ، صفحہ ۲۵ ۔

کمرہ تیار کیا جائے ۔ کھیل کے ختم ہونے پر لڑکوں کی مادری
زبان میں چیزوں کے نام اور سٹیپس نکلوائے جائیں ۔ ان ناموں کو
بتدریج اُردو میں منتقل کر لیں ۔"

"تدریسی کھیل" سلسلہ مطبوعات محکمہ تعلیم بلوچستان کی تیسری کتاب ہے ۔ تمہید قابل ستائش ہے ۔ کھیل ایسے درج کیے گئے ہیں جن میں بچے بآسانی مگن ہو سکتے ہیں ۔ اگر اساتذۂ کرام اس کتاب کا بغور مطالعہ فرما لیں تو خود بھی نئے نئے کھیل اختراع کر کے تدریس کو دلچسپ اور مفید بنا سکتے ہیں ۔

۴۔ قاعدہ : (باتصویر) پہلی جماعت کے لیے ، مصنفہ کمال الدین احمد ، حسب ہدایت محکمہ تعلیم بلوچستان ، زیر نگرانی چودھری عطا محمد ۔ اقبال سٹیشنری مارٹ کوئٹہ نے چھاپا ۔ اسے محکمے نے ستمبر ۱۹۴۵ء میں منظور کیا ۔ کل صفحے اڑتالیس ہیں ، متعدد بار چھپا ۔

مدرسین کے لیے ایک جداگانہ پمفلٹ شائع کیا گیا : "قاعدہ کیسے پڑھائیں ؟" (مرتبہ و مصنفہ کمال الدین احمد ۔ ودیا ساگر) یہ ۱۹۴۶ء کے شروع میں چھپا ۔ بتیس صفحوں پر مشتمل ہے ۔

۵۔ اُردو کی پہلی کتاب ، اردو کی دوسری کتاب اور اردو کی تیسری کتاب : مصنفہ ماسٹر کمال الدین احمد ۔ یہ کتابیں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئیں ۔ ان کے پبلشر تھے "اقبال سٹیشنری مارٹ کوئٹہ"۔ قیام پاکستان کے بعد ان کتابوں میں اصلاح کی گئی ۔ قوم کے حالات اور بچوں کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض مضامین بالکل بدل دیے گئے اور بعض میں ضروری ترمیمیں کی گئیں ۔ ان کتابوں میں بلوچستانی ماحول کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور کئی مضامین ایسے ہیں جن سے اس خطے کے بعض پہلو اُجاگر ہوتے ہیں ۔ مثلاً کاریز ، پالیز کی سیر ، انگور ، کوئٹہ ، پہاڑ ، چشمے کا گیت وغیرہ ۔ چند جملے اور دو چار شعر یہ ہیں :

"شیر محمد نے پوچھا "بھائی دُر محمد ! یہ کیا ہے ؟" دُر محمد نے
جواب دیا " یہ مچان ہے ، رات کے وقت میرے ابا اس پر
سوتے ہیں ، کیونکہ رات کو خربوزے اور کھیرے کھانے کے لیے

پالیز میں گیدڑ بہت آتے ہیں ۔ اور مچان کافی اُونچا ہے ، میرے ابّا یہاں سے رکھوالی اچھی طرح کر سکتے ہیں ۔''[1]

میں بہتا ہوا اور چشموں سے مل کر
میں بہتی ندی اور نالوں سے مل کر
گزر کر پہاڑوں سے میداں میں بہہ کر
میں رستے کے دکھ اور تکلیف سہہ کر
زمینوں کو سیراب کرنے چلا ہوں
میں کھیتوں کو شاداب کرنے چلا ہوں
لگے ہیں کسان اپنی پالیز بونے
کسی کو ابھی اپنے آلو ہیں دھونے
اسی دھن میں ہر دم بہے جا رہا ہوں
کسی نہ کسی کے میں کام آ رہا ہوں[2]

۶۔ **چراغ :** بالغوں کے لیے قاعدہ ۔ مصنفہ کمال الدین احمد ۔ اسے اسلامیہ سٹیشنری مارٹ ، قندھاری بازار ، کوئٹہ نے شائع کیا ۔ اڑتالیس صفحے ہیں ۔

۷۔ **دین کی باتیں :** (مکمل سیٹ) مرتبہ مولانا عبدالشکور ۔ محکمۂ تعلیم بلوچستان کا منظور کردہ سیٹ اقبال سٹیشنری مارٹ کوئٹہ نے چھاپا ۔

۸۔ **اصطلاحات جغرافیہ :** (باتصویر) مصنفہ کمال الدین احمد، مطبوعہ اقبال سٹیشنری مارٹ کوئٹہ ۔

۹۔ **جغرافیۂ بلوچستان :** مصنفہ شیخ جعفر علی ۔ اسلامیہ سٹیشنری مارٹ قندھاری بازار کوئٹہ نے طبع کرایا ۔ کئی ایڈیشن چھپے ۔ اس میں پاکستان

۱۔ اُردو کی دوسری کتاب ، کمال الدین احمد ، صفحہ ۳۵ ۔

۲۔ ایضاً ، صفحہ ۵۸ ۔
کمال الدین احمد ، ودیا ساگر اور غلام محمد جمیل نے مل کر دوسری کتاب (اسی طرح مکمل سیٹ) لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جدا جدا تیار کی تھی ۔ یہ سیٹ کراچی کے لیے قیام پاکستان سے پیشتر کوئٹے میں مکمل کیے گئے ۔

کا مختصر جغرافیہ بھی شامل ہے -

۱۰- قیام پاکستان کے بعد کمال الدین احمد نے ایک سیٹ گلدستۂ اردو کے نام سے لکھا تھا جس میں ارشد امروہوی کی نظمیں تھیں - یہ سیٹ خاصے دنوں تک رائج رہا - اس کے ناشر تھے جے جی پبلشر، سٹیشنر اینڈ بک سیلر شارع لیاقت، کوئٹہ -

۱۱- بلوچستان کے مختلف اضلاع کے جغرافیے تیار ہو کر چھپ چکے ہیں - اُن میں سے ایک (جغرافیۂ ضلع کوئٹہ پشین) کمال الدین احمد نے مرتب کیا ہے اور سلیم بک ڈپو شارع لیاقت کوئٹہ نے شائع کیا ہے -

۱۲- **دینیات کا نیا نصاب** (برائے حصہ مڈل) کے مرتب مولانا عبدالعزیز[1] اور مولانا عبدالشکور اور پبلشر اسلامیہ سٹیشنری مارٹ کوئٹہ ہیں -

۱۳- **دینیات کا نیا نصاب** (برائے جماعت چہارم) کے مؤلف سرور حسین[2] ایوبی اور پبلشر سلیم بک ڈپو شارع لیاقت کوئٹہ ہیں -

۱۴- **مبادیات مدنیت**: حصۂ اول (کل صفحات ۳۳۶، قیمت سوا چار روپے)، حصۂ دوم (کل صفحات ۳۱۶، قیمت چار روپے) - ناشر ایم آر برادرز لاہور - لکھائی، چھپائی اور کاغذ مناسب - ان دونوں حصوں پر نظر ثانی خواجہ ارشاد احمد لیکچرار سیاسیات گورنمنٹ کالج کوئٹہ نے کی ہے - تمام اسباق پر نظر ثانی بورڈ کے جدید سلیبس کے مطابق، عام فہم، سلیس اور دلچسپ پیرائے میں کی گئی ہے - اسباق کے آخر میں

۱- آپ ''تعمیر نو پبلک سکول'' کوئٹہ کے شعبۂ عربی کے نگران ہیں، جہاں مروجہ تعلیم کے علاوہ اسلامی طرز زندگی کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے -

۲- آپ نے قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ میں ''السنۂ شرقیہ'' کا شبانہ کالج قائم کیا جو اب تک مفید کام کر رہا ہے -
چند سال سے چمن (کوئٹہ ڈویژن) میں بھی ایک پرائیویٹ ادارہ قائم ہے جہاں عربی، فارسی اور اُردو کے مختلف امتحانات کی تیاری کرائی جاتی ہے - اس کے مہتمم سید غلام محمد شاہ ہیں -

طلبہ کے استفادے کی غرض سے سوالات دیے گئے ہیں - اس طرح کتاب کی افادی حیثیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے - یہ گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے لکھی گئی ہے -

ریاضی سے متعلق بھی بعض کتابیں اس خطے میں لکھی گئیں - چودھری محمد سلطان کا سیٹ خاصا مشہور ہؤا -

کسی زبان کی ترویج میں تعلیم بجا طور پر ممتاز حیثیت کی مالک سمجھی جاتی ہے - جہاں تعلیم پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب بڑھاتی ہے ، وہاں علمی و ادبی ذوق کے نمو کا باعث بھی بنتی ہے اور یوں ادبی فضا کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں - یہ معیار پیش نظر رکھ کر بلوچستان میں "درس و تدریس" پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خطے میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہؤا ، اُس میں بلوچستان بھر کے تعلیمی اداروں نے اپنا فرض ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور کی جا رہی ہے -

علم و ادب کی ترقی کے لیے اچھے کتاب خانوں کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے - بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں لائبریریوں کا بھی بندوبست کیا گیا ہے - کئی مقامات پر پبلک لائبریریاں بھی موجود ہیں - تین کتاب خانوں کا ذکر ملاحظہ فرمائیے ، بعض کا ذکر بعد میں آئے گا :

سنڈیمن لائبریری :-

تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں[1] سولہ سپیشل لائبریریاں اور اُنسٹھ جنرل لائبریریاں تھیں - بد قسمتی سے سپیشل لائبریریوں میں سے ایک بھی ہماری مملکت میں واقع نہیں - جنرل لائبریریوں میں سے پاکستان کے حصے میں صرف تین لائبریریاں آئی ہیں - اُن میں سے پہلی "پنجاب پبلک لائبریری" ، دوسری "کراچی سنٹرل لائبریری" اور تیسری کوئٹہ کی "سنڈیمن لائبریری" ہے - یہ ۱۸۸۵ع میں قائم ہوئی -

بلوچستانیوں کی خوش نصیبی ہے کہ ایسا تعلیمی ادارہ ان کے دل ، یعنی

۱- الاسلام ، کوئٹہ ، ۲۸ اگست ۱۹۴۸ع -

کوئٹہ میں واقع ہے۔ اس لائبریری کا انتظام ایک منیجنگ کمیٹی کرتی ہے۔ زلزلے سے پہلے اس کی حالت نہایت اچھی تھی۔ اس میں چودہ ہزار دو سو چھبیس کارآمد اور مفید کتابیں تھیں۔ زلزلے میں لائبریری کی عمارت منہدم ہوگئی اور کئی کتابیں بھی ضائع ہو گئیں۔ بعد میں وزیر زادہ عبدالاحد خاں (جو دیر تک میونسپل سیکرٹری رہے اور خود ایک سلجھے ہوئے ادیب اور شاعر تھے) نیز دیگر منتظمین اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ تقسیم ملک کے بعد کچھ دنوں تک اسے تربیت یافتہ لائبریرین نہ مل سکا۔ بعد میں مسٹر عبدالرزاق نے اسے سنبھالا، کتابوں کی ترتیب عمل میں آئی اور نظم و نسق بہتر ہؤا۔

کالج لائبریری:

گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ کی لائبریری میں اُردو کی کئی ہزار کتابیں موجود ہیں۔ ان میں ہر صنف کو نمائندگی دی گئی ہے۔ طلبہ اور اساتذہ مستفید ہوتے ہیں۔ پرنسپل صاحب کی اجازت سے شہر کے ذی علم حضرات بھی استفادہ کر لیتے ہیں۔

پبلک لائبریری مستونگ:

یہ لائبریری ۱۹۵۵ء میں قائم ہوئی۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں راجہ احمد خاں (اُس وقت کے) ڈی سی قلات نے اپنی مساعیٔ جمیلہ سے کام لیا۔ اس میں انگریزی کے بجائے اُردو کی کتابیں زیادہ ہیں۔ ملک کے چوٹی کے اخبار اور رسائل بھی پہنچتے ہیں۔

قصہ مختصر، یہ کتب خانے بھی بلوچستان میں اُردو کی ترویج میں معاون بنے ہیں۔

تحریکاتِ آزادی

پاک و ہند میں انگریزی راج کے قیام کے خلاف جو رد عمل ہؤا اور مسلح مقابلہ کیا گیا ، اس کی قیادت شہزادوں نے کی ۔ افسوس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ آزادی پسند شہزادے برطانوی فتوحات کی ابتدائی منزلوں میں ایک متحدہ اقدام کے اہل ثابت نہ ہوئے حالانکہ اُس وقت انگریزوں کو روک لینا آسان تھا ۔ تاہم انھوں نے انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے میں پہل کی کیونکہ وہ رعایا کے موروثی حکمران تھے ۔

یہ تمام شہزادے اپنی افواج ، ساز و سامان ، غیر ملکی مشوروں اور ذریعوں کے ساتھ انگریزوں کی پیش رفت کو روک نہ سکے ۔ انگریز ایک صوبے کے بعد دوسرے صوبے کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لیتے چلے گئے ، حتیٰ کہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب بھی ان کی حکومت کے دائرے میں آ گیا ۔ بعد ازاں صرف ۱۸۵۷ء میں ہمارے شہزادوں ، مدبروں ، سپاہیوں ، زمینداروں ، عالموں اور کسانوں میں بیداری پیدا ہوئی اور وہ انگریزی حکومت کے خلاف نبرد آزما ہوئے لیکن یہ بیداری بعد از وقت تھی ۔ ہمارے اخلاقی اقدار ، ہمارا تمدنی ورثہ اور ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے ۔ مسلمانوں کو اس المیے میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا اور یاسیت کا دور دورہ ہؤا ۔

وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ایک نیا نظریۂ حیات مرتب کیا جائے ۔ سر سید نے وہ نظریہ پیش کیا جو زندگی اور قوت دونوں کے لیے تازگی و افزائش کا وسیلہ تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اُن علوم سے بہرہ مند ہوں جن کے بغیر انگریزی نظم و نسق میں حصہ لینا ممکن ہی نہ تھا اور ان ہم وطنوں کے تسلط سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں جو انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ان کے علوم سیکھ کر جزو حکومت بن گئے

تھے - اس کے بعد رد عمل کی دو صورتیں سامنے آ گئیں ؛ یعنی مشترکہ جد و جہد یا الگ الگ کوششیں - انگریزوں کے خلاف ہماری مجاہدانہ سرگرمیاں انھی دو صورتوں میں اجاگر ہوئیں -

انگریزوں کے آخری مفتوحہ علاقوں میں سے ایک بلوچستان تھا جس پر وہ ۲۱ فروری ۱۸۷۷ع کو قابض ہوئے اور یہ متذکرہ بالا رد عمل سے مستثنیٰ نہ تھا[1] -

سابق بلوچستان کی سر زمین میں انگریزوں کے خلاف جو پہلی مسلح روک تھام کی گئی ، وہ ایک عوامی فرد غلام حسین مسوری بگٹی[2] کی قیادت میں تھی ، لیکن اس کے نتائج بھی وہی بر آمد ہوئے جو ہندوستان

۱- روسان ، انور ، پروفیسر : ''یوسف عزیز مگسی'' (بزبان انگریزی) بولان ، کوئٹہ ۱۹۵۵ع -

۲- روسان ، انور ، پروفیسر : ''غلام حسین مسوری بگٹی ـــ دی بلوچ ہیرو'' - روئداد آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۱ع -
ویسے بلوچستانی تین دفعہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے : اولاً میر محراب خاں آف قلات کے زیر سرکردگی پہلی افغان جنگ کے بعد ۱۸۳۹ع میں ـــ
ثانیاً غلام حسین مسوری بگٹی کے تحت ـــ وہ انگریزوں کے مقابلے پر بارہ سو مسلح آدمیوں کو لایا اور دم آخر تک مقابلہ کیا اور دو سو ستاون آدمیوں کے ساتھ شہید ہوا -
ثالثاً علاقہ ژوب میں فورٹ سنڈیمن اجمیر خاں مندو خیل کی سرداری میں ـــ روسان ، انور ، پروفیسر : ''بلوچستان کی تاریخی اہمیت'' (بزبان انگریزی) جرنل پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی لاہور ـــ علاوہ ازیں سرزمین بلوچستان کے جن مجاہدوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا ، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں : نورا مینگل ، شاہجہان جوگیزئی ، نواب بنگل خان جوگیزئی ، عبداللہ خان اچکزئی ، فیض محمد غازی ، غازی گہرام ، سردار خان محمد خان زرکزئی ، عبدالرحمٰن غازی ، غازی میر علی دوست ، سہندا ، وزیر محمد ، مولانا عبداللہ لغاری ، ملا مزار بنگلزئی وغیرہ ـــ (اُولس بلوچی ، اگست ۱۹۶۶ع 'ہماری جد و جہد' - مرتبہ عبدالرحمٰن غور) -

میں دوسرے مقامات پر ظاہر ہو چکے تھے ۔ غلام حسین کی تحریک کی ناکامی اور اس کی اپنی موت نے ، جو ۲۶ جنوری ۱۸۶۷ء کو وقوع پذیر ہوئی ، بلوچستانیوں پر عیاں کر دیا کہ انگریزوں کے خلاف ایسی جنگیں بے فائدہ اور گراں ہیں اس لیے دوسرے رد عمل کی پیروی کی گئی ۔

چنانچہ دوسرے رد عمل کی رہنمائی یوسف علی خاں عزیز مگسی نے کی جو سر سید کے خیالات اور ان کی اصلاحات ، علامہ اقبال ، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریرات اور سیاسی نظریات سے اثر پذیر ہوئے تھے ۔ نواب زادہ یوسف علی عزیز مگسی علاقے کے بڑے شہر جھل میں پیدا ہوئے (جنوری ۱۹۰۸ء) ۔ آپ نواب قیصر خاں سوم کے دوسرے فرزند تھے ، جو مگسیوں کے سولھویں تمن دار[1] تھے ۔ نواب قیصر خاں کا فرزند ہونے کی حیثیت سے یوسف عزیز کے لیے تربیت کے عمدہ مواقع مہیا ہوئے ۔ والد کو یقیناً ایسے بچے پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ وہ امیر گھرانوں کے بچوں سے مختلف تھا ۔ یوسف عزیز بچپن ہی سے محنتی اور غور و خوض کرنے والے تھے ۔ ۱۹۱۳ء میں وہ قاضی رسول بخش کے سپرد کیے گئے جو اُن کے پہلے استاد تھے[2] ۔ قاضی صاحب نے ابتدائی مذہبی تعلیم کے علاوہ درجۂ کتب تک تعلیم دی ۔ بعد ازاں چاچڑاں شریف کے مولانا غلام قادر (جن کے خاندان سے مولانا عبدالکریم ایڈیٹر 'میزان' کوئٹہ کا تعلق ہے) کی تربیت میں رہے ، جنھیں جھل مگسی صرف اسی کام کے لیے بلایا گیا تھا ۔ ان سے یوسف علی خاں نے عربی ، فارسی اور اردو پر عبور حاصل کیا ۔ آخر میں لاہور سے لالہ کنھیا لال بی اے نے آ کر آپ کو ڈیڑھ سال تک انگریزی پڑھائی ۔ اس طرح نواب نے اپنے بیٹے کی ذہنی اور شخصی تربیت کی بنیاد

۱۔ ''تمن'' ترکی لفظ ہے بمعنی دس ہزار ۔ کوئی منظم قبیلہ جس کے افراد دس ہزار ہوں اور وہ کسی ایک سردار کے ماتحت ہوں 'تمن' کہلاتا ہے اور سردار کو 'تمندار' کہتے ہیں ۔ دیکھیے ''جغرافیۂ علاقۂ مگسی و تاریخی حالات قوم مگسی'' صفحہ ۱۴ ۔

۲۔ الحنیف ، جیکب آباد ، فروری ۱۹۳۷ء ۔

مذہب سے اٹھا کر علوم جدیدہ پر رکھی۔

یوسف عزیز بلوچستان میں سیاسی بیداری کے علم بردار اور قائد تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر کے خاص عقیدت مند بھی تھے۔ آپ کے متعلق مولانا ظفر علی خاں فرماتے ہیں[1]:

تم کو خفی عزیز ہے، ہم کو جلی عزیز
عارض کا گل تمھیں ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

نقشے کا جائزہ بتاتا ہے کہ مگسیوں کی سرزمین سابق ریاست قلات کے ضلع کچھی کے جنوب میں ہے۔ شمال میں نیابت (تحصیل) گنداوا، مشرق میں نیابت میرپور اور تحصیل نصیر آباد، جنوب میں تعلقہ شہداد کوٹ اور مغرب میں کوہ کھیرتر واقع ہیں۔ اس علاقے کا رقبہ چار سو مربع میل ہے۔ لمبائی شمالاً جنوباً چالیس میل کے قریب اور چوڑائی آٹھ سے سولہ میل تک ہے۔ "مگسی" لاشاری بلوچوں کی ایک شاخ ہے جو اس علاقے پر سترھویں صدی میں اپنے لیڈر سردار بھوت خاں اول کے زیر قیادت قابض ہوئی۔ سردار بھوت خاں قابض خاندان سردار خیل یا سردار کے خاندان کے بانی ہیں۔

سولھویں تمن‌دار نواب قیصر خاں نے انگریزی حکومت سے سی آئی اے کا خطاب پایا۔ وہ روشن خیال سردار تھا۔ اپنے لوگوں کی حفاظت احسن طریق سے کرتا تھا۔ اس سے صرف مگسی ہی محبت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ عام بلوچوں میں بھی مقبول تھا۔ اس کی مقبولیت اور آزادانہ خیالات خان بہادر نواب میر شمس شاہ (۱۹۱۸ء—۱۹۳۲ء) کو، جو میر محمود خان دوم والیِ قلات (۱۸۹۳ء—۱۹۳۱ء) کا وزیر اعظم تھا، بھاتے نہ تھے۔ میر محمود خان بے بصری اور مسلسل بیماری کی وجہ سے شمس شاہ کے

۱۔ وارثی، بشیر احمد: تذکرۂ مگسی، سکھر، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۶۸۔



بلوچستان کی نامور شخصیت نواب زادہ
یوسف علی خان عزیز مگسی
(المتوفی ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء)



ڈاکٹر ناشط صدیقی



سید عابد شاہ عابد

ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا ۔ تاج کی اطاعت کے باوجود نواب قیصر خان ، سر شمس شاہ کے غصے کا شکار ہؤا ۔ چنانچہ اُسے ۱۹۲۲ع میں سوقوف کیا گیا اور اس کے سب سے بڑے بیٹے سردار گل محمد زیب کو تمندار مقرر کردیا گیا ۔

۱۹۲۳ع میں نواب قیصر نے ملتان ہجرت کی اور وہیں ۱۹۲۷ع میں عالم فانی سے کوچ کیا ۔ نواب زادہ یوسف علی خان عزیز نے بھی والد کی معیت میں ہجرت کی ۔ اُنھوں نے چار سال تک ملتان میں قیام کیا اور پنجاب کی انقلابی فضا میں سانس لیا ۔ یہاں نواب زادہ نے انگریزوں کے خلاف ملک کی ہمہ گیر جدوجہد سے آگاہی حاصل کی اور آزادی کے دوسرے کارکنوں کی طرح سر شمس شاہ کے مظالم پر سوچنا شروع کیا ۔

اس اثنا میں آپ کا بڑا بھائی سردار گل محمد زیب مگسی علاقے پر حکومت کرتا رہا ۔ وہ تہذیب یافتہ سردار تھا ، زیب اس کا تخلص اور فارسی میں شعر کہتا تھا[1] ۔ اس کا تصور حیات متصوفانہ تھا ۔ زیب کے عہد حکومت میں بھی سر شمس شاہ مگسیوں کو تنگ کرتا رہا ، حتیٰ کہ اُس نے علاقۂ مگسی کا انتظام خود سنبھال لیا اور سردار زیب سے یہ لکھوا لیا کہ بیمار ہونے کے باعث سردار کی ذاتی ملکیت اور علاقۂ مگسی کی دیکھ بھال وزیر اعظم (سر شمس شاہ) کے ذریعے سے ہو گی ۔ چونکہ یہ بیان صداقت پر مبنی نہ تھا ، اس لیے سردار گل محمد خان زیب نے سر شمس شاہ کے اس ناروا رویے پر انگریزی افسران کی توجہ منعطف کرائی ۔ اس پر سر شمس شاہ نے زیب کو گرفتار کرکے زیر نگرانی رکھا اور اس کی ذاتی جائداد اپنے نائب کے سپرد کر دی ۔

یہ تمام واقعات نواب زادہ یوسف علی خان عزیز کے لیے ناقابل برداشت تھے ۔ انھوں نے ایک مضمون نومبر ۱۹۲۹ع کے ''مساوات'' لاہور میں لکھا جس میں وزیر اعظم کے ان کارناموں پر کڑی نکتہ چینی کی ۔ اس کی غیر آئینی اور قبائلی مفاد کے خلاف پالیسی کو بری طرح سے رد کیا ۔

۱- زیب کا ایک اُردو کا دیوان بھی دستیاب ہؤا ہے جس میں مخمسات ہیں ۔ اس کا ذکر ''شعر و شاعری'' کے باب میں دیکھیے ۔

نواب زادہ ۱۹۳۰ء میں سبی آئے تو انھیں چار ماہ کی سزا دی گئی اور ایک سال تک زیر نگرانی رکھے گئے۔ ان پر ملک میں ''تخریبی سرگرمیوں'' کا بےبنیاد الزام لگا کر دس ہزار روپے وصول کیے گئے۔

ان واقعات پر مگسی بھڑک اٹھے جو ان تکالیف میں اکیلے مبتلا نہ تھے۔ وزیر اعظم کے اس ظالمانہ رویے نے مینگل حسنی اور رستم زئی قبائل کی آزادی کو بھی خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان قبائل نے وزیر اعظم کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ مگسی جو سب سے زیادہ پسے تھے، وہ سندھ کی جانب جوق در جوق ہجرت کرنے لگے۔ یہ افغانستان کی جانب ہندوستانی مسلمانوں کی ہجرت کی صدائے بازگشت تھی۔

اگست ۱۹۳۱ء میں نواب زادہ کو مستونگ جیل سے رہا کیا گیا اور وزیر اعظم نے سردار زیب سے جبراً یہ لکھوا لیا کہ نواب زادہ نے ہجرت کی تحریک کی پشت پناہی کی ہے تاکہ وہ تمنداری حاصل کر سکے۔ ایک اور بیان بھی سردار زیب سے تحریر کرایا کہ نواب زادہ مجھے قتل کرانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پولٹیکل ایجنٹ فلاؤن کو ان الزامات کی بنا پر جو جبر و اکراہ سے لکھوائے گئے تھے، اُکسایا نہ جا سکا کہ وہ نواب زادہ کو گرفتار کر لے۔ تاہم نواب زادہ نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ بلوچستان کو خیرباد کہیں اور سندھ کی جانب ہجرت کر جائیں۔ ان تمام واقعات خصوصاً سر شمس شاہ کی تحکمانہ عملداری کا واضح ذکر چونسٹھ صفحات پر مشتمل ایک چھوٹے سے پمفلٹ بعنوان ''شمس گردی'' میں ملتا ہے جسے انجمن اتحاد بلوچستان نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔ یہ لاہور میں چھپا تھا۔

نومبر ۱۹۳۱ء میں میر محمود خاں دوم نے طویل بیماری کے بعد وفات پائی۔ میر محمد اعظم خاں (۱۹۳۱ء—۱۹۳۳ء) اس کا جانشین بنا، جس نے سر شمس شاہ کی پالیسی کے تباہ کن نتائج کو بھانپ لیا اس لیے موصوف کو ۱۹۳۲ء میں معطل کیا گیا۔ خان بہادر گل محمد خاں کو وزارت عظمیٰ سونپی گئی، قبائلی مسائل کی گرہ کشائی کے لیے نیا طریق اختیار کیا گیا اور ہجرت کردہ مگسیوں کو واپس بلا لیا گیا۔ یوں یوسف عزیز نے کامیابی کے ساتھ ایک ڈکٹیٹر کا مقابلہ کیا۔ اپنے آلام سے نجات پانے کے بعد انھوں نے

بلوچ مسائل کے مختلف پہلوؤں ، سماجی ، سیاسی اور معاشی حالات کا مطالعہ شروع کیا اور اپنی زندگی بلوچوں کی اصلاح کے لیے وقف کر دی[۱] ۔

''شمس گردی'' میں انجمن اتحاد بلوچستان نے نواب زادہ کی رہنمائی اور قیادت میں حکومت کے آیندہ نظام کو ان الفاظ میں پیش کیا :

''ہم قلات میں ایسا حکمران چاہتے ہیں جو تخت نشینی کے فوراً بعد آئینی اور ذمہ دار حکومت کا اعلان کرے اور اسمبلی قائم ہو جس میں لوگوں کے منتخب کردہ نمائندے ہوں ۔ مستقل چار مقامی اور لائق آدمیوں پر مشتمل کابینہ بنے ، جس کا سربراہ ذہین اور مصلح ہو ۔ محکموں کی تقسیم اس نہج پر کی جائے : وزیر اعظم ، محکمۂ داخلہ اور انڈین گورنمنٹ کے ساتھ تعلقات ، وزیر مال ، محکمۂ مالیات ، وزیر اطلاعات ، محکمۂ انصاف ، وزیر محکمۂ رفاہ عامہ ، تعلیم ، صحت اور زراعت ۔ چوتھا وزیر ریاستی افواج ، پولیس ، قانون اور نظم و نسق کا انچارج ہو ۔ اس کابینہ کا امتیازی نشان یہ ہو کہ وزراء کم سے کم تنخواہ پا کر بہت محنت سے کام سرانجام دیں ۔ وزیراعظم کی تنخواہ پانچ سو تک ہو ، کابینہ اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہو تا کہ سر شمس شاہ کے عہد کی بد عنوانیاں دہرائی نہ جا سکیں[۲] ۔''

۱۔ پروفیسر انور رومان کے انگریزی مضمون ''یوسف عزیز مگسی'' کا اُردو ترجمہ راقم‌الحروف نے کیا اور 'امروز' لاہور (۲ اور ۹ فروری ۱۹۵۸ع) میں چھپا ۔ یہ مضمون متعدد اہم ماخذوں پر مبنی ہے ۔

۲۔ شمس گردی (اردو ایڈیشن) ، شائع کردہ انجمن اتحاد بلوچستان لاہور ۱۹۳۱ع ۔
میر عبدالرحمٰن نے ڈیرہ بگٹی میں اصلاح قوم اور حقوق انسانیت کی نگہداشت کے لیے ایک خفیہ تنظیم قائم کی تھی اور اپنے باپ نواب محمد محراب خاں کے مظالم کو طشت از بام کرنے کی خاطر ''محراب گردی'' لکھی تھی ۔ تفصیل آگے آئے گی ۔ (میر عبدالرحمٰن خان بگٹی ، از فقیر بخش بگٹی ، ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع) ۔
''شمس گردی'' میں میر عبدالرحمٰن خاں آزاد بگٹی کے بھی چند شعر
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یہ مطالبات بالخصوص پہلا مطالبہ اخبارات اور تقریروں میں باربار دہرایا گیا ، یہاں تک کہ یوسف عزیز مختلف بلوچ قبیلوں اور سرداروں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ آپ کی پہل اور تجویز پر پہلی ''کل ہند بلوچ کانفرنس[۱]'' ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو جیکب آباد میں منعقد ہوئی ۔ کانفرنس کی صدارت کے فرائض خیر پور کے میر علی نواز خان تالپور کو سر انجام دینے تھے لیکن وہ بیماری کے باعث نہ پہنچ سکے اس لیے ان کا خطبۂ صدارت ان کے پرائیویٹ سیکرٹری (امین خلوت) نے پیش کیا اور خان عبدالصمد خان نے صدارت کی[۲] ۔ کانفرنس میں سندھ ، کراچی ، پنجاب

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

درج ہیں ۔ ان میں یہ شعر ذو معنی ہے ۔ ''سر'' کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ سر بحیثیت سر ، بحیثیت ایک سرکاری خطاب کے اور سر بہ معنی لیڈر ، سردار :

واژگونی ہے مقدر میں بلوچی قوم میں
کاٹ دینے کے جو قابل ہیں وہ سر پیدا ہوئے

۱۔ عبدالصمد درانی اپنے مضمون ''ہماری جد و جہد کا ایک باب'' میں لکھتے ہیں :

''بلوچ کانفرنس کی تجویز نے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جنم لیا ، جہاں مرحوم نواب یوسف علی خان اپنے دیرینہ رفیق میر محمد امین خان کھوسہ سے ملنے گئے تھے ۔ محمد امین خان اُن دنوں یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے ۔ علی گڑھ کے اس تصور نے سندھ اور بلوچستان کے مقام اتصال یعنی خان گڑھ (جیکب آباد) کے شہر میں عملی جامہ پہنا ۔''

[نوائے وطن ، کوئٹہ (سالنامہ و عزیز نمبر) ۱۶ جون ۱۹۵۵ء] ۔

۲۔ خان موصوف نے اس شرط پر صدارت قبول کی کہ کانفرنس کا نام ''بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' رکھ دیا جائے ، جسے منظور کر لیا گیا ۔ اس کانفرنس کی کارروائی میں یوسف علی خان ، خان عبدالصمد خان اچکزئی اور میر محمد امین خان کھوسہ کے علاوہ میر محمد اعظم خان مزاری اور میر عبدالعزیز خان کُرد نے بھی خصوصی سرگرمی کا مظاہرہ کیا ۔ (نوائے وطن کوئٹہ صفحہ ۱۹ ، ۱۶ جون ۱۹۵۵ء) ۔

اور بلوچستان کے دو سو مندوبین نے شرکت فرمائی۔
ہز ہائنس میر علی نواز خان تالپور والی خیر پور نے اپنے خطبے میں فرمایا تھا:

"عزیزان من! میں آپ کو صاف لفظوں میں آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ سیاسیات کے تخریبی پہلو سے ہرگز دلچسپی نہ لیں جو قوموں کی زندگی میں تباہی و بربادی پر منتج ہوتا ہے۔ ایک زندہ قوم کو، جو جہد للحیاۃ میں حصہ لینا چاہتی ہے، اُن قوائے عملی کو بیدار کرنا چاہیے جو امن و سلام کے قصر ہائے رفیع کی شمولیت پر قادر ہوں۔ میں آپ سے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ کانگرس کی تخریبی حکمت عملی اور اس کی قانون شکنی کو میں مسلمانوں اور بلوچوں کی سوسائٹی کے لیے ایک خطرۂ عظیم تصور کرتا ہوں۔ مجھے مسرت ہے کہ پچھلے دنوں میں نے اپنے بھائیوں سے کانگرس کی تحریک میں عدم شمولیت کا جو مطالبہ کیا تھا وہ پورا ہؤا اور مسلمان تحریک میں شریک نہ ہوئے[1]۔"

آل انڈیا بلوچ کانفرنس میں مولانا اختر علی خاں آف "زمیندار" لاہور، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا غلام فرید مبلغ اسلام بھی شامل ہوئے تھے اور تقریریں کی تھیں۔ پہلے دن بلبلان خلافت نے قومی ترانہ پڑھا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

وقت آ گیا کہ باغ میں بلبل ہو نغمہ سنج
اور شاخِ گل کو مژدۂ فصل بہار دے

آخری اجلاس میں بلبلانِ خلافت نے نواب زادہ یوسف علی خان کی مشہور قومی نظم پڑھی تھی[2] جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کر دوں
قطرۂ آب میں پیدا سرِ طوفاں کر دوں

۱۔ "کانفرنس کی مکمل روئداد" از مرید حسین خاں مگسی، صفحہ ۴۵۔
۲۔ میر محمد امین کھوسہ اپنے مضمون "بلوچستان میں دینی سیاست کی بنیاد
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر
ساری دنیا کو نئے سر سے مسلماں کردوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو
ہر بلوچی کو غرض عامل قرآں کردوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طُور کو آباد کروں
آتش دل سے پہاڑوں میں چراغاں کردوں
جوش میں آ کے اگر نعرۂ اللہ ماروں
حق و باطل کے تفاوت کو نمایاں کردوں
میں وہ مجنوں ہوں اگر چاہوں جہاں کو یکسر
طرۂ یار کی مانند پریشاں کردوں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

رکھنے کے لیے تاریخ کا ایک مبارک ورق'' میں لکھتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے زمانے (۱۹۳۲ع) میں علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے - وہاں سے جیکب آباد آئے، پھر یوسف عزیز کے ہمراہ حضرت پیر صاحب برچونڈی شریف کی خدمت میں حاضر ہوئے - ٹرین سے ڈہرکی اترے اور ٹانگہ میں برچونڈی شریف گئے - اسی راستے پر حضرت عبیداللہ سندھی پاپیادہ حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے - برچونڈی شریف میں حضرت صاحب کی امامت میں یوسف عزیز اور امین کھوسہ نے نماز پڑھی - یوسف نے امین سے پوچھا کہ ''نماز یہاں پر ہمیشہ اسی طریق سے ہوتی ہے؟'' پھر کہا کہ ''یہ تو مجاہد پیدا کرنے والی نماز ہے -'' واپس ہوئے تو یوسف کا چہرہ متغیر تھا - اس سے عیاں تھا کہ ان کا دل اس مقدس فضا سے بہت زیادہ متاثر ہو چکا ہے - بر چونڈی شریف سے سٹیشن تک انھوں نے یہ مشہور نظم لکھی جس کا ایک اور شعر یہ ہے:

گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں
میں اگر قول محمدؐ کو نمایاں کر دوں

(ہفتہ وار تنظیم، کوئٹہ، ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ع)

اس قدر شعلہ فشاں بزم جہاں میں ہو جاؤں
ذرے ذرے میں بپا حشر کا ساماں کردوں
میں وہ مالی ہوں، اگر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کردوں
اسی ایقان براہیم کا وارث ہوں عزیز
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کر دوں

حاضرین مجلس نے اس نظم کو بڑے مزے لے لے کر سنا اور ہر طرف سے اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ اس نظم سے نہ صرف لوگوں کے دلوں کو سرور پہنچا بلکہ قومی جذبے کے جوش نے ہر شخص میں نئی روح پھونک دی۔

کانفرنس کے مطالبات بلوچوں کی سماجی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی ترقی سے متعلق تھے۔ چند قرار دادیں یہ ہیں:

لب اور ولور (شادی کی قیمت) کو ختم کیا جائے۔ بچیوں کی تعلیم رائج ہو، عورت کو معاشرے میں بلند مقام عطا کیا جائے، عدالتوں میں فیصلے اور پیشیاں تیز رفتاری سے ہوں، فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کو ختم کیا جائے، اعلیٰ تعلیم کی خاطر بلوچستان میں کالج قائم ہو، ملازمتوں میں بلوچستانیوں کے حقوق کی حفاظت ہو، بلوچستان میں صنعت کا قیام ہو، قحبہ خانے ختم کیے جائیں، شراب بند کی جائے، بلوچ رجمنٹ میں از سر نو بلوچوں کو بھرتی کیا جائے اور بلوچستان میں دستوری حکومت قائم ہو۔

ایک قرارداد کے ذریعے میر محمد اعظم خان آف قلات کو ان کے ایک سال کے کامیاب عہد حکومت پر مبارک باد دی گئی[1]۔

۱۔ آل انڈیا بلوچ کانفرنس جیکب آباد کی مکمل روداد مرتبہ مرید حسین خان مگسی بلوچ بی۔ اے کلاس اسلامیہ کالج لاہور پیش نظر ہے۔ یہ پمفلٹ چونسٹھ صفحوں پر مشتمل ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یوسف عزیز کے ذہن کا غالب ترین خیال بلوچوں کی حیاتِ نو تھا اور اس کے حصول کے لیے انھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے - بلوچوں کو اُبھارنے کے لیے آپ نے بذات خود فارسی اور اُردو میں لکھا - اپنے احباب کو اُردو میں بے شمار خطوط تحریر کیے ، جو اب تک غیر محفوظ ہیں - انھیں پاکستان کی آیندہ نسلوں کی خاطر محفوظ کرنا چاہیے - وہ نہ صرف اُن کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

شروع میں ایک نظم درج ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :

ہماری چاہ میں یوسف نے سختیاں جھیلیں
تجھے خبر بھی ہے گم کردہ رہ جوان بلوچ ؟

یوسف عزیز مقدمے میں لکھتے ہیں : ''آخر میں اپنے ان کم نظر سیاہ بیں اور ''آمنوا کما امن السفہاء'' کہنے والے بھائیوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جنھیں بیٹھے بیٹھے ہماری تذلیل و تضحیک کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں - اپنے پیارے وطن کے بد اندیش بھائیوں کو اگر میں اللہ قادر کے الفاظ میں جواب پیش کروں ''الا انھم ھم السفہاء و لکن لا یعلمون'' تو کیا آپ کے پاس کوئی جواب ہے ؟ نہیں اور یقیناً نہیں ! مگر میں آپ سے یہ بھی نہ کہوں گا ، اس لیے نہیں کہ میں آپ سے خوف کھاتا ہوں ، نہ اس لیے کہ آپ کی مددگار ایک مادی قوت ہے جس کے پاس کروڑوں مشین گنیں ، توپیں اور ہلاکت آفریں حربے ہیں ، بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ میرا خالق محبت کو پسند کرتا ہے - اس کے پاس نفرت قطعاً نہیں - دشمن ہو یا دوست ، مطیع ہو یا منکر ، سب کے لیے اس کی محبت یکساں ہے - مگر یہ عرض ضرور کروں گا کہ اگر میں سورج کی روشنی آنکھوں میں لے سکتا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ؟ اور اگر آپ صرف تاریکی ہی میں آنکھیں کھولنے کے عادی ہو گئے ہیں تو میرا کیا جرم ؟ تاریکی تو ہمارے جہل و فساد کی پیداوار ہے ورنہ یہاں تو روشنی ہی روشنی ہے - اللہ عظیم ہم سب کو روشنی دیکھنے والی آنکھ اور روشنی جذب کرنے والا دل عطا کرے - آمین !

کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد مری
میں ہوں اپنے خالق کی احسن تخلیق پر گواہ محمد یوسف علی خان عزیز مگسی -

اپنی شخصیت کے آئینہ دار ہیں بلکہ خاص طور پر بلوچوں کے ساتھ باطنی لگن اور عام طور پر مسلمانوں کے اصلاحی تقاضوں کو ظاہر کرتے ہیں ۔

اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مذہبی پارٹی کے قیام کا خیال میر تاج[1] محمد ولد میر بلوچ خاں ڈوسکی (تھنگوانی) کے نام خط بتاریخ ۲۱ مئی ۱۹۳۲ع سے ظاہر ہوتا ہے ، جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں :

''قریبی عرصے سے میرا ارادہ ہے سندھ بالخصوص جیکب آباد (جو مرکز ہے بلوچوں کا) آنے کا اور بلوچ بھائیوں کی امداد سے فی الحال ایک انجمن ''حزب اللہ'' (یعنی خدائی فوج) کی بنیاد ڈالنے کا ، جس کے اغراض و مقاصد واضح ہیں ، یعنی دین الٰہی و قیام بر دین الٰہی کی تبلیغ ۔ باقی جو کچھ ہوگا ان دو شقوں کے تشریحی سلسلے میں محسوب ہوگا ۔ ''خیر الناس من ینفع الناس'' (لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے) ۔''

یہ خط افشا کرتا ہے کہ وہ بلوچوں میں تازہ زندگی دوڑانا چاہتے تھے ، لیکن وہ کبھی متعصب نہ تھے ۔ انھوں نے براہ راست قرآن مجید کی طرف رجوع کیا اور اُس سے ساجی سپرٹ اخذ کی ۔ اس سلسلے میں وہ علامہ اقبال سے اثر پذیر ہوئے ۔ اُن کا نظریۂ اسلام حقیقی اسلامی نظریہ تھا ۔ اُنھوں نے محمد امین کھوسہ کو لندن سے ایک خط میں تحریر کیا :

'' ساری تباہی کا سبب انگریز نہیں بلکہ مذہب کو آلۂ کار بنانے والے ہیں ۔ ایسے لوگوں نے مذہب جیسی برگزیدہ اور بلند پایہ چیز کو محض اپنے لیے آلۂ کار بنا کر انسانی آبادی کے کثیر حصے کو تباہ کیا ہے ''۔

یوسف عزیز نے اسلام کے ساجی فلسفے کی روح کی جستجو کی ۔ یہ روح ان کے الفاظ میں اس طرح بیان ہو سکتی ہے :

''خدائے قدوس کے نزدیک انفرادی زندگی کی صلاحیت جماعتی

---

۱ ۔ ان خطوط کی نقلیں پروفیسر انور رومان کے پاس محفوظ ہیں ۔ ہم نے وہیں سے استفادہ کیا ہے ۔

منفعت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں ہمیں طریق استدعا بتایا گیا ، وہ جماعت کی طرف سے ہے ، فرد کی طرف سے نہیں ۔ سورۂ فاتحہ کو دیکھیے : ''اھدنا الصراط المستقیم'' ہے ۔ ''اھدنی الصراط المستقیم'' نہیں ''انعمت علیہم ، غیر المغضوب علیہم'' یہ سب جمع کے صیغہ جات ہیں''۔

گویا یوسف عزیز کے خیالات کے مطابق اسلام کا سماجی فلسفہ یہ تھا کہ انفرادی مفاد اجتماعی مفاد کے تابع ہو ۔ آج بھی ہمیں اپنے معاشرے میں اس کی اشد ضرورت ہے[۱] ۔

نوابزادہ راسخ العقیدہ قسم کے انسان تھے ۔ قید و بند کی صعوبتیں ، جرمانے اور قسم قسم کی مشکلات ان کے عزائم کو کمزور نہ کر سکیں ۔ مئی ۱۹۳۳ء میں آپ نے ''بلوچستان کی آواز'' کے نام سے ایک پمفلٹ طبع کرا کے برطانوی پارلیمان لندن کو بھجوایا اور اپنے عوام کے مطالبات اور علاقائی مسائل کی خاطر بلوچستان کا پہلا اخبار ''بلوچستان'' بھی آپ ہی کی کوششوں سے وجود میں آیا ۔ اس کے بعد علی الترتیب ''البلوچ'' ''بلوچستان جدید'' اور ''ینگ بلوچستان'' جاری ہوئے ۔ ان کا مرکز کراچی تھا اور سرپرست یوسف عزیز ہی تھے ۔ ان اخباروں کے ایڈیٹر میر محمد حسین عنقا تھے ۔ مذکورہ اخبار یکے بعد دیگرے ضبط ہوئے[۲] ۔

۱۹۳۳ء میں نوابزادہ کے بھائی سردار گل محمد خان زیب کو جھل مگسی کی نوابی سے علیحدہ کر کے نوابزادہ کو جھل مگسی کا نواب اور سردار بنا دیا گیا ۔ اس طرح آپ کو بے شمار مواقع دستیاب ہوئے کہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائیں ۔ آپ نے اپنے علاقے میں متعدد اصلاحات نافذ کیں ؛ مثلاً کھیرتر نہر کا بنوانا ، جس سے سندھ کی سرحد کے قریب علاقہ مگسی کا خاصا رقبہ سیراب ہوا ، ایک چھوٹے شہر کوٹ یوسف علی خان کی بنیاد ڈالی اور وہاں سکول قائم کیا ۔ جامعۂ یوسفیہ کی بنیاد ، ڈسپنسری ، غریبوں

۱۔ رومان ، انور ، پروفیسر : ''یوسف عزیز مگسی'' بولان ، کوئٹہ ۱۹۵۵ء ۔
۲۔ جنگ ، کراچی ، ۳ جون ۱۹۶۷ء ۔ صاحب مضمون کو مغالطہ ہوا ہے پہلا اخبار ''البلوچ'' تھا تفصیل ''صحافت'' کے تحت دیکھیے ۔

کے لیے دارالاقامہ کا بند و بست وغیرہ[1] ۔

حکومت وقت سے نوابزادہ میر یوسف علی خان مگسی کا باغیانہ رویہ ، آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا انعقاد ، سرمایہ دار اور صاحب اقتدار طبقے کی مخالفت ، ''شمس گردی'' نامی پمفلٹ کا اجرا ، اپنی ریاست میں حکومت کی مرضی کے خلاف ترقی پسندانہ اصلاحات اور عوام میں انتہائی مقبولیت ، نیز اس قسم کے دوسرے واقعات نے انگریز کو پاگل کردیا ۔ چنانچہ ۱۹۳۴ع میں نوابزادہ کو بظاہر بحالی صحت کے لیے اور در حقیقت جلاوطنی کے طور پر لندن روانہ کر دیا گیا ۔ آپ نے جاتے ہوئے بمبئی سے عنقا کو ایک خط برائے اشاعت ارسال کیا جس کا مضمون یہ تھا[2] ۔

''الوداعی پیغام اہل بلوچستان کے نام :

بادہ ہے نیم رس ابھی ، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

مجبوراً یورپ جا رہا ہوں ۔ مجھے کافی احساس ہے کہ میری غیر حاضری آپ کے لیے کس قدر ذہنی اذیت کا باعث ہوگی ، مگر کیا کیا جائے ، اس کے سوا چارۂ کار نہیں ۔ آپ کا بادہ بھی تو نیم رس ہے اور شوق بھی تو ابھی نارسا ہے ۔ یہی بہتر ہے کہ خُم کے سر پر

۱۔ کوثر ، انعام الحق ، ڈاکٹر : ''بلوچستان کا پہلا مرد قلندر'' میزان کوئٹہ ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۶ع ۔ جامعہ یوسفیہ کی تفصیل ''درس و تدریس'' میں ملاحظہ کیجیے ۔

۲۔ جنگ ، کراچی ، ۳ جون ۱۹۶۷ع ۔
''میزان'' کوئٹہ ، (شمارہ یکم جون ۱۹۵۱ع) میں مندرج ہے : ''آپ فروری ۱۹۳۴ع میں بلوچستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں انگلستان تشریف لے گئے تھے جبکہ سر نارمن کیٹر جیسا قدامت پسند انگریز بلوچستان میں اے جی جی تھا . . . بمبئی مالابار ہل میں حضرت قائد اعظم کی خدمت میں مرحوم یوسف کئی بار حاضر ہوئے اور انگلستان سے واپس آ کر ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ع کے دن بھی مرحوم نواب یوسف علی خان قائد اعظم سے ملے''۔

خشت ہی رہنے دی جائے۔

تو جوان خام سوزے، سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سرایم بہ تو سازگار بادا

آپ جانتے ہیں کہ میں نے، جس قدر بھی میرے عزایم کا احاطہ تھا، کے مطابق خلوص اور بے غرضی سے قوم و ملک کی خدمت کی۔ اور بس خدمت کا معاوضہ اگر چاہا بھی تو صرف یہی کہ میرا ضمیر اور میری روح مطمئن ہے اور کہہ سکتا ہوں کہ:

حاصل عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اگر زندہ رہا اور صحتِ جسمانی بھی معاون رہی تو ان شاء اللہ پھر جلد ہی آپ کے درمیان میں ہوں گا اور آپ یقین رکھیں کہ میں بہرحال آپ کے درد اور آپ کی تکالیف کے احساس سے آزاد نہیں رہ سکوں گا:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

میں ۲۷ ماہ حال لندن روانہ ہو رہا ہوں، پُرنم آنکھوں اور خوں ریز دل کے ساتھ:

آپ کا درد سینے میں دبا کر جانے والا عزیز مگسی، از بمبئی
۲۵ مارچ ۱۹۳۴ء۔"

قاہرہ (مصر) پہنچ کر آپ نے اپنی معرکۃ الآرا نظم:
"اپنی خوشی سے آپ ہؤا ہوں جلا وطن"
اشاعت کے لیے بھجوائی۔ اس سے وطن اور دوستوں سے ان کی بے پناہ محبت واضح ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

قسم اُس درد کی، حصہ میں آیا جو نبوت کے
قسم اُس جوش کی پہلو میں آیا جو محبت کے
قسم ہے اُن نیازوں کی جو ناز عشق بن جائیں
قسم ہے اُن نمازوں کی جو ناز عشق بن جائیں

قسم ہے اُس جنوں کی جو نصیب قیس دانا تھا
قسم ہے اُس دہن کی جس پہ اُلفت کا ترانا تھا

قسم رسوائیوں کی جن سے زینت ہے محبت کی
قسم بدنامیوں کی جن سے قیمت ہے محبت کی

قسم ہے کبریائے عشق شیطاں ساز کی یارب
قسم اُس کبر اور انکار ایقاں ساز کی یارب

قسم ہے غزوۂ بدر و اُحد میں مرنے والوں کی
قسم ہے کربلا کو خون سے تر کرنے والوں کی

قسم اُس شور کی جو رونقِ خم‌خانہ ہوتا ہے
قسم اُس دُرد کی جو زینتِ پیمانہ ہوتا ہے

قسم اُس ناخدا کی جو ندیمِ جوش طوفاں ہو
قسم اُس بادباں کی جو رفیقِ رعد و باراں ہو

قسم اُس مرد غازی کی جو فطرت میں حجازی تھا
گلے پر جس کے خنجر تھا مگر پھر بھی نمازی تھا

قسم ہے اُسی بطحا کے ایثار و شجاعت کی
شکم پر سنگ خارا باندھنے والی سخاوت کی

کہ اپنے ملک سے داغ غلامی دھو کے چھوڑوں گا
بلوچستاں کو آزادی کی مے پلوا کے چھوڑوں گا

جلا کر استخواں کے مغز سے شمعِ دلِ مضطر
عزیزانِ وطن کی بزم کو چمکا کے چھوڑوں گا

کٹا کر چند سر اور گردنیں اپنے رفیقوں کی
زکوٰۃ فرض اپنی قوم سے دلوا کے چھوڑوں گا

میں پھر انداز نو سے نغمۂ حب وطن گا کر
سکوت اندوز تار اسلام کا بجوا کے چھوڑوں گا

سبق دے کر اخوت کا، شجاعت کا، محبت کا
میں پھر بگڑی بلوچستان کی بنوا کے چھوڑوں گا

میں پھر اعلان کرتا ہوں میں پھر اقرار کرتا ہوں
میں اپنی بات پر پھر یوسفی اصرار کرتا ہوں
کہ اے اہل وطن جس وقت تم مجھ کو بلاؤ گے
مجھے سر باز دیکھو گے، مجھے جانباز پاؤ گے[۱]
(قاہرہ، ۳ اپریل ۱۹۳۴ع)

یوسف عزیز نے انگلینڈ کے تعلیمی اور سماجی اداروں کا مطالعہ کیا اور لندن میں اپنے قیام کے دوران بلوچوں کے لیے ایک دارالاقامت بنانے کی تجویز کی، تا کہ جب بلوچ طلبہ باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے جائیں تو وہاں قیام پذیر ہو سکیں۔ لندن سے واپسی پر ان کے ساتھی عنقا نے مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے ایک نظم ''یوسف طرح دار آ گیا'' حاصل کر کے اپنے اخبار کے صفحہ اول پر شائع کی۔ آپ کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے شاندار استقبال کیا۔ آپ نے واپسی پر ''سیاسیات مقدم ہے یا اقتصادیات'' کے عنوان سے ایک زوردار مضمون لکھا جس میں جدید خیالات اس طرح واضح کیے:

''وہ اشخاص جو دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں، کیا انگلیوں پر نہیں گنے جا سکتے؟ ہمارے دیہات کی منتشر آبادی، جن کو نہ سونے کا ڈھنگ ہے، نہ کھانے کی ترتیب اور پھر سردار پرستی، بیماریوں سے بھرے ہوئے غلیظ گھروں اور سال ہا سال کے پرانے کپڑوں کا، جو جراثیم کا آشیاں بنے ہوئے ہیں، استعمال درد ناک نہیں؟''

لندن سے واپسی پر آپ نے ایک بار پھر بلوچوں کی تعمیر جدید کا بیڑا اٹھایا[۲]، لیکن بے حد المناک طریق سے وہ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ع کی رات

۱- زمیندار، لاہور، ۲۲ اپریل ۱۹۳۴ع۔
۲- ایک مقام پر فرماتے ہیں: ''ہم دنیا کے اہل الرائے اور منصف مزاج طبقے سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ مطالبہ ''جیو اور جینے دو''
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کو کوئٹہ کے خوفناک زلزلے کا شکار ہو گئے :

جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہؤا

بقول گل خاں نصیر :

در دل ما تخم آزادی نشاند — وائے یوسف رفت تخم او بماند
خون مارا فطرت سیماب داد — نوجواناں[۱] را دلِ بے تاب داد

اس طرح وہ انسان جس نے حکومت کو چکرا دیا ، لوگوں سے محبت کی ، جس میں بلوچوں کی تعمیر نو کے لیے جنون موجود تھا ، ہم سے جدا ہو گیا ۔ جو کچھ اُس نے کیا ، وہ معرکے کا اور دائمی حیثیت کا حامل ہے ۔

یوسف عزیز ، فیاض طبع اور روشن خیال سرداروں میں سے سمجھے جائیں گے جو مطلق العنان ہونے کے باوجود اپنے لوگوں کی بہتری کے لیے رات دن انتھک کام کرتے تھے ۔ ان کے دروازے ہمیشہ عیش و عشرت ، سستی اور سرکاری آداب کے لیے بند تھے لیکن عام انسانوں کے لیے ہمیشہ کھلے تھے جنھیں آپ اپنے مہمان اور مقدس امانت سمجھتے تھے۔ الغرض عزیز قوم کو ارفع ترین عظمت پر اٹھا دینا چاہتے تھے ۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم ، دوام ما

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

بغاوت ہے ؟ بد امنی ہے ؟ یہ قانون حیات کا وہ مسلمہ اصول ہے جس پر دنیا کے امن و عافیت کا قطعی انحصار ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ہر معقول اور فطری مطالبہ ، جو نوجوانِ بلوچستان کے منہ سے نکلتا ہے ، صرف اس لیے خطرناک اور باغیانہ سمجھا جائے کہ اس کے موجد ، اس کے مفسر ، اس کے ترجمان اور وکیل نوجوان ہیں ۔ اور آج کا نوجوانِ بلوچستان اس لیے باغی قرار دیا جائے کہ وہ نوجوان ہے اور کیوں زندہ رہنا چاہتا ہے ۔''

(''بلوچستان کا ایک شاعر ، ادب ، صحافی اور رہنما'' ۔ چاکر خان بلوچ ۔ جنگ کراچی ، ۳ جون ۱۹۶۷ع ۔)

۱- وارثی ، بشیر احمد ، تذکرہ مگسی سکھر ۱۹۵۸ع ، صفحہ ۷۸ ۔

یوسف عزیز نے بلوچستان کی غزل نواز محفلوں میں قومی راگ الاپے ۔ اُن کی شاعری کے چند مزید نمونے نذر قارئین کیے جاتے ہیں :

اے مطربِ نغمہ نواز

ہاں گائے جا ہاں گائے جا تانوں سے جی بھرمائے جا[۱]
اہل بلوچستان کو پھر شرمائے جا شرمائے جا
اے مطربِ نغمہ نواز

سن او غلامی کیا ہے تو اک پیکرِ لعنت ہے تو
جس قوم پہ نازل ہے تو اُس قوم پہ ذلت ہے تو
اے مطربِ نغمہ نواز

اے انقلاب دہر جاگ پھر کھول دے بوتل کے کاگ
امرا تو کھائیں مرغیاں مزدور کھائیں دال ساگ
اے مطربِ نغمہ نواز

اے گردشِ ایام تو قسمت کی باگیں سوڑ دے
جو رہنما غدار ہو تو اُس کی گردن توڑ دے
اے مطربِ نغمہ نواز

یہ نغمہ ہائے حرّیت سن او بلوچی قوم سن
اُٹھ اور آنکھیں کھول دے اے مست سکر و نوم سن
اے مطربِ نغمہ نواز

اس کو مٹا جلدی مٹا سردار ہو ، انگریز ہو
جو قوتِ شیطان ہو جو ثانیِ چنگیز ہو
اے مطربِ نغمہ نواز

ضرورت ہے

ضرورت ہے کہ پھر شمع وطن پہ نذر ہونے کو
وطن زادوں سے ہر آتش بجاں پروانہ ہو جائے

۱- نوکین دور ، کوئٹہ ، ۸ جون ۱۹۶۵ع -

فقط دانائیوں ہی سے مرادیں بر نہیں آتی
ضرورت ہے کہ داناؤں میں اک دیوانہ ہو جائے
ضرورت ہے اک ایسے ہی بلا نوش و بلا کش کی
کہ بوتل توڑ، خم کو پھینک، خود میخانہ ہو جائے
ضرورت ہے وطن کو ایک ایسے مرد کامل کی
کہ دستِ جنسِ آزادی کا جو بیعانہ ہو جائے
ضرورت ہے اک ایسے کاسۂ سر، شعلہ دیدہ کی
شرابِ آتشِ الفت کا جو پیمانہ ہو جائے

عافیت کوش احباب سے

کرم ہے تیغ جفا کا بقدر وسعتِ شوق
جسے ہو ذوقِ تماشا کفن بدوش آئے ۱

بنے گا کام نہ یاں اب قراردادوں سے
وہ سربلند ہے جو بن کے سرخ پوش آئے

نوائے گاندھی و جیکر سے کام بن نہ سکا
کہاں سا کوئی اب ساز پُر خروش آئے

اب آگے مرحلہ آتا ہے سخت کوشی کا
ہمارے ساتھ نہ اب کوئی عیش کوش آئے

نہ ہو سکے جو حریفِ خمار، جام تو کیا
مزہ تو جب ہے کہ پینے سے اور ہوش آئے

جناب شیخ کو چلتے ہی بن پڑی آخر
کچھ ایسی شان سے محفل میں بادہ نوش آئے

۱- بلوچستان جدید، کراچی، یکم مارچ ۱۹۳۴ء۔
یوسف عزیز کے فارسی کلام کے نمونے راقم الحروف کی کتاب ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' میں ملاحظہ فرمائیے۔

اُٹھ اے بلوچ ! بدل دے نظام فطرت کو
جگر پہ تیر چلیں اور دل میں جوش آئے

(۲۰ فروری ۱۹۳۴ء)

غرض یوسف علی خاں عزیز وہ پہلے مجاہد تھے جنھوں نے بلوچستانیوں کو بیدار کیا - آج بھی اُن کی یاد لوگوں کے دلوں میں موجود ہے - ہر سال ۳۱ مئی کو اُنھیں یاد کیا جاتا ہے اور اُن کا پیغام دہرایا جاتا ہے - انھوں نے اپنے خیالات کو اُردو زبان میں پیش کرکے اس خطے میں اردو کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے - اس پر سرزمینِ بلوچستان جتنا بھی فخر کرے کم ہے -

آپ کا مقبرہ کانسی کے قبرستان میں پہاڑ کے دامن میں ہے جس پر سنگ مرمر کا تعویذ بنا دیا گیا ہے - تعویذ پر آپ ہی کے کہے ہوئے اشعار کندہ ہیں - اکثر شعر پہلے پیش ہو چکے ، مزید دو شعر سن لیجیے :

کہاں ہے قوت حق اور کہاں مروت خلق
سنا کے تھک گئے ہم تو یہ حال زار اپنا[1]
عزیز ! سوت کا جب ایک دن معین ہے
مجاہدوں میں کرائیں نہ کیوں شمار اپنا

یوسف عزیز علم پرور اور عالموں کے قدردان بھی تھے - معروف شاعر احسان بن دانش کی کئی کتابیں آپ کے نام منسوب ہیں - انھوں نے ”غمِ ناگہاں“ کے تحت فرمایا تھا :

زندگانی جس سے تھی خواب گلستاں در کنار
وہ مرا یوسف ، وہ رشکِ ماہِ کنعاں کیا ہؤا؟
خون روتے ہیں سبھی ارکانِ تعمیرِ ادب[2]
کیا ہوا جانِ ادب یوسف علی خاں کیا ہؤا ؟

۱- رہبر نسواں ، کوئٹہ (آزادی نمبر ، اگست ستمبر ۱۹۴۹ء) ، صفحہ ۲۴ -
۲- نوائے وطن ، کوئٹہ ، ۱۶ جون ۱۹۵۵ء - (تعمیر ادب سے مراد انجمن تعمیر ادب مزنگ لاہور ہے) -

نواب زادہ یوسف علی خان عزیز کی زندگی ہی میں جب بلوچستان میں انگریزی استبداد کے خلاف پٹھانوں اور بلوچوں نے مل کر متحدہ محاذ بنایا تو انھوں نے اردو کی لشکری خصوصیت کے باعث اسی کو اپنا ذریعۂ اظہار قرار دیا ۔ اس راہ پر گامزن ہونے کے بعد جو چیز زیادہ معاون ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ اس خطے کی قومی تحریکیں اس برّعظیم کی تحریکوں سے کئی لحاظ سے مختلف ہونے کے باوجود ان سے کئی مصلحتوں کے پیش نظر اپنا رشتہ قائم کیے بغیر نہ رہ سکیں ، جس سے لازمی طور پر اس خطے کے بسنے والوں نے اس زبان کو اپنایا جو ان کے لیے قابل فہم ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکیں چلانے والوں کے لیے اجنبی نہ تھی ۔

چنانچہ بلوچستان میں اردو زبان نے سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ بھی ترقی کی ۔ بلوچ کانفرس ، انجمن وطن ، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی ، جمعیت العلما ، انجمن ملکی نوجوانان بلوچستان اور بلوچستان مزدور پارٹی وغیرہ تحریکیں گو خالص بلوچستانی تحریکیں تھیں ، تاہم ان کی کارروائیاں اردو میں ہوتی رہیں ۔[1] دو خبریں ملاحظہ فرمائیے جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ تحریکیں (ہمیں ان کے سیاسی نظریات سے بحث نہیں کرنی ہے) اس خطے میں کس طرح اردو کے فروغ کے لیے معاون ثابت ہو رہی تھیں ۔

۱۔ مشعل (ادارۂ ادب سبی بلوچستان) عبدالصمد درانی کا مضمون ''بلوچستان اور اُردو'' صفحہ ۸ ، ۹ ۔

ان سیاسی تحریکوں میں جو صاحبان پیش پیش رہے ، ان کے نام یہ ہیں : خان عبدالصمد خان ، محمد ایوب خان ، حاجی عبدالسلام خان ، ملک محمد عیسیٰ ، میر محمد اعظم شاہوانی ، میر عبدالعزیز کرد ، نواب زادہ عبدالرحمٰن بگٹی ، خان محمد ہاشم غلزئی ، جام نور اللہ خان ، میر شہباز خان نوشیروانی ، میر محمود گچکی ، میر بلوچ خان ڈومبکی ، میر عطا محمد مرغزانی ، ملک فیض محمد یوسف زئی ، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل ، مولوی محمد عمر ، مولوی عرض محمد ، میر فاضل خان ، مرزا فیض اللہ ، میر محمد امین خان کھوسہ ، مولانا عبداللہ ، میاں گلزار محمد ، محمد اقبال ، قاضی نور محمد ، قاضی رحمت اللہ ،

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ماہ فروری ۱۹۴۱ع میں سبی میں سیاسی ہفتہ منایا گیا ۔ اس کے ایک جلسے کی خبر یہ ہے : ''مولوی غلام حیدر کاکڑ کی تقریر اگرچہ سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کی چاشنیوں کا قوام تھا ، وہ اگرچہ پٹھانی طرز کی تذکیر و تانیث کی قیود سے آزاد قسم کی اردو میں تقریر فرما رہے تھے لیکن پھر بھی لوگ اس کو کمال پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے[1] ۔''

دوسری خبر[2] : یوم مئی کے موقع پر کوئٹہ کے مزدوروں کا عظیم الشان جلسہ ۔ صدر خادم قوم قاضی داد محمد[3] تھے ۔ ملک سید محمد ، اسدی اور سردار مہندر سنگھ نے نظمیں پڑھیں ، پھر محمد اقبال سلیم ، بلدیو سنگھ اور لاجپت رائے نے اُردو میں تقریریں کیں ۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

میر یعقوب ، میر عیسیٰ خاں قوسی ، محمد حسین عنقا ، محمد حسن نظامی ، نسیم تلوی ، اسلم اچکزئی ، اعظم اچکزئی ، عبدالکریم شورش ، میر مٹھا خاں مری ، ڈاکٹر محمد رمضان ، حرمت خاں ، خان لعل گل خاں ، سید رفیق شاہ ، میر شادی خاں ، خان محمد منشی ، میر غوث بخش بزنجو ، میر گل خاں نصیر ، میر محمد کھوسہ ، برکت علی آزاد ، ملک محمد رمضان ، میر جعفر خاں جمالی وغیرہ ۔

(ایلم ، مستونگ ، آزادی نمبر ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۶ع ۔ نوکین دور ، کوئٹہ ، مکران نمبر ، ۱۶ مارچ ۱۹۶۷ع) ۔

۱- ہفتہ وار ''الحق'' ولھاریخاں سبی ، ۸ مارچ ۱۹۴۱ع ۔

۲- نجات ، کراچی ، یکم جون ۱۹۴۱ع ۔

۳- جہاں میر بارو کی اولاد (بارو زئی) سبی اور اس کے محروسہ علاقوں کی سیادت مآب تھی ، وہاں قاضی داد محمد صاحب کے خاندان کا شمار اس علاقے کے فضیلت پناہ خاندان میں ہوتا تھا ۔ آپ مزدور تحریک کے روح رواں تھے ۔ انھوں نے ''بلوچستان مزدور یونین'' کے نام سے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی ۔ ۱۹۴۰ع میں سبی میں ایک مسجد کے ساتھ ''یوسف عزیز مزدور لائبریری'' قائم کی جس میں مشہور اخبارات باقاعدگی سے آتے تھے ۔ (پاسبان کوئٹہ ، ۲۰ دسمبر ۱۹۴۰ع ۔ ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع) آپ انجمن اسلامیہ سبی کے سیکرٹری بھی رہے (بلوچستان جدید کراچی یکم مارچ ۱۹۳۴ع) ۔ آپ کی تحریر کا نمونہ ''نثر نگاری' کے تحت دیکھیے ۔

ایک خط بھی ملاحظہ فرمائیے جو اُردو میں لکھا گیا اور جسے قلات[1] سٹیٹ نیشنل پارٹی (یہ پارٹی بمقام سبی ۵ فروری ۱۹۳۷ع کو عالمِ وجود میں آئی تھی) کی مکرانی شاخ کے صدر نے تحریر کیا تھا۔

''از تربت

۱۷-۷-۴۵

عالی جاہ مدبر قوم و وطن جناب صدر نیشنل پارٹی دام حشمتکم!
گزارش ہے کہ دعوت نامہ بابت شمولیت میٹنگ مقررہ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ع بساعت نیک پا کر باعث خوشنودی ہوئی۔ یاد آوری کا ممنون ہوں۔ چونکہ اس مضمون کا ایک دعوت نامہ محترم رفیق میر عیسیٰ خان قومی کے نام موصول ہوا تھا، آپ سے پوشیدہ نہ رہے کہ ہم دونوں کی غیر موجودگی تربت میں سیاسی مفاد کے منافی ہے اس لیے ہم نے اور ہمارے پارٹی نے متحد ہو کر مناسب سمجھا کہ ہمارے پارٹی کی جانب تربت سے محض محترم عیسیٰ خاں قومی کوئٹہ میں برائے شمولیت میٹنگ تشریف لے جا کر، جو ہمارے ملک و وطن کے لیے مفید خیال کریں، عمل فرمائیں۔

۱۔ ''مکران اور قومی تحریکیں۔'' عبدالکریم شورش۔ ''نوکین دور'' کوئٹہ، مکران نمبر، مارچ ۱۹۶۷ع۔ اس کے مرکزی صدر ۱۹۳۹ع تا ۱۹۴۷ع ملک عبدالرحیم خواجہ خیل (المتوفیٰ ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ع) تھے جو میدانِ سیاست کے ساتھ ساتھ رزم گاہِ صحافت میں بھی جولانیٔ طبع دکھاتے تھے۔ وہ ''البلوچ'' اور ''بلوچستان جدید'' کراچی میں مستقل مضامین لکھتے تھے۔ آپ نے روزنامہ ''زمیندار'' لاہور میں بھی ایک معرکۃالآرا مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں بلوچستان میں برطانوی راج کے تشدد اور آزادی تقریر و تحریر پر پابندی کے خلاف جذبات کا اظہار کیا گیا تھا ــ یہ زلزلے سے پہلے کی باتیں ہیں جبکہ اخبار بینی بھی اس خطے میں جرم سمجھی جاتی تھی۔(''میر عبدالرحیم خواجہ خیل'' از عبدالکریم شورش۔ بلوچی دنیا، ملتان، اکتوبر ۱۹۶۷ع، صفحہ ۱۰)۔

امید ہے آپ میرے عذرات مندرجہ بالا کو شرف قبولیت عطا فرما کر ہماری جانب سے محترم ممدوح کو ہمارے نمائندہ خیال فرمائیں گے ، عین نوازش ہوگی - ورنہ اگر میری موجودگی کو پارٹی ضروری سمجھتی ہے تو بذریعہ تار مطلع فرمائیں - دوسری ڈاک میں انشاء اللہ حاضر خدمت ہو جاؤں گا - زیادہ نوازش
عبدالسلام زمیندار تربت''

زلزلے کے جلد ہی بعد پہلی بار کوئٹہ سٹوڈنٹس یونین کے نام سے طلبہ کی ایک جماعت قائم ہوئی - اس کی ابتدا خالصہ سکول کوئٹہ سے ہوئی - دو تین برس تک اس تنظیم کا کام صرف کاچرل اور ادبی جلسے منعقد کرانا اور طلبہ میں ادبی اور تقریری ذوق پیدا کرنا رہا - اس کے صدر بلال مراد آبادی مرحوم تھے - یحییٰ بختیار اور عبدالصمد درانی سرگرم کارکن تھے - ماسٹر وزیر چند ان کی سرپرستی فرماتے تھے - بلال اور درانی کی کوششوں سے ایک رسالہ ''بہترین کوشش'' بھی منظر عام پر آیا تھا - اس یونین کو ۱۹۳۹ع میں بڑی آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا - جب فیسوں کی شرح میں اضافہ ہوا تو اس کے خلاف جد و جہد کی گئی[۱] -

زلزلے کے تین سال بعد اس خطے میں خاکسار تحریک بھی زوروں پر رہی - مولانا عبیداللہ خاں بلوچ ، جو یوسف عزیز کے ایما پر آئے تھے ، لکھتے ہیں :

''خاکسار تحریک زوروں پر تھی - ہمارے مکرم الحاج محمد سرفراز خاں کوئٹہ میں موجود تھے - دن کو ہم خطاب لکھتے ، رات کو اجتماع میں پڑھتے - بڑا مجمع ہوتا تھا - الحاج بھی موجود ہوتے - نہیں کہا جا سکتا کہ میرے ان خطبات سے بلوچستان کی فضا میں اردو کے لیے کوئی ارتعاش پیدا ہؤا - اتنا ضرور ہؤا کہ ان بیانات سے لوگوں کے کان اردو زبان سے آشنا ہوتے رہے - ویسے میرے

۱- ہماری جد و جہد (مطبوعہ ادارۂ ادب بلوچستان کوئٹہ ، صفحات ۱۲۱-۱۲۳) - بلال مرحوم کے بھی چند خطوط بنام عبدالصمد درانی پیش نظر ہیں جو اصالت پورہ مراد آباد سے لکھے گئے تھے -

کئی خطاب 'الاصلاح' میں شائع ہو کر آتے اور بلوچستان میں کثرت کے ساتھ تقسیم ہوتے تھے - یہ تحریک کا دور عروج تھا -"

بلوچستان میں مسلم لیگ کا قیام ۱۹۳۹ع کے موسم بہار میں عمل میں آیا تھا - مولانا عبیداللہ تحریر فرماتے ہیں :

"کوئٹہ اب ہماری لیگی سرگرمیوں کا مرکز تھا - شہر کے تمام محلوں ، دور دور تک آبادیوں میں جلسوں اور اجتماعات سے لیگی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا - ہماری تقریریں صاف اور سادہ اردو زبان میں ہوتی تھیں - ظاہر ہے بلوچستان میں اردو کو لانے میں اس خطابت نے نمایاں حصہ لیا ہوگا[1] -"

قیام پاکستان سے پیشتر ہی قائد اعظم کے ایما پر بلوچستان میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بھی قائم ہوئی تھی ، جس نے تحریک پاکستان کے لیے خاصا کام کیا تھا - اس کے پہلے جلسے (منعقدہ اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ) میں قائد اعظم نے بلوچستان کے عوام کو خطاب فرمایا تھا - ۱۹۴۶ع کے انتخابات میں بلوچستان کے طلبہ کے کئی دستوں نے ہندوستان کے ہر صوبے میں پہنچ کر مسلم لیگ کے لیے کام کیا - شہید ملت لیاقت علی خاں بلوچستان کے طلبہ کے اس کام سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس کی ستایش ان الفاظ میں کی :

"آپ نے ثابت کر دکھایا کہ بلوچستان سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دیگر صوبوں سے کمتر نہیں - جائیے ، خدا حافظ اور اپنے صوبے میں کام کیجیے - اللہ ہمارے ساتھ ہے[2] -"

۱- بلوچستان میں اردو ، از عبیداللہ خاں بلوچ (غیر مطبوعہ) کراچی ، تحریر ۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ع -

۲- ہماری جد و جہد (شائع کردہ ادارۂ ادب بلوچستان کوئٹہ ، صفحات ۱۲۸—۱۳۱) غلام کبریا خاں اپنے مضمون "آزادی کی جد و جہد میں خان احمد یار خاں والیِ قلات کا حسن کردار" (ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع) میں لکھتے ہیں :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس فیڈریشن نے متعدد پمفلٹ شائع کیے جو اردو میں تھے۔ چند ایک یہ ہیں :

۱۔ ''اسلامی اقتصادی مطالبہ'' : سولہ صفحوں پر مشتمل — اس میں مسلمان سے خرید و فروخت کا پرچار کیا گیا ہے۔

۲۔ ''فاقہ مست شہزادے'' : سولہ صفحات پر مبنی — اس میں بتایا گیا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں اور اللے تللے چھوڑ دیں۔

۳۔ ''مزدور اور کیمیا'' : کل صفحے سولہ — اس میں ملت اسلامیہ کے بیکار مزدوروں کے لیے قابل عمل نصیحتیں موجود ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے خود داری کو ختم کیے بغیر روٹی کمائی جا سکتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ اس کو نہ صرف گنگناتے رہیں بلکہ اس پر عمل بھی کریں :

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بعض دوسرے پمفلٹوں کے نام یہ تھے : ''فریب کاری'' ، ''واردھائی سامری کا نیا بُت'' ، ''کانگرس اور سرمایہ داری'' ، ''اقبال اور پشتون'' ، ''ملّیت اور قومیت پر ایک نظر'' ، ''شہید اعظم'' (نذر حسین) وغیرہ۔

ان پمفلٹوں کے مصنف فضل احمد غازی سینئر وائس پریزیڈنٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بلوچستان تھے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کوئٹہ نے ملک کے مایۂ ناز ماہرِ مالیات جناب زاہد حسین کے ایما پر اردو میں ایک پمفلٹ (بارہ صفحات) شائع

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

''اعلیٰ حضرت خان معظم نے ایک دیانت دار فرزند وطن کی طرح مسلمانان ہند کی امداد اور اسلام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر قائد اعظم اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور بلوچستان میں مسلم لیگ کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ بلوچستان مسلم لیگ کی تنظیم کے لیے قاضی محمد عیسیٰ کو نہ صرف اخلاقی امداد دی بلکہ مالی امداد پر بھی لاکھوں روپے صرف کیے۔''

کیا تھا جس کا عنوان تھا ''پاکستان اور اقتصادیاتِ بلوچستان'' ۔ اس میں اُن شکوک کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بلوچستان کی مالی حالت کے سلسلے میں پیدا کیے جا رہے تھے ۔

بلوچستان میں ان مختلف سیاسی پارٹیوں کے قیام کے پہلو بہ پہلو ان میں سے بعض نے اپنے اپنے اخبار بھی جاری کیے جو ان کی ترجمانی کرتے تھے ۔ یہ سب اخبار اردو میں تھے ، اس لیے ان سے بھی بلاشبہ اس خطے میں اردو کی ترویج کی خاطر بڑی مدد ملی ۔ ان کے اکثر مدیر بھی اسی خطے سے تعلق رکھتے تھے ۔ مولانا ظفر علی خاں ، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر جیسی قومی شخصیتیں اس خطے کے لوگوں کے جذبۂ آزادی کی پشت پناہی کرتی رہی ہیں ۔ بیرون بلوچستان سے ایسی کئی معروف ہستیاں وارد ہوتی رہیں جو صرف اردو ہی میں اپنے خیالات اجاگر کرتی تھیں[۱] ۔

آزادی کی ان مختلف تحریکوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بھی بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی اشاعت کے لیے ممد ثابت ہوئی ہیں ۔ ان تحریکوں کے بعض داعی بھی پاک و ہند کی فضاؤں میں خاصی شہرت کے مالک بن گئے تھے اور ان کی تحریریں مشہور رسائل و اخبارات کے صفحات کی زینت بنتی تھیں ۔

۱۔ اس سلسلے میں چند نام یہ ہیں : مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ، صاحبزادہ فیض الحسن ، قاضی احسان احمد ، مولانا مظہر علی اظہر ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی ، پروفیسر ملک عنایت اللہ ، نواب زادہ لیاقت علی خاں ، حاجی امین الدین صحرائی ، مولانا عبد الحامد بدایونی (پاسبان کوئٹہ ، شمارے ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ع ، ۴ اگست ۱۹۴۰ع) مولانا عبد المجید قرشی بانیِ تحریک سیرت پٹی لاہور بھی جون ۱۹۴۳ع میں آئے تھے اور دو تین ماہ قیام فرمایا تھا ۔

(پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ جون ۱۹۴۳ع)

روابط

انسان ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو کر عارضی یا مستقل سکونت اختیار کرتا رہتا ہے اور اس کے متعدد وجوہ ہو سکتے ہیں ؛ مثلاً محض نقل مکانی یا کاروبار یا پھر کسی پیشے میں مہارت یا حصول تعلیم یا ملازمت کے لیے بہتر وسائل کا میسر آنا ، یا پھر ملکی حالات کے باعث مذہب اور جان و مال کو خطرے میں پا کر ہجرت کرنا ، جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہؤا -

یہ باتیں ذہن میں رکھ کر بلوچستان کے حالات کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ ایسے کئی مقامی حضرات ہیں جو دوسری جگہ پر متمکن یا سکونت پذیر ہوئے اور تعلیم پائی - علاوہ بریں اس خطے میں اردو دان بھی مختلف حیثیتوں سے آتے جاتے رہے اور ان میں سے بہت سے گھرانے یہیں آباد ہو چکے ہیں - اس خطے میں ایسے لوگ بھی آ بسے ہیں جن کی مادری زبان تو اور تھی اور باہم وہ اُسی زبان میں بات چیت کرتے تھے ، لیکن مقامی لوگوں سے گفتگو اردو ہی میں ہوتی تھی - فورٹ سنڈیمن میں ایک بوڑھے رئیس سردار ''میرک[۱]'' نے بتایا کہ انھوں نے اردو زبان ہندوؤں سے سیکھی ہے ، اس لیے سیکھی کہ انگریزوں سے بھی اس زبان میں بات ہو سکتی تھی - انھوں نے بتایا کہ یہاں انگریزوں کی آمد سے پہلے بھی چند پڑھے لکھے لوگ اردو زبان میں بات چیت کر سکتے تھے -

فورٹ سنڈیمن میں انگریزوں کی آمد[۲] سے پیشتر ہندو گھرانے تجارت کی غرض سے آتے اور اکثر وہیں آباد ہو جاتے تھے - ضلع ژوب کی پہلی

۱- پروفیسر رفیع الدین کا راقم الحروف کے نام خط از فورٹ سنڈیمن مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۶ء -

۲- بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر (ژوب) بمبئی ۱۹۰۷ء ، صفحہ ۶۶ -

مردم شماری (۱۹۰۱ء) کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوؤں کی آبادی اٹھارہ سو انچاس افراد پر مشتمل تھی جو کل آبادی کا ساتواں حصہ بنتا تھا ۔ ان کا تعلق تحصیل کلاچی (ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں) اور تحصیل وہووا (Vihowa) (ضلع ڈیرہ غازی خاں) سے تھا ۔ ان لوگوں کی مادری زبانیں ملتانی اور ہندکو تھیں جن میں بہت معمولی فرق ہے ۔ انگریزوں نے ۱۸۹۰ء میں فورٹ سنڈیمن نام چھاؤنی کی بنیاد رکھی تو ہندوؤں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ان کے علاوہ ڈیرہ غازی خاں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع سے مسلمانوں کی آمد بھی شروع ہوگئی ۔ یہ سب لوگ آپس میں تو مادری زبان بولتے لیکن پٹھانوں سے اردو بولنے کی کوشش کرتے تھے ۔

فورٹ سنڈیمن کے علاقے میں اردو رائج کرنے میں خاکروبوں کا بھی بڑا حصہ ہے ۔ جب یہاں چھاؤنی کی بنا پڑی تو خاکروبوں کی ایک کھیپ جو تقریباً تیس خاندانوں پر مشتمل تھی ، پنجاب سے معقول سہولتوں کے وعدے کی بنا پر فورٹ سنڈیمن لائی گئی ۔ ان میں کئی گھرانے لاہور ، سیالکوٹ اور جالندھر کے اضلاع سے تعلق رکھتے تھے اور آج بھی یہیں آباد ہیں ۔ یہ لوگ ڈیرہ والوں سے بہتر اردو بول سکتے تھے اور مقامی آبادی کے ساتھ ان کا رابطہ جلد ہو گیا ، جس سے اردو کی توسیع میں مدد ملی ۔

چھاؤنی بن جانے سے سپاہی وغیرہ اکثر اردو بولتے تھے ۔ اس کا اثر بھی یقیناً پڑا ہوگا ۔ انگریزوں نے دفتر کا کام چلانے کے لیے کچھ منشی ملازم رکھے ، لیکن یہ لوگ ضلع ژوب سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان میں سے اکثر کوئٹہ اور گرد و نواح یا باہر سے متعلق تھے ۔ مقامی صاحبان پشتو اور اردو دونوں زبانیں جانتے تھے ۔

انسان اپنے ماحول سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا ۔ اس سے بعض باتیں اخذ کر لیتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ لسانی اعتبار سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایسی زبان اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے جو سب کے لیے مشترک ہو ۔ جیسے ایک شخص لنڈی کوتل سے کراچی تک سفر کرے یا پھر کراچی سے زاہدان اور چمن تک آئے اور وہ ہر مقام کی خاص زبان نہ جانتا ہو تو ہر سٹیشن پر ، ہر قلی ، ہر خوانچہ فروش ،

ہر دوکاندار اور ہر ساتھی سے اردو ہی میں بات کرے گا ۔

سر زمین بلوچستان میں متعدد زبانیں رائج ہونے کے باوصف قدر مشترک اُردو ہی ہے ۔ یہاں سے بعض اصحاب ملک کے دوسرے حصوں میں گئے ہیں اور بعض وہاں سے یہاں وارد ہوئے ہیں ۔ اس رابطے سے بھی اُردو کو اس خطے میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے ۔ اُن میں سے چند اہم شخصیتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔ بلوچستان کے حدود میں اردو زبان کے الفاظ پہلے پہل میر نصیر خاں[1] اول (۱۷۵۰ع—۱۷۹۴ع) کی فوج کے اُن سپاہیوں نے استعمال کیے ہوں گے جو احمد شاہ ابدالی کی افواج سے مل کر مرہٹوں کے مقابلے کے لیے ہندوستان گئے تھے ۔ پھر ان سپاہیوں نے پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی بھی کی تھی ۔

اس کے بعد انگریزوں کی عمل داری میں اردو زبان فوجیوں کی بولی کے طور پر ۱۸۳۹ع میں پہلی جنگ افغانستان کے وقت یہاں آئی ۔

اس سے پیشتر سید احمد شہید[2] بھی بغرض جہاد نکلے تھے تو بلوچستان سے گزرے تھے ۔ آپ ۱۴ ذی حجہ ۱۲۴۱ھ ، ۲۰ جولائی ۱۸۲۶ع کو شکار پور سے روانہ ہوئے جو ۱۶۱۷ع میں آباد ہؤا تھا اور اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے بہت جلد مشہور تجارتی منڈی بن گیا ۔ اس وجہ سے وہاں ہر ملک اور خطے کے لوگ آباد ہو گئے تھے ۔ پشتو ، سندھی ، پنجابی ، فارسی ، اُردو اور بلوچی زبانیں وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھیں ۔

وہاں سے خان گڑھ (موجودہ جیکب آباد) شاہ پور ، چھتر ، پھلیجی ، کھنہ بار اور شور سے ہوتے ہوئے ۲۶ ذی حجہ ، یکم اگست کو بھاگ پہنچ گئے ۔ چھتر میں محراب خاں فرساں روائے بلوچستان کی طرف سے مُلا محمد

۱- بلوچستان میں اردو ، غلام حسین سیماب حکیم ، ریڈیائی تقریر ۴ نومبر ۱۹۶۰ع ۔

۲- سید احمد شہید ، غلام رسول مہر ۔ لاہور ۱۹۵۴ع ، صفحات ۳۱۱—۳۲۰ ۔ سید صاحب کی تاریخ ولادت ۶ صفر ۱۲۰۱ھ ، ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ع ، مولد رائے بریلی (یو پی) ، تاریخ شہادت ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ، ۶ مئی ۱۸۳۱ع ۔

سے ملا۔ اس کی وساطت سے سید صاحب نے
حاکم تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ اس کی وساطت سے سید صاحب نے
دعوت نامۂ جہاد، محراب خاں کے پاس بھیجا۔ چھتر سے کھنہ بار تک مُلا
محمد ساتھ آیا اور لشکر کی ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کرا دیں۔ بھاگ اُس
زمانے میں کچھی علاقے کا بہت بڑا قصبہ تھا۔ دو ہزار کے قریب مکان تھے
اور کم و بیش ایک سو دس دوکانیں تھیں۔ سید صاحب قصبے کے مشرق
میں دروازے سے باہر ٹھہرے اور دو روز وہاں مقام رہا۔ حاکم علاقہ،
قاضی، شرفا، علما اور عوام بڑی عقیدت سے ملے۔ حاکم نے سید صاحب
کو چالیس پچاس غازیوں کے ساتھ دعوت طعام دی۔ خربوزے یہاں اتنے سستے
تھے کہ ایک پیسے میں پندرہ بیس مل جاتے تھے۔

۲۹ ذی حجہ (مطابق ۴ اگست) کو بھاگ سے نکلے تو حاجی شہر
میں ٹھہرے۔ راستے کا ایک رئیس سید صاحب کو انتہائی اصرار سے اپنے
مکان پر لے گیا اور پُر تکلف کھانا کھلایا۔ حاجی صاحب شہر سے نکلے تو
ایری میں قیام کیا۔ یکم محرم الحرام ۱۲۴۲ھ، ۶ اگست ۱۸۲۶ع کو سید
صاحب ڈھاڈر پہنچ گئے جو درۂ بولان کے جنوبی دہانے کا مشہور مقام ہے۔
قافلے پیدل جاتے آتے تھے تو ڈھاڈر کی اہمیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سید
صاحب ۴ محرم الحرام کو درۂ بولان میں داخل ہوئے۔ یہ سفر بہت کٹھن تھا۔
پانچ منزلوں (کھنڈلائی، کیرتا، بی بی نانی، مچھ قدیم اور دشت۔ درۂ بولان
کے شمالی دروازے سے عین متصل) کے بعد سرآب میں ٹھہرے جو دشت
سے سولہ میل تھا۔ سرآب سے کوئٹہ صرف آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔
اسی روز یا اگلے روز کوئٹے پہنچ گئے۔ حاکم کوئٹہ نے سید صاحب اور
غازیوں کی مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بیعت بھی کی اور ساتھ
جانے کے لیے بھی تیار ہوا، لیکن سید صاحب نے اسے روک دیا۔

کوئٹہ سے دو کوس پر سادات کا ایک گاؤں تھا۔ ایک روز وہ لوگ
آئے اور سید صاحب کو مع ایک سو غازیوں کے اپنے ہاں لے گئے۔ سید صاحب
چھتر سے محراب خاں کے پاس جہاد کا دعوت‌نامہ بھیج چکے تھے۔ پھر فوجوں
کے کمانڈر فتح محمد اخوند کے پاس مستونگ ایک وفد بھیجا۔ اخوند نے
بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور کہا ”قندھار و بلوچستان کے درمیان

حالتِ جنگ پیدا ہو گئی ہے اور قندھاری فوج کوئٹہ سے قریباً تیس کوس پر پہنچ گئی ہے ۔ اس وجہ سے جواب دینے میں دیر ہو گئی ۔ اب تین روز میں جواب کوئٹے پہنچ جائے گا ۔'' اخوند نے عزت و احترام سے وفد کو بھجوایا اور تحفے بھی دیے ۔

محراب خاں نے جواب دیا کہ آپ جس مہم پر جا رہے ہیں ، تشریف لے جائیں ۔ قندھاریوں کے ساتھ جنگ کا تصفیہ ہو جانے کے بعد جو کچھ مناسب سمجھا جائے گا بروئے کار آ جائے گا ۔

محراب خاں کے جواب کے بعد سید صاحب ۱۵ محرم الحرام ۱۲۴۲ھ بمطابق ۲۲ اگست ۱۸۲۶ء کو چل پڑے ۔ حاکم کوئٹہ پچاس ساٹھ سواروں کے ہمراہ تین کوس تک ساتھ گیا ۔ عام لوگ بھی ساتھ تھے ۔ رخصت کے وقت حاکم پر رقت طاری ہو گئی ۔

کوئٹے تک سفر کا بیشتر حصہ عام مسافروں ہی کی حیثیت میں طے ہؤا تھا ۔ کوئٹے سے آگے عوام کے جوشِ استقبال و پذیرائی کا رنگ بالکل دوسرا ہو گیا ۔ دور دور سے مرد و زن خربوزے وغیرہ لے کر راستے پر آ بیٹھتے تاکہ اس قدوسی لشکر کی زیارت سے برکت حاصل کریں ۔ عورتیں تبرکاً بچوں کے سروں پر ہاتھ پھراتیں ۔ ہر طرف سے سلام علیک ، مرحبا اور ''تڑے سوشے'' کی صدا بلند ہوتی ۔ سید صاحب سب کے لیے دعا فرماتے ۔

کوئٹے سے قندھار تک بارہ منزلوں میں سفر طے ہؤا ۔ سید صاحب کے ساتھ جو غازی گئے تھے ، ان کی تعداد پانسو اور چھ سو کے درمیان تھی۔ یہ اُردو زبان بولنے والے خطوں سے متعلق تھے ۔

مولوی غلام محی الدین قصوری[1] (المتوفی ۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ء) ایک نامور سیاسی اور سماجی رہنما تھے ۔ چالیس سال تک انجمن حمایت اسلام لاہور سے متعلق رہے ۔ آپ قلات میں پیدا ہوئے (۱۸۸۰ء) ۔ جب تحصیل علم کر چکے تو اپنے آبائی شہر قصور (ضلع لاہور) میں وکالت کرنے لگے ۔

صاحب علم و حکمت ، فلسفی ، ادیب و شاعر اور عظیم فن کار مرزا

۱- لیل و نہار ، لاہور ، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء ۔

محمد ہادی رسوا (۱۸۵۸ع - ۱۹۳۱ع) اپنی بیوی کی وفات کے بعد لکھنؤ سے بد دل ہوگئے - اسے خیر باد کہا اور رڑکی جا کر انجینئرنگ کالج میں داخل ہو گئے- رڑکی سے اوورسیئری کا امتحان پاس کر کے محکمۂ ریل میں ملازمت اختیار کی اور بلوچستان پہنچ گئے - کہتے ہیں کوئٹہ لائن کا سروے مرزا صاحب ہی نے کیا تھا[1] -

۱۹۰۳ع میں علامہ اقبال فورٹ سنڈیمن تشریف لائے تھے - ایک مکتوب نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شروانی[2] کو لکھا تھا:

''مخدوم و مکرم خاں صاحب !

السلام علیکم !

آپ کا نوازش نامہ لاہور ہوتا ہؤا مجھے یہاں ملا - میں ایک مصیبت میں مبتلا اس وقت لاہور سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر برٹش بلوچستان میں ہوں - آپ بھی خدا کی جناب میں دعا کریں کہ اس کا انجام اچھا ہو - آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے ، نظر ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا - اگر میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا -

آپ کا اقبال

از فورٹ سنڈیمن - برٹش بلوچستان

۲۵ مئی ۱۹۰۳ع''

آغا سید محبوب علی شاہ ریٹائرڈ سول جج کوئٹہ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد آغا سید شاہ حسن حاکم پغمان اور دیگر افراد خانوادہ کے ہمراہ کابل سے وارد لاہور ہوئے - پھر ۱۹۰۱ع میں نائب تحصیل دار ہو کر کوئٹہ چلے آئے - کابل کے سادات معروف کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ۱۸۸۱ع میں وہاں سے ہجرت کر کے آئے - مرحوم امیر شیر علی خاں ، شاہ افغانستان کے سپہ سالار افواج جنرل پرویز شاہ خان کے بھائی بھی تھے - آپ

۱- ابتدائیہ مرقع لیلیٰ مجنوں ، رسوا ، مرتبۂ عشرت رحمانی ، لاہور ۱۹۶۳ع - ''افکار'' نئی تخلیق نمبر، ۱۹۶۶ع ، صفحہ ۱۰۳ -

۲- ''اقبال نامہ'' حصہ اول ، پروفیسر شیخ عطاء اللہ ، صفحہ ۵ -

۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں وفات پائی ۔

آپ اُردو فارسی دونوں زبانوں کے ماہر تھے ۔ اُردو کی سرپرستی کیا کرتے تھے اور کوئٹے کی ایک پرانی بزم ادب کے نائب صدر بھی رہے ۔ حفیظ جالندھری زلزلے سے پہلے جب پہلی بار کوئٹہ آئے تو مرحوم نے اُن کے اعزاز میں ایک محفل ترتیب دی تھی اور اسلامیہ سکول کوئٹہ میں اُن کا کلام اُن کی زبانی سنا تھا ۔

آپ کے فرزند ارجمند وادیٔ شال کے ایک مشہور شاعر ہیں ۔ اُن کا نام ہے ماہر افغانی ۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (مصنف ''محاسنِ کلام غالب'') کوئٹہ میں رہے ۔ اپنے خطوط میں کوئٹے کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں مرحوم کے چھوٹے بھائی ، باپ یا کوئی اور بزرگ کوئٹے ہی میں مقیم تھے ۔ انھی دنوں ان کے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن علی گڑھ کالج میں داخل ہونے کی فکر میں تھے ۔ اُسے اپنے خطوں میں ہدایات لکھتے ہیں ۔ جن دو چار خطوں میں کوئٹے کا نام آیا ہے ، اُن کی تفصیل یہ ہے[1] :

''داشتہ آید بکار ۔ برائے برادر عزیز تر از جان حبیب الرحمٰن سلمہ

موصولہ کوئٹہ ۳ جون ۱۹۱۲ء دو شنبہ ۔''

صفحہ ۵۷ : ''امام الدین کوئٹے کا ، علی گڑھ کے علاء الدین سے اچھی شیروانیاں تراشتا اور سیتا ہے ۔''

صفحہ ۸۱ ''بادام مقشر کوئٹے سے ساتھ لے آنا ۔''

صفحہ ۱۴۴ : ''بخدمت عالی حضور قبلہ وکعبہ ام مکرم معظم مدظلہ العالی از دارالسعادت ، ۳ ستمبر ۱۹۱۲ء ۔

''مسٹر بدر الدین کے کوئٹہ آنے کا حال معلوم ہوا ۔ اُن کی ناکامیابی سے رنج ہوا ۔''

صفحہ ۱۶۰ : ''دارالسعادت ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء ۔

۱- باقیاتِ بجنوری ۔

عالی جناب قبلہ و کعبہ !

”بحمد اللہ رمضان بخیر و خوبی ختم ہؤا ، تمام روزے پورے ہوئے ۔

کوئٹے کے روزہ داروں کا حال معلوم ہؤا ۔ اللہ قبول فرمائے “۔

ملک محمد رمضان بلوچ اپنے ایک مضمون ”بابائے صحافت کا دورۂ بلوچستان ۱“ میں لکھتے ہیں کہ نواب ارباب کرم خاں کانسی کے قول کے مطابق مولانا ظفر علی خاں ۱۹۲۳ع-۱۹۲۴ع میں یہاں آئے تھے اور فرمایا تھا کہ ”جس ملت کو نواب محراب خاں ایسی غیور شخصیت کی قیادت کا شرف حاصل ہو ، وہ مستقبل میں کبھی غلام رہ سکتی ہے؟ یا کوئی طاقت اسے اپنے مخصوص مصالح کا آلۂ کار بنا سکتی ہے ؟

مجھے اس بات پر بھی بجا طور پر مسرت ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں سامراج کے خلاف جو جنگ آزادی لڑی جا رہی ہے ، اس کی صدائے بازگشت بلوچستان میں بھی سنی گئی ہے اور یہاں ایک نیا ولولہ اور نئی زندگی کروٹ لے رہی ہے ۔“

مولانا ظفر علی خاں نے ”بلوچستان“ کے متعلق یوں اپنے خیالات کو لباسِ شعر پہنایا تھا۲ :

مردانِ مجاہد ہیں گُردانِ بلوچستان
دبتے نہیں باطل سے شیرانِ بلوچستان

جس وقت سے قاسم نے گاڑا ہے یہاں جھنڈا
لغزش میں نہیں آیا ایمانِ بلوچستان

کیا لائیں گے خاطر میں ’خمخانۂ لندن کو
مستِ مۓ یثرب ہیں رندانِ بلوچستان

خوں شہ رگِ بطحا سے پہنچا جو یہاں بہ کر
گل رنگ ابھی تک ہے میدانِ بلوچستان

۱- ساربان ، مستونگ ، ۲۶ دسمبر ۱۹۵۷ع -
۲- البلوچ ، کراچی ، ۲۱ مئی ۱۹۳۴ع -

آزادیٔ کامل ہر حق ہے بدویّت کا
اور یہ بدویّت ہے سامانِ بلوچستان
وہ وقت بھی آتا ہے دیکھو گے ان آنکھوں سے
دارا و سکندر کو دربانِ بلوچستان

اسلام کی عزت پر سو جان سے قرباں ہے
ملت کو نہ بھولے گا احسانِ بلوچستان
ہے ذوق سخن جن کو سن کر اسے کہہ دیں گے
یہ نظمِ مرصع تھی شایانِ بلوچستان

اُسی دور میں عنقا نے لاہور کے مشہور روزنامہ اخبار ''احسان'' کے متعلق کہا تھا:

ترستا دیکھنے کو دہر ہے ایک
تری ہر دل عزیزی قہر ہے ایک
ترے لینے کو گاہک اس قدر جمع
دکاں کیا ہے کہ گویا شہر ہے ایک

انعام اللہ خاں کی نظم پڑھ کر
رگوں میں دوڑ جاتی لہر ہے ایک
مسلمانوں کے حق میں ہے مسیحا
ولے کافر کے حق میں زہر ہے ایک

تلطف ہائے ''احساں'' تو ہزاروں
یہ عنقا کی طرف سے مہر ہے ایک[۱]

ڈاکٹر محمد ایوب، نجم الدین روڈ کوئٹہ جون ۱۹۳۱ء[۲] میں کوئٹہ آئے۔ اُس سے پہلے پاک و ہند کے بعض مقامات کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں مصر، فلسطین وغیرہ میں بھی رہ چکے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں میڈیکل سکول آگرہ سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ بلوچستان میں اُنھوں نے شاہرگ، مچھ،

۱- ینگ بلوچستان، کراچی، ۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء۔
۲- بعنوان ''میری کہانی میری زبانی'' تحریر ۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء، کوئٹہ۔

بوستان ، قلعہ سیف اللہ وغیرہ میں خدمات سرانجام دیں - آخری دس سال (۱۹۳۰ع تا ۱۹۴۰ع) مستونگ میں گزارے - مستونگ اُس وقت ریاست قلات میں پولٹیکل ایجنٹ قلات کا ہیڈ کوارٹر تھا ، اور پولٹیکل ایجنٹ کی خاطر ریاست کی ڈسپنسری کے لیے بلوچستان کی گورنمنٹ سرکاری ڈاکٹر کی خدمات مستعار دیتی تھی - آپ نے تین خوانین (محمود خاں ، اعظم خاں اور احمد یار خاں) کا زمانہ دیکھا - یوسف عزیز مگسی مرحوم سے مستونگ کے جیل خانے میں خوب ملاقاتیں کیں - سر شمس شاہ کی ''ہوشیاریوں'' کو بھی ملاحظہ کیا - بقول اُن کے ''شمس شاہ کی تعلیم تو غالباً پرائمری تک تھی مگر وہ پٹواری کے درجے سے ترقی کرتے کرتے بلوچستان کے پہلے دیسی پولٹیکل ایجنٹ ہوئے اور بائیس سال تک ریاست میں سیاہ و سفید کے مالک رہے -''

شمس شاہ کے دوران وزارت میں صحافیوں کا ایک وفد لاہور سے کوئٹہ آیا تھا اور میر شمس شاہ اس وفد کو قلات لے گئے تھے - محمود خاں سے میر نے اُن کا تعارف کرایا - خاں صاحب نے دریافت کیا کہ ''صحافی کیا ہوتا ہے؟'' میر صاحب نے جواب دیا کہ ''صحافی کا پیشہ یہ ہے کہ اگر کسی سے خوش ہوں تو اپنے اخبار میں تعریف و توصیف کے پل باندھ دیتے ہیں ، ناراض ہوں تو ہجو گوئی و دشنام طرازی اختیار کرتے ہیں -'' محمود خاں نے کہا ''فہمیدم ، فہمیدم در ملک ما او را ''لوھڑی'' می گویند -''

۱۹۳۹ع میں ایک ''صاحب'' نے لیجسلیٹو اسمبلی دہلی میں بلوچستان کے متعلق تقریر کی تھی جو لاعلمی اور ہرزہ سرائی سے مملو تھی - ڈاکٹر ایوب نے اُن دنوں ''ایک واقفِ حال'' کے نام سے اخبار ''مدینہ'' بجنور (یو پی) میں ایک سلسلۂ مضامین شائع کرایا جسے کراچی اور کوئٹہ کے اخباروں نے بھی نقل کیا تھا - آپ کو جنگ کے باعث مستونگ چھوڑنا پڑا - جنگ کے دوران میں مختلف مقامات پر رہے - ۱۹۴۶ع میں جنگ کے اختتام پر میرٹھ اور وہاں سے رڑکی پہنچ گئے اور فوجی ہسپتال میں خدمت انجام دیتے رہے - چند ماہ سول سرجن بھی رہے - قیام پاکستان کے بعد کراچی ، پھر کوئٹہ آ گئے اور یہیں آباد ہو گئے - ۱۹۵۰ع میں پنشن لے لی اور اُس وقت سے پرائیویٹ پریکٹس کر رہے ہیں - ان کے خانوادے کے افراد ملک و ملت کی

خدمت انجام دے رہے ہیں۔

گوادر برصغیر پاک و ہند کا قدرتی حصہ تھا[۱] اور یہاں کے حالات سے ہمارے پرانے سیاسی رہنما ناآشنا نہ تھے۔ فی الحال صحیح تاریخ کا متعین کرنا مشکل ہے، غالباً ۱۹۳۰ع—۱۹۳۲ع کا عہد ہوگا جب کہ گوادر میں ایک فرقہ وارانہ فتنے نے جنم لیا تھا۔ ایک خوجہ نوجوان نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ مذہبی اختلاف نے فتنے کی شکل اختیار کر لی، اس لیے مولانا شوکت علی مرحوم (مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی)، مولوی محمد عثمان اور کراچی کے ایک معروف لیڈر پر مشتمل ایک وفد سر آغا خان مرحوم کے ایما سے گوادر آیا اور بگڑی ہوئی فضا کو ساز گار بنا کر واپس ہؤا۔

۱۹۳۵ع کے زلزلے سے قبل مولانا سید حبیب، مدیر روزنامہ ''سیاست'' لاہور نے نواب خاران کی دعوت پر سابقہ ریاست خاران کی سیاحت کی اور ایک تذکرہ ''تذکرۂ خاران'' کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں خاران کی تاریخ، جغرافیہ، رسومات، آثار قدیمہ (قبے، کتبے اور گبر بند وغیرہ) اور راستے کے شہروں سبی، مچ اور کوئٹہ وغیرہ کا حال بھی ملتا ہے۔ اس تذکرے کے کل صفحات ایک سو ہیں۔ اس میں زبان کے تحت درج ہے[۲]:

> ''اہلِ خاران کی اکثریت کی زبان بلوچی ہے۔ آبادی کا تین چوتھائی حصہ یہی زبان بولتا ہے۔ باقی بروہی زبان بولتے ہیں۔ ہندو سوداگر ہندوستان سے جا کر آباد ہوئے ہیں۔ وہ اور ایسے لوگ جو ہندوستان کی سیر کر چکے ہیں، اردو خوب بولتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نواب خاران بالخصوص اُردو اس عمدگی سے بولتے ہیں کہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے دہلی میں ضرور عرصے تک قیام کیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ آپ صرف ملک معظم کی تاج پوشی کے جشن میں شمولیت کے لیے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ ویسے سرکاری زبان فارسی ہے۔''

۱- ''دید و شنید'' نوکین دور کوئٹہ (مکران نمبر) ۱۶ مارچ ۱۹۶۷ع صفحہ ۵۰۔

۲- تذکرۂ خاران، صفحہ ۹۲۔

مولوی دین محمد مورخ دربارات شاہی و ایڈیٹر ''میونسپل گزٹ'' لاہور کئی کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ آپ ۱۹۳۲ء میں خان میر محمد اعظم جان خان قلات کی مسند نشینی کے موقع پر قلات تشریف لائے تھے۔ واپسی پر ایک کتاب ''یادگار تاجپوشی قلات ۱۹۳۲ء'' تحریر فرمائی جو فیروز پرنٹنگ ورکس سرکلر روڈ لاہور میں چھپی۔

اس کے ایک سو چھتیس صفحات ہیں۔ قیمت تین روپے ہے۔ کتاب کو کئی تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ریاست قلات کے عام حالات اور قدیم تاریخی واقعات درج کیے گئے ہیں۔ مولف نے ہتورام کی ''تاریخ بلوچستان'' سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ بعد میں ہزہائنس کے سوانح حیات اور دیگر کوائف و حالات اچھے انداز میں رقم کیے ہیں۔

مولانا غلام فرید سیالکوٹی[1] زلزلے سے پہلے اور بعد کئی سال تک بلوچستانیوں کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض فرماتے رہے۔ اُن کی تقریریں فرقہ پسندی سے بالا تر ہوتی تھیں اور کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ اتفاق و اتحاد پر زور دیتے تھے۔ اس خطے کے ایک طالب علم مسٹر علی دوست بگٹی نے، جو ۱۹۳۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے، علی گڑھ یونیورسٹی کی فٹ بال کی ٹیم میں شامل ہو کر ہندوستان کا دورہ کیا۔ ٹیم نے سرنگا پٹم بھی دیکھا جہاں سلطان ٹیپو شہید ہوئے تھے۔''علی دوست بگٹی کے تاثرات'' مقامی اخبار میں چھپے تھے۔[2] موصوف نے ۱۹۴۴ء میں ایل ایل بی پاس کیا۔[3]

۱۹۴۳ء میں مسٹر صالح محمد خان (مصنف تاریخ بلوچستان) پسر میر گل محمد خان سب انسپکٹر پولیس نے علی گڑھ سے ایم اے پاس کیا۔[4]

جولائی ۱۹۴۳ء میں محسن اردو جناب سر عبدالقادر کوئٹہ میں تشریف

۱۔ پاسبان، کوئٹہ، ۱۵ جون ۱۹۳۹ء۔
۲۔ پاسبان، کوئٹہ، ۱۵ جون ۱۹۳۹ء۔
۳۔ پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ جون ۱۹۴۴ء۔
۴۔ پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ مئی ۱۹۴۳ء۔

لائے تھے ۔ انھوں نے واپسی پر مچ سے محمد صادق شاذ کو خط لکھا تھا جو ذیل میں درج ہے :

"Mach"

۲۷-۷-۴۳

مکرمی جناب محمد صادق خاں صاحب شاذ

السلام علیکم ۔ ہم اس دن بخیریت یہاں پہنچ گئے اور پرسوں ان شاء اللہ یہاں سے روانۂ بہاولپور ہوں گے ۔ دوران قیام کوئٹہ میں جو توجہ آپ نے اور آپ کے احباب اور اربابِ بزم ادب نے فرمائی ، اس کے لیے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ادبِ اردو کی خدمت کے لیے جو کوشش آپ کرتے رہتے ہیں ، اسے ہر طرح کامیابی دے ۔

آپ نے جو کتاب "ناٹک ساگر" مجھے دی تھی وہ میرے ساتھ یہاں آ گئی ہے ۔ وہ میں خان صاحب شیخ اکرام علی صاحب کو دے جاؤں گا اور تاکید کر جاؤں گا کہ وہ اسے جلد آپ کے پاس پہنچا دیں ۔ جب مل جائے تو مجھے بہاولپور کے پتے سے مطلع کیجیے گا ۔

والسلام

آپ کا مخلص

عبدالقادر"

سید غلام شاہ ۱۹۳۵ع کے زلزلے کے وقت سے ۱۹۶۴ع تک کوئٹے کے محکمۂ ڈاک میں رہے ، اس کے بعد کراچی چلے گئے ، آج کل وہیں ہیں ۔ ہر چند وہ خود شاعر یا ادیب نہیں ہیں ، لیکن ادب پروری اور ادب دوستی میں اہل کوئٹہ میں وہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ملک کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہوگا جو کوئٹہ آیا ہو اور ان سے ملاقات نہ ہوئی ہو ۔ اُنھوں نے ہمیشہ ہر ادیب یا شاعر کی ، جو کبھی یہاں آیا ، میزبانی کا شرف حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ اُن علمی شخصیتوں میں سے چند ایک

یہ ہیں :
جگر مراد آبادی ، ادیب سہارنپوری ، قابل اجمیری ، نذر حیدر آبادی ، عبدالمجید سالک ، بابائے اردو عبدالحق ، مجید لاہوری ، ارم لکھنوی وغیرہ ۔
سید غلام شاہ کے فرزند سید عابد رضوی (ریڈیو پاکستان کوئٹہ) کو اردو ادب کے مطالعے کا شوق ورثے میں ملا ہے ۔ وہ بھی شاعر ہیں ۔
جگر مراد آبادی نے یہ غزل کوئٹہ میں قیام کے دوران میں کہی تھی[1] :

کیا قیامت تھا کسی کا شکوۂ بیداد بھی
لب تک آئی ٹکڑے ہو ہو کر مری فریاد بھی

پہلے تھی کچھ اس سے تسکینِ دلِ ناشاد بھی
اب کلیجا کھائے جاتی ہے تمھاری یاد بھی

جسم ہے زنداں میں لیکن روح بزم یار میں
بیڑیاں بھی پاؤں میں ہیں اور ہوں آزاد بھی

آتے ہی کنج قفس میں چپ سی مجھ کو لگ گئی
لے اُڑے کیا ہوش میرے طاقتِ پرواز بھی

یوں نہ اے بلبل تڑپ کر جان دینی تھی تجھے
چاہیے تھا کچھ تو پاسِ خاطرِ صیاد بھی

دیکھیے کس کی فغاں میں پہلے آتا ہے اثر
میں بھی نالے کر رہا ہوں ، بلبلِ ناشاد بھی

یہ ہجومِ یاس و حرماں ، یہ وفورِ رنج و غم
مجھ کو ڈر ہے، درد بن جائے نہ تیری یاد بھی

مجھ ہی سے کچھ واسطہ مطلب نہیں ان کو جگر
تیز ہوتا ہے مجھی پر خنجرِ بیداد بھی

بلوچستان کے مشہور تاریخ نویس سردار محمد خان گشکوری بلوچ ۱۹۱۴ء میں بمقام سل (سبی) پیدا ہوئے ۔ ۱۹۳۱ء میں سنڈیمن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔ ایف سی کالج لاہور میں ایف ایس سی

۱- شعلۂ طور ، حصہ اول ، لاہور ، صفحہ ۶۰ ۔

(نان میڈیکل) میں داخلہ لیا ، لیکن فٹ بال کی ٹیم کے کپتان بن گئے اور اُسی میں زیادہ دلچسپی کا اظہار فرمایا ۔ بعد میں علی گڑھ چلے گئے اور محنت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے ۔ وہاں سے ایل ایل بی پاس کر کے لوٹے اور ۱۹۴۰ع تا ۱۹۴۲ع ریاست قلات کے وزیر تعلیم رہے ۔ پھر علی گڑھ پہنچے اور ''لائف اینڈ ورکس آف احمد شاہ ابدالی'' پر تحقیق کرتے رہے ۔ جنگ کے باعث لندن سے کتابوں کے عکس وغیرہ نہ مل سکے اس لیے یہ تحقیق پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے ۔ آپ ''بلوچی اکیڈیمی'' [۱] کوئٹہ کے چیئرمین ہیں ۔ اب تک دو کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان : یہ کتاب ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ مصنف نے اسے خود ہی ۱۹۵۸ع میں کراچی سے چھپوایا ۔ پوسٹ بکس ۳۲ کوئٹہ سے دستیاب ہوتی ہے ۔ قیمت پچیس روپے ہے ۔

یورپین تاریخ دانوں نے زیادہ تر بلوچوں کو نسلی اعتبار سے آریا ثابت کیا ہے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ بتائی ہے کہ اُن کی زبان بلوچی ، اوستائی اور سنسکرت کی زبانوں سے ملتی ہے ۔ سردار صاحب نے مختلف دلائل سے اس تحقیق کو نادرست قرار دیا ہے ۔ اُن کے نزدیک بلوچ سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ عرب مورخین نے ''بلوص'' لکھا ہے کیونکہ عربی میں 'چ' موجود نہیں ۔ پھر وہ اس نظریے کے بھی قائل ہیں کہ کسی قوم کا حسب و نسب یا قدیم تاریخ معلوم کرنے کے لیے زبان کو بنیادی مقام دینا قرین مصلحت نہیں ۔

یہ کتاب مستند تاریخی دستاویزوں سے مزین کی گئی ہے اور تاریخ نویسی کی موجودہ ٹکنیک کو اپنایا گیا ہے [۲]۔ اس کا اُردو ترجمہ مصنف کی فرمایش

۱۔ اکتوبر ۱۹۶۳ع میں اس اکیڈیمی کا شاندار سالانہ جلسہ ہوا تھا جس کی کارروائی اُردو میں عمل میں لائی گئی تھی ۔ دوسرے پروگرام کے علاوہ عطا شاد نے ایک بلوچی نظم اور اس کا منظوم اُردو ترجمہ بھی پیش کیا تھا ۔
(نعرۂ حق ، کوئٹہ ، ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۳ع)

۲۔ پروفیسر انور رومان : ''بک ریویوز'' ، جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان ، جنوری ۱۹۶۵ع ۔

پر شعیب حزیں (ریڈیو پاکستان) نے کیا تھا۔

۲۔ محمد سردار خان کی دوسری کتاب ''دی گریٹ بلوچ'' بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ یہ ۲۶۵ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کی قیمت ۱۵ روپے ہے۔ لکھائی چھپائی بہترین، سرورق دیدہ زیب۔ اس کتاب کو سولہ تصویروں سے مزین کیا گیا ہے جو اس خطے سے متعلق ہیں۔

محمد سردار خان نے پہلے باب میں بہت دقت نظر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بلوچ قدیم ترین سامی ہیں۔ پھر بابل سے بلوچستان (پندرھویں صدی عیسوی) تک اُن کی زندگی کے مختلف ادوارِ اقتدار و انحطاط، آبادی و بربادی وغیرہ پر معقول بحث کی ہے۔ دوسرے باب میں بلوچ کردار کی صفات، جیسے مہمان نوازی، سخاوت، جانبازی، جذبۂ انتقام، نظریۂ وقار، پناہ گزین کی حفاظت وغیرہ پر بہت دلآویز طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے باب میں میر چاکر کا تذکرہ ہے۔ میر چاکر خان نے نہ صرف رندوں کو منظم کیا، نہ صرف لاشاریوں کے ساتھ اپنے تعلقات ہموار و خوشگوار رکھنے کی کوشش کی بلکہ مکران سے پانچ چھ لاکھ بلوچوں کے انخلا کو کامیاب طور پر منظم کیا اور انھیں بلوچستان، سندھ، پنجاب حتٰی کہ دہلی تک پھیلا دیا۔ افسوس کہ رند اور لاشار کی خانہ جنگی کی وجہ سے میر چاکر اپنی صفات بحیثیت منتظم زیادہ نمایاں نہ کر سکا، تاہم اُس کا اندازِ حیات و سلطنت ایسا تھا کہ نہ صرف وہ خود بے حد ہردلعزیز اور مقبول عام رہا اور رہے گا بلکہ اس کے اخلاق عالیہ کی وجہ سے لفظ ''رند'' بلوچوں میں عظمت، خاندانی شرافت اور بزرگی کے مترادف بن گیا اور ہر بلوچ خواہ وہ رند ہو یا غیر رند، رندوں پر فخر کرنے لگا۔

کتاب مجموعی طور پر بہت کامیاب ہے۔ بلوچ فہمی اور بلوچ شناسی کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

محمد سردار خان بلوچ غالباً پہلے انگریزی دان بلوچ فاضل ہیں جنھوں نے تاریخ کا جذباتی مطالعہ نہیں بلکہ معروضی اور عقلی مطالعہ کیا ہے۔ حقائق جیسے بھی ہوں وہ انھیں ویسے ہی سپرد قلم کر دیتے ہیں اور جو نتائج بھی برآمد ہوں وہ اخذ کر لیتے ہیں، خواہ وہ لوگوں کو کتنے ہی برے لگیں۔ یہ

آن کی ایک عظیم خوبی ہے:

قاضی عبدالرحیم صابر، خلف الرشید قاضی دین محمد، پسنی بندر (مکران) میں پیدا ہوئے، مڈل تک تعلیم پسنی میں ہی پائی - بعد میں کراچی پہنچے - مزید تعلیم کے بعد وہیں مدرسی اختیار کی - ان کی اُردو شاعری کی ابتدا ۱۹۳۸ع میں ہوئی - ۱۹۴۸ع سے بلوچی اور فارسی میں بھی شعر کہنے لگے - ۱۹۳۹ع سے اُردو میں لکھنا شروع کیا اور تصنیف و تالیف کا آغاز ۱۹۵۹ع میں ہؤا - ۱۹۴۳ع سے کراچی میں سکونت پذیر ہیں - اب تک ان کی پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں - تفصیل یہ ہے:

۱- بلوچستان کی وادیوں میں: سال اشاعت ۱۹۵۹ع، مقام اشاعت کراچی - عوامی کہانیوں پر مشتمل ہے، مثلاً شہداد و مہناز - حانی و شہ مرید، للہ و گراناز، محبت خان و سومری، بہرام و عازیز، حمّل و سہ گنج وغیرہ وغیرہ - یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ اس کی ایک ہزار کاپیاں فروخت ہو گئیں -

۱- بلوچستان کے جانباز: سال اشاعت ۱۹۶۰ع - قاضی عبدالرحیم صابر نے خود چھپوا کر ریکسرلین لیاری کوارٹر کراچی سے شائع کی - ۲۷۰ صفحوں پر مشتمل ہے - قیمت تین روپے ہے - اس کتاب میں بلوچ جانبازوں کے شاندار تاریخی کارنامے اور شجاعت و بہادری کی داستانیں ہیں - شمع وطن کے ان پروانوں میں سے میر محراب خان شہید خان قلات، سردار میر بلوچ خان نوشیروانی اور سردار میر محراب خان نوشیروانی مکرانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - میر محراب خان نوشیروانی اور میر بلوچ خان نوشیروانی نے مکران کے مرکز تربت سے چند میل دور جنوب کی طرف گوک پروش کے مقام پر انگریزوں کے ایک مسلح دستے کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا - یہ ۱۸۹۸ع کا واقعہ ہے - میر محراب خان خان قلات انگریزوں کا مقابلہ دلیری سے کرتے ہوئے میری قلات میں ۵ نومبر ۱۸۳۹ع کو شہید ہوئے تھے -

ہر داستان کے شروع میں موقع و محل کے مطابق کسی نہ کسی شاعر کا اُردو یا فارسی شعر درج کیا گیا ہے - میر حمّل خان کلمتی جو پرتگیزوں

کے ساتھ جنگ میں قیدی بنا ، غداری کی بجائے وطن کی آن کی خاطر موت کے گھاٹ اُتارا گیا ۔ اس کے حالات کی مناسبت سے یہ شعر درج ہے :

ہم سپاہی ، ہم سپہ گر ، ہم امیر
با عدو فولاد و با یاراں حریر (اقبال)

اکثر داستانیں قاضی صابر صاحب نے خود تحریر کی ہیں ، بعض دوسروں کی تحریر کردہ بھی ویسے ہی کتاب میں شامل کر لی ہیں ۔ اس سے کتاب کی افادیت میں فرق نہیں آیا ۔

۳۔ دو جہان ءِ سردار : (بلوچی) سیرت پاک ۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۶ء ، صفحات ۱۹۲ ۔ ہدیہ اڑھائی روپے ۔ شائع کردہ قاضی عبدالرحیم صابر ریکسر لائن لیاری کوارٹرز کراچی (کراچی میں ایک علاقہ لیاری کوارٹرز کے نام سے آباد ہے جس میں کل چھ لاکھ انسان بستے ہیں ۔ اُن میں سے چار لاکھ بلوچ ہیں جو بلوچوں کے مختلف قبائل سے متعلق ہیں ۔ یہ لوگ کئی پشتوں سے ایرانی اور پاکستانی مکران سے نقل مکانی کر کے آئے ، یہیں تعلیم پائی اور یہیں پھلے پھولے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کراچی کے اصل بانی اور معمار کلانچ (مکران) کے بلوچ ہیں)۔ اس کتاب میں آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ ، تعلیمات ، اخلاق اور کردار کو پیش کیا گیا ہے ۔ کتاب کی چھپائی آفسٹ پر ہوئی ہے ۔ کتابت مناسب ہے ۔

۴۔ صابر ءِ گفتار ۔ (مصنف کے بلوچی اشعار بمعہ اُردو ترجمہ) سال اشاعت : ۱۹۶۶ء ، صفحات ۱۹۲ ، قیمت اڑھائی روپے ۔ اسے بھی مصنف نے خود ہی چھپوایا ہے ۔ دو چار شعر بمعہ ترجمہ یہ ہیں :

پہ تئی محبوب ءَ صابر بات قرباں
گوں تو رب ءَ منی یکّیں سوال اِنت (صفحہ ۴)

(تیرے محبوب ، سرکار دو عالم پر صابر قربان ہو جائے ۔ اے رب ! تجھ سے بس ایک ہی سوال ہے ۔ صفحہ ۵) ۔

محبت چِدو دیم ءَ صابر نہ بیت انت
کہ من سجدہ ءِ بے ریا لوٹگایاں (صفحہ ۱۵۷)

(اس سے بڑھ کر صابر محبت اور کیا ہوگی کہ میں سجدۂ بے ریاء مانگ رہا ہوں ۔ صفحہ ۱۵۸)

بکن قوما بیدار است تا ترا دم
دلا تئی محبت ببات گیش و محکم (صفحہ ۹۴)

(قوم کو بیدار کر جہاں تک ہو سکے اور تیرے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ دن بدن بڑھتا رہے ۔ صفحہ ۹۶) ۔

۵۔ مکران ـــــ تاریخ کے آئینے میں : صفحات ۳۲۰ ، سال اشاعت اپریل ۱۹۶۷ع ، قیمت پانچ روپے ۔ ملنے کا پتہ : قاضی عبدالرحیم صابر ریکسر لائن لیاری کوارٹر کراچی ۱ ۔

یہ کتاب اکتالیس مضامین پر مبنی ہے جو مکران کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں ۔ مؤلف نے اپنے علاوہ بارہ دوسرے مصنفوں کے مضامین کو بھی کتاب میں شامل کیا ہے ۔ چند عنوانات یہ ہیں : مکران (مولف) ، عرب فاتحین مکران میں (شیدائی) ، مکران مختلف ادوار میں (صالح محمد خان لہڑی) ، میر شیخ عمر خان آغوش اسلام میں (نصیر نوشکوی) ، گنج آباد سے مکران تک (مرحوم مولوی عبداللہ قاضی مکران) شجرۂ نسب گچکیاں (ہتو رام) ، مکران اور اُس کا جغرافیہ (عبدالصمد سربازی) ، پسنی (قاضی رحمت اللہ ـــ عربی فارسی کے جید عالم ۔ کئی زبانوں کے علاوہ اُردو میں مہارت رکھتے ہیں ۔ پسنی بندر میں سکونت رکھتے ہیں ۔ تبلیغ اور علم و ادب کے سلسلے میں آپ کی خدمات نمایاں ہیں [1]) ، مکران میں معاشی انقلاب (ڈاکٹر عثمانی) ، آثار قدیمہ (میر محمود خان گچکی) ، مکران کے ممتاز شاعر و موسیقار (مولف) ، کُلانچ (مولف) ، کیچ (مولف) گوادر بندر (مولف) ، مکران کا ماضی و حال (مولف) وغیرہ ۔

سرزمینِ مکران کو روشناس کرانے کے لیے قاضی عبدالرحیم صابر کی یہ کوشش یقیناً قابل قدر ہے ۔ اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جانا چاہیے ۔

۱۔ بلوچستان کے جانباز ، صفحہ ۲۷۰ ۔

قاضی موصوف کے اُردو کلام کا نمونہ بھی دیکھیے[۱] :

ایماں ہو مسلماں کا فقط ایک خدا پر
انسان کے آگے نہ جھکے اُس کا کبھی سر
اُس در کے سوا اور نہ ڈھونڈے وہ نیا در
خالق کا یہ ارشاد ہے فرقان میں مسطور
ہو خوفِ خدا دل میں تو ہر رنج و بلا دور

وہی سارے نبیوں کے سرتاج ہیں
وہی صاحبِ تاج و معراج ہیں
شفاعت کے سب اُن کی محتاج ہیں
چمکتا رہے گا سدا اُن کا نام
پڑھو اُن پہ لاکھوں درود و سلام

قدم بڑھائے نہ کوئی ہماری سرحد پر
کھڑے ہیں تیغ بکف شہسوارِ پاکستاں
یہی ہے میری تمنا کہ بار بار جیوں
ہزار بار کروں جاں، نثارِ پاکستاں

ہر کوہ و دمن ملک کا دیتا ہے گواہی
ہر فرد ہے اس قوم کا جانباز سپاہی
درکار ہے بس ان کو ذرا پشت پناہی
پھر سامنے داراب ہو یا لشکرِ فغفور
اب ملک کو درکار ہے قرآن کا دستور

چمن میں دو گھڑی پہلے خزاں کا دورہ تھا
ابھی وہ آئے تو ہر سمت میں بہاراں ہے

۱- کراچی سے قاضی عبدالرحیم صابر کے خطوط راقم الحروف کے نام (۱۶ ستمبر ۱۹۶۷ع اور ۱۸ ستمبر ۱۹۶۷ع)۔

جہاں جہاں بھی قدم اُن کا پڑ گیا صابر
مری نگاہ میں ہر ذرہ ماہِ تاباں ہے

گذشتہ کئی سال سے مکران کے متعدد طلبہ کراچی سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں اور بلوچستان کے مختلف حصوں میں اہم عہدوں پر متعین ہیں۔ بہت سے زیر تعلیم ہیں جو روانی سے اُردو لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ مثلاً :

بشیر احمد بلوچ ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ۔ آپ نے ۱۹۵۱ع میں تربت سے میٹرک پاس کیا۔ ایم اے (معاشیات - ۱۹۵۷ع) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں کراچی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔

عبد المالک بلوچ بی اے آنرز (سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ)۔ ڈاکٹر ریاض (سول سرجن تربت)۔ ڈاکٹر محمد موسیٰ (میڈیکل آفیسر بھاگ)۔ محمد حسن بلوچ (آپ علی گڑھ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ ای اے سی)۔ فقیر محمد بلوچ (ای اے سی)۔ غفار ندیم ایم اے (ذکریوں کے فارسی شعرا کے بارے میں کئی مضمون سپرد قلم کر چکے ہیں)۔ ملک محمد طوق (ریڈیو ایران زاہدان میں اُردو پروگرام کے انچارج) وغیرہ۔

تقسیم ملک سے پیشتر بعض صاحبان لاہور وغیرہ میں زیر تعلیم رہے ہیں ، جیسے :

محمد ہاشم غلزئی (اسلامیہ کالج لاہور- زلزلے سے پہلے) ، محمد عظیم خان (اسلامیہ کالج لاہور) ، میر غوث بخش بزنجو ، میرگل خاں نصیر ، کرنل سلطان ، عبدالحق ترین ، میجر نذر (غالب کے شارح رہے) ، آغا سلطان ابراہیم جان ، آغا عبدالقادر اور عبدالحق زبور (سبھی اسلامیہ کالج لاہور)۔ یہ فٹ بال کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے ، اسی لیے اسلامیہ کالج لاہور نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سردار رشید جان اور سردار انور جان (اردو میں بہت اچھے شعر کہتے ہیں) گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم رہے۔ عبدالصمد درانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ) خالصہ کالج امرتسر میں علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ اپنے کالج کی میگزین ''دربار'' کے حصۂ اردو کے ایڈیٹر رہے۔

نواب میر غوث بخش رئیسانی (ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون میں تعلیم پائی)

کے والد نواب میر اسد اللہ خان ، علامہ اقبال کے گرویدہ تھے - ۳ مئی ۱۹۳۲ء کو ہز ہائنس نواب بہادر سر میر محمد اعظم خان صاحب خانِ قلات کا دربارِ تاجپوشی منعقد ہوا تھا جس میں پہلے خان صاحب موصوف نے اُردو میں تقریر کی ، پھر سرداران و خوانین قلات کی جانب سے سردار نواب اسداللہ خان نے اُردو میں تقریر کی[1] -

دار العلوم دیوبند ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا - اُس کے متعلق ''اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ'' (جلد دوم حصہ دوم[1]) میں مندرج ہے کہ اس دار العلوم نے اردو کی نشو و نما اور مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ وہاں اسی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی - وہ طلبہ جو برصغیر کے ان حصوں سے آتے تھے جہاں کی مادری زبان اُردو نہ تھی ، فارغ التحصیل ہونے کے بعد اُردو کا اچھا خاصا علم بھی لے کر واپس جاتے تھے - یوں یہ طلبہ اپنے اپنے خطوں میں اردو کی نشر و اشاعت میں معاون بنتے رہے -

بلوچستان کے باسی بھی اس دارالعلوم سے فیض یاب ہوئے اور واپس آ کر یہاں کئی دینی مدرسے بھی قائم کیے - اس طرح یہ ذریعہ بھی یہاں اُردو کی ترویج و اشاعت میں مددگار بنا ہے - ان میں سے چند ایک یہ ہیں :

۱- مولانا الحاج سید محمد یعقوب - آپ ۲۷ ذی حجہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۲ جنوری ۱۸۷۸ء کو کلی عبد الرحمٰن زئی (تحصیل پشین) میں پیدا ہوئے - آپ کے والد حضرت قمر الدین جیّد عالم اور صاحبِ حال بزرگ تھے - سات سال تک شیخ الہند حضرت محمود الحسن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل رہے - شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی آپ کے ہم عصر اور ہم جماعت تھے اور دونوں نے ایک ساتھ ہی دستارِ فضیلت حاصل کی - اپنے آبائی گاؤں کے قریب

۱- ''یادگار تاجپوشی'' قلات ، ۱۹۳۲ء - مولفہ مولوی دین محمد - صفحات ۹۴-۹۷ -

۲- تیار کردہ بورڈ آف ایڈیٹرز - شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء ، صفحہ ۴۰۳ -

کلی لاجور (گلستان) میں مدرسۂ ضیاء العلوم میں صدر مدرس اور ناظم اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ کم و بیش نصف صدی تک درس و تدریس میں مصروف رہے ۔ سینکڑوں علما نے آپ سے تکمیل علوم کے بعد دستار فضیلت حاصل کی ۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد بھی خاصی ہے ۔ بروز دو شنبہ ۱۲ ذی حجہ ۱۳۷۲ھ (۲۳ اگست ۱۹۵۳ع) کو اس دارفانی سے اقلیم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی ۔

۲۔ مولوی محمد صدیق اور مولوی دوست محمد بوستان کے رہنے والے تھے ۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آئے ۔ متعدد طلبہ اُن کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے ۔ علامہ عبدالعلی نے بھی (متوفیٰ ۱۶ شوال ۱۳۶۴ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۹۴۴ع) جو اس خطے کے ایک بہت ہی مشہور عالم تھے ، اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا ۔ بقول حافظ خان محمد ''ان دونوں کی صحبت میں رہ کر علامہ اگر سونا تھے تو نکھر کر کندن بن گئے ۔''

۳۔ حافظ خان محمد ، مولانا مفتی کفایت اللہ کے شاگرد تھے ۔ آپ جامع مسجد کوئٹہ کے قریب فارسی ، اُردو اور پشتو کی کتابوں کا کاروبار کرتے تھے ، مگر آپ کا کتب خانہ دکان کم اور ادبی مرکز زیادہ تھا ۔ اُردو ادب میں مولانا آزاد کے گرویدہ تھے۔ آپ پانی زئی کاکڑوں میں سے ہیں ۔

۴۔ مولانا عبد الحق تارن ، تحصیل پشین کے رہنے والے اور دیوبند کے فاضل ہیں ۔ پشتو ، اُردو ، عربی اور فارسی زبان و ادب پر عبور رکھتے ہیں ۔ اس وقت عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہے[1] ۔

۵۔ مولوی عرض محمد مستونگی ، مہتمم مطلع العلوم بروری روڈ کوئٹہ ۔ مولوی محمد عمر اور مولوی تاج محمد بلوچ زلزلے سے پہلے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے گئے تھے[2] اور وہیں سے اُردو میں

۱۔ ثقافت اور ادب وادیِ بولان میں ، صفحات ۳۰-۴۴ ۔
۲۔ البلوچ ، کراچی ، ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ع ۔

مضامین لکھتے تھے۔

۶۔ ڈاکٹر سید غلام محمد شاہ ندوی ایم اے (عربی) پی ایچ ڈی (عربی) جامعۂ ازہر، فاضل دیوبند۔ قریہ گانگل زئی کے رہنے والے ہیں۔ آج کل چمن میں سکونت پذیر ہیں۔ قیصر کے تخلص سے اُردو میں شعر کہتے رہے ہیں۔ آپ نے چمن میں نائٹ اورینٹل کالج بھی قائم کر رکھا ہے۔ علاوہ ان کے مشہور عالمِ دین مولانا شمس الحق افغانی فاضلِ دیوبند ریاست قلات میں وزیر معارف رہے ہیں۔ آپ ان دنوں اسلامی یونیورسٹی بھاول پور سے منسلک ہیں۔

بلوچستان کے دینی مدارس میں برصغیر کے نامور علما و فضلا کی آمد و رفت رہی ہے اور آج کل بھی ہے۔ وہ سب کے سب اُردو میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار فرماتے رہے ہیں اور ان دنوں بھی یہی طریق کار جاری ہے۔

۱۹۴۶ع میں فیض احمد فیض واردِ کوئٹہ ہوئے [1] اور وادیِ شال کے مکینوں نے سب سے پہلے اُن کی زبانی اُن کا کلام سنا۔

۱۹۴۸ع میں شاعرِ جادو بیان جعفر طاہر یہاں ملازمت کے سلسلے میں آئے اور تین سال تک پاکستان کے جسور و غیور فرزندوں کے تربیتی مرکز میں ایجوکیشن افسر کی حیثیت سے رہے۔ وہ خود لکھتے ہیں [2]:

"کوئٹہ میں بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا۔ یہیں اُس وقت کے پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین سے شرفِ ملاقات حاصل ہؤا اور فوج میں اپنے کور کی سرگرمیوں کے بارے میں انھیں بہت کچھ تفصیلات پیش کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ مجھے وہ گھڑی آج بھی یاد ہے جب انھوں نے مجھے دستخط دینے کے لیے

۱۔ بردوش ہؤا، صفحہ ۱۷۵۔

۲۔ راقم الحروف کے نام آپ کا خط مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۶۷ع، از آرمی ایجوکیشن سکول اپر ٹوپہ مری ہلز، بوساطت دوست عزیزم پروفیسر محمد حیات خاں سیال گورنمنٹ کالج جھنگ۔

قلم نکالنا چاہا تو ان کی شیروانی سے تسبیح نکلی اور انھوں نے مجھ سے قلم لے کر دستخط فرمائے۔ یہیں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے (جو اُس وقت میجر جنرل تھے) شرف نیاز حاصل ہؤا۔ اسی کوئٹہ میں جنرل کے ایم شیخ اور جنرل (اب گورنر) محمد موسیٰ کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی کوئٹہ کی سرزمین میں اپنی بچی انیس کو دفن کیا اور اسی خاک پاک میں اپنے فکر و فن کی نادیدہ منزلوں اور انوکھی راہوں سے آشنا ہؤا۔''

کوئٹہ آنے سے پہلے جعفر طاہر غزل اور نظم لکھتے تھے۔ یہاں کینٹوز لکھنے کا آغاز ہؤا اور پاکستان کے عنوان سے چار کینٹوز لکھے۔ احمد ندیم قاسمی نے قیام کوئٹہ کے دوران میں انھیں مبارک باد دی کہ آپ کو اپنا میڈیم مل چکا ہے اور اب صرف مشق اور محنت کی ضرورت ہے۔ قصۂ چہار درویش کے عنوان سے یہ کینٹوز بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کو کوئٹہ ہی میں سنائے۔ ان سے داد ملی تو حوصلہ بڑھ گیا۔ یہ کینٹوز کچھ تو ''ہفت آسماں'' میں شامل ہیں اور کچھ علیحدہ ہیں۔

آپ کوئٹے میں مشاعروں کے علاوہ زیادہ تر نجی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ ان میں سے مسعود احمد انصاری مالک علی گڑھ بک سٹال مشن روڈ کوئٹہ اور میجر اے کیو نیازی اے او سی کے یہاں کی محفلیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیازی صاحب کی بیگم جناب گل بانو اسلامیہ کالج پشاور کی گریجویٹ تھیں۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی اور شعر وادب کا نہایت بلند ذوق رکھتی تھیں۔ وہ خود بھی فارسی کی نہایت مشاق شاعرہ تھیں۔ ان محفلوں میں شرکت کرنے والوں میں جعفر طاہر کے علاوہ جدت میرٹھی، جوہر لکھنوی، عیش فیروز پوری، ماہر افغانی اور خواجہ عبدالحمید عرفانی وغیرہ شامل تھے۔

جعفر طاہر نے اپنے ان کینٹوز سے سامعین کو مسحور کیا۔ ان طویل کینٹوز کو حافظے ہی سے پڑھنا غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہے (کلام کے نمونے شعر و شاعری کے باب میں ملاحظہ فرمائیے)۔ اگست ۱۹۵۴ع میں کوئٹہ میں جس انداز پر جشنِ آزادی منایا گیا، اسے ملاحظہ کرنے کے بعد مرحوم

مولانا عبدالمجید سالک نے فرمایا تھا[1] :

''اس سال یوم آزادی کی تقریبات کے سلسلے میں کوئٹہ نے جس زندہ دلی کا ثبوت دیا ، اس کی مثال پورے پاکستان میں نایاب ہے۔''

اس کی وضاحت کرتے ہوئے سالک صاحب نے لکھا ہے کہ یہ پڑھ کر قارئین بے حد متعجب ہوں گے کیونکہ انھوں نے اخباروں میں کچھ نہیں پڑھا ، یا پھر چند سطروں کی ایک خبر جو اے پی پی کی وساطت سے شائع ہوئی تھی ، نظر سے گزری ہوگی ۔ بلوچستان کی سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ اس کی سیاسی ، معاشری اور ادبی سرگرمیوں کی کوئی تفصیل ملک کے ممتاز اخباروں میں شائع نہیں ہو پاتی اور یوں باہر کے لوگ کوئٹے کے حالات سے بڑی حد تک بے خبر رہتے ہیں اور جب یہاں کے بارے میں کسی اچھی بات کو سنتے ہیں تو متعجب ہوئے بغیر نہیں رہتے ۔

ہاں تو اسی جشن آزادی کے سلسلے میں کوئٹہ میں دو مشاعرے منعقد ہوئے تھے ۔ ان میں دوسرے شعرا کے علاوہ مجید لاہوری مرحوم بھی شریک ہوئے تھے ۔ اُنھی دنوں انھوں نے ''شان کوئٹہ''[2] کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی ۔ مدح خوانی کے رنگ ڈھنگ دیکھیے :

آج کل اے ہم نشیں ہوں میہمانِ کوئٹہ
ہے مری جانِ تمنا ایک جانِ کوئٹہ

دیکھ کر شرما رہی ہیں خلد کی رعنائیاں
اللہ اللہ جلوۂ حسنِ بتانِ کوئٹہ

یہ فضائیں روح پرور ، یہ ہوائیں دل نواز
اک جہانِ رنگ بو ہے گلستانِ کوئٹہ

چاند تارے پھول نغمے رنگ نکہت چاندنی
یہ سر و ساماں ہے گویا ارمغانِ کوئٹہ

۱۔ اخبارِ بلوچستان ، کوئٹہ ، ۸ ستمبر ۱۹۵۴ء ، صفحہ ۲ ۔
۲۔ ایضاً ۔

حاصلِ عمرِ رواں ہیں زندگی کے چار دن
عمر بھر میں اب رہوں گا مدح خوانِ کوئٹہ

ہے تمہارے دم قدم سے نبضِ ہستی میں دھمک
مرحبا ! صد مرحبا ! زندہ دلانِ کوئٹہ

حضرتِ غالب کبھی کرتے نہ کلکتے کا ذکر
مجھ سے سن لیتے اگر وہ داستانِ کوئٹہ

بھول جائے شیخ جنت کے فسانے اے مجید
میری آنکھوں سے اگر دیکھے وہ شانِ کوئٹہ

عبدالحمید عدم کی آواز بھی وادیٔ شال کی فضاؤں میں گونجتی رہی ہے ۔ اُن کی مشہور نظم ''کوئٹہ'' یہ ہے [۱] :

کوئٹے کی سرد اور رنگین راتوں کا شباب
نو تراشیدہ ستارے ، نودمیدہ ماہتاب

عطر میں ڈوبی ہوئی شاداب زلفوں کا خمار
جیسے مدہوشی کا پرتو جیسے خوشبو کی پھوار

دور تک پھیلی ہوئی شفاف سڑکوں کا جمال
جیسے مطرب کا تصور ، جیسے شاعر کا خیال

روح پرور ہوٹلوں میں پُر مسرت قہقہے
جیسے چاندی کے کٹورے ، چاندنی کے چہچہے

عنبر آلودہ زمانہ ، جنت آلودہ ہوا !
آ رہا ہو جیسے پہلی بار ، بر میں دلربا !

ٹوٹتی انگڑائیوں کے دائرے بنتے ہوئے
رنگ لہراتے ہوئے ، شبنم کدے چھنتے ہوئے

کاکلیں خمدار ، لب سیمیں ، بدن ارماں فروز
آرزوؤں کی ڈبکتی کشتیاں طوفاں دوز

خشک مٹیالے پہاڑوں کا سخن پرور سکوت
چوٹیوں پر برف کے خط جیسے تارِ عنکبوت

۱- ماہ نو ، کراچی ، فروری ۱۹۵۴ع ، صفحہ ۳۴ -

ہلکے ہلکے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لبریزِ سرود
جیسے شبنم کی نمی، جیسے ترنم کا وجود!
سیب اور بادام کے پیڑوں میں اک موہوم سی
قاف کی پریوں کے شیریں زمزموں کی دھوم سی
سر زمینِ خُلد کا نقشہ مگر پُر آب سا
رات خورشید آفریں سی، اور دن مہتاب سا
جو مسرت ہے یہاں وہ بنتِ مستی زاد ہے
کوئٹے کی سر زمیں میں شعریت آباد ہے

رفیق خاور بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں۔ اُنھوں نے بلوچستان کی "کاریز"[۱] کو یوں سمجھا ہے:

زمیں دوز رستوں پہ نظروں سے اوجھل رواں ہوں پیاپے پے دواں ہوں
گراں پردہ در پردہ ظلمات کے خولِ سنگیں میں ہے آبِ حیواں نہاں ہوں
طلسم آفریں ہے یہ تاریکیِ بیکراں میں اندھا دھند مخفی روانی
ہو جس طرح پردے میں شب کے کسی لشکرِ بےمحابا نے شب خوں کی ٹھانی
چٹانوں چٹانوں رواں ہوں دواں ہوں کبھی آشکارا کبھی بے نشاں ہوں
مری آمد و شد ہے رستہ برستہ، محبت کی مشاطۂ جاوداں ہوں
ملاتی ہوں چپ چاپ رشتے ہی رشتے ادھر سے اُدھر ندیوں کو ملا کر
رگِ جانِ ہاموں کو سیراب کرتی ہوں شیرِ مصفّا کے جرعے پلا کر
ازل سے ابد تک یہی سلسلہ ہے، یہی رشتہ ہے باہمی دوستی کا
اُبھر کر کبھی دیکھ لیتی ہوں منظر، محبت کی مشّاق جادوگری کا
یہ ہے سحر کاری کا روشن کرشمہ کہ نادیدہ اعجازِ صنعت گری ہے
کہ اس سنگِ خارا کے ماحول میں بھی نئی دلبری ہے، نئی زندگی ہے
نئے شعلہ ہائے فروزاں کی تابش سے ہے قاف تا قاف آفاق روشن
تفِ برقِ خود ساختہ سے منور ہے مانندِ سینا پہاڑوں کا دامن

۱- ماہ نو، کراچی، استقلال نمبر، ۱۹۵۵ع، صفحہ ۱۲۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں پہلی بار پروفیسر محمد علم الدین سالک اسلامیہ کالج لاہور، انجمن اساتذۂ بلوچستان کی دعوت پر تشریف لائے ۔ انھوں نے جن علمی و ادبی اجتماعات سے خطاب فرمایا، ان میں سے ایک جلسہ مجلس فارسی اور بزم تاریخ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے زیر اہتمام ہؤا تھا ۔ آپ کے خطبے کا عنوان تھا ''تیموری بیگمات کی علمی و ادبی سرگرمیاں ۔''[۱] آپ کے اعزاز میں صحافیوں نے بھی ایک مخصوص نشست کا بندوبست کیا تھا ۔

بعد میں آپ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۴ء میں بھی تشریف لاتے رہے اور کوئٹہ کی متعدد انجمنوں (مجلس فارسی، بزم اقبال، بزم تاریخ، مجلس فارسی برائے خواتین وغیرہ) کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے ۔ آپ نے ہمیشہ اردو میں خطاب فرمایا ۔ آپ کی شعلہ بیانی، گرم نوائی اور تبحرِ علمی کے باعث وادیٔ شال کی فضاؤں میں ایک ایسا ارتعاش پیدا ہؤا جو یادوں کے اُفقوں پر ابھرتا رہے گا ۔

پسنی میں ۱۹۵۸ء[۲] میں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی بھی آئے تھے ۔ غالباً انھوں نے یہ سفر کراچی کے مشہور وکیل عبدالمنان خاں کی تحریک پر کیا ہوگا، ورنہ حضرت جوش اور سمندری سفر :

'تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھؤاں اُٹھتا بطونِ خاک سے

آپ نے وہاں سات آٹھ دن قیام کیا کیونکہ ہوا کا رخ بدل گیا تھا اور سمندر بپھرا ہؤا تھا، لانچ واپس نہیں جا سکتا تھا ۔

میر داد بخش کا بیان ہے کہ انھوں نے وکیل عبدالمنان اور جوش صاحب کی دعوت کی ۔ اس دعوت میں ''سویٹ ڈش'' ہلینی (کھجور) پر مشتمل تھی ۔ جوش صاحب نے اس سے شوق فرماتے ہوئے پوچھا ''یہ کیا ہے؟'' مراد بخش نے کہا ''حضور! یہ کھجور ہے'' جوش صاحب نے اپنے میزبان کی جانب مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: ''واہ! جیسے میں

۱- نوائے وقت، لاہور، ۱۶ نومبر ۱۹۵۶ء ۔
۲- دید و شنید، نوکین دور (مکران نمبر) کوئٹہ، ۱۶ مارچ ۱۹۶۷ء، صفحہ ۵۰ ۔

نے کجھور ہی نہیں کھائی ۔"

فیض بخشاپوری (جو "غالبِ سندھ" کہلاتے ہیں) وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے ہیں ۔ انھوں نے ۵ اگست ۱۹۵۹ع کو کوئٹہ میں کوئٹے کے متعلق ایک نظم لکھی تھی ۔ تین شعر یہ ہیں[1] :

کیوں کر رہے نہ کوئی ثنا خوانِ کوئٹہ
رشکِ ارم ہے دوست ! گلستانِ کوئٹہ
پُر کیف وادیاں ہیں ، جنوں خیز ہے فضا
ہے دل نواز موجِ بہارانِ کوئٹہ
جاتے ہیں فیض حسرتِ صحبت لیے ہوئے
دل پر ہے نقش ، نقشِ نگارانِ کوئٹہ

قرۃ العین حیدر بھی کوئٹے میں تشریف لاتی رہی ہیں ۔ جناب مسعود الرؤف[2] لکھتے ہیں : "محترمہ قرۃ العین حیدر کو ہم نے کالج میں مدعو کیا ۔ حلقۂ تحریر و تنقید نے ان کے اعزاز میں چائے کی دعوت کا اہتمام کیا ۔ تمام اراکین ، پرنسپل اور اساتذہ اس تقریب میں شامل تھے ۔ لڑکوں کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ آئس کریم دیتے وقت مس حیدر کے سامنے دو دفعہ پیالہ اُلٹا اور ایک دفعہ تو پوری ٹرے گر پڑی ۔ آخر میں محترمہ سے کچھ کہنے کی درخواست کی گئی تو وہ کترا گئیں ۔ پس یہ کہہ کر کہ "آپ کا کالج بہت اچھا ہے ، آپ کے اساتذہ بہت اچھے ہیں ، آپ سب اچھے ہیں" بیٹھ گئیں ۔

اگست ۱۹۶۴ع میں پروفیسر محمد طاہر فاروقی صدر شعبۂ اردو پشاور

۱- خمخانۂ فیض ، جیکب آباد مئی ۱۹۶۷ع ، صفحات ۱۵۴ - ۱۵۵ -
۲- جناب مسعود الرؤف سی ایس پی معتمد محکمۂ اطلاعات مغربی پاکستان کا طویل خط بنام سید خلیل احمد پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج کوئٹہ (مورخہ ۲ اگست ۱۹۶۷ع از لاہور) ۔ اس میں انھوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے (گورنمنٹ کالج کوئٹہ) کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر فرمایا ہے ۔

یونیورسٹی بھی کوئٹہ تشریف لائے تھے - آپ نے ۱۴ اگست ۱۹۶۴ع کو ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے مشاعرے میں شرکت فرمائی اور دو غزلیں پیش کیں - چند شعر یہ ہیں :

جمالِ یار جو پابندِ جلوہ گاہ نہیں
کمالِ شوق بھی ناآشنائے راہ نہیں

سکوں شناس ازل سے نہیں وہ موج ہوں میں
مرے قرار کو ساحل پہ بھی پناہ نہیں

تمھارے جلووں کی رعنائیوں کا کیا کہنا
مگر جو دل میں نہ ڈوبے وہ کچھ نگاہ نہیں

نگاہ ناز کی یہ سحر کاریاں توبہ !
کہ دل پہ کچھ بھی گزر جائے لب پہ آہ نہیں

تڑپ کے جان بھی دینا ہے شوق کی توہین
سنبھل سنبھل کے تڑپنا مگر گناہ نہیں

جو پختہ شوقِ طلب ہو تو ہر قدم منزل
یہ بُعدِ راہ بہر حال سدِ راہ نہیں

انھیں بھی ضد ہے مری خوئے عجز سے ظاہر
کہ گاہ مشقِ تغافل ہے اور گاہ نہیں

ہاں پھر اسی ادا سے بصد ناز دیکھنا
دل چاہتا ہے حشر کے انداز دیکھنا

خاموشیوں نے ضبط کو افسانہ کر دیا
دل کے شکستہ ساز کی آواز دیکھنا

جلوے ہیں آج محشرِ خاموش درکنار
ہوتا ہے کون درخورِ اعزاز دیکھنا

روشن رہے تو سوختہ جاں ، جل بجھے تو ہیچ
شمعِ حیات بھی ہے عجب راز ، دیکھنا

ہے برہمی بھی شانِ تلطف لیے ہوئے
اُن کی ادائے ناز کے اعجاز دیکھنا

وہ بھی ہیں آج داورِ محشر کے روبرو
سنتا ہے کون درد کی آواز دیکھنا
ہر لحظہ انتشار ہے وہ پاس ہوں کہ دور
طاہرِ غمِ حبیب کا پرداز دیکھنا

سلیم خاں گمی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان لاہور بھی ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں کوئٹہ میں قیام پذیر رہے - بلوچوں کے لوک ادب اور لوک ثقافت سے متعلق مواد تلاش کرتے رہے - آپ کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں - اُن میں سے ایک "بلوچی ادب" ہے جسے اردو اکادمی بہاول پور نے ۱۹۶۱ء میں چھاپا - ۱۱۹ صفحوں کی کتاب کی اڑھائی روپے قیمت ہے - اس کتاب میں بلوچی ادب کو پاکستان کے اردو دان طبقے سے متعارف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے - شعری ادب کے اصناف زیر بحث لائے گئے ہیں اور عوامی گیتوں کے اُردو ترجمے بھی پیش کیے گئے ہیں - بعض مقامات پر بلوچی اشعار اُردو ترجمے کے ساتھ دینے کے بجائے صرف ترجمے ہی کو کافی سمجھا گیا ہے - جو قارئین بلوچی نہ جانتے ہوں اُن کے لیے ایسے ہی مناسب ہے اور جو بلوچی جانتے ہیں وہ ایک کمی سی محسوس کرتے ہیں - بہرحال "بلوچی ادب" اپنے دامن میں گیتوں اور عظیم عوامی شاعر جام دُرک کے شعروں کے علاوہ دو داستانیں (حانی شہ مرید بالاچ حسن گور گیج)، بلوچوں کے عوامی کھیل اور ایک ریڈیائی تمثیل (دوستیں و شیریں) سمیٹے ہوئے ہے - ایک مقام پر سلیم خاں گمی لکھتے ہیں[1]:

"تقابل منظور نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ "حانی شہ مرید" کی منظوم داستان بلوچی زبان کی دوسری داستانوں ـــــ دوستیں و شیریں، مست و سمو، بی‌برگ و گراناز اور شہداد و مہناز کے مقابلے میں اثر آفرینی اور قبول عام کے لحاظ سے بلند درجہ رکھتی ہے - دوستیں و شیریں دو نوجوان دلوں کی جدائی اور ملاپ کی داستان ہے - مست و سمو میں ایک حساس دل جوان کا اپنی محبوبہ

۱- بلوچی ادب، صفحہ ۵۵ -

کے لیے صوفیانہ رنگ میں آہ و بکا کا قصہ بیان ہؤا ہے۔ بی برگ و گراناز میں ایک دلاور بلوچ پاس وفا کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے اور شہداد و سہناز کی کہانی نسوانی کمزوریوں کو ڈرامائی انداز میں آشکارا کرتی ہے۔ یہ داستانیں ہیرے ضرور ہیں لیکن ہشت پہلو نہیں۔ حانی اور شہمرید کی داستانِ محبت ایک ایسا ہیرا ہے جس کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو آب و تاب میں دوسرے سے بڑھ کر ہے۔''

کھیلوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں[1]:

''سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں صدی کے بلوچوں کے لیے کھیل، شاعری کا درجہ رکھتا تھا اور شاعری کھیل کا۔ جب وہ کھیل کے میدان میں جاتے تو شاعرانہ دل اُن کے سینے میں ہوتا اور جب وہ شعر و نغمہ کی محفلیں آراستہ کرتے تو تیر و سنان پہلو میں ہوتے اور گھوڑوں کی لگامیں اُن کے ہاتھوں میں۔ مثلاً ایک جوان دل شاعر مسافت کے دوران ایک جنگل میں شیر سے مقابلہ کرتا ہے اور پھر اس واقعے کو شعری پیکر میں ڈھالتا ہے''۔

زبان، بیان اور سواد کے لحاظ سے یہ کتاب ایک فائدہ مند اور کار آمد کاوش ہے۔

یہاں مولانا نور احمد خاں فریدی[2] اور اُن کے صاحبزادے چاکر خاں بلوچ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے بلوچ تاریخ و ادب کا واحد اُردو ترجمان ''بلوچی دنیا'' ملتان سے جاری کر رکھا ہے۔ یہ رسالہ گیارہ سال سے باقاعدگی کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے اور خالص علمی و ادبی پرچہ ہے۔ سیاست وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس میں بلوچستان کے دور و دراز حصوں کے بسنے والے بھی اپنے خیالات پیش کرتے رہتے ہیں۔

۱۔ بلوچی ادب، صفحہ ۷۷۔

۲۔ آپ اُردو میں کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور اِن دنوں بلوچ تاریخ زیرِ تدوین ہے۔

اس کا دائرۂ عمل وسیع ہے اور اس میں سابق بلوچستان کے علاوہ سابق پنجاب و سندھ کو بھی خصوصی نمائندگی حاصل ہے۔ ویسے اس کے پیش نظر وطن عزیز (پاکستان) سب سے پہلے ہے۔ یہ بحرین، کویت، مسقط، ایران وغیرہ میں بھی بلوچوں سے رابطے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے چند خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں، مثلاً بلوچ ثقافت نمبر، قدیم بلوچستان نمبر، کنونشن نمبر، خیر پور میرس نمبر، بلوچی تنقید نمبر وغیرہ۔ اس ادارے نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی شائع کی ہیں جو اسی خطے سے متعلق ہیں:

۱۔ آئینۂ بلوچ از پروفیسر انور رومان
۲۔ جام درک از سید کامل القادری
۳۔ بلوچ قبائل از سید کامل القادری
۴۔ متاع بردہ از عبدالرحمٰن غور

ہم نے اسی حصے میں ذکر کیا تھا کہ اس خطے کے کئی طالب علموں کو باہر کے کالجوں (بالخصوص اسلامیہ کالج لاہور) میں اچھے کھلاڑی ہونے کے باعث داخلہ ملا تھا۔ اگر یہ کہیں تو مناسب ہوگا کہ کھیلوں کی وجہ سے بھی بلوچستانیوں کا رابطہ برصغیر کے اُن حصوں سے رہا جہاں اُردو کا اثر بہت عمیق تھا، اس لیے لگے ہاتھوں یہاں کے کھیلوں کا بھی مختصر طور پر جائزہ لیتے جاتے ہیں کیونکہ ''اچھا دماغ تندرست جسم میں ہوتا ہے۔''

کوئٹے میں پہلی فٹ بال ٹیم ۱۸۹۸ء میں بنی۔ اس کا نام مسلم کلب تھا جس نے ۱۹۳۲ء تک فٹ بال کے میدان میں برصغیر کے کئی ٹورنامنٹوں میں بلوچستان کا نام روشن کیا۔ مسلم کلب میں تاج جونیئر کے والد محمد بخش (جو اپنے پھرتیلے پن اور درمیانہ قد ہونے کے سبب ''لالہ منڈے'' کہلاتے تھے) حاجی ایزد بخش، گل محمد خان وزیر اعظم قلات، حاجی عبدالواحد خان ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، محمد میر پوسٹ ماسٹر، بکر عیدی بیرہ، رمضان، محمد اکبر خان سپرنٹنڈنٹ ڈاک خانجات، سوما رام، زین الدین خان مصور، عبدالباقی خان مرحوم، محمد، خدا بخش، عبدالحکیم خان فروٹ مرچنٹ، خان بہادر عین الدین خان، بابو عزیز الدین خان اور عزیز

قابل ذکر ہیں ۔ سردار رشید جان ، مرزا مشتاق احمد ، مرزا بشیر احمد اور مرزا نثار بعد میں آئے ۔

اُس زمانے میں فٹ بال کا ایک میدان براؤن جیم خانے میں تھا ۔ براؤن جیم خانے میں کچھ لوگ کرکٹ بھی کھیلتے تھے ۔ ہاکی کا شوق البتہ کم تھا ۔ براؤن جیم خانے پر ہندو افسروں کا قبضہ اور تسلط تھا ۔ وہ مسلم کلب کے نام سے چڑتے تھے اس لیے انھوں نے کوشش کر کے ان نوجوان کھلاڑیوں پر جیم خانے کے دروازے بند کر دیے ۔ بعد میں مسلم کلب کے کھلاڑی روزانہ مشق کے لیے میکموہن پارک جایا کرتے تھے ۔ میکموہن پارک کی تعمیر میں انجمن اسلامیہ کوئٹہ کا بڑا ہاتھ تھا ۔ فٹ بال گراؤنڈ کی باقاعدہ نگرانی کے لیے لوگ مقرر تھے ۔ میدان کے قریب پیولین کی صورت میں ایک عمارت بنی تھی جس میں کھیلوں کا سامان رکھنے کا سٹور اور کھلاڑیوں کے لباس تبدیل کرنے کے کمرے بنے تھے ۔

کوئٹہ میں مسلم کلب والے زیادہ تر انگریزوں اور گورکھوں کی رجمنٹوں کے مدِمقابل کھیلتے تھے ۔ ان رجمنٹوں میں بلیک واچ ، ڈیون شائر ، آئرش رجمنٹ ، ساؤتھ لانسر ، اٹھاسی بیٹری ، نمبر چار بیٹری وغیرہ کی ٹیمیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ ۱۹۰۴ع میں پہلی مرتبہ مسلم کلب کی فٹ بال ٹیم اے ۔ ڈبلیو ۔ خان ٹورنامنٹ کھیلنے پشاور گئی ۔ یہ کپ وہ جیت کر لے آئی ۔ ۱۹۱۴ع میں یہ ٹیم ہیرا لال ٹورنامنٹ کھیلنے لاہور گئی اور ہر سال جیتتی رہی مگر ۱۹۲۵ع میں ہار گئی ۔ ۱۹۱۹ع میں یہ ٹیم علی گڑھ گئی مگر فائینل مقابلے میں دکن کی ٹیم سے ہار گئی ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے کھلاڑی گھاس پر کھیلنے کے عادی نہ تھے ، نیز علی گڑھ کی موسمی کیفیت بھی کوئٹے کے سرد پسند نوجوانوں کو راس نہ آئی ۔ ۱۹۲۹ع میں مسلم کلب کی ایک ٹیم کل ہند ٹورنامنٹ میں شمولیت کی خاطر لکھنؤ گئی اور کلکتے کی مشترکہ ٹیم کے خلاف متواتر چار روز تک فائینل میچ کھیلتی رہی مگر چوتھے روز ایک گول سے ہار کر آ گئی ۔ کراچی میں مسلم کلب کی ٹیم سترہ سال تک متواتر

کھیلتی رہی لیکن صرف ایک دفعہ ہیمراج ٹورنامنٹ میں ہاری ۔[۱]
آج بھی بلوچستان میں کھیلوں کی جانب خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے ۔ یہاں بھی ٹورنامنٹوں کا بندوبست ہوتا رہتا ہے اور باہر جا کر بھی ٹیمیں شریک ہوتی اور ناموری حاصل کرتی رہتی ہیں ۔ کئی نوجوان بین الاقوامی کھیلوں میں ممتاز حصہ لے چکے ہیں ۔ ایوب سٹیڈیم کوئٹہ کی تعمیر نے کھیلوں سے لگاؤ کو چار چاند لگا دیے ہیں ۔ سردار محمد اسحاق اور چودھری عطا محمد برسوں سے اس خطے میں کھیلوں کی سرپرستی فرما رہے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج کے لیے کوشاں ہیں ۔

ان مختلف النوع روابط سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس سر زمین میں اُردو نے قدم جمانے کے لیے کیسے کیسے ذریعوں سے استفادہ کیا اور کر رہی ہے ۔

۱۔ ''کوئٹہ میں پون صدی پہلے کی ثقافتی زندگی'' (پمفلٹ) تحریر ۸ جنوری ۱۹۵۹ء ، صفحات ۳-۴ ۔

ادبی انجمنیں اور مشاعرے

اصل شعر گوئی تو حقیقۃً وہبی خصوصیت ہے ، لیکن شعر فہمی اور شعر خوانی ہر ایک کی دسترس میں ہے - چنانچہ ساسانیوں سے مغلوں تک ایشیا کے اس حصے یعنی پاکستان و ہندوستان میں شعر فہمی ، انفرادی ، درباری اور سماجی زندگی اور عظمت کا ایک لازمہ تھی - یہ ایسا فن تھا جس سے بادشاہ اور عوام مساوی طور پر لطف اندوز ہوتے رہے -

رسم مشاعرہ اسی ذوق و شوق کا ایک مظاہرہ تھی جس کے پیش نظر یہ تھا کہ تھوڑے سے وقت میں عوام کو زیادہ سے زیادہ شاعروں سے متعارف کرا دیا جائے - اگرچہ بعد میں ''آہ'' اور ''واہ'' کے غلبے کے باعث مشاعرہ ایک اجتماعی ذوق کی تنظیم کرنے کی بجائے ایک تماشا اور ایک تفریح بن کر رہ گیا (اور غالباً اسی وجہ سے اب وہ آمادۂ زوال ہے) ، پھر بھی مشاعرے سے شعر و شاعری کی اشاعت کا زبردست کام لیا جاتا رہا -[1]

وزیر زادہ عبدالاحد خاں[2] نے ۱۹۳۹ع میں صنعتی نمائش کوئٹہ کے آل انڈیا مشاعرے کی افتتاحی تقریر میں فرمایا تھا :

''بلوچستان میں فارسی ادب کا کافی دیر چرچا رہا ہے - وقتاً فوقتاً قابل ہستیاں پیدا ہوتی رہیں - انگریزوں کے یہاں آنے سے اُردو کا رواج[3] ہؤا ، عدالتی زبان اُردو قرار پائی - شمالی ہندوستان کے

۱- ''گلدستۂ اشعار'' پیش لفظ از پروفیسر انور رومان ، لاہور ، ۱۹۵۹ع -

۲- پاسبان ، کوئٹہ ، ٦ جولائی ۱۹۳۹ع -

۳- ۱۹۱۱ع کی رپورٹ مردم شماری میں سارے بلوچستان کے ایسے قبائلی یا ملکی اشخاص کی تعداد ، جو لکھ پڑھ سکتے تھے ، دو ہزار ایک سو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

صاحب ذوق حضرات ملازمتوں کے سلسلے میں یہاں آئے ۔ انھوں نے یہ بات فراموش نہ کی کہ ترقی ادب بھی جزو ہے ترقی کا۔ چنانچہ بزم سخن قائم ہوئی۔ اس سلسلے میں مرحوم سردار محمد یوسف خاں کا نام لینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے بلوچستان میں مشاعروں کی بنیاد ڈالی ، بزم ادب قائم کی ، ایک رسالہ نکالا جس میں شعرا کے اشعار ہوتے تھے ۔''

وقارانبالوی تحریر فرماتے ہیں[1] :

''برٹش بلوچستان میں اردو شاعری کے پہلے علمبردار سردار محمد یوسف یوپلزئی اور لالہ فتح چند نسیم تھے ۔ ''قندیل خیال'' انھی کے دم سے روشن ہوئی اور انھی کے ہاتھوں بجھ گئی ۔''

غرض بلوچستان میں ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ لورا لائی میں مشاعروں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

اکیس بتلائی گئی ہے ، جن میں سے ایک ہزار پانچ سو چوالیس فارسی اور صرف پانچ سو پچپن اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ۔ اس رپورٹ میں ایک انگریز ماہرِ السنہ کی تیار کی ہوئی فہرست کے مطابق اردو کو ہندی زبان کی ایک شاخ تصور کرکے ''مغربی ہندی'' کا مضحکہ خیز نام دیا گیا ہے ۔

(ریڈیائی تقریر بعنوان ''بلوچستان میں اُردو'' از غلام حسین حکیم مرحوم ، ۴ نومبر ۱۹۶۰ء) ۔

۱۔ وقار انبالوی کا خط راقم الحروف کے نام ، از شرقپور ضلع شیخوپورہ (لاہور ڈویژن) ، مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۶۷ء ۔ نثار احمد محشر اپنے مضمون ''بلوچستان کی قدیم و جدید ادبی شخصیتیں'' (مطبوعہ پاسبان ، کوئٹہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء) میں لکھتے ہیں :

''سردار محمد یوسف خاں یوسف ادبی حیثیت سے ''السابقون الاولون'' کا مرتبہ رکھتے ہیں ۔ ان کی مخلصانہ تگ و دو پر بلوچستانیوں کو فخر کرنا چاہیے ۔''

کا آغاز ہؤا[۱] ۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں کے نام یہ ہیں :
سردار محمد یوسف خاں پوپلزئی ، مولوی عبدالحنان احقر ، عنایت اللہ خاں
ایاغ ، خان بہادر نبی بخش خاں اسد ، چراغ الدین چراغ ، محمود خاں محمود ،
نانک سنگھ نانک ، فتح چند نسیم ، عابد شاہ عابد ، عنایت علی عنایت ،
ہرکرن داس ہرکرن ، پنڈت جیون سنگھ مسکین ، شیخ محمد عبدالحق ، وغیرہ ۔

پنڈت جیون سنگھ مسکین صدر قانون گو ژوب نے بمقام فورٹ سنڈیمن دربار قیصری دسمبر ۱۹۱۱ع میں ایک مسدس پڑھا تھا جس کے آٹھ بند ہیں ۔[۲] پہلا اور آخری بند درج کیا جاتا ہے (بعض شعری اسقام سے قطع نظر فرمائیے) :

اے شاہ جارج پنجم سلطان فیض گستر
اے صلح جوے عالم ، اے شاہِ عدل پرور
اے خسروِ یگانہ ، عزتِ دہِ سکندر
دائم یہ راج تیرا ہو انڈیا کے اندر
جس میں کہ شیر بکری پیتے ہیں مل کے پانی
رہتے بہم ہیں خرّم با عیش و شادمانی

ہندوستان جب سے قبضے میں تیرے آیا
دہلی کو سب سے پہلے یہ فخر ہاتھ آیا

۱- زاہد حسین قریشی نے لورالائی میں اپنے انٹرویو میں کہا : ''میں نے ۱۹۱۱ع کے ایک مشاعرے میں شرکت کی تھی جس میں اپنے والد مرحوم محمود قریشی کی غزل پڑھی تھی ۔ ان دنوں یہاں سردار یوسف خاں ، سردار غازی خاں ، عنایت اللہ خاں ایاغ وغیرہ شاعری کرتے تھے ۔ ایاغ کا ایک شعر مجھے یاد ہے :

مومنو ! شوق سے قرآن کی آیات پڑھو
بربط و چنگ و پیانو کا ترانہ کیا ہے

۲- قندیل خیال ، صفحات ۲۹—۳۰ ۔ سب سے پہلے اُردو زبان میں جلسہ اُس وقت ہؤا تھا جب جارج پنجم کی تاج پوشی ہو رہی تھی ۔

شاہنشہِ ولایت لندن سے چل کے آیا
ارکان کے علاوہ ملکہ بھی ساتھ لایا
دونوں کو ہو مبارک یہ جشن تاجپوشی
لازم ہے تہنیت میں مسکین اب خموشی

منشی فتح چند نسیم اہل کار تحصیل لورا لائی نے "۱۹۱۴ع کی یاد" میں فرمایا تھا :

دور میں تیرے رہیں سو آفتیں
ایک کیا لاکھوں ہی جھیلیں کلفتیں
دور تھا تیرا نہایت ہی کٹھن
تھا سراپا باعثِ رنج و محن
بنک کتنے فیل تونے کر دیے
جیل خانے مالکوں سے بھر دیے
الوداع اے سالِ سابق الوداع

جن کی کچھ سمجھی گئیں بدمعاشیاں
اُن کے گھر اکثر ہوئیں تالاشیاں
جن کے ہاں کچھ مل گیا ، پکڑا گیا
لوہے کی زنجیر میں جکڑا گیا
گرم رکھا واقعہ دہلی کو بھی
جان پر کتنوں کے آخر بن گئی
الوداع اے سالِ سابق الوداع

دور تھا تیرا نحوست کا بھرا
سر زمیں کو جس نے خوں سے رنگ دیا
جنگ کی تھی ابتدا تجھ سے ہوئی
یہ قیامت سی بپا تجھ سے ہوئی
سیکڑوں ، لاکھوں ، ہزاروں مر گئے
خون اپنا تیرے سر پر دھر گئے
الوداع اے سالِ سابق الوداع



سردار محمد یوسف خاں یوسف پوپلزئی جنھوں نے بلوچستان میں نصف
صدی پیشتر علمی و ادبی سرگرمیوں کو وسعت دینے میں حصہ لیا

تو نے شبلی کو کیا ہم سے جدا
اور عروسِ نظم کو بیوہ کیا
آہِ مظلوماں نہ خالی جائے گی
رنگ اپنا لائے گی پر لائے گی
دورِ آفت تھا کہ تیرا دور تھا
خاتمہ تیرا ہؤا اچھا ہؤا

۱۹۱۴ع

الوداع اے سال چودہ الوداع[۱]

فتح چند نسیم نے نئے سال ۱۹۱۵ع کا خیر مقدم بھی کیا تھا۔ پانچ بند ہیں[۲]، پہلا اور آخری بند ملاحظہ فرمائیے :

گا رہے ہیں طائرانِ باغ نغمہ روزِ نو
چھیڑ رکھا ہے محبّوں نے بھی ذکرِ روزِ نو
مست ہیں مرغانِ گلشن از سرورِ روزِ نو
ہم کو دیتے ہیں عنادل بھی پیامِ روزِ نو
اہلِ عالم کو مبارک ہو مبارک روزِ نو

باغِ ہستی میں تری آمد کی آہا دھوم ہے
گویا کشتِ آرزو کی سمجھا تُو مفہوم ہے
ذکر تیرا ہر کتابِ دل پہ اب مرقوم ہے
دل لگی کے واسطے تُو قصۂ منظوم ہے
اہلِ عالم کو مبارک ہو مبارک روزِ نو[۳]

۱۔ قندیل خیال، صفحہ ۳۱ ۔
۲۔ ایضاً ، صفحہ ۳۲ ۔
۳۔ ان اشعار کے بدیہی اسقام کو بھی نظر انداز فرمائیے ۔ بلوچستان میں یہ بالکل ابتدائی دور کے اردو ترانے ہیں ۔

۷ جون ۱۹۱۵ع کو لورا لائی میں مشاعرہ منعقد ہؤا تھا[1] جس کے سیکرٹری سردار محمد یوسف خاں یوسف تھے۔ مصرع طرح تھا: ع
وہ شبنم ہوں پہنچ سکتا نہیں دیوارِ گلشن تک

اُس میں مختلف شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ نصف صدی پیشتر کے اس مشاعرے میں جو غزلیں پڑھی گئیں، ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیے اور حظ اُٹھائیے:

۱۔ مولوی عبدالحنان احقر عرائض نویس درجۂ اول لورالائی:

وہ شبنم ہوں پہنچ سکتا نہیں دیوار گلشن تک
مرے مولا تری رحمت سے پہنچوں گا نشیمن تک
پسِ مُردن جو دیکھی بیکسی، بیچارگی میری
لہو رونے لگے بےضبط ہو کر میرے دشمن تک
تمنا ہے کروں میں صاف گلیاں اپنی پلکوں سے
شہِ یثرب! اگر پہنچائے قسمت تیرے مسکن تک
تماشا ہے کہ بعدِ قتل تیغ خونچکاں لے کر
وہ ظالم حال پُرسی کے لیے آیا ہے مدفن تک
ترا احقر صدائیں شوق کی کرتا ہر گذرا
مگر پہنچی صدا اُس کی نہ ہرگز تیری چلمن تک

۲۔ بابو عنایت اللہ خاں ایاغ، میرِ مشاعرہ اسسٹنٹ اکونٹنٹ دفتر ضلع لورا لائی:

نعتیہ

بس اب لے چل اُڑا لے چل در محبوبِ ذوالمنن تک
صبا تیری رسائی ہے ضرور اُس گل کے مسکن تک

۱۔ قندیل خیال، صفحات ۳ تا ۱۸ - اس میں بلوچستان بھر کے مختلف شعرا شامل ہوئے۔
اُردو کی طرحی غزلیں جو پیش کی گئیں، ان کے اشعار کی تعداد دو سو گیارہ تھی۔

بہ پیش حق کسی نے تو پسارے ہاتھ ہی ہوں گے
تمہارے واسطے میں نے تو پھیلایا ہے دامن تک
ایاغ راوق عرفاں ہوں مجھ کو گنبد نیلی
سرور کیف میں لے چل اُسی بے خار گلشن تک

دیگر عاشقانہ

عقابِ عقل ہی جاتا نہیں جب اُس کے مسکن تک
تو پھر پیکِ نظر کیا ہے کہ پہنچے روئے روشن تک
کٹا جب کشت دہقاں سے تو کھایا مور نے رہ میں
وہ دانہ ہوں کہ پہنچا ہی نہیں آغوشِ خرمن تک
قمار عشق میں سال اور دھن ناچیز چیزیں ہیں
جنھیں عشق حقیقی ہے لگا دیتے ہیں تن من تک
مئے وحدت کا متوالا ایاغ حوض کوثر ہوں
نظر بازو نہیں پہنچوگے میری گرد توسن تک
جسے لاہوت کہتے ہیں، جسے ناسوت کہتے ہیں
میں جبروتی ہوں، ہے میرا گزر اس خاص آنگن تک

۳- جناب نبی بخش خاں اسد، نائب تحصیل دار لورا لائی:

ہوائے دید سلمٰی لے گئی قسمت سے روزن تک
برا تار نظر کا ہو، گرا دی اُس نے چلمن تک
رسائی ہو کہیں یا رب شہِ یثربؐ کے مدفن تک
کہ گلخن سا، جدائی سے، ہوا جاتا ہے گلشن تک
زمینِ ہند مثلِ تختۂ نارِ جہنم ہے
تمنا ہے مری برسوں سے پہنچوں وادِ ایمن تک
ہمارے مزرعِ دل کو جلایا دیدۂ تر نے
کہ رکھتا ہے نہاں پہلو میں بجلی ابر بہمن تک
دلا! داغِ محبت سے فروغِ قلبِ انساں ہے
رہینِ منتِ خالِ سیہ ہے روئے روشن تک

۴۔ چراغ الدین چراغ ، تحصیل دار کوئٹہ :

رخ۔ گل سے اٹھا دیتا غبار و گرد میں ، لیکن
وہ شبنم ہوں ، پہنچ سکتا نہیں دیوار گلشن تک
بقول ہندیاں ہرچند ہے برسات چوماسہ
جوانی موسم برسات کی لیکن ہے ساون تک
چراغ اپنی ضیا سے کام لیتا وہ شناسی کا
اگر مانند موسیٰ وہ پہنچتا دشت ایمن تک

۵۔ میر حسین علی جنوں پرسنل اسسٹنٹ وزیر صاحب قلات :

پلا دے آج ہی ساقی ، نہ کر برسات کا وعدہ
خدا جانے جیے گا یا مرے گا کون ساون تک
بتوں کی دوستی سے دشمنی پیدا ہوئی سب سے
برا کہتے ہیں سب مجھ کو ، مسلماں سے برہمن تک
مقدر دیکھیے جو راہبر تھا راہزن نکلا
اٹھا کر لے گیا یہ گھر کا بھیدی تار و سوزن تک
دکھا دے تو اگر روئے منور کی جھلک اُن کو
بھریں پانی ترے آگے پری رویانِ لندن تک
دیا اذنِ فغاں صیاد نے اس شرط پر مجھ کو
صدا فریاد کی پہنچے نہ گوشِ اہلِ گلشن تک
نہ سمجھے وہ تری بولی ، نہ تو اُس کی زباں سمجھے
جنوں پھر کس طرح تیری رسائی ہو فرنگن تک

۶۔ منشی ہرکرن داس ہرکرن لائن افسر پولیس لورا لائی :

نظر میری جو پہنچی جا کبھی اُس رشک گلشن تک
کلیجا آ گیا منہ کو ، میں پہنچا جان کندن تک
دبے پاؤں جو دیکھا دور سے صیاد کو آتے
اٹھا کر لے گئی بلبل بہ مجبوری نشیمن تک
کوئی گر دیکھنا چاہے مری تربت کی ظلمت کو
جگر پتھر سا لے کر آئے شب کو میرے مدفن تک

یہ بن کر برق کڑکی ہرکرن ہے رعد عالم پر
تری اس آہِ سوزاں سے جلا دشمن کا خرمن تک

دیگر

ہے لوہا مانتا اوس سنگ دل کا آج آہن تک
ڈکائٹ، چور، اور سارق، ہوئے حیران رہزن تک
میں ذرہ ناتواں ہوں، کیسے پہنچوں تیرے دامن تک
وہ شبنم ہوں، پہنچ سکتا نہیں دیوار گلشن تک
ہؤا گو خاک تیرے عشق میں برباد ہو کر بھی
نہ پہنچا وائے قسمت اُڑ کے بھی میں تیرے دامن تک
خدا نے مرتبہ بخشا ہے تم کو ہرکرن! کیسا
ملائک آ رہے ہیں دیکھنے کو تیرے مامن تک

۷- سردار محمد یوسف خاں پوپلزئی یوسف[1] تحصیل دار لورالائی:

شرارے آہ کے اٹھتے تھے گھر سے لے کے مدفن تک
شہید ناز کی تربت پہ روئیں کیوں نہ دشمن تک

۱- ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع الملک افغانستان میں حکمرانی کرتا تھا۔ بامیزئی پوپلزئیوں کا سردار محمد شریف خاں تھا۔ دربار میں اسے بڑا ہی اثر و رسوخ حاصل تھا اور وہ اپنے وقت میں شاہ کا خاص آدمی متصور ہوتا تھا۔ شاہ شجاع کابل میں مارا گیا۔ اس حادثے کے بعد سردار محمد شریف خاں نے وطن کو خیر باد کہا اور پنجاب میں وارد ہو گئے۔ آپ کے دس بیٹے تھے۔ سر ہنری لارنس نے اس خاندان کا خاص خیال رکھا۔ انھیں سیاسی پنشن کے علاوہ فوج اور سول میں اعلیٰ عہدے دیے گئے۔ چنانچہ سردار محمد یار خاں پنجاب میں ای اے سی تھے۔ سردار محمد یوسف خاں انھی کے فرزند ارجمند تھے۔ فیروز پور، انبالہ، جالندھر وغیرہ میں تعلیم پائی۔ وہ عموماً اپنی کلاس میں اول نمبر پر آیا کرتے تھے۔ نرائن داس (ای اے سی گجرات - ۱۵ مئی ۱۸۸۸ء) نے لکھا تھا کہ انھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی خاص
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ترے جود و سخا نے بھر دیے عالم کے دامن تک
میں خاکِ آرزو اُڑ اُڑ کے پہنچوں کیوں نہ دامن تک

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

صلاحیت ہے۔ آپ نے ۱۸۹۰ء میں ژوب میں بحیثیت ناظر (دفتر پولٹیکل ایجنٹ) کام شروع کیا۔ بعد ازاں بلوچستان کے مختلف مقامات (دُکی، سبی، فورٹ سنڈیمن، نوشکی اور لورا لائی وغیرہ) میں مختلف عہدوں پر تعینات رہے۔ ۱۹۲۳ء میں بحیثیت ای اے سی ریٹائر ہوئے اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔ آپ کے بیٹوں میں سے ایک سردار رشید جان (ریٹائرڈ اے پی اے) ہیں جو کوئٹہ کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ سردار رشید جان کے بیٹے پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ سردار رشید جان نے ہماری درخواست پر اپنے اُس دور کے ایک عزیز ترین دوست [سید غلام علی الماس، مولد کوئٹہ، تاریخ پیدائش ۵ فروری ۱۸۹۳ء۔ آپ کے دادا جان فیض آباد سے شارک میں آ کر دکان کرتے تھے، کسی نے انھیں شہید کر دیا تھا۔ والد، سید اعظم علی شاہ (سنہ وفات ۱۹۰۸ء) پولیس میں ملازم تھے] سے جو پچھلے دنوں کوئٹہ تشریف لائے ہوئے تھے، حالات لکھوا کر دیے ہیں۔ وہ خود بھی شاعر تھے، شعر و شاعری میں ذکر آئے گا۔ وہ لکھتے ہیں:
''سردار محمد یوسف خاں پیرانہ سالی میں بھی جواں خصال تھے۔ اُن کی جولانیٔ طبع ملاحظہ ہو:

دخترِ رز ساقیا باہر نکال
گھر میں رکھ کر کیا یہ پالی جائے گی
ناوکِ مژگاں نے دل چھلنی کیا
روئے زیبا کو یہ جالی جائے گی

سردار صاحب نے اپنے اہل کاروں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہمیں کسی خوشامدانہ القاب سے خطاب نہ کیا جائے کیونکہ ہمارا نام دو عظیم پیغمبروں کے نام کا مجموعہ ہے لہٰذا محمد یوسف کے ساتھ آلائشی الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ ''واہ ری منکسر المزاجی''——الماس۔
الماس صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''ہاں یاد آیا؛ اُس زمانے میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

خدا کی نعمتوں کا شکر ہو کیا کیا ادا مجھ سے
دیا ادنیٰ سے اعلیٰ تک ، دیا زردہ متنجن تک

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)
محبوب حسین کی تھیٹریکل کمپنی کوئٹہ میں آئی ہوئی تھی - محبوب حسین ناچنے میں یکتائے روزگار تھے - سٹیج پر ناچتے ناچتے یہ غزل گا رہے تھے :

''خود چلے آئیں گے ، آہوں میں اثر ہونے تو دو''

سردار محمد یوسف اور ہم سب بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے - غزل ختم ہوتے ہی سردار صاحب فرمانے لگے :

منتیں بھی خود کریں گے خود بلائیں گے مجھے
وصل کی شب کچھ ذرا زیر و زبر ہونے تو دو

''زیر و زبر'' کا قافیہ سنتے ہی ہم سب زیر و زبر ہو گئے - سردار مرحوم جیسے زندہ دل بزرگ اب شاید ہی مل سکیں :

ہوں گے یوسف بھی اور زلیخا بھی
یہ تو یوسف بھی ہے زلیخا بھی (الماس)

پھر سید غلام علی الماس درج فرماتے ہیں :

''سردار محمد یوسف خاں کی محفل میں حضرت عیش بھی آیا کرتے تھے - اگر میں بھولتا نہیں تو یہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے پہلے کا ذکر ہے - عیش بھی مجھ جیسے آزاد منش ، وارفتہ مزاج ، ٹھرے باز ہؤا کرتے تھے لیکن عروض سے ایک حد تک وقوف حاصل تھا - پنجابی ہونے کے باوجود روزمرہ گھریلو اردو میں اچھی خاصی مہارت حاصل تھی - کہتے تھے اور خوب کہتے تھے - میں نے بھی اُن سے فیض اُٹھایا - شیر علی شاہ کے چھوٹے بھائی اصغر علی شاہ سے بہت ربط ضبط تھا - افسوس کہ مجھے زیادہ صحبت کا موقع نہ مل سکا - ہاں تو ایک دن محفلِ یوسف خوب گرم تھی - ہم نئے نئے شاعر اپنا اپنا کہا سنا رہے تھے - سردار صاحب کبھی تو جھوم جھوم کر داد دیتے اور کسی شعر پر مسکرا دیتے - اناڑی شاعروں کے بعض اشعار پر بے تحاشا ہنس پڑتے اور کہتے کہ بیٹا مطالعہ بھی کرتے ہو یا نہیں ؟ کہتے تو خوب ہو - کشاں کشاں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شفیع المذنبیں ہے رحمۃ للعالمیںؐ ہے تو
میں چھوڑوں کس طرح داماں ترا محشر کے دامن تک
کوئی نقشہ بتِ رنگیں ترا آخر نرالا ہے
نثارِ روئے زیبا ہیں مسلماں سے برہمن تک
مجھے محبوب حق کی صورتِ زیبا سے سیری ہے
سگِ دنیا مجھے پروا نہیں زردہ متنجن تک

دیگر عاشقانہ

وہ بن ٹھن کر تفرج کے لیے آتے ہیں گلشن تک
شعاع بقعہ نور آ رہی ہے میرے چلمن تک
یہ کس مہ رخ کی آمد کلبۂ احزاں کی جانب ہے
چٹکتی چاندنی سی آ رہی ہے صحنِ گلشن تک

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

حضرت عیش کی باری آئی ۔ فرمانے لگے :

بے تامل آگ میں کودا وہی پروانہ تھا
حسن بےپروا تھا لیکن عشق بےپروا نہ تھا
تنگ آکر جان دے دی دشت میں دیوانہ تھا
قیس آداب وفا سے کس قدر بیگانہ تھا

ہم نوآموز شاعروں کو تو اتنا ادراک ہی نہ تھا کہ باریکیوں اور رمز و رموز کو سمجھ سکتے ۔ سردار صاحب فرمانے لگے : دیکھو عیش! عاشق اپنے عشق سے تنگ نہیں ہؤا کرتے ۔ عشق میں جان دے دینا آداب وفا کی تکمیل ہے ، بیگانگی نہیں ۔ یوں کیوں نہ کہہ دو :

جان دے دی عشق میں جس نے وہی مردانہ تھا
قیس آداب وفا میں کس قدر فرزانہ تھا

ایک آواز آئی : ''محفل برخاست'' خاموشی طاری ہو گئی ۔ عیش اور ہم سب دم گھٹے باہر نکل آئے ۔''

مرے اس شوخ کی ترچھی نگہ برچھی بلا کی ہے
مقابل اس کے دل کیا ہے، کٹتا جاتا ہے جوشن تک
مجھے کیوں روکتا ہے، ایک عالم اُس پہ شیدا ہے
پڑھا کرتے ہیں کلمہ اُس کا مومن سے برہمن تک
وصیت باغباں سے تھی دمِ آخر یہ بلبل کی
جنازہ آرزوے گل میں میرا جائے گلشن تک
خدایا آبرو یوسف کی رکھ لے اس زمانے میں
اسے اب تاکتی بھنگن سے لے کر ہے فرنگن تک

دیگر ۔ عشق ہرجائی

بتِ طنّاز نے آنکھیں ملاتے ہی نکالا دل
بہت ہی کھچکھچایا پر نہ بن آئی کسی فن تک
نظر بازی حقیقت میں عجب اک تار برقی ہے
پہنچ جاتی ہے لگتے ہی یہ آتش دل کے خرمن تک
خدا کی شان اُس بت پر لٹایا خانماں اپنا
کھلائی دولتِ دنیا، نہ رکھی پاس سوزن تک
عجب اسرار مولا ہیں، نہیں اب زہر کھانے کو
نہ ہے اک جیب میں پائی، نہ ہے اک سیخ آہن تک
کچھ ایسے آ گئے ہیں دن ملاخ نے کھیت چاٹے ہیں
دعا کرتے بھی گو لاکھوں برہمن سے ہیں مومن تک
زمانہ مجھ سے چڑتا ہے تو آنسو ڈبڈباتے ہیں
مری درماندگی پر خوں بہاتی ہے فرنگن تک
گماں ہوتا ہے، سمجھے ہیں مجھے وہ کاٹھ کا اُلو
میں جاتا اب تو کونسل میں ہوں عرضی کرنے لندن تک
تجھے کیا فکر ہے یوسف، اٹھا جلدی قدم، چل دے
بھروسا تجھ پہ ہے سب کو یہاں سے لارڈ کرزن تک

۸- منشی محمود خاں محمود انچارج تھانہ زڑہ ضلع لورا لائی:

میں بلبل ہوں مجھے لازم ہے جانا صحن گلشن تک
خیالِ گل جگاتا رات بھر ہے روز روشن تک
ابھی تو کم سنی ہے اور ہزاروں اُن پہ مرتے ہیں
قیامت ڈھائیں گے پہنچیں گے جب وہ اپنے جوبن تک
مقدر جاگ اُٹھے عاشقِ جاں باز کا اُس دم
دکھانے صورتِ زیبا اگر آئیں وہ چلمن تک
تو اے محمود جاں تک بھی تصدق کر چکا لیکن
نہ آیا راہ چلتے بھی کبھی ظالم وہ مدفن تک

۹- بابو نانک سنگھ نانک نقشہ نویس ملٹری ورکس لورا لائی:

لگیں جب شولڈر میرے تو گل پہنچیں گے گلشن تک
ہزاروں زال اور رستم ہیں بھاگے اپنے مسکن تک
غزل سن کر یہ نانک کی ہوئی حیران مجلس ہے
اگر چاہے تو لکھ سکتا ہے وہ اشعار من من تک

۱۰- منشی فتح چند نسیم محرر تحصیل لورا لائی:

کمندِ برق ہی پہنچی نہ جب شاخ نشیمن تک
رسائی پھر بھلا صیاد کی کب میرے مسکن تک
ارے صیاد ظالم بے گنہ پنجرے میں کیوں ڈالا
وہ بلبل ہوں نہ پہنچا تھا ابھی پھولوں کے دامن تک
نہ کیونکر روئیں وہ افسردگی پر آٹھ آٹھ آنسو
کہ جب روئی ہماری بے کسی پر چشمِ سوزن تک
میں وہ تشنہ دہن ہوں جل گیا گرمئی سوزاں سے
مرے حلقوم میں ذرّہ نہ ٹپکا آب آہن تک
زمیں سے اوج پر ، واں سے زمیں پر پھر مجھے پھینکا
وہ شبنم ہوں ، پہنچ سکتا نہیں دیوارِ گلشن تک
نسیم خلد ہوں میں ، تازگیٔ باغ ہے مجھ سے
ہمیشہ نور کے تڑکے گزر ہے میرا گلشن تک

۱۱- سید عابد شاہ عابد نائب تحصیل دار نوشکی :

سناؤں دردِ دل کس کو نہ مونس ہے ، نہ یار اپنا
مری سب حسرتیں دل میں رہیں گی روزِ مُردن تک
رُخِ زیبا سے سینے تک نظر اُتری تو یوں بولے
حیا کا پاس رکھ عابد بڑھا جاتا ہے دامن تک

۱۲- میر عنایت علی عنایت پنشنر لورا لائی :

بہاتا سیلِ گریہ کیا کہ جاتے یارِ بدظن تک
گلا گھونٹا گریباں نے جو اشک آئے بھی دامن تک
خطا میری نہیں صیاد میری آرزو لے جا
کہ مجھ کو کھینچ کر لائی بھی تھی دیوارِ گلشن تک
نہ کر آزاد اے صیاد ، لیکن رحم کر اتنا
نظر سے دیکھ لوں ، لے چل مجھے اجڑے نشیمن تک
تمھاری ہرزہ گوئی کا خیال آتا ہے جب دل میں
ڈبو دیتا ہے سیلابِ ندامت مجھ کو گردن تک
ہجوم کیف و مستی سے یہ عالم اب تو ہے ساقی
چلی آتی ہے مے اُبلی ہوئی شیشے کی گردن تک
برستا ہے جو ابرِ تر ، تمنائیں ٹپکتی ہیں
ڈبو دے آبِ مے میں آج ساقی مجھ کو گردن تک
غنیمت ہے عنایت جب میسر ہووے آزادی
ملیں گے ہم صفیروں سے پہنچ کر صحنِ گلشن تک

چند غیر طرحی غزلوں کے اشعار بھی پیش خدمت ہیں[1] :

۱- منشی ہرکرن داس ہرکرن کورٹ انسپکٹر پولیس فورٹ پولیس فورٹ سنڈیمن :

(ا) بہ تقریب تولید دیا کرشن فرزند ارجمند بابو جو ند لعل ہیڈ کانسٹبل پولیس ژوب و لورا لائی ، خلف الصدق ڈاکٹر گوپال داس ۔ احاطۂ ہسپتال

۱- قندیلِ خیال ، صفحات ۲۵—۲۸ ۔

فورٹ سنڈیمن میں ایک بھاری جلسے کے موقع پر پڑھی گئی :

امروز بزمِ یاراں کیا ہی ہری بھری ہے
یہ سنڈیمن میں نقشہ دربار اکبری ہے
اس گھر میں بج رہے ہیں خوشیوں کے شادیانے
یہ فضل ایزدی ہے ، یہ شانِ داوری ہے
لو یہ پری وہ آئی اور ساتھ لائی گوہر
گوہر ہے یارو کس کا اور کون جوہری ہے
گوہر ہے بےبہا یہ ، بابو جوند جی کا
قدرت نے جس کو بخشی کیا شانِ دلبری ہے
سنہ چاردہ میں تیرا اے دیا کرشن آنا
شکر خدا ہے لاکھوں کرتا وہ بہتری ہے

دیگر

گھر گھر خوشی ہے تیری او آن بان والے
قربان تجھ پہ سارے اے ننھی جان والے
ہو ڈاکٹر مبارک لاکھوں ہزار تم کو
کہتے ہیں مرحبا سب دستار و خوان والے
ماہ و سما کے مالک ارض و زماں کے خالق
کر ہرکرن پہ رحمت اے دو جہان والے

(ب) منشی اقبال الدین خان انسپکٹر پولیس مبدلہ بہ کوئٹہ کی یاد میں :

منہ پہ کلمہ آپ کا ، دل میں محبت آپ کی
سر میں سودا آپ کا ، ہے لب پہ مدحت آپ کی
بر زبانِ کہ و مہ ہے نام ہر دم آپ کا
دل میں ہے منشی سپاہی کے عقیدت آپ کی
آنکھ سے ہٹتی نہیں تصویر اک دم آپ کی
ہے دعا یہ ، عمر پائے اب طوالت آپ کی

غزلیہ اشعار

فرقت نے تیری خانا ! ہم کو رُلا کے مارا
کیا کیا رُلا کے مارا اور در در پھرا کے مارا
کافر ادا نے ایسا کچھ قافیہ کیا تنگ
گاہے رُلا کے مارا ، گاہے ہنسا کے مارا
افسوس اے ستم گر ، کیوں بے گنہ کو مارا
مجرم نہ ہرکرن تھا ، کیوں بے خطا کے مارا
اے خان جی تمھاری دولت ، عمر فزوں ہو
مجھ کو چھڑا لو لللہ ، بےدل نے آ کے مارا

۲- سردار محمد یوسف خان پوپلزئی یوسف[1] :

عداوت ڈال دی دنیا نے کیسی کالے گوروں میں
کہ ارباب مروت آج کل رہتے ہیں شوروں میں
ہماری خوبیٔ قسمت کے لچھن ہی نرالے ہیں
خدا کی شان پانی تھم رہا اُلٹے کٹوروں میں
میں جامِ جم سے کیا اندازۂ قسمت نکالوں گا
نظر جب آ رہا ہے اپنا مستقبل کٹوروں میں
عجب احمق ہیں جو ترچھی نگہ کو کہتے ہیں احول
لکھیں گے نام اُن کا ہم بھی اب کانوں میں کوروں میں
ہؤا وردِ زباں ہے نامِ حق جس دن سے اب یوسف
ہے تسبیحِ مرصع اپنی ہر انگلی کے پوروں میں

۳- ماسٹر شیخ محمد عبدالحق مدرس گورنمنٹ ہائی سکول سبی کی تصنیف کردہ دعائیہ نظم کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں - جب ننھے بچے اس کو نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے تو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا - یہ باون سال

۱- قندیلِ خیال ، صفحات ۳۲—۳۵ -

پہلے کی بات ہے :

اے خدا ! حاضر ہوئے ہیں ہم دعا کے واسطے
اے خدا ! منظور کر ارض و سما کے واسطے
اے خدا ! خورشید و ماہ و انجم سیارگاں
ہیں سبھی گردش میں گرداں مدعا کے واسطے
اے خدا تو رکھ سلامت شاہ جارج کو مدام
جس کا سایہ ہے مبارک انڈیا کے واسطے
اے خدایا باپ ، ما ، بھائی ، بہن اور آشنا
تو نے بخشے ہیں ہمیں مہر و وفا کے واسطے
اے خدا استاد بخشے عالم و فاضل عجیب
بہرِ تحصیلِ علومِ باصفا کے واسطے
اے خدا مکتب کی رونق ہو ہمیشہ اوج پر
یوں ہی یہ قائم رہے علم و ضیا کے واسطے
اے خدا ہم جس قدر ہیں علم کے طالب یہاں
ہوں نہ پھر طالب کبھی حرص و ہوا کے واسطے
اے خدا سن عبد کی بہرِ کرم یہ التجا
ہم جئیں تیری ثنا ، صدق و صفا کے واسطے

جناب نشتر جالندھری[1] جو نصف صدی پیشتر کوئٹہ میں سکونت پذیر

۱- عبدالحکیم خاں نشتر کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ ، عالمگیر اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں کابل سے ہندوستان آئے تھے - چونکہ یہ پٹھانوں کے قبیلے ''میاں خیل'' سے تھے اس لیے یہاں پہنچ کر اُنھوں نے جو گاؤں آباد کیا ، اُس کا نام ''میاں وال'' (تحصیل نکودر ضلع جالندھر مشرق پنجاب) رکھا - ان کی اولاد میں اس کثرت سے ارباب علم و فضل پیدا ہوئے کہ خود گاؤں کا نام ''میاں وال مولویاں'' مشہور ہو گیا - خاندان کے متعدد بزرگوں نے علومِ ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی درجۂ امتیاز حاصل کیا اور گرد و نواح کے علاقے میں ان سے بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا -
(مقدمہ 'نغمہ زندگی' از مولانا غلام رسول مہر ، صفحات ۱۱ - ۱۲)۔

رہے۔ تحریر فرماتے ہیں[۱] :

"۱۹۱۳ع میں جب میری عمر سترہ سال کی تھی، برادرِ بزرگ مولوی عبدالغفور خاں قادری نے مجھے کوئٹہ میں اپنے پاس بلا کر گورنمنٹ ہائی سکول کی دسویں جماعت میں داخل کرا دیا۔ بعض وجوہ کی بنا پر ۱۹۱۵ع میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے بارگ ماسٹری کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ شاعری کا شوق بلکہ جنون تھا لہٰذا میں نے وہاں کے شاعروں سے ملاقات کی۔ پتا چلا کہ چند سال پہلے یہاں دھوم دھام سے مشاعرے ہؤا کرتے تھے[۲]۔ لیکن آج کل اردو کی فضائے سخن پر سکوتِ مزار طاری ہے۔ میں نے عزم محکم اور سعی پیہم سے کام لے کر نئے سرے سے شعر و سخن کا بازار گرم کر دیا۔ عظیم الشان مشاعرے شروع ہو گئے اور بلوچستان کے گوشے گوشے سے پنجاب و ہند کے خوش گو شعرا ان میں شریک ہونے لگے۔"

جناب نشتر کے ارشاد کے مطابق "بزمِ سخن" ۱۹۱۵ع کے اواخر میں کوئٹہ میں قائم ہوئی اور دسمبر ۱۹۱۸ع میں اُن کی واپسی پر ختم ہو گئی۔ اس کے صدر شیخ چراغ دین تحصیل‌دار تھے اور ناظم نشتر جالندھری۔ سرگرم ارکان حسب ذیل حضرات تھے :

۱- نشتر جالندھری (۱۰ فردوس پارک سنت نگر لاہور) کا خط راقم‌الحروف کے نام مورخہ ۲۶ جون ۱۹۶۷ع۔

۲- سید غلام علی الماس "کوئٹہ میں اُردو" کے تحت لکھتے ہیں :

"۱۹۰۹ع سے کوئٹہ میں اُردو کو فروغ حاصل ہونا شروع ہؤا۔ سخن ور، سخن دان اور سخن شناس میدان میں آنے لگے۔ تھیوسافیکل ہال اور گھروں میں مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ عوام میں شعر و شاعری کا ذوق بڑھنے لگا۔ شعر پڑھنے اور داد دینے کا سلیقہ بھی آ گیا۔"

وہ حضرت نشتر کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

۱- حضرت ایاغ میرٹھی ، ۲- حکیم مطیع الرحمٰن مطیع دہلوی ، ۳- مولوی محمد بخش فریاد ، ۴- شورش اجمیری ، ۵- محمد یوسف خاں صاحب یوسف ۶- غنی گوالیاری ، ۷- گلزار محمد گلزار رسول نگری ، ۸- شہزادہ فرخ سیر لدھیانوی ، ۹- برق گوالیاری، ۱۰- قمر گوالیاری ، ۱۱- شوق امرت سری ۔
ان میں سے چند ایک کے اشعار یہ ہیں[1] :

ہزار نغمہ سرا میں ہؤا تو کیا حاصل
نہ اِس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری (مطیع)

خدا کے واسطے فریاد ! دشمنوں میں نہ جا
ہوا نہ باندھ پہاڑوں کے درمیاں میری (برق)

جھانک کر چلمن سے کوئی فتنہ ساماں رہ گیا
دید کا ارماں جو دل میں تھا ، وہ ارماں رہ گیا (شورش)

شاخسار گل پہ ہے جالی تنی صیاد کی
کیا بُری قسمت ہے یا رب بلبل ناشاد کی (چراغ)

۱۹۱۳ع سے ۱۹۱۸ع تک کا مجموعۂ کلام جناب نشتر جالندھری کے پاس محفوظ تھا جسے اُنھوں نے تلف کر دیا ۔ اس میں سے کچھ اشعار "مشاطۂ سخن"[2] میں طبع ہوئے تھے ۔ وہیں سے نقل کیے جاتے ہیں ۔ ان اشعار کی اصلاح نواب حیدر یار جنگ مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی اور منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم نے کی تھی :

آشیاں باغ میں بلبل کو بنانا نہ ملا
شاخِ گل پر تھا نوا سنج کہ صیاد آیا

افسانۂ دل پردۂ قلقل میں کہوں گا
رکھ دوں گا زباں کاٹ کے مینائے دہن میں

۱- راقم الحروف کے نام نشتر جالندھری کا خط مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۷ع -
۲- مشاطۂ سخن ، حصہ دوم ، از صفدر مرزا پوری ، صفحات ۹۹ - ۱۰۲
لاہور ، ۱۹۲۸ع -

دیکھو، رخِ تاباں کو نہ زلفوں سے چھپاؤ
اندھیر ہے خورشید جو آ جائے گہن میں

ٹھہر ٹھہر کہ ہوں مہماں میں بھی دم بھر کا
قریبِ ختم ہے اے شمع! داستاں میری
بھڑکتی جاتی ہے اندر ہی اندر آتشِ عشق
سلگ رہی ہیں تپِ غم سے ہڈیاں میری

چمن میں پھول، فلک پر کواکب و مہ و مہر
یہ ہیں کسی گلِ رعنا کے گل کھلائے ہوئے
ہلال جھک کے یہ گردن کشوں سے کہتا ہے
جو سرفراز ہیں، رہتے ہیں سر جھکائے ہوئے
عجب ہوائے فنا چل رہی ہے عالم میں
کہ سب چراغ کواکب ہیں جھلملائے ہوئے

مگر پائے حنائی سے کسی نے سیر دریا کی
نگاہیں پھول چنتی پھرتی ہیں دامانِ ساحل سے
مدد اے جوش الفت پر لگا دے تو ہی قدموں کو
کہ منزل دور مجھ سے اور میں ہوں دور منزل سے
یہ ربطِ باہمی تو دیکھ، کس الفت سے لپٹا ہے
مرا دل تیرے پیکاں سے ترا پیکاں مرے دل سے
پڑا ہے کام کس کی کاوش مژگاں سے اے نشتر
کہ فـوّارہ لہو کا چھوٹتا ہے ہر رگِ دل سے

آسماں پر یہ اشارہ کر رہا ہے ماہِ نو
سرفرازی میں بھی لازم ہے کہ گردن خم رہے

مجھ کو گھونگٹ میں نظر اُن کی ادا آتی ہے
آج مقتل میں دلھن بن کے قضا آتی ہے
کشتۂ زلف وہ ہوں میں کہ مری تربت پر
رات اوڑھے ہوئے ماتم کی ردا آتی ہے
ہوش پیارے ہوں جسے، جائے وہ مے خانے سے
دور میں آج مئے ہوش ربا آتی ہے[1]

۱- نشتر جالندھری نے کوئٹہ سے واپس جا کر ایک نظم بعنوان ''کوئٹہ کی رنگین یاد'' لکھی تھی- وہ اُن کے پہلے مجموعۂ کلام ''نغمۂ زندگی'' (ا کتوبر ۱۹۳۳ء - فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹ سرکلر روڈ، لاہور) میں درج ہے- صفحات ۱۴۹ - ۱۵۲ - کل ۲۳ شعر ہیں- چند ایک یہ ہیں:

یاد ایام کہ تھا کوئٹہ مسکن میرا
مکتبِ عشق وہی تھا، وہی ایمن میرا
آہ وہ محفل رنگیں وہ ادب گاہِ جنوں
حسنِ معصوم کی البیلی ادا کا افسوں

نجد کے دشت کا نقشا نظر آتا تھا مجھے
ہر طرف جلوۂ لیلا نظر آتا تھا مجھے

رمز آموزِ جنوں سیر وہ کہساروں کی
حسن افروز فضائیں وہ چمن زاروں کی
سنڈمن ہال میں احباب کے جلسے وہ کہاں
چاندنی رات کے پُر کیف نظارے وہ کہاں
غازۂ روئے چمن، زیور شہناز بہار
حسن اے کوئٹہ! تیرا پر پرواز بہار
موسم گل میں تو اس درجہ حسیں ہوتا ہے
غلغلہ تیرا سرِ عرشِ بریں ہوتا ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

وقار انبالوی رقم طراز ہیں :

جب کوئٹے کا ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ کوئٹہ جس میں ہم نے جوانی کی بہاریں لوٹی تھیں ، اب کہاں ؟ ۱۹۶۴ء میں جس کوئٹے کو میں نے دیکھا وہ بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے کے کوئٹے سے بہت مختلف ہے۔ بہت وسیع ، بہت جاندار ، بہت شاندار لیکن صاحب وہ گلپوش وادی : ع

پلا جس کی گودیوں میں مرا ذوق شاعرانہ

مجھے ۱۹۶۴ء میں نظر نہیں آئی ۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

شوق دیدار میں ہر پیر و جواں آتا ہے
تو اس انداز سے مینہ جلووں کا برساتا ہے
حسن ہے نغمہ ہے مستی ہے ادا ہے تجھ میں
جذب ہے سحر ہے اعجاز ہے کیا ہے تجھ میں؟
تیرے میووں کی حلاوت میں کشش ہے کوئی
جلوہ افروز ہے یا تجھ میں ''نئی شے'' کوئی ؟

مجھ کو معلوم تو ہے راز بتاؤں کیونکر
معنوی کیف کو لفظوں میں دکھاؤں کیونکر
آرزوئیں تری گودی میں جواں ہوتی ہیں
حسرتیں خاک کے پردے میں نہاں ہوتی ہیں
حسن ہے ساقیٔ عرفاں ترے میخانے میں
موج زن کوثر و تسنیم ہیں پیمانے میں

کاش وہ خطۂ محبوب دوبارہ دیکھوں
جنتِ ذوق کا پُر کیف نظارہ دیکھوں

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سنڈیمن ہال ایک دلکشا باغ کے اندر واقع تھا ۔ باغ کو سنڈیمن ہال ہی کہتے تھے۔ یہ زلزلے سے پیشتر کی بات ہے ۔

کوئٹے میں باقاعدہ اور بے قاعدہ مشاعروں کی طرح میں نے ایک نویں جماعت کے طالب علم محمد صادق شاذ سے مل کر ڈالی تھی - پہلا مشاعرہ تو غالباً ۱۹۲۳ء کے آخر میں بابو محلے میں ایک شہتوت کے نیچے منعقد ہؤا تھا، جس میں کچھ ہرزہ سرائی میں نے کی - کچھ یو پی کے شاعر حضرات تھے جو چھاؤنی میں انگریزوں کے نجی ملازم تھے مجھے ایک خانساماں کے دو شعر اب تک یاد ہیں، سنیے :

آیا پوشاک پہن کر جو مٹکتی ہے ذرا
پارٹی بیروں کی کیوں کر نہ بھکتی نکلے
میٹ کو کرتے ہیں تاکید خلیفہ ہر دم
جیلی سانچے سے جو نکلے تو لچکتی نکلے

اگلا مشاعرہ خدا داد کے ہوٹل، پیر بخاری بازار میں ہؤا - مشاعرہ ہو رہا تھا کہ ایک صاحب نذر نامی جھومتے جھامتے ہاتھ میں کوڑا لیے آ ٹپکے اور کہنے لگے ''غزل اس طرح مت بولو، گا کر بولو - ام آرمینم بجاتا ہے، تم گاؤ!'' اور پھر جو ظالم نے ہارمونیم بجایا تو سب کو دنگ کر دیا - ان کی جائیداد کورٹ آف وارڈز کے سپرد تھی - جو روزینہ ملتا تھا وہ کوئٹہ بروری کی نذر ہو جاتا تھا - بہر حال یہاں بھی مشاعرہ مداخلت کی نذر ہؤا - آخر ایک صاحب سید محمود[1] کو مشاعروں کی کس مپرسی پر ترس آیا -

---

۱- سید محمود جس ملک کی زبان بولتے تھے، اُس ملک کا لباس بھی اُن کے پاس تھا - اُس ملک کے طور طریقوں، آداب و معاشرت اور روایات سے بخوبی آگاہ تھے - پہلی جنگ عظیم میں فوج میں بھی رہ چکے تھے - کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات انگریزوں نے اُن کی اس خاص قابلیت سے فائدہ اُٹھا کر بعض جگہ سفارتی مشکلات بھی حل کیں - واللہ اعلم ———
آدمی بہت چرب زبان تھے - حافظہ بلا کا پایا تھا، یاروں کے یار تھے، کبر و غرور نام کو نہ تھا - علم موسیقی کے ماہر تھے، آواز سائیں اختر حسین سے بھی بلند تر تھی - قد بہت لمبا تھا، اُس پر مونچھیں بڑی بڑی، بڑی بارعب اور دلچسپ شخصیت تھی - شاعری بھی فرماتے تھے اور بے تکلف

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یہ صاحب ہفت زباں تھے اور کوئٹہ میں ٹانگہ انسپکٹر تھے - انھوں نے اپنے ایک ماتحت سے کہہ کر گاڑی احاطہ اسلام آباد میں (جہاں اب سینما ہے اور شاہراہ، جو توغی روڈ کے نام سے موسوم ہے) مشاعروں کا بندوبست کرا دیا - میں ۱۹۲۵ع کی ابتدا میں کوئٹہ چھوڑ کر چلا آیا تو شاذ تنہا یہ علم اٹھائے پھرے[۱] -"

محمد صادق شاذ کے اُس زمانے کے چند شعر یہ ہیں[۲]:

کھینچ لائی ترے کوچے کی محبت مجھ کو
آدمی زاد ہوں، محبوب ہے جنت مجھ کو

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

فی البدیہہ شعر کہتے تھے - دنیا بھر کی زبانوں کے اشعار زبانی یاد تھے - جس محفل میں بیٹھتے، فوراً اس کے روح رواں بن جاتے - دنیا بھر کے موضوعاتِ علمی پر بے تکان بولتے تھے - افسوس کہ ان کے اشعار نہ مل سکے - بلوچستان میں اردو ادب کے فروغ میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے - ۱۹۳۵ع کے زلزلے میں بچ گئے تھے لیکن چوٹیں کافی آئی تھیں - غالباً ۱۹۳۵ع میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر وفات پا گئے - حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (بحوالہ تحریر محشر رسول نگری، پاکستان پریس کوئٹہ، مورخہ ۳ اگست ۱۹۶۷ع) -

۱- جناب وقار انبالوی کا خط شرق پور سے راقم الحروف کے نام، مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۶۷ع - وہ اپنے تخلص کے بارے میں لکھتے ہیں: "میرا تخلص ابتدا میں شاکر تھا - شاذ کے پاس "خمخانۂ جاوید" کی جلدیں جانے کہاں سے آ گئی تھیں - وہ کہنے لگے اس تخلص کے بہت سے شاعر ہوئے ہیں اور پیارے لال شاکر تو ابھی زندہ ہیں لٰہذا کوئی اور تخلص اختیار کرو - میں رات کو ایک تخلص سوچتا اور صبح کو شاذ صاحب اس تخلص کے کئی شعرا کا نام اور کلام سنا دیتے - آخر ایک دن خود انھوں نے مجھے ایک بے مثال و لاجواب لیکن غیر معروف تخلص غاضف عنایت کیا - اسے مولانا تاجور نے نظر سے بدلنا چاہا، لیکن نظر مجھے پسند نہ آیا اور پھر میں نے وقار تخلص اختیار کیا -"

۲- ریڈیائی تقریر "بلوچستان میں اُردو" غلام حسین حکیم مرحوم، ۴ نومبر ۱۹۶۰ع -

ایک لغزش پہ جہاں حضرت آدم نہ رہے
وہی جنت ہے تو راس آ چکی جنت مجھ کو

تم جو محفل میں مری آج شب اے گل گل ہو
شمع محفل پہ وہ گل کھائے کہ گھل گھل گل ہو
گل بدن گل رخ و گلقند لب و گل بو ہو
نہیں آمیزش ِگل آپ میں ، بالکل گل ہو
داغ دل کا مرے اے شاذ سلگنا اچھا
کہ یہ وہ گل ہے کہ بندھ جائے اگر گل گل ہو

سوز گل سے جو بھرے ہیں ترے نالے بلبل
برگ گل پر کہیں پڑ جائیں نہ چھالے بلبل[۱]

رفتہ رفتہ ۱۹۲۷ء میں محمد صادق شاذ صاحب کی کوششوں سے بزم ادب قائم ہوئی ۔ اُن دنوں بلوچستان کی فضا جلسوں ، جلوسوں اور عوامی تحریکوں سے نا آشنا تھی ۔ چنانچہ جب بزم ادب کے پہلے جلسے کے لیے پولیس سے اجازت طلب کی گئی تو انجمن کے واضح اغراض و مقاصد کے باوجود کارکنان انجمن سے کئی دن پوچھ گچھ ہوتی رہی ۔ بقول شاذ ''انسپکٹر پولیس بار بار کہتا تھا : ''تم 'مسحرا' کرتا ہے ، اچھا تو تم گورنمنٹ کے خلاف 'مسحرا' کرتا ہے ۔''

اس بزم کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعرے ہوتے تھے اور ادب سے دلچسپی

۱۔ محمد صادق شاذ کی بیاض ۔

صادق شاذ نے ۱۹۲۹ء میں ایک انجمن خدام المسلمین کوئٹہ کی داغ بیل بھی ڈالی تھی جو ۱۹۳۵ء تک قائم رہی ۔ یہ اصلاحی انجمن تھی ۔ مولانا ثناء اللہ کے ساتھ مل کر نماز کمیٹیاں بھی بنائی تھیں ۔ اُردو کے اشعار پڑھ پڑھ کر لوگوں کو نیند سے بیدار کرتے تھے ۔ ایک شعر یہ تھا :

اے محمدؐ کی آنکھوں کے تارو اُٹھو
رات غفلت میں تم نے گزاری ، اُٹھو

رکھنے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا تھا - ۱۹۲۸ء میں سر عبدالقادر کی صدارت میں مشاعرہ ہؤا جو بہت کامیاب رہا - دوسرے سال جو مشاعرہ ہؤا اس میں حفیظ جالندھری جیسے عالی قدر شاعر نے شمولیت کی - ترویجِ ادب کے اس حلقے میں بلوچستان کے بیشتر نامور شاعر اور ادیب بھی شامل تھے، مثلاً عبدالحق زبور (ہلال بھی تخلص فرماتے رہے)، نواب یوسف علی خان عزیز، محمد حسن نظامی، محمد حسین عنقا، نسیم تلوی، اسلم اچکزئی وغیرہ - ان میں اکثر بعد میں مشہور اخبار نویس اور ادیب بنے - یہ سب صاحبان پشتو، بلوچی اور براہوئی بولنے والے خاندانوں کے چشم و چراغ تھے - اسی گروہ میں یہاں کا ایک باسی ہندو نوجوان طوطا رام بھی تھا جس کے گھر میں سندھی بولی جاتی تھی - جب بزم ادب نے زلزلے سے پیشتر کوئٹے سے رسالہ "نوشیرواں" جاری کیا تو اُس کی ادارت اسی نوجوان کے سپرد ہوئی تھی، مگر ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں یہ گوہر گران مایہ مٹی میں مل گیا - [1]

محشر رسول نگری کا کہنا ہے کہ زلزلے سے پیشتر "بزم سخن" کا احیا بھی ہؤا تھا - اُس کے صدر خان بہادر عین الدین خاں (جن کے نام پر ایک سڑک بھی مشہور ہے) - جنرل سیکرٹری غلام محمد جمیل (جو بلبل بلوچستان

۱- پاسبان، کوئٹہ، ۶ جولائی ۱۹۳۹ء -
"بلوچستان میں اُردو" غلام حسین حکیم (ریڈیائی تقریر) ۴ نومبر ۱۹۶۰ء - زلزلے سے پیشتر مشہور ماہر مالیات مرحوم زاہد حسین بھی (۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۱ء) کوئٹہ چھاؤنی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے - وہ بھی علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی فرماتے تھے - بقول شاذ: زاہد حسین صاحب کو شاذ کا یہ شعر بہت پسند تھا:

ایک لغزش پہ جہاں حضرت آدم نہ رہے
وہی جنت ہے تو راس آ چکی جنت مجھ کو

ان ادبی جلسوں کے لیے جناب صادق شاذ بہ آسانی چندہ اکٹھا کر لیتے تھے - لوگوں کو اُن پر پورا اعتماد تھا - مالی سرپرستی فرمانے والوں میں نبی بخش زہری، میر جعفر خان جمالی، قادر بخش بلوچ، نواب خاران اور زاہد حسین وغیرہ شامل تھے -

کہلاتے تھے)، روح رواں سید آغا محمود (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) تھے۔ ایک مشاعرے میں مصرع طرح تھا:

جھوم رہی ہیں شوخیاں دیدۂ نیم باز میں

محشر صاحب نے کہا تھا:

یہ تو شرف مجھی کو تھا آپ کا راز رکھ لیا
غیر تھا جو نہ رکھ سکا راز کی بات راز میں

اُس زمانے یعنی ۳۲ - ۱۹۳۱ء تک یہاں اُردو پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد بموجب سرکاری اعداد و شمار تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

۱۹۳۵ء کے زلزلے سے پہلے جن علمی و ادبی سرگرمیوں (مشکلات کا ذکر صحافت کے تحت کر دیا گیا ہے) کا دور دورہ تھا، اُن کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملتی ہیں۔

۲۱ جولائی ۱۹۳۴ء کو ۹ بجے شب نیاز مندان کوئٹہ کی سرپرستی میں ایک عظیم الشان مشاعرہ میکموہن پارک متصل اسلامیہ ہائی سکول میں زیر صدارت حافظ قطب الدین ایم اے، بی ٹی ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ انعقاد پذیر ہؤا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً پانچ چھ سو تھی۔ بہت سے شعرائے کرام کوئٹہ نے طرحی اور غیر طرحی کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ زبیری، نیاز، شاذ اور جمیل کا کلام از حد پسند کیا گیا۔ میر مشاعرہ کی افتتاحی تقریر اور شکریے کے بعد تقریباً ایک بجے شب یہ دلچسپ ادبی بزم بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی۔[۱]

۸ ستمبر ۱۹۳۴ء کو اسلامیہ ہائی سکول اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ سکول ہذا کے ہال میں نو بجے شب زیر صدارت جناب وزیر زادہ عبدالاحد خان منعقد ہؤا۔ ہال کے علاوہ دیگر کمروں میں بھی پبلک کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ معززین شہر نے کافی تعداد میں شرکت فرمائی۔ شعرائے کرام نے طرحی اور غیر طرحی کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ان میں ارمان صاحب دہلوی تلمیذ حضرت داغ،

۱- اتحاد بلوچاں (ہفتہ وار) کراچی، صفحہ ۸، ۲۹ جولائی ۱۹۳۴ء۔

شاذ صاحب ، نیاز صاحب ، فراق صاحب ، جمیل صاحب اور زبیری صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مشاعرہ رات کو ایک بجے کے قریب بخیر و خوبی اختتام پذیر ہؤا[۱] ۔

زلزلۂ عظیم (۳۱ مئی ۱۹۳۵ع) میں زندگی کے سارے نظام کے تہ و بالا ہو جانے کے بعد جب دوبارہ وادیٔ شال میں آثارِ حیات پیدا ہوئے تو ادبی زندگی بھی از سر نو اور زیادہ رونق کے ساتھ نمودار ہوئی ۔ کئی ادبی انجمنیں قائم ہو گئیں ، گو اصلیت یہی رہی کہ :

یک چراغست درین خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند (فغانی)

ایک دور ایسا بھی آیا کہ مصحفی اور انشا کے زمانے کی یاد تازہ ہو گئی ۔ بہر حال اُردو ادب میں دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی ۔ کئی ایک پریس کھلے ، کئی اخبار اور ہفتہ وار پرچے جاری ہو گئے اور یُوں اُردو عوام کے اظہارِ خیال کا ذریعہ بن گئی ۔

۲۹ ، ۳۰ جون اور یکم جولائی ۱۹۳۹ع کو صنعتی نمایش کوئٹہ کے تھیٹر ہال میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہؤا ۔ پہلی نشست کے صدر وزیر زادہ عبدالاحد خاں[۲] تھے ۔ اُنھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا :

''بلوچستان ایک ایسا صوبہ ہے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں تعلیمی و ادبی لحاظ سے پس ماندہ اور علوم و فنون سے بے بہرہ سمجھا جاتا ہے ۔ یہ وہ ملک ہے جس میں دریا ہیں لیکن اُن میں پانی نہیں ، جنگل ہیں لیکن اُن میں درخت نہیں ، بستیاں ہیں لیکن آبادی سے خالی ہیں ۔ لیکن آج کا یہ مشاعرہ ثابت

۱۔ اتحاد بلوچاں (ہفتہ وار) کراچی ، صفحہ ۳ ، ۷ اکتوبر ۱۹۳۴ع ۔
۔ آپ میونسپل سیکرٹری تھے ۔ علم و ادب کا ذوق سلیم رکھتے تھے ۔ خود بھی شعر کہتے ، شعرا اور ادبا کے مربی" تھے ۔ آپ کی نظم ''نور جہاں'' بہت مشہور تھی ۔ آپ بلوچستان میں اردو زبان اور اُردو علم و ادب کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہے ۔

کرتا ہے کہ علم و ادب کے متعلق جو رائے ہے ، اس میں ترمیم کی گنجایش ہے ۔ آج کا بلوچستان مختلف ہے ۔ اس میں ذوق علم اور ترقی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے ۔

پچھلے دنوں زلزلے کے اثرات کی وجہ سے ادبی کوششوں میں رکاوٹیں آتی رہیں لیکن محمد صادق خان شاذ صاحب کی ہمت کم نہ ہوئی ۔ اس بہار کے اوائل میں 'یوم اقبال' منایا گیا جو پورا کامیاب ثابت ہؤا ۔ 'بزم ادب' نے جو کام کیا ہے ، اُس کی وجہ سے بلوچستان کے بچے بچے کے دل میں ادب کا مذاق پیدا ہو گیا ہے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کوئٹہ سے اُردو کے تین اخبار نکل رہے ہیں ۔ ان کی پالیسی کچھ ہی کیوں نہ ہو ، لیکن اُردو کی خدمت سب کر رہے ہیں ۔ اُمید ہے کہ بزم ادب کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے گی تا کہ وہ اردو کی خدمت زیادہ کر سکے ۔ میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج کے تاریخی مشاعرے کا صدر منتخب کر کے میری عزت افزائی کی گئی ہے ۔"

دوسری نشست کے صدر خان بہادر میر کریم بخش خان ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم ریاست قلات اور تیسری نشست کے صدر مسٹر محمد اکرام الحق آئی ۔ سی ۔ ایس تھے ۔ خان بہادر کریم بخش نے منظوم تقریر کی تھی جو اکیس اشعار پر مشتمل تھی ۔ پہلے صنعتی نمائش کا ذکر کیا ہے اور بعد میں ادب کے بارے میں خیالات کا اظہار ملتا ہے ۔ چند شعر یہ ہیں :

بلوچستان کے لوگوں کا یہ حسنِ عقیدت ہے
کہ حاصل مجھ کو اس اجلاس کا شرفِ صدارت ہے
نمایش کے بیاں سے میں شروع خطبہ کرتا ہوں
مجھے ہر بات میں مدِ نظر حق و صداقت ہے
یہ محفل جو سجائی ہے ہمارے درد مندوں نے
وطن اور قوم کی یہ انتہا درجے کی خدمت ہے
یہ 'پر عظمت نمایش ایک زینہ ہے ترقی کا
کہ صنعت ہی سے قوموں کی بلندی اور رفعت ہے

نہ پوچھو مجھ سے ، کیا ہے قدر و قیمت دستکاری کی
ہزاروں بادشاہوں کا خزانہ اس کی قیمت ہے
یہ ہے وہ شمع جس سے گھر میں مفلس کے اُجالا ہے
یہ ہے وہ نور جس سے اس جہاں میں دور ظلمت ہے
ہمارے بچے اپنے ہاتھ سے روزی کریں پیدا
ہمیں اس دور میں سب سے زیادہ اس کی حاجت ہے
بچا سکتی ہے کوئی چیز گر ہم سب کو فاقوں سے
تو بس اک صنعت و حرفت ہے اور ذوقِ تجارت ہے
نمایش گاہ میں مجلس جو ہے یہ شعر گوئی کی
ادب کے از سر نو زندہ ہونے کی شہادت ہے
وہی اصلی ادب ہے روح جو پھونکے ترقی کی
وہی اصلی ادب ہے جو علم بردارِ صنعت ہے[1]
ادب میں سے فسانے لیلیٰ و مجنوں کے باطل ہیں
یہاں باطل سے کیا مطلب ، حقیقت پھر حقیقت ہے
ادب ہم کہہ نہیں سکتے کبھی ذہنی تعیش کو
ادب ہے بس وہی جس میں فلاحِ ملک و ملت ہے
جو ہو ادبار کی لعنت مٹانے پر کمربستہ
ہمیں اے میر ایسے ہی ادب کی اب ضرورت ہے

اس مشاعرے میں بیرونِ بلوچستان سے جن شعرا نے شرکت فرمائی اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

ساغر نظامی ، ضیاء راولپنڈوی ، عدم افسر صاحب امروہوی ، صبا دہلوی ، حیات امروہوی ۔ مقامی شعرا یہ تھے :

نذیر احمد شیخ ، قاری نصیر آبادی ، محشر رسول نگری ، لطیف ، ارشد امروہوی ، جگت رام بی اے اور صادق شاذ ۔

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ٦ جولائی ۱۹۳۹ع ۔

مصرع طرح دو تھے:

۱۔ گرتا ہوں اس لیے کہ اُٹھا لے خدا مجھے

۲۔ خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمن بے ہوش ہے

جناب مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر 'انقلاب' تشریف نہ لا سکے، اُنھوں نے غزل بھیج دی۔ اُسی سے مشاعرے کی ابتدا ہوئی۔ سالک صاحب کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا:

سجدے میں مانگتا ہوں دُعا اپنی موت کی
گرتا ہوں اس لیے کہ اُٹھا لے خدا مجھے

شاذ صاحب کو اس شعر پر خوب داد ملی:

میری شکست ہی مرا کوسِ رحیل تھی
کیا چوٹ دے گئی مرے دل کی صدا مجھے

نذیر احمد شیخ کے اس شعر کو پسند کیا گیا اور خوب داد دی گئی:

زلف بھی کرنے لگے وہ نذرِ مقراض فرنگ
جو بہار دوش تھی، وہ آج بار دوش ہے

قاری نصیر آبادی کے اس شعر نے مجمع سے خوب خراجِ تحسین وصول کیا:

لو پہنچا رازِ عشق کہاں سے کہاں تلک
تم نے کہا نظر سے، نظر نے کہا مجھے

۳۰ جون ۱۹۳۹ع کو پنجاب اور زلزلہ پر نظمیں پڑھی گئیں۔ ضیا صاحب کی نظم کو بہت پسند کیا گیا۔ ساغر صاحب نے اپنا کلام سنایا اور مجمع کو گرویدہ کر لیا۔ بہت رات گئے تک حاضرین ان کی ترنم باریاں سنتے رہے۔

یکم جولائی ۱۹۳۹ع کی رات بھی اسی طرح نغمہ ریزیوں میں گزری۔ نذیر احمد شیخ نے اپنی نظم ''چور کی سیر'' سنا کر مجمع کو کشت زعفران بنا دیا اور مشاعرہ ختم ہوا۔ ''چور کی سیر'' ایک پیروڈی ہے جس کے

نو بند ہیں۔ پہلا اور آخری بند ملاحظہ فرمائیے[۱]:

لکھ پتی 'دوکان دار جاگتا ہے نابکار
کھانستا ہے بار بار

ہے یہ حرص کا شکار سر پہ بھوت ہے سوار
یا ہے غالباً بخار میں یہ اس کا کاروبار
دیکھتا چلا گیا

سو رہا تھا اہل کار شکل سے تھا مال‌دار
پیٹ میں بھی تھا اُبھار

کچھ نہ تھی اُسے خبر میں سمیٹ سارا گھر
تالے توڑ کر لے بغل میں مال و زر
دیکھتا چلا گیا

یہ پہلا موقع تھا کہ بلوچستانیوں نے ہندوستان کے مشہور شاعر ساغر نظامی کا کلام خود ان کی ترنم بار زبان سے سنا۔ ان کی نظم 'پنگھٹ کی رانی' اور ان کی 'پجارن' کو کوئٹہ کی فضائیں بھول نہ سکیں گی۔

کوئٹہ میں موسم بہار کا آخری شاندار ادبی جلسہ ۲۱، ۲۲ اکتوبر[۲] ۱۹۳۹ء کو سیکموہن پارک میں منعقد ہوا۔ پہلی نشست کی صدارت میاں نصیرالدین احمد اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر نے فرمائی۔ اُنھوں نے اپنے خطبے میں فرمایا:

"ہندوستان کے جس دور دراز حصے میں آپ چلے جائیں، اس زبان کو سمجھنے والے آپ کو ملیں گے۔ زبان کی یک جہتی، قومی اتحاد

۱- حرف بشاش، صفحات ۱۶۹—۱۷۲۔

۲- پاسبان: کوئٹہ، ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء۔ اگست ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ کوئٹہ میں قائم کی گئی۔ آنریری سیکرٹری غلام سرور انور تھے۔ سیٹھ فدا علی مستعدی اور سرگرمی سے کام کرتے تھے۔ اس شاخ کی جداگانہ حیثیت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ (پاسبان، کوئٹہ، ۱۲ اگست ۱۹۳۹ء)۔

اور مختلف خیال کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے ضروری ہے ۔ اس لیے تمام لوگوں کا ، جو ہندوستان میں رہتے ہیں اور اپنے آپ کو ہندوستانی کہتے ہیں ، یہ فرض ہے کہ وہ اردو کو اپنا بنائیں ۔ اردو سے محض اس لیے نفرت نہیں کرنی چاہیے کہ اس کی بنیاد مسلمان بادشاہوں نے رکھی ہے ۔''

میاں صاحب نے اس بات کی خوشی ظاہر کی کہ جلسے میں ہندو ، مسلمان اور سکھ صاحبان کثرت سے آئے ہوئے تھے ۔

آپ کے بعد بزم ادب کے صدر وزیر زادہ عبدالاحد خاں نے بزم ادب کی خدمات پر ایک سرسری نظری ڈالی کہ اس سے پہلے بھی یہ بزم چند گرامی قدر شعرا کو یہاں بلا چکی ہے ، آج بھی اس سلسلے کی ایک اور بیش قیمت قسط پیش کی جا رہی ہے ، یعنی احسان دانش ۔

وزیر زادہ صاحب کے بعد مختلف اصحاب نے اپنے مضامین اور نظمیں پڑھیں ۔ مضامین میں سید اکبر حسین رضوی اکسائز انسپکٹر سیبوی (سبی) کے مزاحیہ مضمون ''سیوی سے کوئٹہ تک میرا سفر'' کو بہت پسند کیا گیا ۔

عباس قدسی کی نظم ''آ پریم کے پجاری'' نے بھی خراج تحسین وصول کیا ۔ حکیم غلام حسین سیماب کے مقالے کو بھی داد ملی ۔ بزم کے سیکرٹری اور بلوچستان کے مشہور شاعر شیخ نذیر احمد کی نظم ''سگریٹ نوش کا پہلا روزہ[۱]'' پسند کی گئی ۔ احسان دانش نے اپنی متعدد نظمیں سنائیں جن میں انسانی درد مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ بالخصوص ''جشنِ بیچارگی'' کو سن کر مجمع بہت متاثر ہوا ۔ اس نظم میں

۱- اس نظم کے تین بند ہیں ۔ آخری بند یہ ہے :

دینا مجھ کو کوئی ناول   آج پکاؤ میٹھے چاول
مہمل یہ تحریر ہے کیسی   ناول ہے کچھ ایسی ویسی
مجھ کو پھر اک بار سلا دو   ماچس میری دور چھپا دو
میرے دل میں کھوٹ بہت ہے   سگرٹ کی اب ٹوٹ بہت ہے
آج گزارا دن مر پڑ کے   کل نہ جگانا تڑکے تڑکے

(حرف بشاش ، صفحہ ۱۱۶)

آپ نے اپنے ایک مزدور دوست کی لڑکی کی شادی کا حال بیان کیا ہے اور بتلایا ہے کہ افلاس کی وجہ سے یہ مزدور اپنی پیاری بچی کو دو کپڑے بھی جہیز میں نہیں دے سکا۔ آپ کی نظم ''گنگا میں طوفان'' بھی پسند کی گئی۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو یہ محفل پھر آراستہ ہوئی۔ شیخ عبد الرحمٰن سیشن جج صدر تھے۔ حسب معمول نظمیں اور مقالے پڑھے گئے۔ علامہ اقبال پر ریاض صاحب اور خواجہ سردار علی اور میر انیس پر حنیف صاحب نے مضمون پڑھا۔ ان کے بعد احسان دانش نے اپنی متعدد نظمیں سنائیں۔ ''سادھو کی چتا'' اور ''شوہر کو خط'' بہت پسند کی گئیں۔

وزیر زادہ عبد الاحد خاں، صادق شاذ اور محشر رسول نگری نے بھی اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ نذیر احمد شیخ نے اپنی مثنوی ''شیر و خر''[۱] بھی پڑھی اور داد پائی۔

اگست ۱۹۴۰ء میں بزم ادب کے زیر اہتمام عام ادبی جلسہ اور مشاعرہ منعقد ہؤا۔ راجپال صحرائی، سیماب، حسن نذیر ایم اے (صادق شاذ کے برادرِ اصغر۔ آپ کا افسانہ ''شیشم کے پتے'' خاصا مشہور ہؤا تھا)، ڈاکٹر حامد، شاذ، محشر، صوفی حکیم، نذیر احمد شیخ، اکبر حسین رضوی وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ مصرع طرح تھا:

نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں[۲]

۱- کارکی کرتے کرتے کوئٹہ بھی گئے، یہاں کی بڑی ادبی پیداوار اُن کی مثنوی ''شیر و خر'' ہے جو انھوں نے ''مسئلۂ خیر و شر'' پر روشنی ڈالنے کے لیے لکھی تھی۔ خیر و شر جیسے اہم مسئلے کا ''شیر و خر'' کی قسم کے حیوانات سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو نظم دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے، یا ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی معلوم نہ ہو سکے۔ مگر افسوس ہے کہ اس معرکۃ الآرا مثنوی کے اشعار دستیاب نہیں ہو سکے اور اسی لیے یہ سارا معاملہ بھی واضح نہ ہو سکا۔''
(حرف بشاش، تعارف از ممتاز حسن، صفحہ ۱۵، لاہور ۱۹۶۵ء)۔

۲- پاسبان، کوئٹہ، ۲۵ اگست ۱۹۴۰ء۔

اپریل ۱۹۴۱ء میں بزم ادب نے ایک شاندار مشاعرے کا بندوبست کیا۔ سناتن دھرم سکول کا ہال لوگوں سے پٹا ہوا تھا۔ ظفر صاحب کی "لاجونتی" کو سراہا گیا۔ محشر رسول نگری صاحب کے علاوہ جناب وزیر زادہ عبدالاحد خاں صدر بزم ادب نے بیس سال کی خاموشی کے بعد غزل کہی تھی اور پیش کی تھی۔[1]

اگست ۱۹۴۱ء میں وار فنڈ کمیٹی کے تحت میلہ لگا۔[2] ۱۱ اگست ۱۹۴۱ء کو میلے کے تھیٹر ہال میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ مزاح نویس، ادب کثیف، ماڈرن شاعری اور پولٹیکل غزل کے موجد اور 'شہباز' اخبار سے منسلک حاجی لق لق نے شرکت فرمائی اور اپنے مزاحیہ کلام سے حاضرین کو مسرور کیا۔ مقامی شعرا میں سے شاذ، محشر، جمیل اور راجپال صحرائی کی غزلوں کو پسند کیا گیا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد کوئٹہ کے مشہور حاذق حکیم اور شاعر مشتاق احمد صاحب نے اپنے کلام سے رونق جمائی۔ اکثر حضرات کو شربت بھی پلایا۔ پھر میجک ہال میں مشاعرہ ہوا۔ حاجی لق‌لق صاحب نے حاضرین کے اصرار پر اپنی مشہور نظم، "مقصد حیات" بھی سنائی۔ اس رات بزم اقبال[3] کوئٹہ کے شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا۔

۱۔ پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ اپریل ۱۹۴۱ء۔

۲۔ ایضاً، ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء۔

۳۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں کوئٹہ میں "بزم اقبال" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے دو مقصد تھے: ایک تو اقبال کی یادگار کو بلوچستان میں قائم کرنا۔ دوسرے اُردو زبان کی نشر و اشاعت اور ادب اردو کو فروغ دینا۔ صدر، اس خطے کے مشہور وکیل ملک کرم الٰہی اور جنرل سیکرٹری ڈاکٹر غلام نبی تھے۔

(پاسبان کوئٹہ، شمارے ۲۰ جنوری، ۲۸ جنوری، ۲۸ فروری ۱۹۴۱ء)

لٹریری سوسائٹی کوئٹہ[1] کے زیر اہتمام براؤن جیم خانہ کے لان میں ۱۵ اگست ۱۹۴۱ع کو ٹیگور کے ماتم میں پبلک جلسہ ہؤا - جلسے کی صدارت سوسائٹی کے مستقل صدر سردار امر سنگھ نے فرمائی - مسٹر بھارتی، میاں نصیر الدین احمد، وزیر زادہ عبد الاحد خاں، صادق شاذ وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا - ارشد امروہوی نے ڈاکٹر ٹیگور کے ماتم پر ایک نظم پڑھی - وہ شعر زیادہ پسند کیا گیا جس میں آپ نے ٹیگور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ بنگال میں آرمیدہ ہیں اور آپ کا ہم نوا لاہور میں خوابیدہ ہے -

۲۵ اگست ۱۹۴۱ع کو ٹیگور کے ماتم میں دوسرا جلسہ[2] اولڈ بوائز اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کی جانب سے ہؤا جس کی صدارت رانا ولی محمد ای اے سی نے کی - ماسٹر محمود خان نے اپنی نظم پڑھی - قدوسی، بھارتی، مولوی ثناء اللہ، دیوان دولت رام، مسٹر یحییٰ، گیان نرندر سنگھ اور عبد الصمد نے تقریریں کیں - ٹیگور کی وفات پر ایک بلوچستانی شاعر (عبد الحکیم قطب زئی قلعہ عبد اللہ) کے تاثرات یہ تھے :

آن ذکی ٹیگور شاعر نکتہ داں　　رفت در سیلاب مرگ ناگہاں
ہمچوں نے نالہ مزن عبد الحکیم　　قلب ارباب ادب گشتہ دونیم[3]

۱۵ اگست ۱۹۴۲ع کو ٹاؤن ہال کوئٹہ میں بزم ادب کی جانب سے اس سال کے موسم بہار کا پہلا مشاعرہ منعقد ہؤا - خان فیض محمد خان پرنسپل مقامی کالج کے صدر تھے - بیس سے زیادہ شعرا نے حصہ لیا - لطیف صاحب کے مقالے سے جلسے کا افتتاح ہؤا - بزم کے نئے سیکرٹری مرزا طالب شیرازی بی اے کا تعارف کرایا گیا - وہ پہلے بلوچستانی نوجوان تھے جو بزم کے سیکرٹری چنے گئے - جمیل، محشر، منیر نقی، نیاز الدین حسن، صحرائی،

۱- اُسی زمانے میں کوئٹہ میں لٹریری سوسائٹی بھی قائم ہوئی تھی -
(پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ اگست ۱۹۴۱ع)
۲- پاسبان، کوئٹہ، ۴ ستمبر ۱۹۴۱ع -
۳- ایضاً، ۱۲ ستمبر ۱۹۴۱ع -

خواجہ عبد الحمید عرفانی، شاذ اور نذر وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ مرحوم غلام محمد جمیل جو بلوچستان کے رئیس المتغزلین تھے، ان کی غزل ''افسانۂ درد دل'' نے حاضرین کو تڑپا دیا[1]۔ نذر کے مزاحیہ کلام کو پسند کیا گیا۔ چند شعر یہ ہیں:

کتنے پیدل اور کتنے اہل موٹر ہو گئے
جب ہؤا پٹرول راشن سب برابر ہو گئے[2]
کیا عجب ہے پھر زمانہ آئے پتھر دھات کا
معتبر اس دور میں جب اُونٹ خچر ہو گئے
جب سنا اس شوخ نے موٹر خریدی ہے نذر
سلگجے کپڑے پہن کر ہم بھی شوفر ہو گئے

اگست ۱۹۴۲ء میں سردار امر سنگھ کے دولت کدے پر لٹریری سوسائٹی کوئٹہ کی پندرہ روزہ میٹنگ ہوئی۔ سید اعجاز حسین رضوی پوسٹماسٹر

۱- 'درد دل' کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

کس زباں سے کہہ سکیں گے ہم بیانِ دردِ دل
کوئی کس دل سے سنے گا داستانِ دردِ دل
یہ بھی سچ ہے درد دل ہے ترجمانِ دردِ دل
یہ بھی سچ ہے بے زبانی ہے زبانِ دردِ دل
اشک بھر آئے ابھی سے رکھ لیا سینے پہ ہاتھ
ہو چکا تم سے مری جاں امتحانِ دردِ دل
وہ اٹھائیں تو کہاں، وہ تیر جوڑیں تو سہی
دل کی بیتابی بتا دے گی نشانِ دردِ دل
میرے سینے پر وہ رکھ کر ہاتھ بولے ناز سے
کہیے مٹ جائے کہ رہ جائے نشانِ دردِ دل
کس قدر درد آشنا معلوم ہوتے ہیں جمیل
رہ گئے دل تھام کر، سن کر بیانِ دردِ دل

[''نقش جمیل'' (قلمی) بشکریہ دوست عزیزم منصور احمد خلف الرشید غلام محمد جمیل]۔

۲- پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ اگست ۱۹۴۲ء۔

کوئٹہ نے صدارت کی ۔ محمد صادق شاذ نے ''اُردو زبان کی نشو و نما میں ہندوؤں کا حصہ'' مقالہ پڑھا ۔ نظم و نثر کے نمونے بھی پیش کیے ۔ آخر میں سر تیج بہادر سپرو کے اُس خطبے کے اقتباسات دیے جس میں انھوں نے اردو زبان کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ ترکہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ یہ زبان صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندو اس کے مساوی طور پر دعویدار ہیں[۱] ۔

ستمبر ۱۹۴۲ء میں بزم ادب کوئٹہ نے ایک بحث کا انتظام کیا ۔ عنوان تھا ۔ ''اُردو کی خدمت نثر سے زیادہ ہوسکتی ہے یا نظم سے[۲] ؟''

ستمبر ۱۹۴۲ء ہی میں ایک مشاعرہ ہؤا ۔ سابق صوبۂ سرحد کے نامور ادیب اور شاعر شہزادہ فضل داد صاحب شاد ایڈیٹر اخبار ''مجاہد'' ڈیرہ اسماعیل خاں نے صدارت کے فرائض ادا کیے ۔ مقامی شعرا (منیر ، صمصام ، کلیم ، محشر ، صحرائی ، نیاز الدین حسن ، جس نے دو معرا نظمیں سنائیں) نے اپنا کلام پیش کیا ۔[۳]

نومبر ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ سنڈیمن ہائر سکنڈری سکول (انٹر کالج) کوئٹہ میں مجلس مباحثہ کے زیر اہتمام اس موضوع پر بحث ہوئی : ''کیا اقبال محض اسلامی شاعر تھا ؟''۔ خان صاحب شیر زمان خان پبلسٹی افسر نے صدارت فرمائی ۔ جمیل صاحب نے ساقی نامہ کا دوسرا بند پڑھا ۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی اور مرزا فیض اللہ نے موافقت میں تقریریں کیں ۔ مخالفت میں میاں نصیرالدین احمد ، عبیداللہ خان ، سید اکبر حسین رضوی ، محمد نواز خان وکیل اور دیوان سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ۔[۴]

اسی ماہ میں بزم ادب کوئٹہ کا شاندار مشاعرہ ہؤا ۔ مصرع طرح تھا :

بندہ نواز عشق ہے ، یہ کوئی دل لگی نہیں

صدر سید اکبر حسین رضوی تھے ۔ کلیم ، جمیل ، محشر ، عبدالاحد خاں[۵]

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ٦ اگست ۱۹۴۲ء ۔

۲ و ۴- پاسبان ، کوئٹہ ، شمارے ۴ ستمبر ، ۲۰ ستمبر ، ۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء ۔

۳- وزیر زادہ عبدالاحد خاں میونسپل سیکرٹری کوئٹہ کو خداوند تعالیٰ نے بڑی تمناؤں کے بعد فرزند ارجمند عطا فرمایا ۔ اُنھوں نے ایک دعائیہ قطعہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

مولوی شبیہ الحسنین اور دو مدراسی سپاہیوں نے بھی اپنا کلام سنایا جو پسند کیا گیا۔ تین نئے شاعر (یار محمد شاذ، ملک ہدایت اللہ اور عزیز سوہدروی) بھی شامل ہوئے۔ شبیہ الحسنین نے اپنی تقریر میں کہا:

"ہر تحریک، ہر ادارہ اور ہر جماعت کو لیڈر کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے بلوچستان میں وزیر زادہ عبدالاحد خان صاحب جیسے فاضل کی سرپرستی حاصل ہے۔"

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

"دعائے پدر" کہا تھا۔ چند شعر یہ ہیں:

برقیہ سر شام کو لایا نویدِ جاں فزا
خانۂ تاریک میں میرے دیا روشن ہوا

اے مرے مولا! ترا لطف و کرم ہے بے حساب
جس نے جو مانگا ترے در سے اُسے وہ دے دیا

میرا یہ لختِ جگر ہے تیری رحمت کا نشان
شان بھی تو مردِ مومن کی اسے کر دے عطا

موم کر دے اس کے دل کو بے کسوں کے واسطے
سرکشوں کے واسطے بن جائے سنگِ آسیا

یا الٰہی یہ بنے چشم و چراغِ خاندان
قوم ابدالی کی کشتی کا اُسے کر ناخدا

پھر چمن میں خانۂ سدو کے آ جائے نسیم
پھر بدل دے اے خدا رخ گردشِ ایام کا

دل سے نکلی یہ دعا، عرشِ الٰہی تک گئی
مچ گیا قدوسیوں میں شور و غل آمین کا

بہر تاریخ ولادت عقل نے کی یاوری
ہاتفِ غیبی نے دی فی الفور مجھ کو یہ صدا

مصرعِ ثانی میں لفظ 'آ گہی' بے سر ملا
اے خدا کے روز و شب کر عمر نوح اس کو عطا

۳۵ + ۱۹۰۸ء = ۱۹۴۳ء

(پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ جنوری ۱۹۴۳ء)

بزم ادب اور بزم اقبال کے جلسے مارچ ۱۹۴۳ع میں منعقد ہوئے ۔
۱۹ مارچ ۱۹۴۳ع کو ڈاکٹر شجاع ناموس نے ہندوستان کی زبانوں کے موضوع پر لیکچر دیا ۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۳ع کو بزم اقبال کوئٹہ کے زیر نگرانی ساڑھے تین بجے سے ساڑھے چھ بجے تک ایک مشاعرہ ہؤا جس میں بشیر فاروق اور جمیل کے کلام کو پسند کیا گیا ۔ ڈاکٹر شجاع ناموس نے فلسفۂ خودی پر تقریر کی ۔[1]

۲۱، ۲۲ اپریل ۱۹۴۳ع کو اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کے طلباے قدیم کی انجمن نے یوم اقبال منایا ۔ راجہ عدالت خاں اور وزیر زادہ عبدا لاحد خاں (جو میونسپل کمیٹی کوئٹہ سے ریٹائر ہونے پر محکمۂ اے آر پی کے ڈپٹی کنٹرولر مقرر ہوئے تھے) نے صدارت فرمائی ۔ محمد عیسٰی ، عبدالرشید ، ماسٹر محمد اسماعیل ، محمد یوسف ، مسٹر محمد اسماعیل نے اقبال کا کلام پیش کیا ۔ وزیر زادہ عبد الاحد خاں ، محشر اور سردار چانن سنگھ نے منظوم عقیدت کا اظہار فرمایا ۔ یعقوب توفیق بیگ بی اے ، الطاف گوہر ، اعجاز بٹالوی ، شہزادہ فضل داد شاد ایڈیٹر ''مجاہد'' ڈیرہ اسماعیل خاں ، میرزا طالب شیرازی ایم اے اور راجہ عبداللطیف کلیم نے اقبال کے متعلق تقریریں کیں ۔ یعقوب توفیق کی تقریر ''اقبال ایک محکوم کی حیثیت میں'' خاصی چمکی ۔

اس جلسے میں بزم ادب کوئٹہ اور بزم اقبال کوئٹہ کے اراکین بھی آئے ہوئے تھے ۔

انھی دنوں میں بزم اقبال کوئٹہ نے ایک مشاعرہ کرایا ۔ مصرعِ طرح تھا :

موت بنتی جا رہی ہے زندگی میرے لیے

دوسرے شعرا کے علاوہ عیش فیروز پوری اور مذاق العیشی نے بھی حصہ لیا ۔ ''اقبال اور عورت'' کے عنوان سے یعقوب توفیق نے تقریر کی[2] ۔

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ اپریل ۱۹۴۳ع ۔
۲- ایضاً ، ۴ مئی ۱۹۴۳ع ۔

جون ۱۹۴۳ء میں صادق شاذ کے گھر پر ایک خاص نشست[1] کا بندوبست ہوا۔ اُس میں اس موضوع: ''کیا غالب جدید شاعری کا بانی ہے؟'' پر تبادلۂ خیال ہوا۔ صدارت کے فرائض وقار انبالوی نے ادا کیے۔ مرزا فیض اللہ، خواجہ عرفانی، خلیل، غلام حسین سیماب، محشر وغیرہ نے حصہ لیا۔ بزم ادب کے ایک خاص اجلاس کی صدارت جنگلات کے افسر خان بہادر قاضی حفیظ الدین نے فرمائی۔ وقار انبالوی، مولانا غلام فرید، صادق شاذ، محشر رسول نگری، راجپال صحرائی، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی، غلام محمد جمیل وغیرہ شریک ہوئے۔ چند روز بعد ہی قاضی حفیظ الدین کے تبادلے پر ان کے اعزاز میں دعوت طعام کا بندوبست کیا گیا۔ اُس میں محشر رسول نگری نے ''وحدت انسانی'' پر ایک دل نشین نظم پڑھی۔ چند شعر یہ ہیں[2]:

تسبیحِ کائنات کے دانے ہیں سب بشر
سر رشتۂ جہاں میں پروئے ہوئے ہیں ہم
انسان شرق و غرب کے سب ایک ہیں مگر
افسوس ہے کہ خواب میں کھوئے ہوئے ہیں ہم
اے مرحبا وہ شخص کہ جس کی کشش سے آج
اک تار جمعیت میں پروئے ہوئے ہیں ہم

ہوتی کہاں ہیں روز میسر یہ صحبتیں
ایمن نہیں ہیں کش مکشِ روزگار سے
یہ بھی کسی کے حسنِ مودت کا ہے کمال
آئے ہیں کھچ کے جذبۂ بے اختیار سے
ممکن کہاں ہے زیرِ فلک جذبِ باہمی
باہر ہیں آج حلقۂ لیل و نہار سے

۱۔ پاسبان، کوئٹہ، ۴ جون ۱۹۴۳ء۔
۲۔ ایضاً، ۴ جولائی ۱۹۴۳ء۔

بیٹھے ہیں جس کے واسطے پیوستہ یک دگر
اس کی مثال ایسی ہے اے صاحبِ نظر
جیسے کسی غریب کی کشتِ خراب پر

ابر آیا جھوم جھوم کے ، برسا ، گزر گیا
مدت کی خشک کھیتیاں سیراب کر گیا

۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو[۱] بزم ادب کوئٹہ کا ادبی جلسہ زیر صدارت سر شیخ عبدالقادر ، مقامی ٹاؤن ہال میں رات کے دس بجے منعقد ہؤا ۔ یہ جلسہ ، جیسے کہ توقع تھی ، بہت کامیاب رہا ۔ ہر قوم کے افراد نے شرکت فرمائی ۔ سامعین کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ۔ برآمدوں میں بھی کافی مجمع تھا ۔ مسٹر نثار احمد محشر جنرل سیکرٹری بزم ادب نے تقریر کرتے ہوئے کہا :

"بزمِ ادب[۲] ، بلوچستان میں واحد ادبی انجمن ہے جو بلوچستان جیسی غیر ادبی فضا میں تیس سال سے ادب اُردو کی اشاعت کا کام

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء ۔
۲- اسی بزم ادب کے متعلق چودھری محمد سلیمان خان دشتی فارسٹ آفیسر نے کہا تھا :

کس قدر مشہور ہے بزم ادب ہر جگہ مذکور ہے بزم ادب
کیا کہوں بزم ادب کی شان میں طالبوں کا طُور ہے بزم ادب
ہے اگر مہرِ درخشاں شانِ علم تب سراپا نور ہے بزم ادب
ہے درخشاں مہرِ انور کی طرح کب کبھیں مستور ہے بزم ادب
کوئٹہ کا شہر ہے جنت نشاں اس کے اندر حور ہے بزم ادب
گرد ہے اس کے ہجومِ عاشقاں اس لیے مسرور ہے بزم ادب
عاشقوں کے دل میں ہے اس کی جگہ حاسدوں سے دور ہے بزم ادب
ہے ادب اور علم کی شمعِ منیر نور سے معمور ہے بزم ادب
کیفِ ہستی اس کی محفل کا خمار شاہدِ مخمور ہے بزم ادب
تجھ کو ساعی دیکھ کر دشتی ہے خوش اور ترا مشکور ہے بزم ادب
(پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ جولائی ۱۹۴۳ء)

سر انجام دے رہی ہے ۔ اس عرصے میں کئی بار بادِ حوادث کے تھپیڑوں نے اس شمع ادب کو گل کرنا چاہا مگر بمصداق اس شعر کے جس میں ذرا سا تصرف کیا گیا ہے :

ہوتا ہے شعلہ بادِ مخالف سے اور تیز
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

یہ شمعِ ادب جھلملاتی ہوئی ، ٹمٹماتی ہوئی اور کبھی پوری تابانی سے رہروانِ جادۂ ادب کو راستہ دکھاتی رہی ۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا رہا کہ اس شمع ادب کی کرنوں سے کچھ کرنیں کھو جاتی رہیں ، علیٰحدہ ہو جاتی رہیں مگر وہ نور جو ان تمام کرنوں کا سرچشمہ تھا ، برابر بلوچستان کے ظلمت کدہ میں اپنی روشنی بکھیرتا رہا ۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ہم تنہا تھے مگر یہاں اب میرے ہم زبان اور بھی ہیں ۔ بلوچستان میں بہت سی ادبی انجمنیں موجود ہیں اور اراکین بزم ادب یہ دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی محنت اکارت نہیں گئی ۔ گھر گھر ادبی چرچا موجود ہے ، گویا :

یک چراغست درین خانہ کہ از پر تو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

۱۹ جولائی ۱۹۲۸ع کو پہلی بار بزم ادب کو عالی جناب سر شیخ عبدالقادر کی سرپرستی کا شرف حاصل ہؤا تھا اور اب دوسری بار پھر حضرت قبلہ کے فیض سے بلوچستان کی ادبی دنیا شرمندۂ احسان ہو رہی ہے ۔ آپ نے ادب اُردو اور زبان اُردو پر جو جو احسانات کیے ہیں انھیں ہندوستان اور بلوچستان کے غیور فرزند کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔"

ان گزارشات کے ساتھ ہی جنرل سیکرٹری نے جناب سر عبدالقادر صاحب سے استدعا کی کہ وہ کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر اپنی تابانیوں سے حاضرین کے تیرہ دلوں کو رشکِ مہتاب بنائیں ۔

جناب صدر نے اپنی برجستہ تقریر (زبانی) ارشاد فرمائی اور کہا کہ ۱۹۲۸ع میں مجھے زلزلے سے قبل یہاں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا - اُس وقت بھی بزم ادب کے زیر اہتمام ایک کامیاب جلسہ ہوُا تھا اور اُردو کی ترقی کے لیے کوششوں کا آغاز کیا گیا تھا - مجھے خوشی ہے کہ یہ کوششیں اب تک جاری ہیں اور میں اُردو کا چرچا پہلے سے زیادہ پاتا ہوں - محشر صاحب نے کہا ہے کہ کوئٹہ کی فضا غیر ادبی فضا ہے - وہ کوئٹہ کے رہنے والے ہیں ، ایسا کہہ سکتے ہیں لیکن میں ایسا کہنا گستاخی سمجھتا ہوں اور اس کے پہاڑوں اور چٹانوں میں اُردو کو جذب کرنے کی کوشش پاتا ہوں - بزم ادب کا وجود اس کا ثبوت ہے - بزم ادب قابل قدر خدمت کر رہی ہے - یہ خدمت ادبی بھی ہے اور قومی بھی - قومی اس لیے کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے - یہاں بہت سی زبانیں مروج ہیں اس لیے باہمی اتفاق و اتحاد کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو سب کی مشترکہ ہو اور جس کے ذریعے اس ملک کے مختلف حصوں کے لوگ بہ آسانی آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں - آپ نے تالیوں کی گونج کے درمیان ارشاد فرمایا کہ یہ مشترکہ زبان اُردو ہے اس لیے جو انجمن اس کی ترقی و ترویج کی کوشش کرتی ہے وہ ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ قومی خدمت بھی بجا لاتی ہے - تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اُردو کی بنیاد کسی ایک بادشاہ ، کسی ایک قوم یا کسی ایک شخص کی وجہ سے نہیں پڑی ، بلکہ یہ قدرتی طور پر پیدا ہوگئی - اس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو اور مسلمانوں دونوں نے حصہ لیا ہے اور یہ ان دونوں جماعتوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے - اس مجمع میں میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندو ، مسلمان اور سکھ موجود ہیں اور غالباً عیسائی بھی ہوں گے - یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سب کو اُردو کے ساتھ رغبت اور تعلق ہے اور سب اس سے محبت کرتے ہیں ، جو بڑی خوشی کی بات ہے - حضرات ! جہاں اُردو زبان کا چرچا بڑھ رہا ہے ، وہاں اس کی مخالفت بھی ہو رہی ہے ، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ مخالفت اسے ضرر نہیں پہنچا سکتی کیونکہ اس کی بنیاد مستحکم اور مضبوط ہے اور اسے مقبولیت عامہ حاصل ہے -

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اخبارات کے ذریعے انھیں بزم ادب کی سرگرمیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں علم ہے کہ ۱۹۲۸ع کے بعد معرکے کے جلسے ہوتے رہے۔ آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا۔ وقتاً فوقتاً باہر سے اُردو زبان کے خادم بلائے جاتے رہے۔ یہ تمام ادبی سرگرمی وقت کی نیک فال ہے اور اس پر جتنی خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

شیخ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ متعدد نئی انجمنیں بھی ترقی اُردو کا کام کر رہی ہیں اور اُردو زبان کے خادموں کے لیے یہ خوشی کا باعث ہونا چاہیے۔ اس رابطے کو مضبوط پکڑے رہنا چاہیے اور ترقی دینا چاہیے۔ یہ دلپذیر تقریر تقریباً نصف گھنٹے کے قریب جاری رہی۔

تقریر سادہ، رواں، فصیح اور بلیغ تھی۔ تصنع اور تکلف نام کو بھی نہ تھا۔ انداز بیان کی دلاویزی شہد سے بھی زیادہ پُرحلاوت تھی۔ سامعین ہر جملے پر سر دھن رہے تھے اور داد و تحسین کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔

تقریر کے بعد شعرا نے اپنے کلام سے حاضرین کو مسرور کیا۔ پروفیسر آغا صادق حسین کی نظم ''آنسو'' مقبول ہوئی۔ جناب صدر نے اپنی داد سے اس نظم کو نوازا۔ ''آنسو'' کے دو شعر قارئین کی خدمت میں پیش ہیں[۱]:

مل نہیں سکتا کہیں آرام، انگاروں پہ ہوں
دل سے آنکھوں میں، کبھی آنکھوں سے رخساروں پہ ہوں
دفعتاً رخسار سے دامن پہ بہہ جاتا ہوں میں
ایک داغِ نامرادی بن کے رہ جاتا ہوں میں

راجہ عبد اللطیف کلیم نے غالب پر اپنا مقالہ پڑھا۔ مسٹر طالب شیرازی نے ''فریب'' کے عنوان سے اپنی نظم پڑھی۔

آخر میں شیخ صاحب نے ادب اُردو پر تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ ''اُردو ادب اور اُردو زبان میں اس قدر لوچ اور مٹھاس ہے کہ وہ خود

۱- معلم، کوئٹہ، اگست ۱۹۵۳ع، صفحہ ۴۲۔

بخود انسانی حیات میں جذب ہو جاتے ہیں۔ پرانے اساتذہ کے کلام میں جواہر پاروں کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے اور اُن کے کلام کا کمال یہ ہے کہ ہر چند وہ عشقیہ رنگ میں کہے گئے ہیں، تاہم بیشتر اشعار ہماری زندگی کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور دوسرے بے شمار پہلوؤں پر اس طور سے منطبق ہو جاتے ہیں، گویا ایسے ہی موقعوں کے لیے کہے گئے تھے۔ آپ نے مثال کے طور پر غالب، شہنشاہ ظفر اور دوسرے اساتذۂ قدیم کے کئی اشعار سنائے اور انھیں دور جدید کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ مطابقت دے کر بے حد دلچسپی پیدا کی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آج کل کی "بے قید شاعری"، "پابند شاعری" کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ اس میں ایسے عناصر کا فقدان ہے جو اسے زندۂ جاوید بنا سکیں۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے خان صاحب وزیر زادہ عبدالاحد خاں صدر بزم ادب، شاذ صاحب اور دیگر اراکین بزم کا شکریہ ادا کیا۔ وزیر زادہ نے بھی جلسے میں اپنا معرفت سے بھرا ہؤا خمسہ پڑھا۔

شعر و ادب کی یہ مجلس رات کے ایک بجے ختم ہوئی۔ کوئٹہ کی ادبی تاریخ میں یہ جلسہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

محشر رسول نگری نے اُس پارٹی میں ایک نظم "سکون" پڑھی جو ۱۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو سردار امرسنگھ ایس۔ڈی۔او (نائب صدر بزم ادب) نے سر شیخ عبدالقادر کے اعزاز میں دی تھی۔ چند اشعار یہ ہیں:

اک گھڑی ایسی بھی آتی ہے وفورِ غم کے بعد
چین مل جاتا ہے اتنا گریۂ پیہم کے بعد
صبح دم جیسے مریضوں کو قرار آنے لگے
رات کے جاگے ہوؤں کو کچھ خمار آنے لگے
بیٹھ جائے تھک کے جیسے راہرو زیرِ شجر
پھر برسنے کے لیے تھم جائے بارش لمحہ بھر
اس لیے دل کو دیا جاتا ہے تسکیں کا فریب
پھر تڑپنے کے ہو قابل تا کہ جانِ ناشکیب

چیرہ دستوں کو تباہی کا پیام آنے کو ہے
شعلۂ جوّالہ بن کر انتقام آنے کو ہے[1]

شیخ عبد القادر صاحب کی تشریف آوری کے سلسلے میں بزم کا تیسرا جلسہ ۲۳ جولائی کو ہؤا ۔ بزم اقبال کوئٹہ کے دو ارکان (فاروق صاحب اور توفیق صاحب) نے شرکت فرمائی ۔ محشر ، راجپال صحرائی ، کلیم اور نسیم کے کلام کو پسند کیا گیا ۔ شاذ (اُردو پر ہندوؤں کے احسانات) اور توفیق (اقبال کا شعر کیا ہے) کے مقالے اچھے رہے ۔ صاحب صدر نے مقالوں کی تعریف کی اور جلسے میں نظم و نثر کے جو اچھے نمونے پیش کیے گئے تھے ، ان کو سراہا ۔ پھر آپ نے کوئٹہ کی ادبی انجمنوں کے باہمی اتحاد پر زور دیا ۔[2] ۱۴ اگست ۱۹۴۳ع کو بزم اقبال کوئٹہ کا جلسہ ہؤا ۔ صدارت کے فرائض جناب بشیر احمد ہاشمی سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن بلوچستان نے ادا کیے ۔ آغا صادق ، یعقوب توفیق ، غلام محمد جمیل اور خواجہ عبدالحمید عرفانی نے حصہ لیا ۔[3] اپریل ۱۹۴۴ع میں جناب بشیر احمد ہاشمی نے اس عنوان پر انعامی مضمون لکھوائے کہ ''بلوچستان تعلیمی لحاظ سے کیوں اس قدر پسماندہ ہے اور یہاں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں ؟'' ۔ اٹھارہ بیس صاحبان نے حصہ لیا ۔ محمد حسن نظامی ایڈیٹر ''استقلال'' اور محمد حسین عنقا ایڈیٹر ''بولان'' اول رہے ۔ مرزا فیض اللہ اور مسٹر کھنولکر وکیل دوم ، خواجہ عبدالحی سوم اور محمد اکبر سکول نوشکی کو خصوصی انعام ملا ۔[4]

جولائی ۱۹۴۴ع میں انجمن طلبۂ قدیم اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کی جانب سے ''یوم اقبال'' کا بندوبست کیا گیا جس میں نصراللہ خاں عزیز ایڈیٹر ''کوثر'' مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا ثناء اللہ خاں

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ع ۔
۲- ایضاً ، ۴ اگست ۱۹۴۳ع ۔
۳- ایضاً ، ۴ ستمبر ۱۹۴۳ع ۔
۴- ایضاً ، ۲۰ اپریل ۱۹۴۴ع ۔

نے شرکت فرمائی ۔[1]

۳۱ مئی ۱۹۴۴ع کو بزم ادب کوئٹہ نے زلزلۂ عظیم کی یاد میں مشاعرہ منعقد کرایا ۔ سردار میر احمد خان محمد زئی نے صدارت فرمائی ۔ شیر محمد زخمی (پنجابی نظم) ، راجہ عبداللطیف کلیم ، بشیر احمد صمصام ، آغا صادق ، رام داس (پنجابی نظم) ، محشر رسول نگری اور صادق شاذ نے پروگرام میں حصہ لیا ۔ محشر کے چند شعر یہ تھے :

خاک و خوں میں وہ تڑپتے ہوئے لاکھوں انسان
آہ اس عمرِ دو روزہ کا یہ خونیں انجام
فرش خاکی پہ جگہ ملتی ہے سب کو پسِ مرگ
ایک ہی سطح پہ آ جاتے ہیں آزاد و غلام
دیدۂ حق میں برابر ہیں ترے پست و بلند
کم نظر فطرتِ عالم ہے مساوات پسند

صادق شاذ نائب صدر بزم ادب نے خاصی طویل نظم کہی تھی جس کے اشعار پچاس کے قریب تھے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

تجھے اے ہم نشیں اک داستانِ غم سناتا ہوں
بھر آیا ہے مرا دل ، خون کے آنسو بہاتا ہوں[2]
یہ افسانہ نہیں رودادِ گردش ہے زمانے کی
قضا نے خون سے لکھی ہے سرخی اس افسانے کی
یہ رشکِ طور وادی جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں
کہ جس کو گلستان کوئٹہ سب لوگ کہتے ہیں
یہ قصہ مئی سنہ اُنیس سو پینتیس کی شب کا
نہ بھولے گا ابد تک نوعِ انساں کو نہ بھولے گا
زمیں کی گڑگڑاہٹ تھی کہ سازِ مرگ بجتا تھا
اجل کا دیوتا غصے میں آ آ کر گرجتا تھا

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ جولائی ۱۹۴۴ع ۔
۲- ایضاً ، ۴ جون ۱۹۴۴ع ۔

غرض ہر ایک ذرے پر کچھ ایسا خوف طاری تھا
کہ ہر اک کی زباں پر وردِ استغفار جاری تھا
طرارے بھر رہی تھی یوں قضا اپنے شکاروں پر
کہ جیسے شیر جنگل میں جھپٹتے ہیں چکاروں پر
اجل کا دور دورہ ، اہرمن کی بادشاہی تھی
جدھر دیکھو مسلط بس تباہی ہی تباہی تھی
نظامِ دہر بگڑا ، نظمِ ہستی میں فشار آیا
ہوائے مرگ کے جھونکوں سے فطرت کو بخار آیا

۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ اگست ۱۹۴۴ع کو بزم ادب بلوچستان کا سالانہ جلسہ سلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کے وسیع احاطے میں منعقد ہوا - مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر ''انقلاب'' لاہور ، مولانا وقار انبالوی اور صاحب زادہ ابو نعیم عبدالحکیم نشتر جالندھری نے خاص طور پر اس جلسے میں شرکت فرمائی - حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے سینئر جرنلسٹ سید محمد صاحب جعفری نقوی اتفاق سے ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے - انھوں نے بھی پہلے دن کی کارروائی میں حصہ لیا -

۱۰ اگست ۱۹۴۴ع کو مولانا عبدالمجید سالک کے زیر صدارت یوم اُردو منایا گیا[۱] - چھ سات سو ہندو مسلمان بھائی جلسے میں شریک ہوئے - ملک محمد صادق شاذ کے ترانۂ اردو سے کارروائی کا آغاز ہوا - ترانے کے بعد شہر کے ادیب نواز وکیل لالہ سورج بھان صدر بزم ادب نے اردو زبان کے مشہور محسن سر تیج بہادر سپرو کا وہ پیغام ، جو انھوں نے کشمیر کے ایک ادبی اجتماع کے نام بھیجا تھا ، پڑھ کر سنایا - صادق شاذ نے ایک مقالہ بہ عنوان ''اُردو پر ہندوؤں کے احسانات'' پیش کیا جسے صاحبِ صدر نے سراہا - جناب نشتر جالندھری نے جو نظم پڑھی تھی ، اس میں سے چند

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ اگست ۱۹۴۴ع -

شعر یہ ہیں[1] :

کوئٹہ کی باز دید

پہلی حالت

یاد ایامے کہ تھا عید ِ نظر تیرا جمال
حسن اخذ ِ حسن کرتا تھا تری تنویر سے
ذرہ ذرہ صورت ِ موسیٰ[۴] تھا مست ِ بےخودی
طور کے جلوے برستے تھے تری تصویر سے

دوسری حالت

آہ ! یہ دن ، حشر در آغوش ہے نقشہ ترا
کھا گئی کس کی نظر تجھ کو حسین ِ کوئٹہ !
تیرے ماتم میں فقط نشتر کہاں ہے سینہ کوب
تجھ کو دنیا رو رہی ہے مہ جبین ِ کوئٹہ

محترم وقار انبالوی نے اپنا مقالہ پڑھا ۔ ان کا مقالہ اپنے اندر تعمیری نکتہ چینی لیے ہوئے تھا - انھوں نے نمایاں طور پر ذکر کیا کہ اُردو ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور اسی کو قومی زبان بننا ہے :

سید محمد جعفری نے اپنی دو نظمیں ''ریل گاڑی کا سفر'' اور ''پرانا کوٹ'' سنائیں ۔ صاحب ِ صدر کی تقریر کا لب لباب یہ تھا ۔

۱- اُردو زبان ایک مشترک زبان ہے ۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک عمل سے وجود میں آئی ہے اس لیے اگر کوئی مسلمان یہ کہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو وہ غلطی پر ہے ۔

۲- یہ کہنا تاریخی غلطی ہے کہ اُردو زبان شاہجہان کے وقت پیدا ہوئی ، بلکہ اس کی داغ بیل سات سو سال پہلے شہنشاہ بابر کے زمانے میں پڑ چکی تھی ۔ اُس زمانے کے بعض مذہبی رسالے اسی زبان میں لکھے گئے ۔

۱- جناب نشتر جالندھری کا خط راقم الحروف کے نام ، مورخہ ٦ اگست ۱۹٦۷ء ، از فردوس پارک سنت نگر ، لاہور ۔

۳۔ یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ اُردو زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں ۔ صورت حال یہ ہے کہ اس میں ۶۵ فیصد الفاظ ہندی کے ہیں ، صرف ۲۵ فیصد عربی ، فارسی اور دیگر زبانوں کے ہیں ۔ عربی کے الفاظ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ گجراتی ، مرہٹی اور بنگلہ میں بھی پائے جاتے ہیں ۔

۴۔ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے ۔ پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ پنجاب ، سرحد ، دہلی ، یوپی کے علاوہ بلوچستان ، سندھ ، مدراس ، بنگال اور بمبئی سے بھی کثیر تعداد میں اردو اخبارات نکل رہے ہیں ۔ ایک بنگالی اور بلوچستانی کو جب آپس میں بات چیت کرنی ہو تو وہ اسی زبان میں گفتگو کر کے اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں ۔

صاحب صدر نے بزم ادب کے کام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اس کا یہ کام آیندہ نسلوں کے کام آئے گا ۔

۱۱ اگست ۱۹۴۴ء کو یوم اقبال منایا گیا ۔ جناب بشیر احمد ہاشمی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ تعلیم (سابق وائس چانسلر کراچی) نے کرسیٔ صدارت کو رونق بخشی ۔ مرید حسین نے ترنم سے علامۂ مرحوم کی ایک نظم پڑھی ۔ بشیر احمد صمصام اورینٹل ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ نے اپنا منظوم ہدیۂ عقیدت علامہ مرحوم کی یاد میں پیش کیا ۔ جناب الطاف گوہر[1] نے ''بانگ درا'' پر تقریر کی اور کہا کہ اب عوام کو فائدہ پہنچانا شاعری کا بڑا مقصد قرار دیا گیا ہے ۔ نوجوان مقرر نے اس سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی اور آزاد مرحوم کا ذکر کیا اور ''بانگ درا'' پر طائرانہ نظر ڈالی ۔
جناب وقار انبالوی نے اپنے مقالے میں علامہ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ۔ آخر میں جناب عبدالمجید سالک نے تقریر فرمائی ۔ علامہ مرحوم کے کلام اور ان کی شخصی زندگی کے متعلق اپنے ذاتی مشاہدات بیان کیے ۔

۱۔ موجودہ سیکرٹری مرکزی وزارت اطلاعات حکومت پاکستان ۔ آپ اُن دنوں موسم گرما گزارنے اور کوئٹہ کی خوشگوار موسمی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے ۔

۱۲ اگست ۱۹۴۴ء کو تزک و احتشام کے ساتھ مشاعرہ منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض مولانا عبدالمجید سالک نے انجام دیے۔ نشتر جالندھری صاحب اور محترم صاحب۔ صدر نے اپنے کلام غزل و نظم سے حاضرین کو نوازا:

مندرجہ ذیل مقامی شعرا نے سامعین کو محظوظ فرمایا:

صادق شاذ، نثار احمد محشر، راجپال صحرائی، راجہ عبداللطیف کلیم، آغا صادق[1]، ملک عبدالرب نسیم، بشیر احمد صمصام، انور شیرازی، اقبال راجہ، احمد خان، الطاف گوہر وغیرہ۔ یہ کامیاب محفل شکریے کے ساتھ شب کے ساڑھے بارہ بجے ختم ہوئی۔[2]

پبلک کے علاوہ معززین اور افسران نے بھی بزم ادب کے جلسوں کو اپنی شرکت سے نوازا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں بزم ادب نے ایک مشاعرہ کرایا۔ سردار بہادر سردار اجیت سنگھ ڈی۔ ایس۔ پی۔ نے صدارت فرمائی۔ مقامی شعرا کے علاوہ سید محمد جعفری نقوی اور سید اصغر علی احسن نے مزاحیہ پڑھیں۔ جعفری کی نظمیں تھیں ''راشننگ'' اور ''پٹرول راشن''۔ احسن کی نظم کا عنوان تھا ''معصوموں کی وادی''۔ صدر جلسہ نے کہا ''اُردو زبان ہندوستان کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جو پشاور سے سیوی تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ میں نے ذاتی طور پر جو کچھ حاصل کیا ہے اسی کے ذریعے حاصل کیا ہے۔''[3]

۲۵ اگست ۱۹۴۴ء کو ملک محمد صادق شاذ (بزم ادب کے روح رواں)

۱- آغا صادق نے اپنی مشہور نظم ''دوشیزہ'' پیش کی تھی۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:

وہ دوشیزہ تھی یا شہکار فطرت کے مصور کا
وہ دوشیزہ کہ تصویرِ کمالِ حسنِ انسانی
وہ دوشیزہ تھی یا صبحِ سعادت کی تجلی تھی
وہ دوشیزہ کہ خورشیدِ صباحت کی درخشانی

(معلم، کوئٹہ، اگست ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۲)

۲- پاسبان، کوئٹہ، ۲۰ اگست ۱۹۴۴ء۔
۳- ایضاً، ۲۰ ستمبر ۱۹۴۴ء۔

نے ''من چلا بلوچستان'' کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک تقریر نشر کی تھی جس میں اس خطے کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا گیا تھا ۔[۱]

۱۹۴۴ع میں الطاف گوہر ایم ۔ اے نے اقبال کے سلسلے میں اپنی دل پذیر تقریروں سے عوام کو متاثر کیا ۔[۲]

۱۹۴۵ع میں بھی یہ مفید علمی اور ادبی سرگرمیاں جاری رہیں ۔ اُسی سال چند ادب شناس اور صاحب ذوق حضرات نے ''ادارۂ ادب بلوچستان'' کے نام سے ایک ادبی ادارے کی بنیاد رکھی جس کی مجلس عمل کا پہلا اجلاس ماہ نومبر ۱۹۴۵ع میں بمقام کوئٹہ منعقد ہوا[۳] جس میں چند ٹھوس مقاصد پیش نظر رکھ کر تبلیغی اور تحریری طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ اس کا مرکز سبی قرار پایا ۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ تھے :

۱۔ اردو اور مقامی زبانوں میں ترقی پسندانہ ادبی تصنیف و تالیف کی اشاعت کرنا ۔

۲۔ تبلیغ و عمل کے ذریعے عوام میں ذہنی بیداری پیدا کرنا ۔

۱۔ پاسبان ، کوئٹہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۴ع ۔
نثار احمد محشر اپنے مضمون ''بلوچستان کی قدیم و جدید ادبی شخصیتیں'' ۔ (مطبوعہ پاسبان کوئٹہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۴ع) میں لکھتے ہیں کہ ''ایک بزرگوار کے ارشاد کے مطابق صادق شاذ کو مجازاً بلوچستان کا ڈاکٹر عبدالحق کہنا زیادہ صحیح ہے''۔ حکیم غلام حسین سیماب مرحوم نے بھی اپنی ریڈیائی تقریر ''بلوچستان میں اُردو'' (نشر ہونے کی تاریخ ۴ نومبر ۱۹۶۰ع) میں کہا تھا کہ صادق شاذ نے بعد میں ادبی حلقوں میں بلوچستان کے مولانا عبدالحق کا لقب پایا ۔

۲۔ پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ دسمبر ۱۹۴۴ع ۔
آغا صادق (بردوش ہوا ، صفحہ ۱۶۸) لکھتے ہیں کہ ''اس انجمن میں حصہ لینے والے عارف سیمابی سیالکوٹی ، نشتر ارشدی ، ماسٹر جمیل اور مزاح نگار شاعر حبیب تھے ۔ اس بزم اقبال کے صدر ملک رامجی داس وکیل تھے ۔''

۳۔ بولان ، مچھ ، ۳۱ جنوری ۱۹۴۷ع ، صفحہ ۵ ۔

۳- بلوچستان کی ادبی و تمدنی تاریخ سے متعلق تحقیقات کرنا ۔
۴- بلوچستان کے گمنام اہل قلم حضرات کی مرکزی حیثیت قائم کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی اور حتی الامکان مدد کرنا ۔[1]

اس ادارے میں میر گل حسن خان حریم اوستوی ، سردار محمد خان باروزئی ، عبدالرحمٰن غور ، ندیم ، سہیل بوستانی ، مجید دیوانہ ، میر محمد افضل خان لونی ، منظور احمد ، آغا مرتضیٰ ، گھنشام ، دلیپ سنگھ ، مسافر سینی وغیرہ شامل تھے ۔ اس ادارے کے صدر سردار محمد خان باروزئی اور جنرل سیکرٹری میر گل حسن[2] خان حریم اوستوی تھے ۔ اسی ادارے نے ہائی سکول

۱- بولان ، مچھ ، ۳۱ جنوری ۱۹۴۷ع ۔ ادارۂ ادب بلوچستان از حریم اوستوی ۔
۲- میر گل حسن خان حریم اوائل جنوری ۱۹۲۰ع میں دیار عزیز کے نزدیک کانڈوری (Kandori) تحصیل جھل مگسی میں پیدا ہوئے جو درۂ مولا کے مشرقی سرے پر واقع ہے ۔ جب والدین وہاں سے نقل مکانی کر کے اوستا محمد چلے آئے تو یہاں پر پرائمری سکول میں داخل کرائے گئے ۔ کتب درسی کے علاوہ قرآن شریف با ترجمہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن مرحوم پڑھا ۔ مزید تعلیم سبی میں پائی ۔ اپنے سکول کے ڈرامے میں موسیقی کے پروگرام میں شامل ہوتے تھے ۔ ۱۹۳۹ع میں مدرسے میں مدرس بن گئے ۔ اُنھی دنوں ایک نظم ''زیارت کا نظارہ'' (مطبوعہ پھول لاہور) لکھی تھی جو بچوں میں کافی مقبول ہوئی ۔ اس کا پس منظر وطن عزیز کے ایک نہایت ہی پُر فضا مقام سے مربوط تھا ۔ چند شعر یہ ہیں :

رنگین ہیں فضائیں ، مخمور کن ہوائیں
کہسار کے سروں پر چھائی ہوئی گھٹائیں
چاروں طرف سے بادل کیسا گھرا ہؤا ہے
بجلی چمک رہی ہے ، پانی برس رہا ہے
کلیاں کھلی ہوئی ہیں ، سبزہ لہک رہا ہے
ہے کیف سا ہوا میں ، جنگل ہرا بھرا ہے
واللہ یہ نظارہ دل کو لبھا رہا ہے
آنکھوں میں حسرتوں کی دنیا بسا رہا ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سبی کے ہال میں ایک نائٹ سکول کا اجرا کیا جس میں اُن آن پڑھ ساتھیوں کو بغیر کسی معاوضے اور لالچ کے تعلیم دیتے تھے جو دن کے وقت اپنے کاروبار کے باعث کسی درسگاہ میں نہ پڑھ سکتے تھے ۔ رات کو غور، میر افضل، حریم اوستوی کلاس کو پڑھاتے اور سردار محمد خان باروزئی نگرانی فرماتے ۔ گاہے بگاہے میر سردار خان گشکوری ایم اے، ایل ایل بی بھی تشریف لاتے اور ان صاحبان کی ڈھارس بندھا جاتے ۔ یہ صاحبان اپنی ادبی و علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے ہفتے میں ایک بار ادبی نشست کا بندوبست فرماتے تھے جس میں غزلیں، نظمیں اور تعمیری مضامین پڑھے جاتے تھے ۔

فروری ۱۹۴۷ء میں آل بلوچستان مشاعرہ منعقد کیا گیا ۔[1] صدارت کے فرائض خان محمد سرور خان ہیڈ ماسٹر ہائی سکول سبی نے ادا کیے ۔ مقامی شعرا میں غور، مسافر، سہیل بوستانی، مجید دیوانہ، نفیس، نصیر مینگل اور حریم اوستوی سر فہرست تھے ۔ غیر مقامی شعرا میں سے گوہر، نازلی، ذوقی بلوچ اور آغا صادق مدعو تھے جو کسی خاص وجہ سے شریک مشاعرہ نہ ہو سکے اور ان کا ارسال کردہ کلام جنرل سیکرٹری کی زبانی سٹیج پر پڑھا گیا ۔ عبدالرحمٰن غور نے اپنی غزل سے سامعین کے تسکین ذوق کا فریضہ ادا کیا، جس کا مطلع تھا:

کچھ قلت جنوں کی شکایت رہی مجھے
کچھ زندگی کا بار بھی بارِ گراں رہا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

آپ نے ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ کا سفر اختیار کیا اور وہاں ایک استاد کی مہربانی سے ادیب فاضل کا کورس پاس کیا ۔ وطن میں واپسی پر مختلف محکموں میں ملازم رہے ۔ ۱۹۴۵ء میں سبی کی بڑی لائبریری گیسفورڈ کے بھی انچارج رہے ۔ ۱۹۴۶ء میں حریم نے ایک نظم ”خطاب بہ قلعہ میر چاکر اعظم“ واقعہ سبی لکھی تھی جو ادارۂ ادب میں پڑھی گئی ۔ علاوہ ازیں آپ کی کئی غزلیں ملتی ہیں جو اسی ادارۂ ادب کے جلسوں میں پیش کی گئیں ۔

۱۔ ”غور ـــــ میرا ساتھی“ (حریم اوستوی) بلوچی دنیا، ملتان، جون، جولائی ۱۹۶۵ء ۔

حریم اوستوی نے اپنی معروف نظم ''قسمیں'' پڑھی جو اُن دنوں بلوچستان کے مشہور اخبار ''استقلال'' کے پہلے صفحے پر ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ۔[۱] آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے وہ نظم پیش کی جاتی ہے :

قسم ہے زحمت غم کی ، قسم ہے چشم پُرنم کی
قسم ہے شور ماتم کی ، قسم ہے درد پیہم کی
ترے ظلم و ستم کو آج دنیا سے مٹا دوں گا

قسم بے چین حالت کی ، قسم رنجیدہ راحت کی
قسم بے باک وحشت کی ، قسم تخریب عزت کی
ترے قصرِ ملوکانہ کو ٹھوکر سے اُڑا دوں گا

قسم ہے جوش وحدت کی ، قسم ہے حسن غربت کی
قسم آئین ملت کی ، قسم خوابیدہ ہمت کی
ترے عشرت کدے کی آج دیواریں ہلا دوں گا

قسم افسردہ ہستی کی ، قسم احساس پستی کی
قسم بے کیف مستی کی ، قسم اس تیرہ بختی کی
ترے احساسِ عظمت کو ترے دل سے مٹا دوں گا

'استقلال' کوئٹہ کے اُسی شمارے میں حریم کے یہ اشعار بھی بعنوان

۱- استقلال ، کوئٹہ ، یکم اپریل ۱۹۴۷ء -
حریم اوستوی راقم الحروف کے نام خط (مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۶۷ء) میں لکھتے ہیں :
''ذوق ادب اب بھی رکھتا ہوں اور فقیران شعر کا فقیر ہوں - 'بلوچستان میں اُردو'' کے بہی خواہان میں میرا نام سر فہرست ہے کیونکہ ملکی نوجوانوں میں سے میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس نے باوجود اپنی علمی بے بضاعتی کے نہایت ہی مختصر وقت میں پہلا آل بلوچستان مشاعرہ منعقد کرانے کی زبردست تحریک کی تا کہ کہستانی ذہن ادب و شعر کی لطافتوں سے بہرہ ور ہو کر اس کی کما حقہ خدمت کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے -''

''مجبوری'' درج ہیں جو اسی مشاعرے میں پیش کیے گئے :

راس کیا آتی مجھے اس تیرے عالم کی بہار
زندگی جب بن گئی حسرت نشان در روزگار
کر دیا ہے مجھ کو محکومی نے غارت ورنہ میں
موڑ سکتا ہوں رخِ گردش کے بھی لیل و نہار

یہ جو کتابِ زیست میں دھندلے نقوش ہیں
کچھ نا تمام حسرتوں کی یادگار ہیں
کیسے بیاں کروں کہ غمِ روزگار سے
عنوان زندگی کے سبھی داغ دار ہیں

یہ درد ، یہ تڑپ ، یہ خلش اور حسرتیں
کیا خوب زندگی کی شرح کر رہا ہوں میں
وائے خیال دوست کی وسعت نہ پا سکا
ناحق دماغ و دل پہ جرح کر رہا ہوں میں

نصیر سینگل نے اپنی نظم ''مرے دیس کے نوجوان سو رہے ہیں'' سنائی۔ نظم کیا تھی ، وطن اور وطن والوں کی ابتری و زبوں حالی کا نوحہ تھی۔ اس کے سات بند ہیں۔ چند بند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فضا پے بہ پے آگ برسا رہی ہے
جہنم کی صورت نظر آرہی ہے
غلامی ستم پر ستم ڈھا رہی ہے
گلستان نذرِ خزاں ہو رہے ہیں
مرے دیس کے نوجوان سو رہے ہیں

کسی کو نہ احساسِ سود و زیاں ہے
نہ ہاتھوں میں طاقت نہ منہ میں زباں ہے

جوانی میں پیری کی صورت عیاں ہے
کہ باغ وطن میں خزاں ہی خزاں ہے
مکینوں سے خالی مکاں ہو رہے ہیں
مرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں

تمھیں غم کا دکھڑا سناؤں کہاں تک
سرشکوں کے موتی لٹاؤں کہاں تک
کسی کو میں غیرت دلاؤں کہاں تک
میں خونابۂ دل بہاؤں کہاں تک
مرے ساتھ کون و مکاں رو رہے ہیں
مرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں[1]

اس مشاعرے میں عوام اور علم دوست حضرات کی بھاری تعداد شریک ہوئی تھی اور یہ ہر طرح کامیاب رہا تھا۔

ایک ایسا ہی دوسرا مشاعرہ بھی ہفتۂ سبی کے دوران ادارۂ ادب کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ لوگوں میں علمی شعور اور قومی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ادارۂ ہذا نے ایک ایسی لائبریری بھی قائم کی تھی جس سے لوگوں کو مطالعے کے لیے کتابیں مفت دی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ مالی بدحالیوں کے باعث ادارے کے اراکین میں سے بیشتر کسبِ معاش کی خاطر ملازمتیں اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ وہ ایک ایک کرکے چلتے بنے۔ لیکن عبدالرحمٰن غور تن تنہا ادب کی خدمت کرتے رہے۔ آخر کار بعض مجبوریوں کے سبب اس ادارے کو سبی سے کوئٹہ منتقل کیا گیا[2] اور اس کے تحت چند کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں جن کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

۱- جناب حریم اوستوی کے پاس ادارۂ ادب سبی سے متعلق جو ریکارڈ محفوظ ہے، اس سے استفادہ کیا گیا۔
۲- ''ایک ادیب'' فقیر بخش بگٹی، بلوچی دنیا، جون ۱۹۶۵ع، صفحہ ۴۱۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا ۔ غیر مسلم شعرا اور ادبا ہندوستان چلے گئے اور بلوچستان میں مہاجرین کی پہلی ہی کھیپ میں بہت سے شعرا دلی ، یو پی ، سی پی ، بہار اور مشرقی پنجاب سے وارد ہوئے ۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں بلوچستان میں ادب اُردو و زبان اُردو کی ترویج و توسیع کے لیے ''بہار ادب'' کے نام سے جناب کیپٹن محمد باقر خاں یاس کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ اس انجمن کو بلوچستان کے بیشتر نامور شعرا اور ادبا کا تعاون حاصل تھا ۔ اس کے صدر سید اکبر حسین رضوی اور معاونِ خاص حضرت متین تھے[۱]۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں بڑے شاندار مشاعرے منعقد ہوئے ۔ شہر ، چھاؤنی اور ریلوے کالونی میں شعرائے کوئٹہ کے کلام کے چرچے تھے ۔

حضرت جدت میرٹھی نے کوئٹہ چھاؤنی میں اور جناب گوہر جالندھری نے ریلوے کالونی میں اپنی ذاتی کوششوں سے شعر و شاعری کو بہت فروغ دیا ۔ اس خطے میں اُردو زبان کی ترقی اور ترویج کا حق ان دو بزرگوں نے ادا کرنے کے لیے سعی بلیغ فرمائی ۔[۲]

۱۹۴۸ء میں ''حلقۂ ارباب ادب'' قائم ہؤا ۔ اس کے صدر قیوم راشد بی اے تھے ۔ چند سال تک اس حلقے نے یہاں کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی ۔ اس کے سلسلۂ تصنیف و تالیف کی پہلی کڑی ''بربط ناہید'' تھی ۔ اس حلقے کو پروفیسر انور رومان ، پروفیسر ش ضحیٰ وغیرہ کا خصوصی تعاون حاصل تھا ——— ۱۹۵۴ء میں[۳] حلقۂ ارباب ادب اور مرکز ادب کوئٹہ نے مشترکہ طور پر اُن تمام مہمان شعرا کو عصرانہ دیا تھا جو کوئٹہ میں ایک مشاعرے[۴] میں شریک ہونے کے لیے

۱- خورشید ، کوئٹہ ، ۶ فروری ۱۹۴۸ء ۔
۲- بردوش ہوا ، آغا صادق ، صفحہ ۱۶۹ ۔
۳- اتحاد ، کوئٹہ ، ۲۵ اگست ۱۹۵۴ء ۔
۴- یہ مشاعرہ ''تفریحی ہفتہ'' کی ایک کڑی تھا جو میونسپل باغ میں منعقد ہؤا ۔ تاریخ تھی ۲۳ اور ۲۴ اگست ۱۹۵۴ء ۔ پہلے دن مشاعرہ دو گھنٹے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

آئے تھے ۔ عصرانے کے بعد قریباً پانچ بجے شام زیر صدارت مولانا عبدالمجید سالک مقامی (قیوم راشد ، صلاح الدین ، حزین ، خادم کیتھلوی ، ضیاء صدیقی ، عاطفی ، اختر واحد ، گلزار ، شفق ، شادان وغیرہ) اور مہمان (ثاقب زیروی ، حافظ انصر لدھیانوی ، احسان دانش ، ادیب سہارنپوری ، بہزاد لکھنوی ، بنیاد تیموری ، (انشاءاللہ انشا کے نواسے) صوفی تبسم اور مولانا سالک) شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا ۔

بلوچستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ۲۵ جولائی ۱۹۴۸ع کو یوم اُردو زیر صدارت بابائے اُردو مولوی عبدالحق سنایا گیا ۔ اس اجتماع میں اساتذہ اور مقامی شعرا نے زبان اُردو پر تقاریر اور نظمیں پیش کیں ۔ صاحب صدر نے فرمایا کہ پاکستان کے جس صوبے میں سب سے پہلے یوم اُردو منا کر اُردو پروری کا ثبوت دیا گیا ، وہ بلوچستان ہی ہے جسے ہر لحاظ سے پس ماندہ کہا جاتا ہے ۔ اُردو زبان کے مستقبل کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

جاری رہا اور دوسرے دن تین گھنٹے ۔ صدر مولانا عبدالمجید سالک تھے ۔ مجید لاہوری کے اشعار نے محفل کو کشت زعفران بنا دیا تھا ۔ ثاقب زیروی کی نظم ''یوم آزادی پر جشن عیش و عشرت کو دیکھ کر'' خاصی پسند کی گئی ۔ مقامی شعرا میں سے آغا صادق ، ش ضحیٰ ، قیوم راشد ، ماہر افغانی اور صادق شاذ وغیرہ شامل ہوئے تھے ۔ سالک صاحب کی نظم ''شہدا و مجاہدین'' کو سراہا گیا ۔ اُس کا ایک بند یہ ہے :

تمھیں سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
بلائیں جن کی قوم لے تمھیں وہ شہسوار ہو
تمھیں وہ سرفروش ہو ، تمھیں وہ جاں‌سپار ہو
تمھیں دفاع و احترام دیں کے ذمہ دار ہو
جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ استوار ہو
تمھاری تیغ ضامن نظام کائنات ہے)

(قندیل ، لاہور ، ۱۲ ستمبر ۱۹۵۴ع)

اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے۔[۱]

۱۹۴۷ع کے آخر میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ''بزم اقبال'' کا افتتاح ہؤا۔[۲] اس کے روح رواں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید عرفانی تھے جو بعد میں ایران میں پاکستان کے پریس اتاشی اور کلچرل اتاشی رہے۔ اُنھوں نے مجلۂ 'ہلال' کراچی کی ادارت کے فرائض بھی ادا کیے، علامہ اقبال سے متعلق کتابیں بھی لکھیں اور ایران میں اقبال کو روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

خواجہ عبد الحمید عرفانی کے ایران جانے کے بعد پہلے آغا صادق اکیلے اس بزم کی آبیاری فرماتے رہے، پھر دو سال تک (۱۹۵۸ع، ۱۹۵۹ع) اس کی سرگرمیوں کی نگرانی ایک کمیٹی کرتی رہی جس میں آغا صادق، سعید احمد رفیق، رشید احمد اور انعام الحق کوثر شامل تھے۔ آغا صادق کے تبدیل ہونے پر قریباً نو سال سے بزم اقبال راقم الحروف (انعام الحق کوثر) کے زیر نگرانی علامہ اقبال کی تعلیمات سے طلبہ کو آگاہ کر رہی ہے۔ جلسوں کے علاوہ علامہ اقبال سے متعلق مختلف انداز کے عنوانات پر مضامین کے مقابلے بھی کرائے جاتے ہیں اور باقاعدہ انعامات کا بندوبست ہوتا ہے۔ پبلک جلسوں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۶ع میں یوم اقبال کی اہم تقریب شایان شان طور پر منائی گئی اور یہ سعادت صرف اسی بزم کو نصیب ہوئی۔ صدارت کے فرائض پرنسپل کرار حسین نے ادا کیے۔ مقالہ نگاروں میں طلبہ کے علاوہ پروفیسر سردار نقوی اور ڈاکٹر اکبر حسین قریشی بھی شامل تھے۔ ظہیرالحق الحسینی الساق نے نذرانۂ عقیدت کے تحت اپنے خیالات منظوم صورت میں پیش کیے تھے۔

اس بزم کی کارگزاریوں میں ش ضحیاؔ، خلیل صدیقی، عبدالصمد درانی، مولانا عبدالکریم، چودھری عطا محمد اور پروفیسر کرار حسین وغیرہ بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔

۱۔ جمہور، کوئٹہ، ۸ اگست ۱۹۴۸ع۔
۲۔ جمہور، کوئٹہ، یکم نومبر ۱۹۴۸ع۔

متعدد طالبات اور طلبہ اس بزم کے سرگرم رکن رہے ہیں[1] اور اب بھی ہیں۔

۱۹۴۱ء میں جو بزم اقبال شہر میں قائم ہوئی تھی اور تقسیم ملک سے پہلے تک بر سرِ کار رہی، اُس کا احیا ۱۹۵۶ء میں ہوا۔[2] سرپرستوں میں کمشنر صاحب اور چودھری محمد صادق ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کوئٹہ قلات ریجن تھے۔ صدر آقای افراسیاب نوائی، نائب صدر صادق شاذ اور آغا صادق، جنرل سیکرٹری اے ایچ دلشاد، جوائنٹ سیکرٹری انعام الحق کوثر، خازن عبدالعزیز ملک[3] اور سیکرٹری نشر و اشاعت یعقوب توفیق تھے[4]۔ تین سال تک یہ بزم باقاعدگی سے یوم اقبال کا وسیع پیمانے پر انتظام کرتی رہی۔ اس کے ارکان چھوٹے پیمانے پر بھی نشستوں کا بندوبست کرتے تھے[5]۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے انجمن ترقیٔ اردو کوئٹہ شاخ کا افتتاح کیا جس کے صدر مسٹر یحییٰ بختیار، سیکرٹری محمد صادق شاذ اور جائنٹ سیکرٹری راجہ عبد اللطیف کلیم منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر عبد الحق نے فرمایا تھا کہ اُردو ایک ایسی قوت ہے جو دور افتادہ صوبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ہو سکتی ہے اور ایک دوسرے کے سکینوں کے مابین ہمدردانہ سوچ بچار کا شعور پیدا کرتی ہے۔[6]

۱- گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے ترجمان ''بولان'' کی فائل پیش نظر ہے (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۶ء)۔
۲- اتحاد، کوئٹہ، ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء۔
۳- آپ ان دنوں گورنمنٹ انٹر کالج سبی کے پرنسپل ہیں۔ سائنسی موضوعات پر مضامین لکھنے کے علاوہ اُردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔
۴- آج کل میاں یعقوب توفیق کراچی میں اقبال کونسل کے اعزازی سیکرٹری ہیں۔ حال ہی میں یادگار ہفتہ اقبال (۲۱ اپریل تا ۲۷ اپریل ۱۹۶۸ء) کی روداد مرتب کر کے شائع کرائی ہے۔
۵- قاصد، کوئٹہ، ۲۳ اپریل ۱۹۵۹ء۔
۶- ڈان، کراچی، ۱۷ ستمبر ۱۹۵۰ء۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ کے ہال میں بابائے اردو کے زیر صدارت جلسہ ہوا جس میں نئے عہدیداروں کا انتخاب ایک سال کے لیے عمل میں لایا گیا۔ صدر نواب محمد اکبر خاں بگٹی، نائب صدر سید اکبر حسین رضوی، سیکرٹری ملک محمد صادق شاذ، جائنٹ سیکرٹری آغا صادق، خازن مولوی مسعود احمد انصاری۔

ان عہدہ داروں کے علاوہ یہ صاحبان بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے: محشر رسول نگری، اخگر سہارنپوری، سید علی نظامی، ارشد صدیقی، ماہر افغانی اور جوہر ڈبائیوی۔

۱۹۵۲ء میں آل پاکستان اُردو کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں ہوئیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر کانفرنس ملتوی ہو گئی اور چھوٹے پیمانے پر انجمن کا جلسہ ہوا۔[۱] بعد ازاں اس کے جنرل سیکرٹری ابراہیم خلیل چنے گئے اور وہ دو سال تک مستعدی سے کام کرتے رہے۔ اس شاخ کے اغراض و مقاصد یہ تھے جن کے بارے میں بابائے اردو نے لکھا تھا: "بہت مناسب" (۳ مارچ ۱۹۵۴ء):[۲]

۱- اُردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے آئینی جدوجہد کرنا۔
۲- اُردو کو وسعت دینے کے لیے مقامی زبانوں سے استفادہ کرنا۔
۳- عوام میں ادبی شعور بیدار کرنا۔
۴- اُردو کے لیے تعلیم بالغاں کی تنظیم کرنا۔

اسی شاخ کے تحت انجمن ترقی اُردو کا ایک شعبہ طلبہ اور ایک خواتین کے لیے قائم ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں خواتین انجمن ترقی اُردو کا سالانہ انتخاب ہوا جس میں صدر بیگم نواب غوث بخش رئیسانی، نائب صدر حسن بانو قزلباش، سیکرٹری صفیہ ایوب، جائنٹ سیکرٹری مسز پروین، خزانچی کوکب حق اور سیکرٹری نشر و اشاعت یاسمین صوفی منتخب ہوئیں۔[۳]

۱- ریکارڈ محمد صادق شاذ کے پاس محفوظ ہے۔
۲- فائل ابراہیم خلیل ایڈیٹر 'قاصد' کوئٹہ کے پاس موجود ہے۔
۳- جنگ، کراچی، ۴ مئی ۱۹۵۴ء۔

اسی طرح شعبۂ طلبہ کا انتخاب بھی ہؤا جس کے صدر محمد رحیم خان اور سیکرٹری امام واسطی چنے گئے۔[۱]

انجمن ترقیٔ اردو کی اس شاخ کی ہفت روزہ ادبی و تنقیدی نشستیں ہوتی تھیں۔ طرحی مشاعروں (ایک طرحی مشاعرے کا مصرع طرح تھا: ''شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں'') کے علاوہ ایک بار یوم اقبال بھی منایا گیا تھا۔[۲] انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ، کراچی نمبر۱ سے مددگار معتمد نے ابراہیم خلیل کو لکھا تھا: ''مشاعرے اچھی چیز ہیں بشرطیکہ ان سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچے۔ گل و بلبل کی شاعری کا زمانہ اب ختم ہو گیا ہے۔ اب تو شاعری برائے زندگی، برائے ملک و قوم ہونی چاہیے، ورنہ وقتی نقش کے سوا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

اس انجمن کے ممبران مقامی اور غیر مقامی حضرات تھے۔

۱۹۴۸ع میں 'عیش لٹریری سوسائٹی' کوئٹہ قائم ہوئی۔ اس کے سیکرٹری مذاق العیشی تھے۔ اس کی سرپرستی عیش فیروز پوری فرماتے تھے۔ اس کاروان میں عسکری العیشی، جمیل العیشی، منیر العیشی کے علاوہ ماسٹر سعادت اور ماہر افغانی وغیرہ شامل تھے۔ بقول ماہر افغانی ''بظاہر اس سوسائٹی کا نام اب تک موجود ہے لیکن اس کے کرتا دھرتا مفقود الخبر ہیں۔'' ایک زمانہ تھا جب مرکز ادب اور عیش لٹریری سوسائٹی کی معرکہ آرائیاں اور چشمکیں عام تھیں۔

ستمبر ۱۹۴۹ع میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے چند اساتذہ[۳] (انور رومان،

۱۔ اتحاد، کوئٹہ، ۶ مئی ۱۹۵۴ع۔

۲۔ انجام، کراچی، ۲۵ مارچ ۱۹۵۴ع۔ جنگ، کراچی، ۱۰ اپریل ۱۹۵۴ع۔ ۱۹۵۲ع سے بابائے اردو کے خطوط ابراہیم خلیل کے نام آنے لگے تھے جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۲ع، نمبر ۱۰۳۶ کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے فورٹ سنڈیمن سے راقم الحروف کے نام ایک خط (یکم دسمبر ۱۹۶۶ع) میں لکھا تھا ''کالج کے حلقۂ تحریر و تنقید

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ش ضحیا، سعید احمد رفیق ، آغا صادق اور خلیل صدیقی) اور کچھ باذوق طلبہ نے مل کر علمی و ادبی ذوق کے پہلو بہ پہلو ناقدانہ شعور اور صحت مند نقطۂ نظر کی نشو و نما کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کی ٹھانی ، جسے ''حلقۂ تحریر و تنقید'' کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے گئے ۔ تشکیل اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے یہ حلقہ مروجہ سوسائٹیوں سے نرالا تھا ۔ عہدے اور نامزدگی کی کوئی قید نہ تھی ۔ استاد شعبۂ اردو (پروفیسر خلیل صدیقی ، نگران حلقہ) کی مدعو کردہ مجلس قائمہ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں ایک ناظم منتخب کر لیتی تھی اور ہر ادبی نشست میں ہنگامی صدر کا انتخاب کر لیا جاتا تھا ۔ صدر کے لیے اساتذہ ہی کا انتخاب ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ حلقے کی رکنیت کے لیے یہ لازمی تھا کہ امیدوار کوئی ادب پارہ پیش کرے ۔ اگر مجلس قائمہ کے اراکین اس ادب پارے کے معیار سے مطمئن ہو جاتے تو رکنیت منظور کر لی جاتی تھی ۔

آئین کی رو سے ہر نشست کی ترتیب کار ایک نظم یا غزل اور ایک نثر پارہ (افسانہ ، فیچر ، رپورتاژ ، خاکہ نگاری ، طنز و مزاح ، تنقید وغیرہ) پر مشتمل تھی ۔ اس التزام کی پابندی ہر نشست میں کی جاتی رہی ۔ حلقے کے قواعد و ضوابط میں جزوی تبدیلیوں کی گنجائش کا بطور خاص خیال رکھا گیا تھا ۔ اگر ضرورت پڑی تو حلقے کی غرض و غایت کا احترام کرنے کے لیے نگران حلقہ یا اساتذہ میں سے کسی نے صدارت کے فرائض انجام دیے ۔ ۱۹۵۴ء میں حنفی صاحب (ایڈووکیٹ) ، ۱۹۵۵ء میں سید خلیل احمد ، ۱۹۵۷ء میں رشید احمد اور چند باذوق اساتذہ کے تعاون سے حلقے کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

کے قیام میں انور رومان صاحب کا خاص ہاتھ تھا ۔ پہلے سیکرٹری مسٹر مسعود الرؤف نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ۔ طلبہ میں لطیفہ صدیقی ، مسعود الرؤف ، صفیہ ایوب اور کامل القادری وغیرہ پیش پیش تھے ۔

سرگرمیوں میں خاصا اضافہ ہؤا ۔ بعد میں ڈاکٹر محمد اسلم قریشی اور انوارالحق چودھری بھی اس کے سرگرم کارکن رہے ۔ اس ادارے نے جو ٹھوس خدمات انجام دی ہیں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اولاً ہفتہ وار اور پھر پندرہ روزہ نشستوں کی بدولت سینکڑوں طلبہ میں صحیح ادبی ذوق اور تنقیدی شعور بھی پیدا ہؤا اور بعض ایسے لکھنے والے پیدا ہوئے جن پر کالج فخر کر سکتا ہے : مثلاً مسعود الرؤف ، فصیح الدین ، وقار احمد ، ریاض احمد ، صفیہ ایوب ، ممتاز حسن تاج ، کامل القادری ، شاہین بشیر ، ناہید بشیر ، ریاض فاطمہ ، شاہین رحمان ، زکریا صدیقی ، ظہیر یوسفی ، قمر کاشمیری ، سعادت حسین ، اشفاق احمد ، افضل مہدی وغیرہ ۔ ان میں سے اکثر نے عملی زندگی میں بھی نمایاں مقام پیدا کر لیا ہے ۔ حلقے کی نشستوں میں پیش کیے جانے والے فن پاروں میں سے اکثر معیاری اور بلند پایہ ثابت ہوئے ، جیسے حسن عسکری کے افسانے از مسعود الرؤف ، ادب کیا ہے از مبشر علی ، دستووسکی کی ناول نگاری از وقار الرحمٰن ، اقبال کا تصور ابلیس از وقارالرحمٰن ، اردو ناول کا انحطاط اور شفیق الرحمٰن کا مقام مزاحیہ ادب میں از سعادت حسین ، کچھ غزل کے بارے میں از افضل مہدی ، اختر انصاری کی شاعری از کامل القادری ، اکبر الہ آبادی کا طنز و مزاح از مبذول الرحمٰن ، تنقید کا منصب از مبشر علی وغیرہ ۔ ان کے معیار سے قطع نظر صحت مند تنقید اور معلومات افزا ضمنی مباحث کی مکمل روداد قلمبند کی جاتی رہی جو علمی اور ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل تھی ۔ اس امر کا افسوس ہے کہ حلقہ فن پاروں اور علمی مباحث کی روداد کی ترتیب و تدوین نہ کر سکا ۔ ہاں اتنا ضرور ہؤا کہ ان میں سے بعض مضامین کالج میگزین (بولان) میں شائع ہو گئے اور یوں کالج میگزین کا معیار عام کالجوں کے رسائل سے کچھ بلند ہی رہا ۔[1]

۱۹۴۹ع میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے اساتذہ انیس الرحمٰن (فلسفہ) ،

۱۔ "بولان" ، کوئٹہ کی فائل ۱۹۴۹ع—۱۹۶۶ع ۔
قاصد کوئٹہ ، (کالج نمبر) ۱۶ جولائی ۱۹۵۹ع ، صفحہ ۱۵ ۔

ش ۔ ضحیٰ (جغرافیہ) ، خلیل صدیقی ؔ (اُردو) ، عزیز الدین (انگلش) اور کرم الٰہی خاں (معاشیات) نے مل کر ایک ''سٹڈی سرکل'' قائم کیا جس کے اجلاس کسی ایک رکن کے مکان پر ہوتے تھے ۔ انیس صاحب کے تبادلے کے بعد سعید احمد رفیق (فلسفہ) نے ان کی جگہ لی ، پھر گورنمنٹ کالج (خواتین) کی مس شفیق بانو منہاج ، مس حسینہ شیخ (فلسفہ) ، مسز قزلباش (اُردو) ، مس رحمٰن (جو اب مسز واسطی ہیں) وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئیں[۱] ۔

۱۹۴۹ع میں انجمن ترقی پسند مصنفین بلوچستان کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ اس میں کامل القادری ، رفیق راز ، انجم قزلباش اور ع سلام وغیرہ شامل تھے ۔ یہ بھی اُردو کی ترقی اور ترویج کے حامی تھے[۲] ۔

۱۹۵۳ع میں ایک انجمن محشر رسول نگری کی صدارت میں قائم ہوئی جس کا نام تھا ''انجمن اصلاح ادب'' ۔ اس کا نصب العین ادب برائے اسلام تھا ۔ ہفتہ وار جلسوں میں مضامین نظم و نثر پڑھے جاتے تھے اور ان پر تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی تھی ۔ اس کے سرگرم اراکین منظور بخاری ، ناظم علی دریا بادی ، صادق شاذ ، اکبر بخاری ، وحشی جنجوعہ اور آغا صادق وغیرہ تھے[۳] ۔

۱۹۵۳ع میں ''مرکز ادب'' کے نام سے کوئٹے میں ایک ادبی انجمن معرض وجود میں آئی ۔ اس کے کرتا دھرتا ناظم علی دریابادی (صدر)[۴] ، حکیم نسیم الدین پانی پتی (معتمد) ، ارشد امروہی ، اخگر سہارن پوری ، شفق سہارن پوری ، قیوم راشد ، ضیاء صدیقی ، ماسٹر سعادت علی اور آغا صادق تھے ۔ نظر نقوی ، تقی امروہوی ، تصور امروہوی ، حافظ ضیا ،

۱- پروفیسر خلیل صدیقی کا خط فورٹ سنڈیمن سے راقم الحروف کے نام خط مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۶ع ۔

۲- خورشید ، کوئٹہ ، ۹ دسمبر ۱۹۴۹ع ۔

۳- بردوش ہوا ، آغا صادق ، صفحہ ۱۲۰ ۔

۴- دشمن ، کوئٹہ ، ۳۰ جون ۱۹۵۳ع ۔

ماسٹر ہمدم اور اقبال سلطان وغیرہ گہری دل چسپی کا مظاہرہ کرتے تھے ۔ اگست کی پہلی تاریخ تھی (سنہ[1] ۱۹۵۳ع) ''بلوچستان کا دل'' اس سال کی غیر معمولی گرمی کے بعد باران رحمت سے فیض‌یاب ہو رہا تھا ۔ فضا میں تازگی کے آثار نمایاں تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ۔ بارش کبھی تھم جاتی اور کبھی تیز ہو جاتی ۔ اسی پر لطف روز سرِ شام ہی سے لوگ لٹن کی طرف جا رہے تھے کیونکہ عبدالرحمٰن صدیقی کے دولت کدے پر ایک طرحی مشاعرہ ہونے والا تھا ۔ یہ مشاعرہ 'مرکز ادب' کوئٹہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا ۔ ناظم علی دریا بادی ایم ۔ اے صدر مرکزِ ادب کی تجویز اور حاضرین کی تائید پر جناب پروفیسر خلیل صدیقی نے کرسئ صدارت کو رونق بخشی ۔ حکیم نسیم الدین معتمد مرکز ادب نے ترتیب نامہ پیش کیا ۔ صاحب صدر نے سلجھے ہوئے انداز میں اور مزے لے لے کر مشاعروں کی افادی اور تفریحی قدروں پر اپنے خیالات کا مختصراً اظہار فرمایا جو صرف انھی کا حصہ ہے ۔ سامعین کی تعداد کافی تھی ۔ ایک بجے شب تک مشاعرہ جاری رہا اور مجموعی طور پر مشاعرہ کامیاب تھا ۔ اب چند شعرا کے چیدہ چیدہ اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں ۔ مصرع طرح تھا : ''ہوائے گل بڑی دیوانہ گر معلوم ہوتی ہے''

مری دنیائے دل جو مختصر معلوم ہوتی ہے
وہی لاکھوں تمناؤں کا گھر معلوم ہوتی ہے (نقی امروہوی)

جو سہمی جا رہی ہیں شام ہی سے صحنِ گلشن میں
انھیں کلیوں کے دامن میں سحر معلوم ہوتی ہے
یہ اتنی بے خودی کیسے ہوئی ہے آج اے ساقی
مرے ساغر میں حل تیری نظر معلوم ہوتی ہے
(شادان امرتسری)

۱۔ کوئٹہ کا ایک طرحی مشاعرہ ، انعام الحق کوثر ، روز نامہ ملت ، لاہور ۶ اکتوبر ۱۹۵۳ع ۔

لیے بیٹھی ہے دامن میں تمناؤں کی اک دنیا
بظاہر زندگانی مختصر معلوم ہوتی ہے
(نقوی امروہوی)

ستاروں کی جوانی جھومتی ہے شب کے سایوں میں
ردائے شب میں پوشیدہ سحر معلوم ہوتی ہے
کلی چٹکی ، نسیم اٹھلائی ، گلشن لہلہا اٹھا
ہوائے گل بڑی دیوانہ گر معلوم ہوتی ہے (ضیا صدیقی)
جہاں مرکوز ساقی کی نظر معلوم ہوتی ہے
تہی ساغر میں صہبا جلوہ گر معلوم ہوتی ہے
ستارے ٹمٹماتے ہیں ، سحر معلوم ہوتی ہے
سکوتِ شب میں فردا کی خبر معلوم ہوتی ہے
یہ سبزہ ، یہ ہوا ، کالی گھٹائیں ، دامنِ صحرا
فضا بھیگی ہوئی دیوانہ گر معلوم ہوتی ہے (عاطفی)
اکیلا میں نہیں ہوں جادہ پیما راہِ الفت میں
امیدِ جانفزا بھی ہم سفر معلوم ہوتی ہے (اثرپانی پتی)
نہ کچھ خوفِ خدا تجھ کو نہ ڈر ہے روزِ محشر کا
نہ دل میں اُلفت خیر البشرؐ معلوم ہوتی ہے (ضیا)
ارے ساقی بتا کل تیرے میخانے پہ کیا گزری
بچارے شیخ کی حالت دگر معلوم ہوتی ہے (زخمی)
وہ جتنے دور ہیں ، نزدیک تر معلوم ہوتے ہیں
بشر کی یہ تو معراجِ نظر معلوم ہوتی ہے (سعادت)
ابھی تک جلوہ گاہِ حسن کے پردے نہیں اٹھے
نظر اب تک اسیرِ بام و در معلوم ہوتی ہے
(ناز اکبر آبادی)

ہے اک رنگیں تجلی جلوہ افشاں دیر و کعبہ میں
جو وجۂ اختلافاتِ نظر معلوم ہوتی ہے (نظامی)

کبھی راہ وفا میں خود کو میں تنہا سمجھتا ہوں
کبھی یہ ساری دنیا ہم سفر معلوم ہوتی ہے
کہاں پہنچاؤں یا رب وسعتِ ذوقِ تماشا کو
یہ دنیا تو بقدرِ یک نظر معلوم ہوتی ہے
(ارشد امروہوی)

کشش منزل کی خود ہی راہبر معلوم ہوتی ہے
جدھر جاتا ہوں تیری رہگزر معلوم ہوتی ہے
تجھے پہچان لیتا ہوں ہجومِ لالہ و گل میں
نظر کثرت میں بھی وحدت نگر معلوم ہوتی ہے
کوئی شیشہ چٹخ جاتا ہے میخانے میں جب صادق
تو اُس کی چوٹ، میری روح پر معلوم ہوتی ہے (آغا صادق)

مزاح نگار شعرا

وہ آئے تو مریضِ ہجر اچھا ہو گیا فوراً
نگاہِ ناز اُن کی ڈاکٹر معلوم ہوتی ہے (نظر)
کبھی دل توڑ دیتی ہے کبھی دل جوڑ دیتی ہے
ازل سے دخترِ حوا فٹر معلوم ہوتی ہے
تصور میں یہ عالم ہو گیا باریک بینی کا
مجھے ہر نوکِ مو تیری کمر معلوم ہوتی ہے
(نسیم پانی پتی)[1]

مرکزِ ادب کوئٹہ کے مزید دو طرحی مشاعروں کا انتخاب پیش خدمت

۱- حکیم نسیم الدین نسیم ان دنوں لاہور میں مقیم ہیں - راقم الحروف کے نام ایک خط (مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۷ع) میں لکھتے ہیں: ''حضرت! میرا کلام کیا اور دیوان کیسا - بلکہ اس سلسلے میں اُسی زمانے کا میرا ایک شعر ہے:

بغل میں ہے کسی شاگرد کے استاد کا دیوان
میں ایسی ساتھ چلتی پھرتی الماری پہ ہنستا ہوں''

ہے ۔ ایک مشاعرہ نومبر ۱۹۵۳ء کو آغا صادق صاحب کے دولت کدے پر منعقد ہؤا ۔[1] مصرع طرح تھا :

دنیا ابھی دنیا بن نہ سکی انساں ابھی انساں ہو نہ سکا

اس بحر کی ہر غزل میں ایک ، دو یا اس سے کچھ ہی زیادہ اشعار معیاری پائے جاتے تھے جو بزم مشاعرہ کو گرما رہے تھے اور محفل شعر کا وقار قائم کر رہے تھے ۔ مشاعرے کی صدارت کے فرائض جناب قیوم راشد نے انجام دیے :

شاید وہ میرا قصہ ہو جس کا کوئی عنواں ہو نہ سکا
وہ درد مرا حصہ ہوگا جس درد کا درماں ہو نہ سکا
اے شمع لحد اے رقصِ شرر اے شعلہ و گل اے نجم سحر
کیا میں بھی تمھارا ہم دم تھا دم بھر جو فروزاں ہو نہ سکا
اک ساز کلی کو مل جاتا ، اک جام کنول کو دے دیتے
کچھ بھی نہ ہؤا گر اہل چمن یوں جشنِ بہاراں ہو نہ سکا
جس قیس کی مٹی سے صادق قالب نہ ڈھلے دل والوں کے
وہ اہلِ جنوں کے مذہب میں شایانِ بیاباں ہو نہ سکا

(آغا صادق)

موسیٰ کی طرح بے خود میں رہوں بے ہوش رہوں حسرت ہی رہی
آئینہ بھی ان جلووں کا بنا ، لیکن کبھی حیراں ہو نہ سکا
افسوس تصور میں اپنے خود کو بھی نہ اب تک دیکھ سکے
ہم اُن کا تو عرفاں کیا کرتے ، اپنا ہمیں عرفاں ہو نہ سکا
دریا کے تلاطم میں اکثر موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر
صد حیف کہ پھر بھی اے اخگر اندازۂ طوفاں ہو نہ سکا

(اخگر سہارن پوری)

۱۔ نعرۂ حق ، کوئٹہ ، ۹ دسمبر ۱۹۵۳ء ۔

شکوہ جو کیا میں نے کہ وفا تم نے بھی کیا وعدہ کوئی ؟
جھنجلا کے کہا ہاں ہو نہ سکا ہاں ہو نہ سکا ہاں ہو نہ سکا
(سعادت بریلوی)

جب عزم و عمل کے سر نہ اٹھے اور ہوش کا ساماں ہو نہ سکا
ساحل پہ سفینہ ڈوب گیا ، اندازۂ طوفاں ہو نہ سکا
(جمال الدین قاصر)

وہ دیکھ نہیں سکتا ہے نظر جلوے کو خدا کے طُور پہ بھی
جو دیکھ کے اپنی ہستی کو آئینۂ حیراں ہو نہ سکا
(نظر نقوی امروہوی)

جینا ہے بہر صورت اب تو خواہ ہنس کے جئیں یا رو کے جئیں
چاہا تھا اجل ہی آئے اس سے یہ بھی احساں ہو نہ سکا
(کلیم عباسی)

جب جوشِ عمل ہو سرد اپنا رہبر کی شکایت بے جا ہے
اندھوں کو اجالے کا باعث خورشید درخشاں ہو نہ سکا (افتخار)

جن کو تری آنکھوں نے ظالم دیوانہ کیا بیمار کیا
اُن کا کوئی مونس بن نہ سکا ، اُن کا کوئی درماں ہو نہ سکا
(ذہین قادری نگینوی)

ناقص ہو جمیلی فکر تو پھر تکمیل حقائق کیسے ہو
مقصد جو تھا اپنے پیش نظر وہ حاصلِ ایماں ہو نہ سکا
(جمیلی میرٹھی)

لہروں سے لڑا ، گردوں پہ اُڑا ، کرنوں سے اُلجھا ہے لیکن
دنیا ابھی دنیا بن نہ سکی ، انساں ابھی انساں ہو نہ سکا
(شفق سہارنپوری)

دنیا تو سرائے فانی ہے ، بے شک یہ مقام عیش نہیں
جس نے کیا کچھ غور ضیاء وہ پھر کبھی شاداں ہو نہ سکا
(ضیاء نہٹوروی)

جس قطرۂ خوں سے شامِ غم، تھی ہم کو اُمیدِ شب تابی
وہ گوہرِ شب تاب اے ہمدم! وابستۂ مژگاں ہو نہ سکا
(عابد رضوی)

جس طرح مری دنیائے وفا ناکام ہوئی، برباد ہوئی
کوئی بھی چمن اس دنیا میں اس رنگ سے ویراں ہو نہ سکا
(صدق رضوی)

خود زندگی جس کی طوفاں ہو موجوں سے مسلسل کھیلا ہو
ساحل کا وہ منت کش کیا ہو، اندیشۂ طوفاں ہو نہ سکا
(صولت بریلوی)

مزاح

ہم ایسے مقدر والے کو صوبے کا گورنر کہتے ہیں
جو جیل کا پھاٹک دیکھ چکا، سرکار کا مہماں ہو نہ سکا
محفل میں کلیم اک ہم ہی کیا، سب دل بہلانے آئے ہیں
بے کیف سی ہے وہ بزم جہاں تفریح کا ساماں ہو نہ سکا
(کلیم عباسی لکھنوی)

اس چار سو بیس کے لچھن سے دنیا بھی گئی اور دیں بھی گیا
اللہ کو راضی کر نہ سکے، خوش آپ سے شیطاں ہو نہ سکا
کیا لطف ترقی کا آیا دل لینے یا دل دینے پر
جب غنڈہ اکٹ میں دونوں کا چالان بھی یکساں ہو نہ سکا
(حکیم نسیم عثمانی پانی پتی)

دوسرا مشاعرہ ۵ دسمبر ۱۹۵۳ء[1] کو سید ناظم علی دریا بادی ایم اے صدر مرکز ادب کوئٹہ کے مکان پر حافظ محمد ابراہیم کی صدارت میں منعقد ہوا:

یہ کس کی آمد آمد ہے چمن میں
کہ غنچے مسکرائے جا رہے ہیں (حافظ ابراہیم)

۱- رہبر نسواں، کوئٹہ، ۱۶ دسمبر ۱۹۵۳ء-

یہ کس محفل سے پی کر آرہے ہیں
کہ فرش و عرش پر ہم چھا رہے ہیں
یہ کہتی ہے اُداسی انجمن کی
یہاں وہ انجمن آرا رہے ہیں (آغا صادق)

یہ کھل کھل کر جو گل مرجھا رہے ہیں
چمن کے راز کھلتے جا رہے ہیں
دلِ مضطر سے ان نظروں کو اخگر
حسیں جھولا جھلائے جا رہے ہیں
(اخگر سہارنپوری)

اسے کہتے ہیں فالِ نیک بختی
وہ دیکھو بِن بلائے آرہے ہیں (حکیم اعجاز)

وہ پھر ساون کے بادل آ رہے ہیں
فضا پر میکدے لہرا رہے ہیں

شبِ غم ، بے کسی ، پرخار راہیں
مگر ہم ہیں کہ بڑھتے جارہے ہیں (قیوم راشد)

نگاہوں میں لیے منزل کو اپنی
بھکتے ، ڈگمگاتے جا رہے ہیں (سعادت بریلوی)

برائے فاتحہ وہ آ رہے ہیں
ملا کر خاک میں اپنا رہے ہیں (نظر امروہوی)

جبینِ شوق کی راہیں نہ کھولو
مٹادو نقشِ پا ہم آ رہے ہیں (شاہد بدایونی)

مرے ظرفِ نظر کا امتحاں ہے
نقابِ رخ جو وہ سرکا رہے ہیں

یہ حسن و عشق کی پیچیدگی ہے
میں سلجھاتا ہوں ، وہ اُلجھا رہے ہیں
(جلال الدین ناصر)

اجل جب تک سرِ بالیں نہ آئی
یہی سنتے رہے وہ آ رہے ہیں (ظفر عثمانی)
تمھیں دیکھا چھپے آنکھوں میں آنسو
ستارے چاند سے شرما رہے ہیں
(شفق سہارنپوری)
سرِ تسلیم خم ہے اپنا عابد
جبینِ حسن پر بل آرہے ہیں (عابد رضوی)
بنا کیا آشیاں کی رکھ رہے ہیں
بلانے بجلیوں کو جا رہے ہیں (صولت)

مزاحیہ

محبت سٹ پٹا کر رہ گئی ہے
سنا ہے وہ رپٹ لکھوا رہے ہیں (کلیم عباسی)
کوئی کھاتا ہے غم، کھائے بلا سے
مزے سے ہم سموسے کھا رہے ہیں (شوہر پریمی)
گئی بازار بیگم بھرِ شاپنگ
میاں گھر میں ُرلا بہلا رہے ہیں
ستمگر کم نہیں زاغ و زغن سے
وطن کی لاش پر منڈلا رہے ہیں
(حکیم نسیم پانی پتی)

دوسرے دور (۱۹۵۸ء) میں مرکز ادب کوئٹہ کے کارپردازان میں[1] ڈاکٹر محمد الیاس، ماسٹر عبد المجید، مولانا عبد الکریم، حافظ ضیا، فضا نہٹوروی، ع ـ سلام، افضل کوٹلوی، محبوب سیالکوٹی، ضیا رضوی، رفیق رضوی اور رفیق راز وغیرہ شامل تھے ـ اس کا دستور العمل خاصا جاذب نظر ہے ـ بعد ازاں ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ اور عابد شاہ عابد بھی اس کے سرگرم کارکن رہے ـ

۱ـ دھنک، مستونگ، صفحہ ۲۴ ـ

۱۹۴۸ء میں[1] چند اہل قلم نے کوئٹہ میں ایک ادبی انجمن کی داغ بیل ڈالی جس کا نام ''بزم ارتقائے ادب'' تجویز کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں بزم نے ایک رسالہ ''ارتقا'' کے نام سے جاری کیا تھا لیکن بعض نامساعد حالات کی بنا پر اُسے بند کر دیا گیا۔ اس بزم کے کرتا دھرتا علی نظامی، ناز اکبر آبادی، خلیل صدیقی، سعید احمد رفیق، ش ضحیٰ، تراب گوالیاری، بدر الحسن بدر، صفدر سیالکوٹی، سید غلام شاہ، قتیل فرید کوٹی وغیرہ تھے۔ نظامی، ناز اور صفدر کے چلے جانے کے بعد اثر جلیلی، شعیب حزیں اور رشید نثار نے اس بزم کو زندہ رکھا۔ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ''مرکز ادب'' کے انتشار کے بعد صرف ''ارتقائے ادب'' ہی ایک ایسی انجمن تھی جس کے باقاعدہ طرحی مشاعرے ہوتے اور اُن میں تقریباً تمام مکتب خیال کے لوگ شریک ہوتے تھے۔

یہ بزم مشاعروں سے بڑھ کر کچھ اور آگے قدم بڑھانا چاہتی تھی۔[2] چنانچہ مناظمے، مسلاسے، مناثرے اور مذاکرے منعقد کرنا بھی اس کے مقاصد میں سے تھا اور ایک ادبی رسالہ بنام ''مرقع'' جاری کرنے کی داعی بھی تھی لیکن مالی حالت کی نادرستی کی وجہ سے اس کا ڈکلریشن منظور نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۶ء میں بزم کی تشکیل جدید کی گئی۔ جناب شعیب حزیں کو صدر اور اثر جلیلی کو جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ اس وقت بزم کے ارکان کی تعداد بہت ہی محدود تھی لیکن ان چند نفوس نے از سر نو بزم کے اغراض و مقاصد[3] وضع کیے اور اُنھیں دستور العمل کے نام سے شائع کر دیا۔

۱۔ تعارف بزم ارتقائے ادب کوئٹہ ۷/۱۶۔ ۷ بارنس روڈ کوئٹہ (پمفلٹ) ۱۹۶۱ء، مطبوعہ بولان مسلم پریس کوئٹہ — بردوش ہوا صفحہ ۱۷۰۔

۲۔ ''کوئٹہ میں میری بارہ سالہ ادبی سرگرمیاں'' (غیر مطبوعہ) از رشید نثار۔

۳۔ مقاصد یہ تھے:

(الف) بزم کا مقصد اردو ادب اور زبان کی ترویج ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بزم مختلف ذرائع استعمال کرے گی؛ مثلاً (۱) مشاعرے اور مناثرے منعقد کرنا (۲) رسالہ جاری کرنا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

۱۹۵۸ء میں جناب سید امتیاز حسین[1] باقری حنفی ایڈووکیٹ ، بزم کے صدر منتخب ہوئے ۔ انھی دنوں بزم کی مجلس انتظامیہ نے ہفت روزہ نشستوں کا آغاز کیا جو کہ مجلس ادب و تنقید کے نام سے چند برسوں تک جاری رہیں ۔ ان نشستوں میں نہ صرف مقامی اہل قلم شرکت فرماتے تھے بلکہ بیرونی حضرات جب کوئٹہ آتے تو انھیں بھی شرکت کی زحمت دی جاتی تھی۔ حلقۂ ارباب ذوق کوئٹہ کے ختم ہو جانے کے بعد صرف بزم مذکور کی یہ ادبی نشستیں ہی تشنگان ادب کی تسکین کا ذریعہ بنیں جن میں تمام ادب دوست حضرات شریک ہوتے تھے ۔ ان نشستوں نے نئی پود میں ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا ۔

۱۹۵۹ء میں یوم سالک (مولانا عبدالمجید سالک) منا کر اپنے فرض کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی[2] - ۱۹۶۰ء میں بزم نے اپنے ایک رکن جناب اصغر انبالوی کا مجموعۂ کلام ''دستِ سبو'' کے نام سے شائع کیا جو ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا ۔

۱۹۶۱ء کے انتخابات میں سید دربار علی شاہ صاحب پولٹیکل ایجنٹ کوئٹہ کو بزم کا سرپرست اور جناب محمد ظہیر فرخ انکم ٹیکس آفیسر کو صدر منتخب کیا گیا ۔ دیگر عہدے داران یہ تھے : نائب صدر ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ اور محترمہ ثریا فخری ، جنرل سیکرٹری اثر جلیلی ، خزانچی و محاسب سید عابد رضوی ، پروپیگنڈا سیکرٹری رشید نثار ، مجلس انتظامیہ کے اراکین

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

(۳) مختلف قسم کے ادبی جلسے کرنا (۴) دیگر ذرائع ۔
(ب) اردو زبان اور بیان کی صحت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ۔
(ج) مختلف ادبی انجمنوں اور جماعتوں میں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنا اور ان کے باہمی اختلافات کو حتی الوسع ختم کرنا ۔

۱- تعارف بزم ارتقاے ادب کوئٹہ (پمفلٹ) ۔
۲- ''لاہور'' لاہور ، ۱۴ دسمبر ۱۹۵۹ء ۔

میں تراب گوالیاری ، غلام شاہ ، محمد اسلم عارف[1] ، سعید احمد رفیق ، ذکاء اللہ عقیل ، ڈاکٹر مختار الدین احمد مختار اور آغا غوث ۔

۱۹۶۱ء میں بزم ارتقائے ادب نے جشن کوئٹہ کے دوران میں ایک دو روزہ جشن بعنوان ''شمع شبستان غزل'' منایا تھا جو ہمیشہ یاد گار رہے گا ۔ اُس کا جائزہ ملاحظہ فرمائیے[2] ـــــ ہم آپ کو گورنمنٹ کالج جناح روڈ کوئٹہ کے سجے سجائے ہال میں لیے چلتے ہیں ۔

بزم کے ارکان کالی شیروانیوں میں ملبوس ، جیبوں پر زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کا ''بِلا'' (جس پر ''شمع شبستان غزل'' لکھا ہوُا تھا) لگائے ہوئے انتظام میں مصروف ہیں ۔ کرسیٔ صدارت پر ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی (پرنسپل

۱- ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کا قیام کوئٹہ قلات ڈویژنوں میں ۱ اکتوبر ۱۹۵۹ء سے اپریل ۱۹۶۳ء تک رہا ۔ آپ نے اپنا مقالہ ''ڈرامائی نظریے اور تکنیک کی روشنی میں اردو ڈرامے کا جائزہ'' (برائے پی ایچ ڈی) کوئٹہ ہی میں قیام کے دوران پنجاب یونیورسٹی کو پیش کیا تھا (۱۹۶۲ء) آپ نے بزم ارتقاے ادب کوئٹہ کی محفلوں میں متعدد مقالات پیش کیے ۔ چند ایک یہ ہیں :

اِ- ادب کیا ہے ؟ ۲۲ نومبر ۱۹۵۹ء - (مطبوعہ ، شہاب ، لاہور ، ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء) ۔

ب- افلاطون کا نظریۂ شاعری ۔ ۳ جنوری ۱۹۶۰ء ۔

ج- ادب میں مواد کی اہمیت ۔ ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء ۔

د- کچھ اردو غزل کے بارے میں ۔ ۲۶ جون ۱۹۶۰ء ۔

ہ- برصغیر پاکستان و ہند میں، تحریر کا آغاز ۔ ۲۴ جولائی ۱۹۶۰ء (مطبوعہ میگزین اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ ، مارچ ، اپریل ، مئی ۱۹۶۴ء) ۔

و- اسلامی ادب ۔ ۴ جون ۱۹۶۱ء (مطبوعہ ''سیارہ'' لاہور، اکتوبر ۱۹۶۳ء) ۔

ز- اُردو کے قدیم نام ۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۱ء ۔

۲- شمع شبستان غزل از رشید نثار ، ہفت روزہ ''لاہور'' لاہور ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء ۔

جلوہ افروز ہیں ۔ سٹیج سیکرٹری اثر جلیلی ہیں ۔ پہلا مقالہ رئیس احمد جعفری کا ہے ۔ اُن کا مقالہ پہلے دور کے غزل گو شعراء کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ اس دور کی ایک نمائندہ غزل : ع

ابر میں یادِ یار آوے ہے گریہ بے اختیار آوے ہے

ریڈیو آرٹسٹ فضل الٰہی گا کر سنا رہے ہیں ۔

دوسرا مقالہ پروفیسر محمد اسلم قریشی کے ذمے تھا ۔ اس دور کی نمائندہ غزل : ع

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

ریڈیو سنگر عبدالغنی گا کر سنا رہے ہیں ۔

تیسرا مقالہ فرمان فتح پوری سنا رہے ہیں ۔ اس دور کی غزل : ع

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا

عبدالصمد درانی اساوری میں سنا رہے ہیں ۔

چوتھا مقالہ پروفیسر خلیل صدیقی پیش کر رہے ہیں اور اُن کے مقالے پر یہ مجلس اختتام پذیر ہوتی ہے ۔

جشن کوئٹہ کی ایک کڑی مشاعرہ بھی تھا جس کے انصرام کا بوجھ کوئٹہ ریلوے کے کندھوں پر تھا ۔ اُنھوں نے آل پاکستان مشاعرہ کر کے اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دیا اور وادیٔ شال کے اہل ذوق کے احساسات کو بیدار کیا ۔ جس کے نتیجے میں چند ادبی دوستوں نے ایک دلکش پروگرام ترتیب دے کر کوئٹہ کے باشندوں کو ”ہنہ جھیل“ پر مشاعرہ سنوایا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً انفرادیت کا حامل تھا ۔ ہنہ جھیل جو عام طور پر کسی بیوہ کی جوانی کا نظارہ پیش کرتی ہے ، مشاعرے والی شب کو واقعی نئی نویلی دلھن کی طرح سجی ہوئی تھی ۔ کوئٹہ کے ایک ہمدرد خلائق (میر اسحاق) اور کنٹونمنٹ کے ایگزیکٹو آفیسر میاں اقبال احمد نے اس کے خوابیدہ دل کو لمعہ فگن بنا دیا تھا ۔ اس شب کو چمکتے ہوئے ستارے ، آسمان کی خاموش نیلاہٹیں ، کہکشاں کی اُجلی ندی ، چاند کا روپہلی چہرہ ، ہوا کی پھواریں خوشی اور مسرت کا سیل رواں بن گئی تھیں ۔ ہنہ جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے سامعین دل کھول کر مسرت اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے ۔ یہ محفل مشاعرہ رات کے دو بجے تک جاری رہی اور ادبی

ذوق کو بیدار کرتی ہوئی بخیرو خوبی تمام ہوئی - یہ مشاعرہ بغیر ٹکٹ کے ہؤا - اخراجات بزم ارتقائے ادب کوئٹہ نے برداشت کیے - اُن کے نزدیک ٹکٹ پر مشاعرہ کرنا ایک غلط رجحان ہے - اُن کا خیال ہے کہ ٹکٹ پر مشاعرہ سننے والے صاحبِ ذوق نہیں ہوتے ، محض تماشائی ہوتے ہیں -

لیجیے مشاعرے کی صدارت علی مظہر رضوی اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے سپرد ہے - مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے اثر جلیلی اپنا کلام سنا رہے ہیں - اُن کے بعد عابد رضوی تشریف لائے اور اسی طرح شاہد العیشی ، افسر بہزاد ، عطا شاد ، رشید نثار ، حسن پرویز ، انوار زریں ، ڈاکٹر مختار ، طفیل لودھی داد وصول کرتے ہوئے اپنی اپنی باری نمٹا چکے ہیں - آذر تونسوی جثے سے زمیندار نظر آتے ہیں مگر ادب و شعر کے شیدائی - ان کا ایک شعر یہ ہے :

اے دوست ترے عشق میں ہم مُہر بلب ہیں
وہ اور کوئی تھے جو سرِ دار پکارے

آذر کے بعد ضیا صدیقی ، اخگر سہارنپوری اور سہان شاعر اختر انصاری اکبرآبادی اپنا کلام سنا چکے ہیں - ماحول خوشگوار ہے لیکن مشاعرہ ڈاکٹر حمید کاکڑ کے اس شعر سے چمکتا ہے :

یونہی کب ساغرِ لبریز چمک اُٹھتا ہے
کسی مے خوار کا غم سینے میں پنہاں ہوگا

ناز اکبر آبادی اچھی خاصی داد پا گئے ہیں - محسن احسان پشاور سے تشریف لائے ہیں ، اُن کا ایک شعر دیکھیے :

کوئی دھڑکن کوئی آواز کوئی چاک نہیں
دل ہے آباد مگر شہرِ خموشاں کی طرح

آپ کے بعد سحاب قزلباش نے داد سمیٹی - اُن کی دو معروف غزلوں کا ایک ایک شعر سنیے :

حقارت سے نہ دیکھو ، دل کو جامِ جم بھی کہتے ہیں
اسی خاکِ تپاں کو فاتحِ عالم بھی کہتے ہیں

بجھ رہے ہیں چراغِ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

سید علی نظامی، صادق نسیم، تراب گوالیاری نے اپنی صاف ستھری غزلوں کے باعث خوب داد پائی۔ تراب کے دو شعر سنیے:

رہِ طلب میں اب اپنا نشاں نہیں ملتا
نہ جانے آئے تھے ہم کس کی جستجو کے لیے
کہیں کشش کہیں مرکز کہیں نمو کہیں عشق
ہزار نام ہیں اک حرفِ آرزو کے لیے

ثریا ناہید اور ثریا فخری پاکستان کی دو معروف شاعرہ ہیں ــــ ثریا ناہید اپنے وجد آفریں ترنم کی وجہ سے اور ثریا فخری اپنے اشعار کے باعث ــــ ثریا فخری کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

نہ جنوں کے ولولے ہیں، نہ خرد کے مرحلے ہیں
میں کہاں بھٹک رہی ہوں تری بزم سے نکل کے

رفیق خاور کا یہ شعر سنیے:

تیرے دیوانے گھڑی بھر کو جو سو جاتے ہیں
زندگی پھر کوئی زنجیر ہلا دیتی ہے

قابل اجمیری مادی دنیا اور جسم کی قبولیت کے قائل ہیں۔ جسم کو قبول کرنے میں اذیت بھی اٹھانی پڑتی ہے لیکن جینے کی اذیت بذات خود سرشاری ہے بلکہ یہ وہ زخم ہے جو اپنا مرہم خود ہے۔ لیجیے اُن کے دو شعر پڑھیے:

حیرتوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آ گئے
ہم نظر تک چاہتے تھے، تم تو جاں تک آ گئے
اُن کی آنکھوں میں ستارے اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے

شعیب حزیں کی غزلوں کے یہ دو شعر بے حد پسند کیے گئے:

لالہ و گل سے قلب و جگر تک جو ہے چاک گریباں ہے
آگ لگا دو موسم گل کو، یہ بھی کوئی بہاراں ہے

اظہار الم ، لب اور زبان ، اشک اور فغاں کی بات نہیں
دل آپ صدا دے جاتا ہے ، قولِ دگراں کی بات نہیں

بشیر الحق بشیر بزرگ شاعر ہیں اور شاید پاکستان میں داغ سکول کے واحد نمائندے ہیں لہٰذا اُن کی غزل کے ساتھ مشاعرہ اختتام کو پہنچا ۔ دو شعر یہ ہیں :

ایک جھلک دکھا گیا اور چلا گیا کوئی
بزمِ سکونِ قلب میں حشر اُٹھا گیا کوئی
بارگہِ جمال میں سجدہ کہاں کہاں رہے
نقش قدم سے جا بجا کعبہ بنا گیا کوئی[1]

یکم اپریل ۱۹۵۶ء کو سٹیشن ہیڈ کوارٹرز کوئٹہ کے زیر اہتمام پریکیڈنٹ سکول کوئٹہ چھاؤنی کے ہال میں ایک پُر رونق مشاعرہ منعقد ہؤا تھا ۔ یہ مشاعرہ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر اور ایران کے فاضل بزرگ علامہ سعید نفیسی (مرحوم) کے اعزاز میں ہؤا ۔ انھوں نے خود ہی صدارت فرمائی ۔ چھاؤنی کے فوجی شاعروں کے علاوہ شہر کے چیدہ چیدہ شاعر جیسے ملک محمد صادق شاذ ، آغا صادق ، خلیل صدیقی ، شفق اور ماہر افغانی بھی شریکِ محفل تھے ۔

مشاعرہ شام کے پانچ بجے سے سات بجے تک جاری رہا ۔ ہر اچھے شعر پر تحسین و آفرین کی صدا بلند ہوتی تھی ۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی (ایران میں پاکستان کے سابق پریس اتاشی اور مجلہ 'ہلال' کراچی کے مدیر) نے ، جو استاد سعید نفیسی کے ہمراہ آئے ہوئے تھے ، ایک طویل عرصے کے بعد اپنا فارسی اور اردو کلام سنایا ۔ سامعین خواجہ صاحب کو سٹیج پر دیکھ کر مسرور ہوئے ۔

شاذ صاحب کے اس شعر پر حاضرین جھوم اُٹھے اور خوب داد دی ۔[2]

دو روزہ زندگی ہے مری کائنات شاذ
اور اس پہ دے دیا ہے غمِ دو جہاں مجھے

۱- ''لاہور'' (ہفت روزہ) ، لاہور ، ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء ۔
۲- پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ اپریل ۱۹۵۶ء ۔

ماہر افغانی کی دو نظمیں 'نغمہ' اور 'خط' بہت زیادہ مقبول ہیں[1]۔ اُن کی فرمائش اکثر مشاعروں میں کی جاتی ہے اور سامعین دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ لگے ہاتھوں آپ بھی 'نغمہ' (جس کی شان نزول صرف ایک ترنگ خیال ہے) سے لطف اندوز ہو جائیے :

اے شمیم نفس و جان نسیم سحر و مشک بجاں قند دہاں باد صبا جان بہار
اے دم روح و دماغ و نظر و حسن بہار چمن قلب و جگر ساغر جانان بہار
محفل نازک افکار حسیں بزم اشارات و کنایات فسوں ساز جوانی ہے تری
اے خمار نگہ و کیف و سرور نظر مست گر شاعر رنگین خوش آواز گلستان بہار
ترے ہونٹوں سے وہ پھوٹا ہؤا اک نغمۂ شیرین و دل آویز و خوش آواز ہوں میں
جیسے گاتی ہے کف گل پہ دم صبح اچھلتی ہوئی شبنم صفت جوئے خوش الحان بہار
آ میری روح میں آ اور اُٹھا پھر وہی اک نغمۂ خوش کیف دل آرا و جواں ساز خرام ہستی
جو کہ گایا تھا کبھی پہلے سر انجمن غنچہ و گل میں نے دم رخصت خاصان بہار
دیکھ کس رنگ سے کس ڈھنگ سے مخمور ہوئے نغمہ زن و نغمہ نوا نغمہ سرا نغمہ طراز
ماہر مست ہے سردار شباب و خم پیمانہ و شہزادۂ میخانہ و سلطان بہار

مشاعرہ بحیثیت مجموعی دلچسپ رہا۔

۱۹۵۶ع کے وسط میں کوئٹے میں ریڈیو سٹیشن قائم ہؤا۔ اس کے کارپردازوں میں سے چند علم دوست حضرات کی کوششوں سے یہاں حلقۂ ارباب ذوق کی شاخ بھی قائم ہو گئی۔ کے جی علی ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ، نصیر ناصر اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ اور مسعود قریشی پروگرام پروڈیوسر ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے بڑے ذوق و شوق اور سرگرمی سے کام کیا اور شہر کے قریباً تمام ادیبوں اور شاعروں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ کوئٹے میں غالباً یہ اپنی قسم کا واحد ادارہ تھا جس میں بڑی دلچسپی لی گئی[2]۔

۱- الاسلام، کوئٹہ، ۲۸ اگست ۱۹۴۸ع۔
۲- روداد حلقۂ ارباب ذوق، کوئٹہ، از اقبال سلطان — بقول رشید نثار:
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

حلقۂ ارباب ذوق کا طریق کار یہ تھا کہ ہر جمعہ کو ساڑھے تین بجے بعد از دوپہر ٹاؤن (میونسپل) ہال کوئٹہ میں ایک نشست منعقد ہوتی تھی - پورے ایک مہینے کی چاروں مجلسوں کا پروگرام پہلے ہی شائع ہو جاتا تھا - ایک نشست میں ایک افسانہ یا مضمون اور ایک نظم یا غزل کا پروگرام ہوتا تھا - افسانہ نگار اپنا افسانہ خود پڑھ کر سناتا اور حاضرین اس پر باری باری اپنی رائے کا اظہار کرتے - اس کے موضوع ، تکنیک اور زبان وغیرہ پر تنقید ہوتی ، بحث ہوتی اور افسانہ نگار کو بھی تنقید کا جواب دینے یا بحث میں حصہ لینے کا موقع دیا جاتا - افسانے یا مضمون کے بعد کوئی غزل یا نظم پیش کی جاتی اور اس پر بھی اسی طرح بحث و تنقید کی جاتی - یہ نشست عام طور پر دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی -

مقامی حلقۂ ارباب ذوق کے پہلے سیکرٹری ابو یوسف قاسمی[1] تھے - وہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

''جلیل کریر اور مسعود قریشی کی تجویز پر حلقۂ ارباب ذوق کا قیام عمل میں لایا گیا -'' وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''اس نیک مقصد کے لیے وہ خود اور ابو یوسف قاسمی ، مسعود قریشی ، حکیم نصیر شادانی ، ابن حنیف ، نصیر ناصر ، رشید الحق اکٹھے ہوئے - اس کے اجلاس پہلے جناب مسعود (مالک علی گڑھ بک سٹال) جلیل کریر اور رشید الحق کی قیام گاہوں پر منعقد ہوئے ، پھر چھاؤنی کے ایگزیکٹو آفیسر (عمر فاروق) کی مساعی سے میونسپل ہال مل گیا -'' (ادبی جمود کی ایک مثال ، رشید نثار ، قندیل لاہور ، ۱۲ جولائی ۱۹۶۲ع) -

۱- آپ کے والد شیخ محمد ابراہیم بلوچستان کے مختلف مقامات پر بہ سلسلۂ ملازمت پینتیس سال رہے - آپ لورا لائی میں پیدا ہوئے - سبی ، فورٹ سنڈیمن اور کوئٹہ میں تعلیم پائی - گورنمنٹ سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ سے ۱۹۳۵ع میں میٹرک فسٹ ڈویژن میں پاس کیا - لاہور کے کالجوں میں تعلیم پائی - اسلامیہ کالج لاہور میں جناب پروفیسر حمید احمد خاں (وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے ان کے ادبی ذوق کو مہمیز لگائی - آپ لاہور میں حلقۂ ارباب ذوق اور حلقۂ ارباب علم سے بھی متعلق رہے -

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بڑے ان تھک اور محنتی کارکن تھے۔ خود بھی افسانے اور ڈرامے وغیرہ لکھتے تھے اور نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کی کوششوں سے یہاں نئی صلاحیتیں دریافت ہوئیں اور اکثر نوجوان حلقے کے اجلاسوں میں شرکت کرنے اور اس کے پروگراموں میں حصہ لینے لگے۔

حلقے کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً جو ادیب اور شاعر حصہ لیتے رہے ہیں اُن میں محشر رسول نگری، صادق شاذ، آغا صادق، ارشد امروہوی، اثر جلیلی، صادق نسیم، آغا غوث، حکیم نصیر شادانی، اخگر سہارنپوری، رشید نثار، تراب، ناز، خلیل صدیقی، سعید احمد رفیق، سید خلیل، محمد اسلم قریشی، اقبال سلطان، ماہر افغانی، ثریا فخری، بیگم خورشید مرزا اور ریڈیو کے کار پردازان کے نام قابل ذکر ہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری اور شاہد احمد دہلوی مرحوم بھی حلقے کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور ان کی صدارت میں یہ اجلاس منعقد ہوئے۔

۲۵ اپریل ۱۹۵۸ع کو حلقے نے یوم اقبال کی تقریب منائی جس کی صدارت ایران کے کوئٹہ میں مقیم قونصل جنرل آقای افراسیاب نوائی نے کی۔ یہ جلسۂ عام گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے ہال میں منعقد ہوًا۔ دو نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ پہلی نشست میں اقبال سلطان (اقبال کا فلسفۂ موت) اور مولانا عبد الکریم وغیرہ نے مقالات پڑھے۔ دوسری نشست میں محفل مشاعرہ آراستہ کی گئی جس میں مقامی شعرا نے حصہ لیا۔ محترمہ پروین فنا سب سے پہلے اسی مشاعرے میں شامل ہوئی تھیں۔ اُن کا کلام تین چار دفعہ سنا گیا۔ یہی حلقہ اُن کی شہرت دوام کا باعث بنا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

ہفت روزہ 'چٹان' لاہور میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ع میں ملازمت کے سلسلے میں اُسی سر زمین (کوئٹہ) میں پہنچے جہاں کا خمیر تھا۔ جون ۱۹۵۸ع میں لاہور آ گئے۔ دو کتابیں (افضل حق اور زہر خند) عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔

[ابو یوسف قاسمی کے خطوط (۱۸ اگست اور ۲۰ اگست ۱۹۶۷ع) راقم الحروف کے نام]۔

جون ۱۹۵۸ع میں ابو یوسف قاسمی تبدیل ہو گئے اور اُن کی جگہ اقبال سلطان نے لے لی ۔ رشید نثار لکھتے ہیں : ''اقبال سلطان نے حلقے کو بطریق احسن چلایا ۔ مقامی انجمنوں کی عصبیت نے ادب کے آبگینے کو چٹخا دیا جس سے اقبال سلطان مستعفی ہو گئے اور قرعۂ فال بنام صادق نسیم نکلا ۔ انھوں نے اپنی سیکرٹری شپ کے عرصے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا (اُن کا کارنامہ یوم پطرس تھا) لیکن حلقہ یک رُخہ ہو گیا تھا ۔ چنانچہ حلقے میں بیرونی اثرات زیادہ دخیل ہوتے گئے اور حلقہ بتدریج رو بہ زوال ہوتا گیا ۔''۱

۱- ''ادبی جمود کی ایک مثال'' رشید نثار، قندیل لاہور ، ۱۲ جولائی ۱۹۶۴ع صفحہ ۲۰ ۔

یوم پطرس زیر صدارت کمشنر کوئٹہ ڈویژن منایا گیا ۔ سب سے پہلے رشید نثار نے تازہ ترین قطعات سنا کر حضورِ پطرس میں خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ دو قطعے یہ ہیں :

چھن چکی ہے لبوں سے طنّازی　　پھبتیاں ہیں نہ تیز گفتاری
موت نے لوٹ لی متاع حیات　　ایک ہی زخم ! اس قدر کاری

اب ریاض سخن کی نکہت کو　　زندگی کا نقیب ترسے گا
شعر و انشا کی کونپلوں کو مدام　　اس چمن کا ادیب ترسے گا

پھر صادق نسیم نے ایک مقالہ ''پطرس سے ایک ملاقات'' اور آغا صادق نے فارسی کی ایک نظم کی صورت میں خراج ارادت پیش کیا ۔

کے جی علی نے اپنی ملازمت کے دوران کے تعلقات اور گزشتہ واقعات کا ذکر کیا ۔ شیخ عمر فاروق نے زمانۂ طالب علمی کی یادوں پر مشتمل ایک تقریر فرمائی ۔ پروفیسر خلیل صدیقی نے پطرس کے منفرد اسلوبِ بیان و مزاح پر تقریر کی ۔ آقائے افراسیاب نوائی (ایرانی قونصل) نے فارسی میں پطرس کو خراج تحسین پیش کیا ۔ کمشنر صاحب نے کچھ زمانۂ طالب علمی کے واقعات قریب ماضی میں ملا کر خطبۂ صدارت کے رنگ میں بیان فرمائے ۔ پھر پطرس مرحوم کے متعلق ایک لطیفہ بھی سنایا ۔ فرمانے لگے :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بعد میں انفارمیشن کے جمیل الزمان کی تحریک پر اقبال سلطان نے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا - بہر حال کہا جاتا ہے کہ جو معیارِ تنقید حلقۂ ارباب ذوق نے قائم کیا تھا وہ وادیٔ شال میں کسی اور ادارے کو نصیب نہ ہوا -

اس حلقے کے مقاصد یہ تھے :

۱- حلقہ کسی گروہ کا غلام نہیں بنے گا

۲- ادب کے حصول میں کسی نظریے ، عقیدے میں امتیاز نہیں برتا جائے گا

۳- کسی شخصیت اور اُلجھن سے حلقہ خائف نہیں ہوگا

۴- فن کے فرقِ مراتب کا لحاظ رکھا جائے گا اور ادب میں مادی وسائل سے اجتناب برتا جائے گا -

۵- زبان ، علم ، ادب کی ترویج ، شعر و ادب کی تخلیق ، صالح تنقید اور ثقافتی زندگی کے نشو و نما کی حوصلہ افزائی کی جائے گی

ان اصولوں پر حلقہ کاربند رہا - حلقے نے مقامی ثقافت کو بھی اپنایا -[۱] حلقے نے بلوچ ، براہوئی ، پنجابی ، سندھی ، پشتو اور بنگالی ادیبوں کو ایک

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

"بخاری صاحب نے دہلی میں ایک دعوت کا انتظام کیا جس میں خواجہ حسن نظامی بھی شریک تھے - اُنھوں نے ایک باریش بزرگ کو دیکھا جو نہایت ہی خاموش بیٹھے ہوئے تھے - خواجہ صاحب نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں ؟ اُن صاحب نے جواب دیا "خواجہ صاحب ! آپ نہیں جانتے ؟ یہ بخاری صاحب کے والد ماجد ہیں -"
خواجہ حسن نظامی بولے "تو اچھا ! یہ 'صحیح بخاری' ہیں !"——اس لطیفے کے قہقہوں نے مجلس برخاست کر دی -

(ہفت روزہ لاہور ، لاہور ، ۵ جنوری ۱۹۵۹ع)

۱- اس سلسلے کی پہلی کوشش "ہانی شاہ مرید" ڈرامے کی تخلیق تھی -

پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ مختلف صوبوں میں بسنے والے لوگ اپنے تمدنی عناصر سے آشنا ہو سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آنے کے بعد اُن میں مشترکہ تمدن کا احساس پیدا ہو جائے، جو قوم و ملک کی بقا اور پیش رفت کے لیے نہایت ضروری ہے ۔ حلقۂ ارباب ذوق کوئٹہ کا ہر اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتا تھا ۔ اس کے بیشتر اجلاس قابلِ رشک حاضری کے حامل ہوتے تھے ۔

۱۹۵۷ء میں کوئٹہ کی تاریخ میں پہلی بار رحمان بابا کی یاد میں عظیم الشان اجتماع ہوا ۔ رحمان بابا انسانیت کا شاعر تھا ۔ اس کا مسلک خدا کی مخلوق سے عشق تھا ۔ اس کا انتظام ''پشتو ادبی ٹولنہ'' نے کیا تھا ۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبد الحمید خاں کاکڑ کی صدارت میں پشتو اور اُردو کا کامیاب مشاعرہ بھی ہوا ۔ بلوچستان سے باہر کے بعض شعرا (قابل اجمیری، حافظ ذاکر دہلوی وغیرہ) نے بھی اس میں شرکت کی ۔ اجتماع مختلف زبانیں بولنے والوں پر مشتمل تھا ۔ اس یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ''پشتو ادبی ٹولنہ'' کے جنرل سیکرٹری مسٹر سلطان محمد صابر نے تین زبانوں پشتو، فارسی اور اُردو میں اپنی غزل سے سامعین کو خورسند کیا ۔[1]

۱۹۵۷ء کے وسط میں کوئٹے میں پنجاب یونیورسٹی پریس کلب (شعبۂ صحافت دانش گاہ پنجاب لاہور) کی ایک شاخ بھی قائم کی گئی جس کے مقاصد کلب کے ممبران کے مابین سماجی اور تمدنی تعلقات استوار کرنا، لیکچر، سیمینار اور سمپوزیم کا اہتمام کرنا، صحت مند صحافت کے ارتقا کے لیے کوشاں رہنا وغیرہ وغیرہ تھے ۔ اس کے صدر چودھری عطا محمد پرنسپل گورنمنٹ کالج، سیکرٹری پروفیسر انعام الحق کوثر اور مس ثریا فخری خاتون نائب صدر تھیں ۔[2]

یہ کلب قریباً دو سال تک مفید کام کرتی رہی ۔ بعد ازاں مرکز میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پھر یہاں بھی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری

۱- ہلال، کوئٹہ، ۳ اپریل ۱۹۵۷ء ۔
۲- ڈان، کراچی، ۱۷ جون ۱۹۵۷ء ۔ ٹائمز آف کراچی، کراچی، ۱۷ جون ۱۹۵۷ء ۔ جنگ کراچی ۱۸ جون ۱۹۵۷ء ۔

نہ رہ سکیں ۔ اس میں مقامی اخباروں اور قومی اخباروں کے نمائندے بھی شامل ہوئے تھے ۔ مرکز کے سات شائع کردہ پمفلٹ بڑی دلچسپی سے زیر مطالعہ رہے ۔ کلب کے جلسوں میں جو مقالے بہت زیادہ پسند کیے گئے، اُن میں پروفیسر انور رومان کا مقالہ ''مصر ــــ قدیم اور جدید''[1] اور پروفیسر اعجاز حسین کا مقالہ ''امریکہ میں صحافت'' شامل ہیں ۔

۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو کوئٹے میں بزم ثقافت قائم ہوئی ۔[2] اس کے صدر سید دربار علی شاہ (ایڈیشنل کمشنر) اور سیکرٹری امیر عثمان (ڈپٹی ڈائرکٹر قبائل نشر و اشاعت کوئٹہ) تھے ۔ اس بزم نے جہاں علاقائی ادب اور ثقافت کے فروغ کے لیے کام کیا ، وہاں قومی مسائل سے بھی اغماض نہیں برتا ــــ دو کتابیں شائع کی ہیں (جن کا آگے ذکر آئے گا) ۔ اس کے صدر کے جی علی (ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ) بھی رہے ۔

تین مرتبہ یوم اقبال شایان شان طریقے سے منایا گیا :

۱- ۲۱ اپریل ۱۹۶۲ء کو جن صاحبان نے مقالے پیش کیے اُن میں سعید احمد رفیق (اقبال اور فلسفۂ عشق) نذیر احمد بھٹی (اقبال اور نوجوانانِ ملت) ، ڈاکٹر مس کنیز یوسف (عورت اور اقبال) اور انعام الحق کوثر (اقبال اور قومیت) شامل تھے ۔ اس کی صدارت خان سرور خان کمشنر نے کی ۔

۲- ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء ــــ اس جلسے میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر (اقبال اور اجتہاد) ، بیگم آثم ملک (نظریۂ تعلیم اور اقبال) اور مولانا عبد الکریم (اقبال اور ملی اتحاد) وغیرہ نے نمایاں حصہ لیا ۔ اس محفل کی صدارت انور عادل کمشنر نے فرمائی ۔ بزم موسیقی کا بھی اہتمام تھا ۔[3]

۳- ۲۱ اپریل ۱۹۶۴ء ــــ اس میٹنگ میں میاں بشیر احمد ، (ترکی میں پاکستان کے سابق سفیر) اور پرنسپل کرار حسین نے اہم حصہ لیا ۔

ان دنوں بزم ثقافت کے کرتا دھرتا نور محمد پروانہ ایڈیٹر ''ایلم'' ہیں ۔

۱- یہ مقالہ روزنامہ امروز لاہور میں شائع بھی ہوا تھا ۔

۲- نعرۂ حق ، کوئٹہ ، ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء ۔

۳- زمانہ ، کوئٹہ ، ۲۲ اپریل ۱۹۶۳ء ۔

ن کا ارادہ ہے کہ اُردو میں ایک اور کتاب شائع کرائیں جس میں اس
خطے کی لوک کہانیاں اور لوک گیت ہوں ۔ دیکھیں یہ خواب کب
شرمندۂ تعبیر ہو ۔

۱۹۵۹ء میں رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ مرکزی کمیٹی کراچی نے کوئٹہ کے چار ادیبوں : ثریا فخری ، آغا صادق ، سید خلیل احمد اور صادق نسیم کو کنوینر نامزد کیا ۔ یہاں رائٹرز گلڈ کی شاخ قائم تو ہوگئی جس کے سیکرٹری سید خلیل احمد تھے ، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر کوئی خاطر خواہ کام نہ ہوسکا ۔ ۱۹۶۵ء میں دوبارہ اس شاخ کو زندہ کیا گیا اور سردار نقوی[1] اس کے سیکرٹری چنے گئے ۔

رائٹرز گلڈ کی تنقیدی نشستوں میں شہر کے مختلف ادیب اور شاعر شریک ہوتے رہے ہیں جن میں اثر جلیلی ، عابد رضوی ، زاہد نقوی ، آغا غوث ، آغا صادق ، سعید الحسن ، یونس واسطی ، رضی عزیزی ، ریاض قمر ، ساقی الحسینی اور رشید احمد قابل ذکر ہیں ۔ طرحی مشاعروں میں محشر رسول نگری ، امتیاز حسین حنفی ، اثر جلیلی ، مقبول رانا اور دوسرے مقامی شعرا شرکت کرتے رہے ہیں ۔ گلڈ کے زیر اہتمام یوم اقبال ، یوم حالی اور یوم کیانی[2] کے جلسے بھی منعقد ہو چکے ہیں ۔ علاوہ ازیں گلڈ کے زیر اہتمام باہر سے آنے والی ادبی شخصیتوں کے ساتھ نشستیں بھی ترتیب دی گئیں ۔ انور عنایت اللہ ، ریاض انور اور صادق الخیری کے ساتھ باقاعدہ شامیں ترتیب دی گئیں ۔

۱- سردار نقوی گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں لیکچرار ہیں ۔ غزل کے علاوہ آپ نے قومی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں ۔ ایک طویل نظم میں پلاسی کی جنگ سے لے کر آج تک کی برصغیر کی تاریخ کو سمویا ہے ۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو مجلس فارسی گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے جلسے میں شہنشاہ ایران کے جشن تاجپوشی کے سلسلے میں ایک قصیدہ پیش کیا تھا جو اُردو میں تھا ۔

۲- صدارت کے فرائض جناب پروفیسر کرار حسین ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج کوئٹہ نے ادا کیے ۔ آپ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء تک کوئٹہ میں مقیم رہے ۔ وادیٔ شال کی علمی سرگرمیوں میں ممتاز حصہ لیتے رہے ۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ۱۹۵۶ع میں کوئٹہ میں ریڈیو سٹیشن قائم ہؤا - یہ سٹیشن بلوچی، براہوئی، پشتو اور فارسی ادب کی نشریات کے علاوہ اُردو نشریات سے قومی زبان کی قابل قدر خدمت سر انجام دے رہا ہے - اس خطے کے اہل قلم حضرات کو اظہار خیال کا موقع تقاریر اور تمثیلات کے ذریعے ملتا رہتا ہے - مقامی شعرا میں سے بعض کا کلام ریڈیو فن کار نشر کرتے ہیں -

ریڈیو پاکستان کوئٹہ کُل پاکستان مشاعرے اور مقامی مشاعرے بھی نشر کرتا ہے - قومی تقاریب اور مشاہیرِ اُردو مثلاً حالی، غالب اور اقبال وغیرہ کے یوم وفات کے موقعوں پر خاص پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے - یوں تو اب تک متعدد مشاعرے ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے نشر ہو چکے ہیں لیکن بمصداق مشتے نمونہ از خروارے ۱۹۵۸ع میں یوم جمہوریہ کی تقریب پر جو ریڈیائی مشاعرہ نشر ہؤا تھا، اُس کی مختصر روداد پیش کی جاتی ہے -

یہ مشاعرہ ٹاؤن ہال کوئٹہ میں، زیرصدارت ایڈیشنل کمشنر کوئٹہ ڈویژن غلام سرور خاں منعقد ہؤا اور اس میں مقامی شعرا کے علاوہ بعض معروف بیرونی شعرا نے بھی شرکت کی -

مشاعرے کے آغاز کا وقت نو بج کر بیس منٹ پر تھا لیکن ہال کے باہر سامعین و شائقین کا جم غفیر ساڑھے آٹھ بجے ہی سے تھا - آغاز مشاعرہ کا اعلان ہوتے ہی محشر سیوہاروی مائک پر تشریف لائے - اُن کا یہ شعر پسند کیا گیا :

نہ چھیڑ تذکرۂ عظمت و جلال کہ ہم
زمیں پہ رہ کے ترے آسماں سے گزرے ہیں

اخگر سہارنپوری نے اپنے خاص ترنم میں اپنی معروف غزل سنائی جسے اہل کوئٹہ پہلے بھی سننے کا شرف حاصل کر چکے تھے - تراب گوالیاری کا ایک شعر سماعت فرمائیے :

درد سا اُٹھتا ہے کیوں نامِ محبت سن کر
کیا ابھی حوصلۂ ترکِ وفا باقی ہے ؟

تراب کے بعد 'نغمہ' اور 'ایک خط' کے لیے مشہور شاعر ماہر افغانی نے

غزل کی بجائے رباعیات ہی عطا کیں ۔ آپ کے بعد اثر جلیلی نے ایک جاندار غزل پیش کی ۔ ایک شعر تھا :

نفس کے ساتھ ہؤا ختم مرحلہ دل کا
یہ انتظار کی حد ہے کہ انتظار نہیں

صادق شاذ نے مشاعرے کے لیے اس تقریب کے مطابق نظم پڑھی جس کا مطلع تھا :

اے اہلِ وطن ! ہو تمھیں دستور مبارک
یہ عزمِ مساوات کا منشور مبارک

ارشد امروہوی نے علامہ اقبال کی ایک نظم پر تضمین پیش کی ۔ آغا صادق کی تازہ غزل بھی تقریب کے مفہوم سے ہم آہنگ تھی ۔ دو شعر یہ تھے :

نئی سحر پہ بہت ناز ہے زمانے کو
نئی سحر تو ہماری نظر سے پھوٹی ہے
بہار ہے کہ بہاروں کا پیش خیمہ ہے
ابھی تو ایک ہی کونپل شجر سے پھوٹی ہے

شعیب حزیں کی غزل خوب پسند کی گئی ۔ دو شعر سنیے :

عرش تک عشق کے نالوں کا گزر ہے اب تک
آسمانوں کو زمینوں کی خبر ہے اب تک
نشۂ سوز نہ ٹوٹا نگہِ لطف سے بھی
لذتِ درد بہ اندازِ دگر ہے اب تک

آپ کے بعد محترمہ ثریا فخری میدانِ شعر و سخن میں اُتریں ۔ ایک شعر یہ تھا :

مرے ضبطِ غم سنبھل جا کہ اُبھر رہے ہیں پھر سے
وہ مٹی مٹی سی یادوں کے نقوش ہلکے ہلکے

ان کے بعد حمایت علی شاعر مائک پر آئے ۔ اُن کے یہ دو شعر زیادہ داد لے گئے :

تو بھی محدود نہ ہو ، مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدا را غمِ حاصل نہ بنا

عبدالعزیز فطرت کی غزل کے دو شعر یہ تھے :

ہر نفس دامِ ہوس ہے مجھے معلوم نہ تھا
زندگی ایک قفس ہے مجھے معلوم نہ تھا
آپ کے حسنِ سماعت کا ہے احسان ورنہ
میری باتوں میں بھی رس ہے مجھے معلوم نہ تھا

ضیا جعفری کی پُر کیف غزل کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے :

یہ شبنمی سا بدن پیرہن کے سایے میں
کہ جیسے چاند کسی جھیل میں اُتر آئے

راز مراد آبادی نے ایک پھڑکتی ہوئی غزل عطا کی ۔ اس کے یہ شعر سماعت فرمائیے :

لالہ فروش خونِ شہیداں ہے آج کل
کہتے ہیں لوگ جشنِ چراغاں ہے آج کل
دورِ جنوں ہے وقتِ بہاراں ہے آج کل
دامن کی وسعتوں میں گریباں ہے آج کل
برپا ہے چشمِ ناز میں اک حشرِ التفات
اپنی جفا پہ کوئی پشیماں ہے آج کل
یا رب ! متاعِ دردِ محبت کی خیر ہو
پھر چشم ناز سلسلہ جنباں ہے آج کل

کیپٹن ضمیر جعفری کو منہ کا مزہ بدلنے کے لیے بلوایا گیا ۔ دیکھیے کیسا بے داغ مزاح ہے :

کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر بُلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خدا کے نام پر کھنچوائی جاتی ہے
پکڑ کے بھیجی جاتی ہے ، جکڑ کے لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ پھر بھی اس میں موٹر پائی جاتی ہے

قابل اجمیری کی تازہ غزل کے دو شعر سنیے :

عشق کے دیدۂ بیدار پہ کیا گزری ہے
خود ترے کاکلِ رخسار پہ کیا گزری ہے
قافلے منزلِ مقصود تک آ پہنچے ہیں
اہتمامِ رسن و دار پہ کیا گزری ہے

اہتمامِ رسن و دار پہ جو گزرنا مقدر تھا ، گزر چکا تو ادیب سہارنپوری کو زحمت دی گئی ۔ انھوں نے اپنے مخصوص ترنم میں جو غزل الاپی ، اس کے تین شعر یہ ہیں :

رہے عمر بھر وہ برہم یہی سوچتے رہے ہم
ہمیں آزما رہا ہے کوئی رخ بدل بدل کے
شبِ ماہ مختصر تھی مجھے ہائے کیا خبر تھی
کہ طلوع پھر نہ ہوگا مرا ماہتاب ڈھل کے
تری بزم کے چراغوں کا نیا ہی رنگ دیکھا
کوئی مشتعل ہے بجھ کے کوئی مطمئن ہے جل کے

ایرانی قونصل آقای افراسیاب نوائی نے ایک فارسی قصیدہ پڑھ کر مشاعرے کو رنگِ جدید عطا کیا ۔ اس پر سامعین کا اصرار بڑھا اور ایک مختصر سا فرمائشی پروگرام بھی چلا جس میں ماہر افغانی ، حمایت علی شاعر ، ضمیر جعفری اور ادیب نے قابل ذکر تاثر چھوڑا ۔ اس غیر ریڈیائی فرمائشی نشست میں بیگم رضیہ گل نیازی نے بھی حاضرین کو اپنے فارسی کلام سے نوازا ۔ اس پروگرام میں ضمیر جعفری کی مزاحیہ غزل کا ایک شعر یہ تھا :

ہر کسی سے کرب کا اظہار ، میں روزے سے ہوں
چھاپ دے اے کاش ڈان اخبار ، میں روزے سے ہوں

یہ مہکتی دمکتی بزمِ شعر و سخن رات کے بارہ بجے تک جاری رہی ۔[1] کوئٹے میں بعض صاحبان انفرادی طور پر بھی مشاعروں کا اہتمام

۱۔ ہفت روزہ ”لاہور“ لاہور ، ۱۴ اپریل ۱۹۵۸ء ، صفحات ۸—۹ ۔

کرتے رہتے ہیں جن میں کم و بیش سبھی حلقوں سے مختلف صاحبان شریک ہوتے ہیں ۔ اس سلسلے میں نثار احمد محشر رسول نگری ، ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ (جو حال ہی میں اللہ کو پیارے ہوئے) ، آغا صادق اور عیش فیروزپوری وغیرہ کے ہاں کی ادبی محفلیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۳ء کی ایسی ہی دو یادگار ادبی محفلوں کی کارروائی مختصر طور پر پیش کی جاتی ہے ۔

جولائی ۱۹۵۸ء میں محشر صاحب کے ہاں ایک ادبی مجلس ہوئی[1] جس کی صدارت نصیر ناصر نے فرمائی اور سیکرٹری کے فرائض حمید اعظمی نے انجام دیے ۔ شعرا نے اس ''طرح'' پر طبع آزمائی فرمائی :

ہم پہ لطف اُن کا بہ اندازِ دگر ہوتا رہا

جز پیامِ مرگ و پیغام فنا کچھ بھی نہ تھی
زیست کا مجھ کو گماں جس زیست پر ہوتا رہا
خشک ہو جائیں نہ آنکھیں پھر بھڑک اٹھے نہ دل
یوں ہی گر دامن مرا اشکوں سے تر ہوتا رہا (عنبر زیدی)

راستہ گو زیست کا دشوار تر ہوتا رہا
دل میں پختہ اور بھی عزمِ سفر ہوتا رہا
داستانِ شامِ غم بڑھتی رہی بڑھتی رہی
قصۂ صبحِ مسرت مختصر ہوتا رہا
(افضل کوئٹاوی)

زلفِ مشکیں کا اثر شام و سحر ہوتا رہا
جلوۂ رخ سے درخشاں بام و در ہوتا رہا

۱۔ نعرۂ حق ، کوئٹہ ، ۲۴ جولائی ۱۹۵۸ء ۔ کوئٹہ میں اردو ادب صفحہ ۲۰ ۔

چارہ گر مصروفِ درماں جس قدر ہوتا رہا
زندگانی کا فسانہ مختصر ہوتا رہا (پیامی)

اہتمامِ وسعتِ قلب و نظر ہوتا رہا
زندگی بھر امتحانِ چشمِ تر ہوتا رہا
ہر نفس میں جل اٹھیں گے تیری یادوں کے چراغ
گر یوں ہی اے دوست فیضانِ نظر ہوتا رہا (عقیل)

عشق کی منزل سے آگے بھی سفر ہوتا رہا
جذبۂ شوقِ محبت معتبر ہوتا رہا
ماہ و انجم زخمِ نظارہ ہیں ان کے واسطے
جن کو کچھ ادراکِ دستورِ سحر ہوتا رہا (رشید نثار)

لاکھ عالم، ہم نے مانا، پُر خطر ہوتا رہا
راہ و منزل سے مگر واقف بشر ہوتا رہا
ہو گی یہ دنیا کسی کے واسطے جنت نشاں
میں تو نذرِ گردشِ شام و سحر ہوتا رہا
(مشتاق راہی)

ایک ہنگامہ تری تائید پر ہوتا رہا
دل دھؤاں دیتے رہے رقصِ شرر ہوتا رہا
ہم سے قائم ہے جہاں میں عظمتِ انساں تراب
ہم ہیں جن سے امتیازِ خیر و شر ہوتا رہا (تراب)

عاشقی میں جرأتِ عرضِ تمنا تھی محال
پردہ دارِ شوق خود ہی پردہ در ہوتا رہا

اب سے پہلے تو نہ تھا یہ شہر خوباں کا رواج
جور وہ کرتے رہے، رسوا اثر ہوتا رہا (اثر جلیلی)

ہر نفس وہ رنگِ نو سے جلوہ گر ہوتا رہا
اک نیا احسان نگاہِ شوق پر ہوتا رہا
شوقِ نظارہ حزیں یوں معتبر ہوتا رہا
دل ہم آہنگِ تقاضائے نظر ہوتا رہا
(شعیب حزیں)

شوقِ منزل آپ اپنا راہبر ہوتا رہا
جو قدم اٹھا چراغِ رہگزر ہوتا رہا
اہلِ حق تھے کون صادق اہلِ باطل کون تھے
فیصلہ اس کا ہمیشہ دار پر ہوتا رہا (آغا صادق)

عشق اپنی جان دے کر معتبر ہوتا رہا
فیصلہ ہر مدعی کا دار پر ہوتا رہا
رات بھر دیکھا کیا چاکِ گریباں کو جنوں
چارۂ ظلمت بہ عنوانِ سحر ہوتا رہا
(محشر رسول نگری)

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں کوئٹہ کے مشہور وکیل جناب امتیاز حسین حنفی باقری کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں یہاں کے ہر مدرسہ فکر کے شعرا نے شرکت کی۔ اس کے صدر جعفری صاحب ایڈووکیٹ اور سیکرٹری اثر جلیلی تھے۔ انتخاب ملاحظہ فرمائیے[۱] :

سرِ منبر نہیں لگن تو سرِ دار سہی
کسی عنوان بھی اگر شرحِ جنوں ہو تو غلط

۱- نعرۂ حق، کوئٹہ، ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء ''ایک یادگار ادبی محفل''۔

جن سے بخشا تھا کبھی درد محبت تم نے
انھی نظروں سے میسر جو سکوں ہو تو غلط (محشر)

آنکھ تر ہو تو غلط ، اشک میں خوں ہو تو غلط
قرب سے بھی ترے حاصل جو سکوں ہو تو غلط (اثر جلیلی)

صرف اک بار نگاہِ غلط انداز سہی
پھر اگر مجھ کو تمنائے سکوں ہو تو غلط (رشید نثار)

مثلِ بو ، رنگ بھی محرومِ سکوں ہو تو غلط
چمنِ زیست کی ترتیب جو یوں ہو تو غلط
(عابد رضوی)

ہاتھ روکا جو ستم سے تو تغافل برتا
لطف ان کا مری حالت پہ جو یوں ہو تو غلط
(تراب گوالیاری)

سجدہ موقوف ہے معبودِ حقیقی کے لیے
اور کسی بت کے لیے سر جو نگوں ہو تو غلط (بشیر تمنا)

خود پرستی نہیں اے دوست خودی کا مفہوم
اپنے ہی در پہ جبیں تیری نگوں ہو تو غلط
(ضیا صدیقی)

کون یہ بات کہے ؟ کس کی قضا آئی ہے ؟
اب ترے شہر میں انساں کو سکوں ہو تو غلط (رفیق راز)

زندگی بھر اسی اک سوچ سے آگے نہ بڑھے
یوں اگر ہو تو غلط اور جو یوں ہو تو غلط

(قاسم نوری)

آگہی اور بڑھاتی ہے غمِ دل اے دوست
ہوش مندی میں میسر جو سکوں ہو تو غلط
شہرِ خورشید کو جاتا ہے بلا کیش عقیل
اب رہِ شوق میں حائل جو ستوں ہو تو غلط

(عقیل لودھی)

روشنی ہو کہ تپش، گریۂ غم ہو کہ دھؤاں
کسی صورت بھی عیاں سوزِ دروں ہو تو غلط
ختم کر دیں گے تو اک بار مگر مقتل میں
زندہ رہنے کے لیے سر جو نگوں ہو تو غلط

(ڈاکٹر مختار)

عشق کی چوٹ کا اظہار جو یوں ہو تو غلط
آنکھ سے شام و سحر بارشِ خوں ہو تو غلط
تیری سرکار سے بڑھ کر کوئی سرکار نہیں
مرا اور کسی در پہ نگوں ہو تو غلط

(ڈاکٹر حمید کاکڑ)

وہ بھی شرمندہ ہیں کچھ اپنے کیے پر اے دوست
اب مرے دل میں شکایت جو فزوں ہو تو غلط (فضا)

ایک یہ ہی تو نہیں کارگہِ حسنِ عمل
طرفِ صحرا ترا میدانِ جنوں ہو تو غلط
(ماہر افغانی)

کششِ سنگِ درِ یار تو مجبوری ہے
سرِ خود دار کہیں اور نگوں ہو تو غلط
(شاہد نقوی)

لطف تو جب ہے کہ سب عمر تڑپتے گزرے
فطرتِ عشق بہ اندازِ سکوں ہو تو غلط
جبکہ رونا ہی مقدر ہے تو دل کھول کے رو
ضبطِ گریہ سے جگر سینے میں خوں ہو تو غلط
(ارشد امروہوی)

ہوش نے رکھ دیے ہیں وقت کے سینے پہ قدم
عقل گھبرا کے جو مائل بہ جنوں ہو تو غلط (جعفری)

حافظ ضیا نے اپنے نعتیہ کلام سے سامعین کرام تک دین کا پیغام پہنچایا جس پر یہ محفل ختم ہوئی -

۱۹۵۵ء میں کوئٹہ چھاؤنی کے اعلیٰ حکام نے آل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کرایا - اس کے سیکرٹری تجمل حسین[1] تھے - اس میں تابش دہلوی ،

۱- آپ ان دنوں مغربی پاکستان کے محکمۂ خزانہ کے سیکرٹری ہیں - راقم الحروف کے نام اپنے خط (مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۶۷ء) میں لکھتے ہیں :
"میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کوئٹہ میں تھا - چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعت خالصہ ہائی سکول کوئٹہ سے پاس کی - یہی وہ زمانہ ہے جب مجھے اس زبان سے رغبت پیدا ہوئی تھی - پھر میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک کوئٹہ میں فنانشل ایڈوائزر اور ڈپٹی کنٹرولر تھا - اسی زمانے میں ہم نے
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جمیل الدین عالی، سحاب قزلباش، یوسف ظفر، قیوم نظر، شہرت بخاری، ادیب سہارنپوری، حبیب جالب، مختار صدیقی اور ضمیر جعفری نے شرکت فرمائی۔ مقامی شعرا میں سے عیش فیروز پوری، ماہر افغانی اور آغا صادق وغیرہ نے حصہ لیا۔

۱۹۵۷ء کے مشاعرے[1] میں حضرت جگر کے علاوہ اقبال صفی پوری، قابل اجمیری، ماہر القادری، تابش دہلوی اور ذاکر دہلوی شامل ہوئے تھے۔ اس کی صدارت معز الدین احمد کمشنر کوئٹہ ڈویژن نے فرمائی تھی اور آمدنی اردو کالج کراچی کے فنڈ میں دی گئی تھی۔

حافظ ذاکر دہلوی اور تابش دہلوی کا ایک ایک شعر علی الترتیب سنتے جائیے:

ہے نورِ بصیرت کا سہارا مجھے ذاکر
رہتے ہیں اُجالے مری بے نور نظر میں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

ایک نہایت شاندار مشاعرہ بھی کروایا تھا جس میں پاکستان کے ہر بڑے شاعر نے حصہ لیا۔ شعر کہنا سننا، حلقۂ ارباب ذوق کی محفلوں میں حصہ لینا مشاغل میں شامل تھا''۔

جناب جعفر طاہر اپر ٹوپہ مری ہلز سے لکھتے ہیں (خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء): ''راجہ تجمل حسین کی بدولت کوئٹہ میں یادگار ادبی اجتماعات ہوئے۔ اتنے بڑے اجتماعات پاکستان کے کسی بھی شہر میں نہیں دیکھے گئے۔ راجہ تجمل حسین نہ صرف ایک وجیہ و شکیل اور خوبصورت و دلنواز شخصیت ہیں بلکہ اُسی پیمانے پر ایک خوشگو شاعر، انتہائی فیاض اور بے لوث ادب پرور افسر ہیں۔ انھوں نے کوئٹہ میں پاکستان کے ہر بڑے شاعر کو اپنے مشاعروں میں بلوایا اور داد و دہش کے ڈونگرے برسا برسا کر ان خشک چٹانوں اور اُجاڑ پہاڑوں کے کفن پوش میدانوں کو علم و ادب کے پھولوں سے گلزار ارم بنا دیا۔ ''قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم'' ان ہی کے متعلق غالب نے کہا تھا''۔

۱۔ ساربان، مستونگ: ۵ ستمبر ۱۹۵۷ء۔

اُن کے غم کو کیوں اپنایا ، درد کو اپنا سمجھا کیوں
اتنی بات پہ گردشِ دوراں مجھ سے برہم آج بھی ہے

یکم ستمبر ۱۹۵۷ع کو گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے ہال میں پریس کلب کوئٹہ کی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی جس کے پہلے صدر معز الدین احمد اور بعد میں زیڈ اے بخاری تھے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (صحافت اور اس کی ذمہ داریاں) ، ماہر القادری (ادب کیا ہے ؟) اور میجر آفتاب حسن (اُردو ذریعۂ تعلیم) نے اپنے خیالات پیش کیے تھے ۔

۱۲ اگست ۱۹۶۲ع کو نمائش کا آل پاکستان مشاعرہ زیر صدارت سید ذوالفقار علی بخاری منعقد ہوًا ۔ جن بیرونی شعرا نے اس میں شرکت کی اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

حفیظ اثر ، رضا ہمدانی ، فارغ بخاری ، خاطر غزنوی ، محسن احسان ، احمد فراز ، کوکب تبریزی ، اصغر سودائی ، قتیل شفائی ، ناصر کاظمی ، شہزاد احمد ، صوفی تبسم ، احمد ندیم قاسمی ، حمایت علی شاعر ، ادیب سہارنپوری ، ظریف جبل پوری اور سید محمد جعفری ۔ اس مشاعرے کے منتظم صادق نسیم تھے ۔

اگست ۱۹۶۳ع میں ریلوے اکاؤنٹس اکیڈمی کوئٹہ نے مشاعرے کا اہتمام کرایا ۔ صدر تھے جناب محمد شعیب وزیر خزانہ پاکستان ۔ مہمان شعرا میں اعظم چشتی ، محسن احسان ، ارشاد کاظمی ، شہزاد احمد اور جمیل الدین عالی شامل تھے ۔

۲۱ مارچ ۱۹۶۴ع کو گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں آل پاکستان مشاعرہ زیر صدارت انور عادل کمشنر کوئٹہ ڈویژن انعقاد پذیر ہوًا ۔ اس کا انتظام صادق نسیم کے سپرد تھا ۔ جن بیرونی شعرا نے شرکت کی اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :

محسن احسان ، خاطر غزنوی ، سید عطا حسین کلیم ، اصغر سودائی ، سید ضیا جالندھری ، صلاح الدین ندیم ، شہزاد احمد ، احمد ندیم قاسمی ، سردار محمد انور خاں ۔

اکتوبر ۱۹۶۶ع میں حبیب بنک کوئٹہ کی طرف سے ٹاؤن ہال

کوئٹہ میں ''شام حبیب'' کے سلسلے میں ایک مشاعرہ منعقد ہؤا ۔ مہمان خصوصی میر بہادر علی ایس پی کوئٹہ تھے ۔ مسٹر شمیم کاظمی منیجر نے بتایا کہ ''شام حبیب'' امسال اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ انھی دنوں 'حبیب بنک' نے اپنی سلور جوبلی منائی ہے ۔ مختلف شعرا نے اپنا کلام سنایا ۔ اس میں سے چیدہ اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں :

شعر کو چاہیے آئینۂ تصویرِ جمال
وادیٔ شوق میں گھر ہو تو غزل ہوتی ہے (ہمدم)

اور بڑھتی ہے دل کی بے چینی
جس قدر احتیاط کرتا ہوں (مقبول رانا)

قدم قدم پہ دیکھا لیکن پھر نہ مجھے پہچانے لوگ
اب ہاتھوں میں پتھر لے کر کس پہ چلے برسانے لوگ (عابد رضوی)

دیوانوں کو مت چھیڑو بڑھ جائے گی بات سے بات
مت پوچھو وحشت کا سبب آ جائے گی تم پر بات (زاہد نقوی)

پکارتی ہے جسے تشنگی نگاہوں کی
اسی کا نام زباں سے لیا نہیں کرتے (سردار نقوی)

شمع احساس سے سہرا ہے یہ نہیں جانتے ہیں پروانے
ساری عقدہ کشائیاں کر دیں یار کی زلفِ کارفرما نے (ماہر افغانی)

عطا ہؤا ہے جسے جام ، کوئی جم ہوگا
مرے نصیب تو ٹوٹا ہؤا سبو بھی نہیں (اثر جلیلی)

وہی ستارے کہ جن کی چھاؤں میں میں نے رو رو کے شب گزاری
سحر سے نظریں بچا بچا کے اُنھی ستاروں نے ساتھ چھوڑا
(افسر بہزاد)

آپ فرما تو رہے ہیں اہتمامِ زندگی
دیکھیے برہم نہ ہو جائے نظامِ زندگی (رفیق صابری)

آپ کہتے ہیں تو کہہ لیں مجھے سودائی بھی
اس میں پنہاں ہے مگر آپ کی رسوائی بھی
تیری محفل میں جو آئے تو یہ احساس ہؤا
زندگی رقص بھی ہے، رنگ بھی، رعنائی بھی (امداد نظامی)

تلقین اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں کو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے (محسن بھوپالی)

نصف رات گئے یہ محفلِ شعر و سخن اختتام پذیر ہوئی[1]۔
پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد لورا لائی (کوئٹہ ڈویژن) میں عبدالرشید تابش نگینوی[2] (جو ۱۹۴۳ع سے وہاں سکونت پذیر ہیں)،

۱- "نعرۂ حق"، کوئٹہ، ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۶ع - "شام حبیب اور محفلِ شعر و سخن" از عزیز بھٹی -

۲- اس وقت بھی اُردو کے سات آٹھ شاعر موجود ہیں جن کے سننے اور پڑھنے والوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے ۔ سعید احمد گوہر تیراہوی (تیراہ کی نسبت سے) اور رب نواز سائل اورک زئی (پٹھان) قوم سے تعلق رکھتے ہیں - خورشید احمد افروز کاشمیری بھی لورا لائی میں پیدا ہوئے ۔ تابش نگینوی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سلیم ، تراب گوالیاری اور دوسرے اصحاب نے مشاعروں کے ذریعے عوام کے ذوق کی تربیت کی اور مقامی و بیرونی ثقافتوں کو یکجا کرنے کے لیے سعیٔ بلیغ سے کام لیا - ۱۹۵۸ع کے بعد رب نواز مائل (جو اسی سرزمین کا سپوت ہے) اور دوسرے صاحبان نے مل کر ''سماجی ، ادبی و ثقافتی انجمن'' کی طرح ڈالی - بعد میں اس انجمن کا نام بدل کر ''بزم سخن'' رکھا گیا - ان دنوں انوار الحق چودھری اور سعید احمد گوہر اس کے سرگرم رکن ہیں -

۱۹۶۴ع میں یہاں بزم ثقافت کوئٹہ کی ایک شاخ بھی قائم ہوئی جس کے سیکرٹری نسیم عثمانی ہیں - اس کے مقاصد میں ہر قومی اور اسلامی دن کا منانا منجملہ اور تقریبات کے شامل ہے - بزم نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ملک گیر شہرت کے حامل فنکار مثلاً مہدی حسن ، اقبال بانو ، سائیں اختر ، منیر نیازی ، گلنار بیگم اور سلیم رضا وغیرہ یہاں کی رقص و موسیقی کی مجلسوں میں شریک ہوں -

بزم نے علامہ اقبال ، حضرت امام حسینؓ اور حضور پاک سرور کائنات صلعم کی سیرت کے سلسلے میں ایسی ایسی مجالس منعقد کی ہیں جن کی ستائش میں ہر کہ و مہ رطب اللسان ہے -

بزم ثقافت لورالائی کے ذکر کے ساتھ ہی ''ہفتۂ لورا لائی'' کا تذکرہ بھی ضروری ہے - اس ہفتے کا انعقاد پہلی بار جناب افضل آغا کے وقت (۱۹۵۲ع) میں ہؤا تھا جب وہ یہاں کے ڈپٹی کمشنر تھے - اس کے بعد یہ ہفتہ ہر سال بہار کے موسم کے لیے مخصوص ہو گیا اور اس کی تقریبات مقامی تہذیبی زندگی کا جزو بن کر رہ گئیں - ہفتۂ لورا لائی نے جن تقریبات کو قرار واقعی اہمیت دی ، ان میں سکولوں کے مباحثے ، قومی مشاعرے اور مجالسِ موسیقی سر فہرست ہیں - ان تینوں نے جہاں ایک طرف عوامی ذوق

(بقیہ حاشیۂ گزشتہ صفحہ)

نے ۱۹۶۵ع کی جنگ سے متاثر ہو کر جو اشعار کہے ، وہ ایک پمفلٹ (۲۴ صفحے - بہ اہتمام بزم سخن لورا لائی - مطبوعہ اسلامیہ پریس کوئٹہ) کی صورت میں چھپ چکے ہیں - نام ہے ''جوشِ جہاد'' -

کی آبیاری کی اور علم و ادب کے میدان کو وسیع کیا ، وہاں دوسری طرف فن کی ترقی اور اُس سے محبت کے عوامی جذبے کو بھی استحکام بخشا - اس ہفتے کے سرگرم اور سب سے فعال کارکن کے طور پر نسیم عثمانی پیش پیش رہے ہیں اور یہ اُن کی کوششیں ہی تھیں کہ لوگ سارنگی کی لے پر یہاں کے لوک گیت بھی سنتے رہے اور اُردو کے رسیلے نغمات بھی -

لورا لائی کی پبلک لائبریری بھی قابل ذکر ہے - اس لائبریری کا قیام ۱۹۶۵ع میں ہؤا - اس کے ارکان کی تعداد سینکڑوں تک ہے - لائبریری میں مردوں ، خواتین اور بچوں کے لیے الگ الگ کمرے ہیں اور ہر کسی کے ذوق کا سامان اس کے سامنے الماریوں میں موجود ہے - کوئی اڑھائی تین ہزار کتابیں فلسفے جیسے دقیق موضوع سے لے کر ادبیات ، سیاسیات ، تاریخ ، ٹیکنیکل علوم ، ساجی علوم اور فنون لطیفہ تک پھیلی ہوئی ہیں اور باقاعدہ ڈیوی تقسیم کے مطابق تنظیم شدہ شکل میں موجود ہیں - کتابوں کے علاوہ کم و بیش سبھی قومی اخبارات اور اہم ادبی رسائل باقاعدہ آتے ہیں - اس لائبریری کے قیام اور دوسری علمی و ادبی سرگرمیوں میں ملک کے ممتاز ادیب جناب مسعود مفتی کا خصوصی اور نمایاں حصہ ہے- وہ یہاں چند سال تک ڈپٹی کمشنر رہے ہیں - نسیم عثمانی اُن کی رہنمائی میں کام کرتے رہے ہیں[1] -

قیصر الہ آبادی نے ''مکران میں اردو'' کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مکران کے پہلے وزیر اعظم نے مکران کی ترقی کے واسطے ایک پنج سالہ سکیم بنائی تھی - اُسی کے تحت تعلیم کی ترویج کے لیے احمد الدین[2] مارہروی صاحب

۱- لورا لائی میں علمی و ادبی سرگرمیاں - (غیر مطبوعہ) از رب نواز مائل (مورخہ ۲۶ جون ۱۹۶۷ع) اور مائل کا راقم الحروف کے نام خط (مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ع) -

۲- احمد الدین مارہروی کے چچا ڈاکٹر سر ضیاء الدین علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جو ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ دوسرے ''سر سید''

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سابق پرنسپل اسلامیہ کالج اٹاوہ کی خدمات حاصل کی گئیں - آپ نے تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ اُردو کی ترویج کے لیے بھی رات دن محنت کی - عام لوگوں کو ، جن میں فقیر ، دھوبی ، لکڑی چننے والے اور دودھ بیچنے والے وغیرہ شامل ہیں ، اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اُردو کا ایک ایک فقرہ ، جو اُن کے مناسب حال ہو سیکھ لیں - یہ ترکیب خاصی مفید رہی - سکولوں کے قیام سے باہر کے استاد کافی تعداد میں آئے اور اُردو بولی جانے لگی - استادوں اور لڑکوں میں بھی بات چیت اُردو میں ہوتی اور پند و وعظ بھی ، جو اب تک مقامی زبان میں ہوتے تھے ، اُردو میں ہونے لگے - پھر رفتہ رفتہ لڑکوں نے تقریریں اور بحث مباحثے بھی اسی زبان میں شروع کر دیے - چنانچہ پہلی مرتبہ مکران میں ''یوم اقبال'' منایا گیا جس سے لوگوں کو نہ صرف اقبال کی شخصیت کا صحیح علم ہؤا بلکہ جب اُن کا کلام سنا تو خود بھی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

کہلاتے تھے - آپ نے علی گڑھ اور الہ آباد سے تاریخ کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کرکے دو سال علمی تحقیق (ریسرچ) میں گزارے - پھر اپنی زندگی اٹاوہ کالج کے لیے وقف کر دی جو علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک شاخ تھی - وہاں آپ نے تاریخ کا ایک عجائب خانہ قائم کیا - مکران آپ کو وہاں کا پولٹیکل ایجنٹ میجر ڈیوی لے گیا تھا - چنانچہ وہاں آپ نے ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۱ء تین سال کام کیا - تربت میں ہائی سکول اور مختلف جگہ پرائمری سکولوں کا قیام انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا - لیاقت علی خاں نے آپ کو اس سلسلے میں ایک سند بھی عطا کی تھی اور اپنے خطبے میں مکران کی تعلیمی ترقی کی ان الفاظ میں تعریف کی کہ جتنی جلد مکران نے تعلیم میں ترقی کی ہے ، اُتنی ملک کے کسی اور حصے نے نہیں کی - احمد الدین صاحب کو آب و ہوا راس نہ آئی اس لیے وہاں سے آ گئے ، لیکن اس علاقے سے اتنا لگاؤ پیدا ہو گیا کہ مکران سے متعلق کئی مضامین لکھے اور ایک جغرافیے کی کتاب بھی مرتب کی - آپ کی تعلیمی ، ادبی اور تاریخی موضوعات پر چند کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں - آج کل آپ نمبر ۱۸ چوبرجی پارک لاہور میں مقیم ہیں - (آپ کے کئی خطوط راقم الحروف کے نام آئے ہیں)

اُن میں اقبال کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہؤا ۔ اس وقت راجہ احمد خاں وزیر مکران تھے ۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اہل مکران میں اُردو کا شوق بڑھ رہا ہے تو ایک پبلک لائبریری قائم کر کے اس زبان کی چند مفید اور دلچسپ کتابیں منگوائیں اور اقبال کا ایک مکمل سیٹ ذاتی طور پر پیش کیا ۔ دوران سال سکولوں میں اقبال پر تقریریں اور مباحثے ہوتے رہے حتیٰ کہ دوسرے سال یوم اقبال پر اتنا کامیاب اور شاندار جلسہ ہؤا کہ اس کی مثال مکران کی تاریخ میں نہیں ملتی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود اہل مکران نے بھی اس موضوع پر دو ایک عمدہ تقریریں کیں ۔

مکران کے مرد تو عموماً اُردو سمجھ لیتے تھے لیکن طبقہٗ نسواں میں ایک بھی اُردو نہ سمجھ سکتی تھی ۔ بیگم احمد الدین مرحوم نے اپنے شوہر کے دوش بدوش تعلیمِ نسواں کی ابتدا کی اور گھر پر اُس مدرسے کی بنیاد ڈالی جو بعد میں مکران کا پہلا نسوانی سکول بن گیا ۔

مرحومہ ، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں اتنی منہمک ہوئیں کہ رات دن کا فرق بھی باقی نہ رہا ۔ مرض الموت کے زمانے میں بھی یہ حال تھا کہ لڑکیاں اُن کو گھیرے رہتی تھیں اور وہ نیک بی بی کسی کو کھانا پکانا ، کسی کو بُننا یا کاڑھنا ، کسی کو مذہبی مسائل اور کسی کو املا اور حساب بتاتی رہتی تھیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ آج مکران میں اُردو رائج ہو چکی ہے اور ترقی کر رہی ہے ۔ اس میں بڑا ہاتھ راجہ احمد خاں کے علاوہ احمد الدین صاحب اور اُن کی اہلیہٗ مرحومہ کا ہے ۔[1]

سبّی کے میلے میں بھی ، جو ہر سال فروری میں لگتا ہے ، علمی و ادبی تقریبوں کا انتظام ہوتا ہے ۔ فروری ۱۹۶۷ء میں ایک شاندار مشاعرہ ہؤا تھا جس میں ملک بھر کے چوٹی کے شعرا نے شرکت فرمائی ۔

سبی ہی کے ایک مشاعرے کا حال سنیے جو ۲۷ فروری ۱۹۶۳ء

۱۔ ''مکران میں اُردو'' قیصر اللہ آبادی ، نمایندہ انجمن ترقی اُردو کراچی ۔ قومی زبان ، کراچی ، ۱۶ نومبر ۱۹۵۱ء ۔

کو ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے زیر اہتمام جرگہ ہال سبی[1] میں منعقد ہؤا تھا۔ صدارت کمشنر انور عادل نے فرمائی۔ عبد الصمد درانی نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض ادا کیے۔ پہلے براہوئی، پشتو اور بلوچی کے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا اور داد پائی۔ اُردو کی باری آئی تو افسر بہزاد نے اپنا کلام پیش کیا۔ ان کے یہ شعر سنیے:

کس کی نظروں میں ترا حسن خدا داد نہیں
کون ہے میری طرح جس کو خدا یاد نہیں
ہم چلے تھے کہ بنائیں گے نشیمن اپنا
اب یہ عالم ہے کہ منزل بھی ہمیں یاد نہیں
جی حضوری کا یہ انجام ہے افسر ہر سُو
آپ پابند رضا ہے مگر آزاد نہیں

صادق نسیم کے جو اشعار پسند کیے گئے، وہ یہ ہیں:

کانٹوں کے دلوں میں بھی وہی زخم تھے لیکن
پھولوں نے سجائے تو نمایاں نظر آئے
ہر بامِ تمنا پہ دیے اتنے جلاؤ
ہر سمت چراغاں ہی چراغاں نظر آئے

رشید نثار کے بعد یوسف عسکری نے اپنی غزل ایسے انداز میں پیش کی کہ لوگ جھوم اُٹھے۔ فرمایا:

متاعِ کون و مکاں دل تو ہے مگر اے دوست
تری نگاہ کے قابل نہیں تو کچھ بھی نہیں
تمہارے دستِ تسلی کے آسرے کی قسم
سکوں نصیب اگر دل نہیں تو کچھ بھی نہیں

اُن کے بعد لمبے قد کے پتلے دبلے اثر جلیلی نے پان چباتے لبوں سے

۱- بلوچی دنیا، ملتان ''سبی میں مشاعرہ'' چاکر خان رند، اپریل ۱۹۶۴ء صفحات ۲۷-۲۹-

یوں موتی بکھیرے :

کسے معلوم کیا ہوگا سال انتظار اب کے
ترے وعدے پہ مشکل سے کیا ہے اعتبار اب کے
نظر آتے ہیں چھینٹے ہر طرف ہر دامنِ گل پر
ترے کوچے سے ہو کر آئی ہے شاید بہار اب کے

پھر ارشد امروہوی نے فرمایا :

یہ درد عشق مری زندگی کا حاصل ہے
تو مجھ کو درد دیے جا ، دوا کی بات نہ کر
وہ عہد رفتہ کی رنگین داستانیں ہیں
یہ عہد اور ہے اس میں وفا کی بات نہ کر

محشر بدایونی نے ترنم میں پڑھا :

وہ ارزاں تو کریں جلووں کو ، دیوانے بھی آتے ہیں
جہاں شمعیں جلا کرتی ہیں ، پروانے بھی آتے ہیں
محبت کے گلستانوں میں پھلنے پھولنے والو !
اسی رستے میں آگے چل کے ویرانے بھی آتے ہیں

صہبا اختر نے خاص انداز میں کہا :

نشے کے باوجود بہکتا نہیں ہوں میں
دریا ضرور ہوں پہ چھلکتا نہیں ہوں میں
ہے میرے ساتھ میری شکستوں کا بھی غبار
خوابوں کے اس ہجوم میں تنہا نہیں ہوں میں

شعلہ کے کلام اور انداز سے بے پناہ حسرت ٹپکتی تھی - ایک شعر یہ ہے :

سنواری جائے گی زلف پریشاں ، ہم نہیں ہوں گے
نہ جانے کون ہوگا پا بہ جولاں ، ہم نہیں ہوں گے

طفیل ہوشیاری کی اس غزل پر داد کے بے پناہ ڈونگرے برسے - وہ

کہتے رہے :

دل میں محبوب کا گھر ہو تو غزل ہوتی ہے
کوئی مسجودِ نظر ہو تو غزل ہوتی ہے
تیرگی ہی میں ستاروں پہ نکھار آتا ہے
شام محرومِ سحر ہو تو غزل ہوتی ہے
ذکرِ محبوب ہے پابندِ تقدس کتنا
باوضو آنکھ اگر ہو تو غزل ہوتی ہے

معروف شاعر حمایت علی شاعر سٹیج پر کیا آئے ، محفل کو متاثر کرتے چلے گئے ۔ کئی شہ پارے پیش کیے ۔ ''رفاقت'' پر کہا :

شب میں سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

غزل کا تقاضا ہؤا تو اپنی پیاری آواز میں گویا ہوئے :

بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار
وہ لوگ جن کو محبت کا آسرا نہ ملا
انھی کے دم سے ہے آباد کنجِ دیر و حرم
جنھیں بفضلِ خدا سایۂ خدا نہ ملا

آخر میں ایک عمر رسیدہ شاعر عظیم عباسی نے فرمایا :

راجا کی یہ پہچان ، ریاست میں وہ گم ہے
بھارت کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ریاست
لیڈر کی یہ پہچان ، سیاست میں وہ گم ہے
مُلا کی یہ پہچان کہ گم اس میں سیاست !

پھر غزل چھیڑی اور سامعین نے سر دُھنا ۔

رات بھیگ چکی تھی ۔ بھاری پگڑیوں ، لمبی ڈاڑھیوں اور وسیع و عریض شلواروں کے علاوہ طرح طرح کے سوٹ والے لوگوں پر بھی نیم شبی کا خیال اپنا اثر دکھا رہا تھا ۔ کمشنر صاحب نے صدارتی خطبے کے بعد مشاعرے کے خاتمے کا اعلان فرمایا اور انسانوں کا ایک جم غفیر

پیدل اور سوار اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب بڑھ گیا ۔

مستونگ (قلات ڈویژن) کی فضائیں بھی علم و ادب کی گونج سے اچھی طرح آشنا ہیں ۔ اگست ۱۹۵۸ع میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے زیر اہتمام ایک آل پاکستان مشاعرہ اسی مقام پر منعقد ہوا تھا جسے کوئٹہ ریڈیو سٹیشن سے ریلے کیا گیا ۔ اس میں اقبال صفی پوری ، ثاقب زیروی ، حمایت علی شاعر ، ضمیر جعفری اور ادیب سہارنپوری مدعو تھے ۔ مقامی شعرا میں سے بھی چند ایک شامل ہوئے تھے ۔

یہ ہے سابق بلوچستان میں ادبی انجمنوں اور مشاعروں کا ایک مختصر سا جائزہ ۔ اس سے بخوبی اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس خطے میں مشاعروں نے ایک ایسے ہتھیار کا کام دیا جس سے ان فضاؤں میں اُردو کا نام گونجنے لگا ۔ ان مشاعروں کو سرکاری اور نجی اداروں کی سرپرستی حاصل رہی جس کے باعث مشاعرہ یہاں کی ادبی روایت ہی بن گیا ۔ اس خطے میں ملک کے نامور متعدد علماء مذہبی تقاریب میں شرکت کے لیے تشریف لاتے رہے ۔ وہ ہمیشہ اُردو ہی میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے ۔ امام باڑوں میں بھی مسالموں کے انعقاد سے ایک اعتبار سے اُردو کی خدمت ہوئی ہے ۔

جہاں ایک زمانے میں مقامی اُردو دانوں کی کل تعداد پانچ سو پچپن بتلائی جاتی تھی ، وہاں اس وقت ڈیڑھ لاکھ کے قریب اشخاص اُردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والے ہیں ۔ اس ترقی کی اہم وجہ اُردو زبان کی جاذبیت ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصے میں بلوچستان کے لوگ اُردو زبان کی خدمت میں کسی اور خطے کے لوگوں سے پیچھے نہیں رہے ۔

ڈرامہ

پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے کی بات ہے کہ غلام حیدر خان نے کوئٹہ کے مشہور مصور اور مجسمہ ساز آغا سید عزیز شاہ اور مشہور اداکار و مغنّی طاؤس خان کے ساتھ مل کر کوئٹہ ڈرامیٹک کلب کے نام سے ایک کلچرل کلب کی ابتدا کی - غلام حیدر خان پشاور کے خلیل قبیلے سے متعلق تھے - ۱۸۸۲ع میں پشاور میں پیدا ہوئے لیکن دس گیارہ سال کی عمر میں کوئٹہ پہنچ گئے - اُنھوں نے گورنمنٹ سنڈیمن سکول کوئٹہ میں تعلیم حاصل کی اور ضلع سبّی میں پینتیس برس تک پولٹیکل ایجنٹ کے سررشتہ دار رہ کر ریٹائر ہوگئے - منصبی فرائض کی بجاآوری کے بعد وہ اتنا وقت نکال لیتے تھے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ثقافتی سرگرمیوں میں شریک ہوں - چنانچہ غلام حیدر خان ہی اس ڈرامیٹک کلب کے منتظم تھے - سید عزیز شاہ ڈراموں کے پردے اور سین سینریاں بھی خود بناتے تھے - اداکاروں کی پوشاک بھی اُنھی کی فن کارانہ صلاحیتوں کی تخلیق ہوتی تھی - اس کلب کے سرگرم ارکان میں خان صاحب محمد اکبر خان انسپکٹر ڈاک خانجات، عبدالحمید خان سٹاف کالج کے ہیڈ ڈرافٹس مین، پنڈت روشن لال تحصیل دار، مولوی عبدالغنی صاحب اور ریلوے کے کئی ہندو اور سکھ ملازم شامل تھے -

کوئٹہ ڈرامیٹک کلب کا مقصد پیسے کمانا نہ تھا بلکہ کلب کے ارکان شہریوں کے لیے تفریح طبع کا سامان فراہم کرتے اور اس کی آمدنی تعلیمی اور خیراتی اداروں پر خرچ کرتے تھے - چنانچہ جب ایم اے او کالج علی گڑھ کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک وفد یہاں آیا تو کوئٹہ ڈرامیٹک کلب نے اس وفد کے لیے کئی ڈرامے سٹیج کیے اور پوری آمدنی وفد کے حوالے کردی -

کلب میں زیادہ تر آغا حشر مرحوم کے ڈرامے سٹیج ہوتے تھے - بعض
اہل ذوق انگریزی ڈراموں کے ترجمے کرکے بھی اس سٹیج کے لیے پیش
کرتے تھے - پہلی جنگ عظیم کے بعد غلام حیدر خاں نے خود بھی کئی
ڈرامے اور فیچر لکھے، جن میں کنیز شیطان، قتل یوحنا، خیال خام،
آصف نوشابہ، مار آستین، حور جنت، آئینۂ قسمت، ضدیں، دوستان صادق،
کوتاہ اندیش، غلام شیطان، غازی سلطان محمود اور قربانیاں قابل ذکر ہیں -

کوئٹہ ڈرامیٹک کلب میں غلام حیدر خاں اکثر ہیرو کا کردار ادا
کرتے تھے - اُنھوں نے اس کلب میں اپنا تو کوئی ڈرامہ پیش نہیں کیا،
البتہ صید ہوس، سفید خون، اسیر ہوس اور رستم و سہراب کے نام سے جو
ڈرامے پیش کیے گئے، ان میں اُنھوں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے -
رستم و سہراب میں غلام حیدر خاں نے رستم کا اور پنڈت روشن لال نے
سہراب کا کردار ادا کیا تھا - پنڈت روشن لال کے بڑے صاحب زادے آج کل
بھارت میں ایک مشہور فلم کمپنی کے مالک ہیں - ان ڈراموں کے لیے اکثر و
بیشتر برصغیر کے دوسرے مقامات سے بھی اداکار منگوائے جاتے تھے - اُس
زمانے میں کلب نے جعفر نامی ایک مشہور رقاص کی خدمات حاصل کر لی
تھیں جو کلاسیکی رقص میں بھی ماہر تھا - ڈرامیٹک کلب کے تمام ڈرامے
گوکل چند کے منڈوے میں سٹیج ہوتے تھے - اسلام آباد کے اسی علاقے
میں آج کل ایک سینما بنا ہؤا ہے - تقسیم سے پہلے یہ پریم سینما کہلاتا تھا - یہ
سینما ایک بڑی پختہ عمارت کی صورت میں تعمیر کیا گیا تھا جس میں تماشائیوں
کے بیٹھنے کے لیے گیلریاں بھی بنائی گئی تھیں -

کوئٹہ ڈرامیٹک کلب پہلی عالمگیر جنگ کے بعد زیادہ دیر تک قائم
نہ رہ سکا کیونکہ کلکتہ، دہلی اور بمبئی سے کئی کمپنیاں یہاں ہر سال آتیں -
۱۸۹۶ع میں سب سے پہلے باہر سے ایک تھیٹریکل کمپنی یہاں آئی تھی، جو
"جمعدار کی کمپنی" کے نام سے مشہور تھی لیکن پہلی جنگ کے بعد جمیلہ
کی کمپنی، محمود حسین کی کمپنی، رائزنگ سٹار کمپنی وغیرہ کے نام سے
بے شمار کمپنیاں آئیں - ان کمپنیوں کی مقبولیت بڑھنے سے کوئٹہ ڈرامیٹک کلب
کی مقبولیت اور آمدنی پر اثر پڑا اور نتیجہ یہ ہؤا کہ کلب عضوِ معطل کی

صورت اختیار کر گیا۔

کوئٹہ ڈرامیٹک کلب کے ڈرامے زیادہ تر نصیحت آموز اور حیرت انگیز ہوتے تھے تاکہ اُن سے لوگوں کے اخلاق کی اصلاح اور ذہنی تربیت کا کام بھی لیا جائے۔ سید آغا عزیز شاہ، جو اس کلب کے ایک سرگرم رکن تھے، اکثر ہندو دھارمک ڈراموں میں کام کرتے تھے اور پسِ پردہ تبلیغ کا منشا بھی پورا ہو جاتا تھا۔

تماشائیوں میں اکثریت سرکاری ملازموں اور شہری لوگوں کی ہوتی تھی۔ دیہات کے پڑھے لکھے لوگ بھی ان میں حصہ لیتے تھے۔ ان ڈراموں میں ایکٹر رضاکارانہ طور پر کام کرتے تھے، البتہ موسیقی اور ناچ وغیرہ کے لیے پیشہ ور لوگوں سے کام لے کر انھیں باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی۔

ایک صاحب مولوی نقشبند ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک لورالائی میں سکونت پذیر رہے۔ وہ ایک جیّد عالم اور مکالمہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ ہدایت کار بھی تھے۔ خود ہی ڈرامے لکھتے بھی تھے اور سٹیج بھی کرتے تھے۔ اُس زمانے کے ایک بزرگ (سیٹھ ولی محمد) نے اُن کے ایک ڈرامے کا نام ''سفید خون'' بتایا ہے مگر ایک اور صاحب کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ آغا حشر کے ڈرامے بھی سٹیج کرتے تھے۔ بہرحال یہ امر مصدقہ ہے کہ وہ خود بھی ڈرامے لکھتے تھے۔ موہن لال بھاری ہیڈ کلرک کنٹونمنٹ ایگزیکٹو آفس لورالائی ایک شاعر تھے۔ وہ مولوی نقشبند کے ڈراموں کے لیے نظمیں اور غزلیں لکھا کرتے تھے۔

بلوچستان کے معروف فن کار، اداکار اور مصور آغا سید عزیز شاہ ۱۸۹۳ء میں کوئٹے میں پیدا ہوئے۔ وہ تحصیل پشین کے بخاری سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اُس زمانے کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم مسجد میں پائی۔ بعد میں اُن کے مکان کے نزدیک آریہ سماج سکول کی بنیاد ڈالی گئی تو اُنھوں نے پانچویں جماعت تک اسی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس سکول کے تمام اخراجات مخیّر ہندوؤں کے چندے اور خیرات سے پورے ہوتے تھے۔ سکول کے بچے ٹولیاں بنا کر گھروں کو جاتے تھے۔ ان ٹولیوں کے لیے سکول کی جانب سے خاص وردی مقرر تھی۔ یہ لڑکے گھروں

میں جا کر آٹا جمع کرتے اور آٹے کی قیمت سے سکول کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے - ایک دن آریہ سماج سکول کے مسلمان بچے ، جن میں آغا سید عزیز شاہ بھی تھے ، اسی وردی میں نماز پڑھنے کے لیے مسجد گئے - وہاں اسلامیہ سکول کوئٹہ اور گوجرانوالہ کالج کے بانی مولوی محبوب عالم صاحب نے انھیں دیکھا - ان بچوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی تعلیم وغیرہ کے بارے میں دریافت کیا - بچوں سے انھوں نے پوچھا کہ اگر کوئٹہ میں اسلامیہ سکول بن جائے تو آپ سب اُس میں پڑھنا پسند کریں گے ؟ بچوں نے اثبات میں سر ہلایا - مولوی محبوب عالم نے انھیں سکول کے لیے بچے تیار کرنے کو کہا - چنانچہ مستقبل کا یہ طباع فن‌کار اور مصور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر مسلمان محلوں میں گیا اور نعت خوانی کرتے ہوئے سکول کے لیے بچوں کو تیار کیا — ۱۹۰۸ع - ۱۹۰۹ع میں عین الدین خاں روڈ پر ایک عمارت کرائے پر لی گئی اور اسے ''مدرسۃ القرآن'' کا نام دیا گیا - زلزلے سے پہلے اسلامیہ سکول کے ہال پر یہی الفاظ لکھے تھے - ''مدرسۃ القرآن'' میں صوفی عبدالحق ، حاجی عبدالکریم اور مولوی نواب الدین درس و تدریس پر مامور تھے -

آغا سید عزیز شاہ کو ڈراموں کا شوق آریہ سماج سکول میں پیدا ہؤا - اُن کے والد صاحب نے اپنے بچے کے شوق کو بھانپ کر اُنھیں اپنے گھر کے باغیچے میں ایک عمدہ سا سٹیج بنا کر دیا - آریہ سماج سکول کے لڑکے بھی باغیچے میں آ کر اُن کے ہمراہ ڈرامے سٹیج کرتے تھے - سکول سے فارغ ہو کر اُنھوں نے اپنے دوسرے ہم عمر ساتھیوں مثلاً غلام حیدر خاں ، پنڈت روشن لال اور سٹاف کالج کے بابو دینا ناتھ کے ساتھ مل کر انڈین ڈرامیٹک کلب قائم کیا جو بعد میں کوئٹہ ڈرامیٹک کلب کہلانے لگا - کلب میں مہا بھارت ، رامائن اور دوسرے ہندو دھارمک ناٹکوں کے علاوہ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ، مثلاً اسیر ہوس ، چترا بکاولی اور رستم و سہراب سٹیج ہوتے تھے - ان ڈراموں کا مقصد تفریح کے علاوہ ریڈ کراس وغیرہ جیسے رفاہی اداروں کے لیے چندہ مہیا کرنا بھی ہوتا تھا - سید عزیز شاہ کے ایک پارسی ساتھی بہرام جی بھی ہوتے تھے جو کوئٹے میں پہلے پریس کے مالک

تھے اور فارغ اوقات میں ڈرامیٹک کلب میں حصہ لیتے تھے - بہرام جی نے چترا بکاولی میں گھسیارے کا پارٹ ادا کیا تھا اور بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی -

سید عزیز شاہ[1] ، کلب کے ڈراموں میں اداکاری کے علاوہ سٹیج منیجر ، میک اپ ماسٹر اور سینری اور پردے بنانے کے آرٹسٹ کے فرائض بھی انجام

۱- سید عزیز شاہ مرحوم اچھے مصور ، ماڈل بنانے والے اور مردہ جانوروں کو آرایش کے قابل بنانے کے فن میں مہارت رکھتے تھے اور اس فن کو وہ ''ٹیکسی ڈرمی'' کہتے تھے - انھوں نے یہ چیزیں اپنے شوق کی بدولت سیکھیں - ٹیکسی ڈرمی اور مجسمہ سازی کا خیال انھیں کلکتے کا چڑیا گھر دیکھنے کے بعد پیدا ہوا - ان کی تخلیقات نے کوئٹہ سے باہر دور دراز علاقوں میں بھی شہرت پائی اور کئی ایک نے کُل ہند نمایشوں میں سندیں اور انعامات حاصل کیے - ۱۹۲۳ء میں جناح روڈ پر آغا صاحب کا اپنا سٹوڈیو تھا جہاں وہ جیولری کا کام کرتے تھے - مردہ جانوروں کو کیور کر کے ان میں بُھس اور مسالہ بھرتے اور اُنھیں ڈرائنگ روم کی آرایش کے قابل بناتے - اُن کے اپنے بیان کے مطابق وہ اُس سستے زمانے میں بھی روزانہ اسّی نوے روپے کماتے تھے - ۱۹۱۸ء میں خلافت کی تحریک سے متاثر ہوئے اور ''سیوا سمتی دل'' کی بنیاد رکھی - ان کے والد نے اس شوق کو پسند نہ کیا اور کہا کہ اگر تمھیں قومی خدمت کا اتنا ہی شوق ہے تو سکاؤٹ یا روور (Rover) سکاؤٹ بن جاؤ - چنانچہ اُنھوں نے سکاؤٹنگ کی بنیاد رکھی اور سکاؤٹ ماسٹر کی حیثیت سے کئی بیج اور انعام حاصل کیے - آغا صاحب کے ہاتھ کی بنی ہوئی کئی چیزیں مثلاً قبائلیوں کی کُشتیاں ، بلوچ باشندوں کے قافلوں وغیرہ کے ماڈل آج بھی سنٹرل میوزیم لاہور میں رکھے ہوئے ہیں - انھوں نے کاغذ کی لُگدی ، رنگ ، پلاسٹر اور سریش سے ایک خاص قسم کا مسالہ تیار کیا اور اُس سے اُبھری ہوئی تصویروں کی طرح ڈالی جو غالباً برصغیر میں ایک نئی چیز تھی - اس مسالے سے کئی تصویریں بنائیں جن میں خانۂ کعبہ ، رحمان بابا کی شبیہ اور اُن کی اپنی تصویر قابل ذکر ہیں - گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی سائنس لیبارٹری میں اُن کے ہاتھ کے بنے ہوئے کئی ماڈل پڑے ہیں -

دیتے تھے۔ انھوں نے دھارمک ڈراموں کی بدولت ہندو حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ کئی برس تک راون کے بُت بنانے اور رام لیلا کے ڈرامے وغیرہ کا بندوبست آغا صاحب ہی سے کرایا جاتا تھا۔ آغا صاحب نے ان تعلقات سے تبلیغی فائدے بھی اُٹھائے اور کئی ہندوؤں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔[1]

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد مسئلۂ کشمیر شدید تر سیاسی کشمکش کا باعث بنا۔ جب کشمیر کے مسلمانوں پر ڈوگرہ اور ہندو راج کے مظالم کی داستانیں لوگوں تک پہنچیں تو کوئٹہ میں بھی لوگوں نے اس درد کو محسوس کیا۔ جہاں اس مسئلے نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو متاثر کیا، وہاں سٹیج ڈرامے کو بھی ایک زندہ، جیتا جاگتا موضوع ملا۔ چنانچہ اس سلسلے میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی ڈرامیٹک کلب نے پہل کی اور ایک ڈرامہ ''مجاہد'' اگست ۱۹۴۸ء میں پیش کیا۔ ''جمہور'' اخبار[2] کی یہ خبر پڑھیے، اُس سے مزید پتہ چلے گا:

''جشنِ استقلال میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کا حصہ

جشن محض ہنگامی قہقہوں اور چراغاں تک محدود نہیں رہا بلکہ گورنمنٹ کالج کی ڈرامیٹک کلب نے ۱۶ اگست سے ۱۹ اگست تک ڈرامہ ''مجاہد'' سٹیج کیا۔ اس میں جہاں دشمنوں کی بربریت کو آشکار کیا گیا تھا، وہاں اُس قوت ایمانی کو بھی نمایاں کیا گیا تھا جس کے بل پر مسلمان زندہ رہا ہے اور تا ابد زندہ رہے گا۔

۱۔ ''کوئٹہ میں پون صدی پہلے کی ثقافتی زندگی'' (پمفلٹ)، تحریر ۸ جنوری ۱۹۵۹ء۔ صفحات ۱، ۲، ۵، ۶، ۷۔

۲۔ جمہور، کوئٹہ، ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء ——— ''ڈرامہ 'مجاہد' سارے پاکستان میں مشہور ہوا اور ملک کے مختلف حصوں کے کالجوں سے اُس کی مانگ ہوئی'' (جمہور، کوئٹہ، ۲۶ اگست ۱۹۴۹ء)۔ اس ڈرامے کی آمدنی سے ایک ہزار روپیہ قائد اعظم ریلیف فنڈ میں دیا گیا۔
(بولان، کوئٹہ، ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۶)

نفس مضمون ، گیتوں اور غزلوں کے معیار اور پاکیزگیِ کردار کے اعتبار سے 'مجاہد' ایک یادگار ڈراما تھا ۔ مجاہد نہ صرف وقت کی ضرورت تھی بلکہ ان پاکیزہ ادبی رجحانات کا حامل بھی تھا جن پر پاکستان کے ادبی مستقبل کی بنیادیں کھڑی کی جا رہی ہیں ۔"

اس کے لکھنے والے تھے پروفیسر انور رومان اور ہدایت کار ادریس خورشید تھے اور سیک اپ کے انچارج قیوم راشد تھے ۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں ریلوے[۱] کے چند اصحاب اور سپیشل سکول کوئٹہ کے طلبہ کے اشتراک سے مسئلۂ کشمیر سے متعلق ایک ڈرامہ گورنمنٹ سپیشل ہائی سکول کوئٹہ میں پیش کیا گیا جس کا نام تھا "وقت کی پکار" ۔ اگست ۱۹۴۹ء[۲] میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی ڈرامیٹک کلب نے "محمد بن قاسم" کے نام سے ایک شاندار ڈرامہ پیش کیا ۔ ڈرامے کے مکالمے اور کہانی دونوں بہترین تھے ۔ اداکاروں نے بڑا اچھا پارٹ ادا کیا جس میں سے مسٹر محمود (جنھوں نے پنڈت کا پارٹ ادا کیا) اور مسٹر مسعود الرؤف (جنھوں نے محمد بن قاسم کا پارٹ ادا کیا) کے پارٹوں کو بہت پسند کیا گیا اور ہر دو کو انعام سے نوازا گیا ۔ یہ ڈرامہ بھی "مجاہد" کی طرح کامیاب رہا اور عوام نے اس میں خوب دلچسپی کا اظہار کیا ۔[۳]

اسے بھی پروفیسر انور رومان نے لکھا اور ادریس خورشید نے پیش کیا ۔

۲۱ ، ۲۲ اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ڈرامیٹک کلب گورنمنٹ کالج کوئٹہ نے ایک ڈرامہ "محمود غزنوی" پیش کیا ۔ اسے بھی پروفیسر انور رومان نے تحریر کیا اور ادریس خورشید ہی نے ڈائریکٹ کیا ۔ اس کے گیت آغا صادق نے لکھے ۔[۴]

۱۹۵۳ء میں کالج کے کلب نے اُردو کے بعض ڈراموں (ضرورت رشتہ ،

۱- جمہور ، کوئٹہ ، ۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء ۔
۲- ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ اگست ۱۹۴۹ء ۔
۳- جمہور ، کوئٹہ ، ۲۶ اگست ۱۹۴۹ء ۔
۴- بولان ، کوئٹہ ، نومبر ۱۹۵۱ء ، صفحہ ۵۵ ۔

مستقبل کا سوداگر، مالک مکان) کے حصے سٹیج کیے تھے ۔ ہدایت کار تھے خلیل صدیقی ۔[1]

۱۹۵۵ء میں ڈرامیٹک کلب نے پروفیسر خلیل صدیقی کی رہنمائی میں ورائٹی شو کا اہتمام کیا، جس میں ایک اُردو ڈرامہ ''پرواز'' (اوپندر ناتھ اشک) بھی شامل تھا ۔[2]

۱۹۵۶ء میں ڈرامیٹک کلب گورنمنٹ کالج کوئٹہ نے ایک ڈرامہ ''چنگیز خاں'' پیش کیا جسے سید خلیل احمد نے ڈائریکٹ کیا تھا ۔

نومبر ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے ڈرامیٹک کلب نے ایک نصیحت آموز ڈرامہ ''سحر کے داغ'' پیش کیا ۔ ہدایت کار تھے اے ایچ دلشاد ۔ یہ ڈرامہ سوسائٹی کے گھناؤنے واقعات پر مشتمل تھا ۔[3]

۱۹۵۹ء میں اسی کلب نے سید عابد علی عابد کا ڈرامہ ''روپ متی باز بہادر'' سٹیج کیا ۔ اسے محمد رئیس نے ڈائریکٹ کیا ۔

۱۹۶۰ء میں ڈرامیٹک کلب نے ''فریب مسلسل'' (آسکر وائلڈ کے مشہور ڈرامے ''The Importance of Being Earnest'' کا اُردو ترجمہ) سٹیج کیا ۔ اس کے ڈائریکٹر محمد رئیس تھے ۔

ڈرامیٹک کلب گورنمنٹ کالج کوئٹہ نے حلقۂ ارباب فن کوئٹہ کی پیشکش ''دشمن'' کو پیش کرنے میں خصوصی تعاون فرمایا ۔[4]

۱۹۶۱ء میں ڈرامیٹک کلب نے ایک ڈرامہ ''جب تک چمکے سونا'' پیش کیا ۔ ہدایت کاری کے فرائض محمد رئیس نے ادا کیے ۔[5] میک اپ کے انچارج سعید الحسن تھے ۔

۱۹۶۲ء میں ڈرامیٹک کلب کی پیش کش تھی 'بڑا صاحب' جو آغا بابر

۱۔ بولان، کوئٹہ دسمبر ۱۹۵۳ء ۔
۲۔ ایضاً، دسمبر ۱۹۵۵ء ۔
۳۔ قاصد، کوئٹہ، ۲۷ نومبر ۱۹۵۸ء ۔
۴۔ بولان، کوئٹہ، سالنامہ ۱۹۵۹ء ۔ ۱۹۶۰ء، صفحہ ۶۱ ۔
۵۔ ایضاً، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۹۵ ۔

کے ڈرامے کا اختصار تھا ، اس کے ہدایت کار محمد رئیس تھے - سعید الحسن اور بشیر احمد غوری نے بھی تعاون فرمایا -[۱]

بعد میں بھی یہ کلب ڈرامے کے میدان میں مستعد نظر آتی رہی - چنانچہ ۱۹۶۵ء میں بھی ایک ڈرامہ سٹیج کرنے کا بندوبست کیا جا چکا تھا کہ بھارت نے ہمارے عزیز وطن پر حملہ کر دیا اور وطن کی جانب سے عائد ہونے والے فرائض کے پیش نظر اسے ملتوی کر دیا گیا -

۱۹۶۶ء میں انٹر اور ڈگری کالج علیٰحدہ علیٰحدہ دو ادارے بن گئے اور یوں یہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کا مشہور ڈرامیٹک کلب دو حصوں میں منقسم ہو گیا - نومبر ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ انٹر کالج کے ڈرامیٹک کلب (بزم تمثیل) نے ایک ڈرامہ ''دل ہی تو ہے'' پیش کیا جس کے ہدایت کار تھے ساقی الحسینی ——— یہ ڈرامہ سرگزشت موسیو ژوروان حکیم نباتات و مست علی شاہ درویش از اخونزادہ فتح علی سے ماخوذ تھا -

۱۹۵۶ء میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے قیام کے ساتھ ایک نام ، ایک ہستی ، ایک قلمکار نے جنم لیا ——— وہ ہستی تھی منظور بخاری - منظور بخاری (مرحوم) ایک اچھے ادیب ، ریڈیو کے لیے بہت اچھی آواز اور سٹیج ڈراموں کے لیے ذہین ڈائرکٹر اور ایکٹر تھے -

شروع میں انھوں نے دلی اور امرتسر میں سٹیج ڈرامے کا فن سیکھا - وہاں کے ڈراموں میں حصہ لیا ، ہدایت کاری کی اور ڈرامے لکھے - کوئٹہ میں پہلے انھوں نے ریڈیو ڈرامے لکھے لیکن ان کی تمام تر دلچسپی چونکہ سٹیج سے وابستہ تھی اس لیے انھوں نے محنت کرکے کوئٹہ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''حلقۂ ارباب فن کوئٹہ'' رکھا گیا - اس حلقے کے بانی ممبروں میں مقصود عالم ملک ، جناب اے ایچ رضوی ، جمیل ملک ، شفقت علی خاں ، سردار رشید جان (خلف الرشید سردار محمد یوسف خاں پوپلزئی ، جن کا ذکر خیر ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' کے تحت آ چکا ہے) اور ڈاکٹر صلاح الدین شامل ہیں :

۱- بولان ، کوئٹہ ، سالنامہ ۱۹۶۲ء -

اس حلقے نے اپنی کارروائی سٹیج ڈرامے ہی سے شروع کی۔ سب سے پہلا ڈرامہ جو حلقۂ ارباب فن کے زیر اہتمام سٹیج کیا گیا، اس کا نام تھا ''بدر بن مغیرہ''۔ اسلامی تاریخ کے اس ورق کو منظور بخاری نے لکھا اور ہدایت کاری کے فرائض بھی خود ہی انجام دیے۔ حلقۂ ارباب فن کے زیر اہتمام دوسرا ڈرامہ ''دشمن'' سٹیج کیا گیا۔ یہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی سٹیج پر کھیلا گیا۔ منظور بخاری نے لکھا اور انھوں نے ہی پیش کیا۔

اس کے بعد تیسرا ڈرامہ ''بڑے لوگ'' نامی تھا جسے گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی سٹیج پر منظور بخاری نے پیش کیا۔ ہدایت کار بھی وہی تھے۔ منظور بخاری مرحوم کا لکھا ہؤا چوتھا ڈرامہ ریلوے انسٹی ٹیوٹ کوئٹہ کی سٹیج پر پیش ہؤا۔ اس کا نام تھا ''سہارا''۔

پانچواں ڈرامہ ریلوے انسٹی ٹیوٹ کوئٹہ کی سٹیج پر ''خزانہ'' پیش ہؤا، تحریر و ہدایات منظور بخاری۔

۱۹۶۱ء میں جشن کوئٹہ کا اہتمام کیا گیا اور اوپن ایئر تھیئٹر وجود میں آیا۔ اس تھیئٹر کے بننے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن حلقۂ ارباب فن کوئٹہ اور سٹیج ڈرامے کی موجودگی نے اس سلسلے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔

۱۹۶۱ء میں جشن کوئٹہ کے ثقافتی شعبے نے حلقۂ ارباب فن سے اُردو ڈرامہ سٹیج کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ ڈرامہ ''جلال الدین خوارزم شاہ'' پیش کیا گیا۔ اس کی ہدایت کاری کے ذمہ دار بھی منظور بخاری تھے۔

۱۹۶۲ء میں حلقۂ ارباب فن نے ساتواں ڈرامہ ''ہانی شہ مرید'' پیش کیا۔ مصنف و ہدایت کار تھے منظور بخاری۔

۱۹۶۳ء میں[۱] جشن سبی کے موقع پر ۹، ۱۰ مارچ کو حلقۂ ارباب فن

۱۔ اسی سال بزم ثقافت کوئٹہ اور حلقۂ ارباب فن کوئٹہ کے تعاون سے ورائٹی شو کا بندوبست کیا گیا جس میں اقبال بانو، عذرا خورشید، زوار حسن اور رشید فریدی قوال اور ساتھی شریک ہوئے۔ (ماہانہ ''ویسٹ پاکستان'' لاہور، مارچ ۱۹۶۳، صفحہ ۳۲)

کوئٹہ کے زیر اہتمام ایک مزاحیہ کھیل ''دو مسافر'' پیش کیا گیا جو منظور بخاری مرحوم کے ڈراموں سے اخذ کیا ہؤا تھا۔ اس کے ہدایت کار تھے مقصود عالم ملک۔ حصہ لینے والوں میں کریم، منظور، احمد جمیل، الطاف نعیم، سلیم، خدائے داد، ناصر دل، جاوید، نیک محمد درانی، مرغوب، یٰسین، سلیم جاوید، قمر جہاں، عصمت، نگار اور بلقیس بیگم شامل تھیں۔

۱۹۶۳ع میں ہی کوئٹہ میں نمائش کے موقع پر اوپن ایئر تھیٹر کے سٹیج پر حلقے کی طرف سے ''ایک رات''۱ پیش کیا گیا۔ اس ڈراسے کی کہانی مقصود عالم ملک نے لکھی اور ہدایات بھی انھوں نے دیں۔ مکالمے عظیم سرور اور وحشی جنجوعہ نے لکھے۔ کہانی حب الوطنی کے تصور پر مبنی تھی۔ ایک بیوہ عورت بڑی جانفشانی سے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلواتی ہے۔ بڑا لڑکا اعلیٰ تعلیم پاتا ہے۔ چھوٹا لڑکا تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتا، زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتا ہے اور بڑے بھائی کی ترقی کو دیکھ کر حسد کرنے لگتا ہے۔ جذبۂ حسد اُسے وطن سے غداری کا راستہ دکھاتا ہے اور وہ اس ذریعے سے دولت حاصل کرکے عیش و عشرت کرنا چاہتا ہے۔ وطن کے خلاف اس کی سرگرمیوں کا راز ڈرامائی انداز میں فاش ہو جاتا ہے اور پولیس اُس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ وہ پولیس کی نظروں سے بچتا ہؤا گھر آتا ہے لیکن اس کی ماں، جو ایک محب وطن خاتون ہے، اپنی ماستا کو وطن پر قربان کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اُسے گولی مار دیتی ہے۔ یہ سیدھی سادی کہانی بڑے عمدہ انداز میں پیش کی گئی۔

۱۹۶۴ع میں حلقۂ ارباب فن نے لوک بلوچ کہانی ''سہرک'' نمائش کے لیے اوپن ایئر تھیٹر کے سٹیج پر پیش کی جس کے مکالمے اور گانے محشر رسول نگری نے لکھے تھے اور ہدایت کاری مقصود عالم ملک کی تھی۔ اس میں کراچی کی دو خاتون فنکاراؤں پروین اختر اور نسیم رعنا کے علاوہ بدیع الزمان اعظمی، رؤف بھٹی، آفتاب احمد، اے کریم، جاوید بٹ، اکرم ڈار

۱- نعرۂ حق، کوئٹہ، ۲۹ جولائی ۱۹۶۳ع -

اور محمود ہارون نے حصہ لیا ۔ اس لوک کہانی کا مزاحیہ حصہ وحشی جنجوعہ نے لکھا تھا ۔ اس کی موسیقی کو ریکارڈ کرنے کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا تعاون قابل قدر تھا ۔ صوتی اثرات مسٹر قاسم علی نے دیے ۔ بیگم سعید صاحبہ کلچرل سیکرٹری اپوا نے انعامات تقسیم کیے ۔[1]

۱۹۶۵ع میں حلقے نے ''پیاری بیگم'' ڈرامہ پیش کیا جسے جمیل ملک نے لکھا اور مقصود عالم ملک پیش کر رہے تھے ۔

۱۹۶۶ع میں حلقۂ ارباب فن کوئٹہ نے ایک مزاحیہ ، نغمہ بار اور[2] اصلاحی ڈرامہ ''پائل باجے چھم چھم چھم'' پیش کر کے عوام اور خواص سے داد تحسین حاصل کی ۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا شاہکار تھا جس میں ایک رقاصہ کا کردار پیش کیا گیا جو در اصل وطن کی دشمن اور دشمنوں کی جاسوسی کرتی تھی ۔ ڈرامے میں گو مزاح کا پہلو نمایاں تھا لیکن فنکاروں نے بازار حسن کے مضرت رساں ماحول کا ہُو بہو نقشہ کھینچا تھا ۔

اس ڈرامے کے مکالمے جمیل ملک نے لکھے ۔[3] نغمے سید محمد حسین شاہ زخمی اور مظہر کے تھے ۔ اس کی دھن عنایت شاہ نے بنائی ۔ اور موسیقی بلقیس بیگم ، کنیز بیگم ، قاسم علی ، رؤف بھٹی ، عنایت شاہ ، عبد الغنی اور احسان اللہ نے پیش کی ۔ استاد کریم بخش نے رقص ترتیب دیے تھے اور ہدایت کار تھے مقصود عالم ملک ۔ کامیڈی میں پہلا انعام احمد جمیل اور دوسرا انعام آفتاب احمد کو ملا ۔ سنجیدہ کرداروں میں پہلا انعام جمیل ملک اور دوسرا رؤف بھٹی نے حاصل کیا ۔ خواتین میں پہلا انعام مس کنول اور دوسرا انعام مس سائرہ کو ملا ۔ رقص میں پہلا انعام بے بی نرگس کو اور دوسرا مس دیبا کو ملا ۔ اِن کے علاوہ جاوید اقبال اور توفیق ملک کو دل جوئی کے انعام ملے ۔

۱۔ نعرۂ حق ، کوئٹہ ، ۱۸ اگست ۱۹۶۳ع ۔

۲۔ نعرۂ حق ، کوئٹہ ، ۱۳ ستمبر ۱۹۶۶ع ۔ اسی اخبار کی خبر میں لکھا ہے کہ ''مقصود عالم ملک کی اس پیش کش کو بہت سراہا گیا ۔''

۳۔ ''کوئٹہ میں اُردو ڈرامہ'' از جمیل ملک (غیر مطبوعہ) تحریر ۲۸ جولائی ۱۹۶۷ع ۔

۱۹۶۶ء میں سٹیج ڈرامے کو ریڈیو پاکستان کوئٹہ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ''پیار کے روپ ہزار'' ڈرامہ ۱۹۶۶ء کے جشن تمثیل کا آخری ڈرامہ تھا جسے سٹیج کیا گیا اور براہ راست ریلے ہؤا۔ اسے جمیل ملک نے لکھا اور ہدایت کار بھی وہی تھے۔

حلقۂ ارباب فن کوئٹہ کے ڈراموں میں سٹیج پر عملی طور پر (شوقیہ) حصہ لینے والوں میں جمیل ملک، رؤف بھٹی، احمد جمیل، آفتاب احمد اور مرغوب احمد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ریلوے انسٹیٹیوٹ کوئٹہ کے ڈراموں میں چودھری لال دین، عترت علی خاں، انور چودھری اور قاضی صاحب پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۲ء میں کوئٹہ میں ''آغا حشر آرٹ سوسائٹی'' بھی قائم ہوئی۔ اس کے سیکرٹری اے جی اسدی ہیں۔ اس سوسائٹی نے ۱۹۶۴ء میں 'فریدہ' ڈرامہ سٹیج کیا۔ جشن سبی میں ''لال حویلی'' کا مظاہرہ ہؤا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ریڈیو پاکستان کوئٹہ قائم ہؤا۔ اُس وقت سے اب تک بے پناہ ڈرامے نشر ہوئے جن میں علاقائی، ثقافتی، تہذیبی، معاشرتی، جاسوسی، المیہ اور طربیہ ڈرامے شامل ہیں۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے منظور بخاری مرحوم، شعیب حزیں، امان اللہ گچکی، عطا شاد، بشیر بلوچ، زاہد نقوی، جمیل ملک اور بیگم خورشید مرزا قابل ذکر ہیں۔ منظور بخاری (جو ۵ دسمبر ۱۹۶۲ء کو فوت ہوئے) شروع میں اس علاقے کے واحد ڈرامہ نگار تھے جنھوں نے یہاں کی عوامی کہانیوں کو ریڈیائی ڈرامے کی شکل میں لکھ کر اس علاقے کی ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی حیثیت کو اُجاگر کیا۔ اُن کے لکھے ہوئے یہ سب ڈرامے خاص طور پر مقبول ہوئے:

۱۔ حانی شہ مرید، ۲۔ للہ گراناز، ۳۔ باتو خان، ۴۔ دل کی ٹھنڈک ۵۔ زلیخا اور ۶۔ قربان گاہ۔

منظور بخاری مرحوم کے علاوہ اس خطے کے دوسرے ڈرامہ نگاروں کے مشہور ڈرامے یہ ہیں:

جمیل ملک: ۱۔ وفا کے بعد، ۲۔ ہمسفر، ۳۔ بُجھ گیا چاند، ۴۔ تصادم، ۵۔ خدا جانتا ہے، ۶۔ پیار کے روپ ہزار، ۷۔ تیسرا ساتھی،

۸- صدائے مرگ ، ۹- نور ، ۱۰- دائرے ، ۱۱- ایک خیال ایک پیکر -

زاہد نقوی : ۱- دروازہ ، ۲- اجنبی ، ۳- درد کا رشتہ ، ۴- رات باقی ہے ، ۵- ایک فرشتہ ایک شیطان -

عطا شاد : ۱- آواز کے سائے ، ۲- ساز کے آنسو ، ۳- آئینہ -

بیگم خورشید مرزا : ۱- کچے دھاگے ، ۲- نجم السحر ، ۳- سہاگ ، ۴- ڈوبتی کرنیں ، ۵- انتظار -

امان اللہ گچکی : ماہ ناز -

بشیر بلوچ : دوستیں اور شیریں -

عبد الحمید اعظمی : ۱- پیشین گوئی ، ۲- دعا بلا تھی ، ۳- ہزاروں خواہشیں ایسی ، ۴- زندگی کی کروٹ ، ۵- خلش -

شعیب حزیں : ۱- وہ کون ، ۲- پاگل ، ۳- دیا جلے ساری رات -

ان میں سے اکثر ڈرامے پاکستان کے دوسرے ریڈیو سٹیشنوں سے بھی نشر ہوئے - علاوہ ازیں ۱۹۶۴-۶۵ء میں کوئٹہ ریڈیو سے "تاریخ اسلام سے ایک ورق" کے عنوان سے ڈرامائی انداز کے فیچر بھی نشر ہوتے رہے - اُن کے لکھنے والوں میں محشر رسول نگری اور انعام الحق کوثر (اُن کے چند اہم ڈرامائی انداز کے فیچروں کے عنوان یہ ہیں : عمرو بن العاص ، بدر بن مغیرہ ، ہارون الرشید ، سلطان محمد اول اور بلوچستان کے فارسی شعرا کا عالم ارواح میں ایک اجتماع) قابل ذکر ہیں - حال ہی میں عشرت رحمانی نے "تاریخ اسلام سے ایک ورق" کے سلسلے میں ڈرامائی انداز کے فیچر "یوسف بن تاشفین" کو کامیاب پیش کش قرار دیا تھا ، جسے انعام الحق کوثر نے تحریر کیا اور اُس کے پیش کار جمیل ملک تھے -[1]

کوئٹہ قلات ریجن (سابقہ بلوچستان) میں اردو ڈرامے کی ترقی میں جہاں اور بہت کچھ کیا گیا ہے ، وہاں سرکاری طور پر بھی اس فن کی افادیت کو مانا گیا ہے - چند سال پیشتر محکمۂ زراعت کی صوبائی سطح کی ایک میٹنگ

۱- روزنامہ مشرق ، لاہور ، ۱۲ اپریل ۱۹۶۸ء -

میں تجویز پیش کی گئی کہ کسانوں اور زمینداروں کو حکومت کی مہیا کی گئی تازہ ترین سہولتوں سے متعارف کرانے کے لیے ہر ضلع میں چھوٹے چھوٹے ڈراموں کا اہتمام کیا جائے ۔ کیونکہ باوجود اس کے کہ حکومت کی تمام تر یہی کوشش ہے کہ ملک میں کسانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں لیکن کسان اپنی کم علمی کی بدولت اُن سے محروم رہتا ہے ۔ چند سال پہلے تو اس پر عمل نہ کیا جا سکا مگر ۱۹۶۷ء میں حکومت نے اس کی اجازت دے دی ۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوئٹہ میں محکمۂ زراعت Extention Service نے پہلا عملی قدم اُٹھایا اور ایک ڈرامہ سٹیج کیا ۔

اس ڈرامے کا مقصد تفریح کے ساتھ ساتھ وقت کے اہم مسائل اور اُن کے حل کو بھی پیش کرنا تھا ۔ میکسی پاک گندم اور قرضوں کی فراہمی اس ڈرامے کے خصوصی موضوع تھے ۔ یہ ڈرامہ محکمۂ زراعت کے افسران و کارکنان کی پہلی کامیاب کوشش تھی ۔ اس سلسلے میں آئندہ ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں اُردو ڈرامے سٹیج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ اس سے جہاں محکمۂ زراعت نے کسانوں کو بہت مفید باتیں سمجھائیں ، وہاں فن ڈرامہ کو بھی کوئٹہ قلات ریجن میں فروغ حاصل ہؤا ہے اور ہوگا ۔

اس ڈرامے کا نام تھا ''نئی راہیں'' جو محکمۂ زراعت کے ناصر عباس اور ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے جمیل ملک نے لکھا ۔ ہدایات کے بھی جمیل ملک ذمہ دار تھے ۔

بلوچستان میں اُردو ڈرامے کی اس مختصر سی روداد سے مکرر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ڈرامے سے بھی اس علاقے میں اُردو کے فروغ میں بڑی مدد ملی ہے ۔

لسانی عوامل

مسلمانوں کی تمام موجودہ علاقائی اور قومی زبانیں ملی اسلامی زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے یا تو براہ راست ماخوذ و منشعب ہیں یا بالواسطہ ان سے مکتسب اور فیض یاب ہوئی ہیں ۔ اکتساب کا دائرہ کم ہو یا زیادہ اس لیے کہ عربی قرآن و حدیث ، فقہ و تفسیر ، تاریخ و اسماء الرجال ، فلسفہ و علم الکلام اور خاصی حد تک علم و ادب کی زبان تھی اور اسے پیغمبر اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام ، محدثین و مفسرین ، مورخین و متکلمین ، علما و فضلا ، فصحا و بلغا اور ائمہ کرام نے چھ سات صدیوں تک اپنے ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا اور یہ اپنی اہمیت کی وجہ سے اب بھی زیر استعمال ہے اور ہم اس کے نور سے مستنیر و مستفید ہو رہے ہیں ۔ ایک طائرانہ اندازے کے مطابق صرف قرآن شریف کے کم و بیش پانچ سو الفاظ (مشتقات کے علاوہ) پاکستان کی روز مرہ علاقائی اور قومی زبانوں میں مروج ہیں ۔ دوسری ملی زبان یعنی فارسی علم و ادب ، حکومت و حکمت اور فن و شاعری کی زبان تھی اور اسے علما و فضلا ، حکما و عمال اور مورخین و شعرا نے کم و بیش اُنیسویں صدی تک ذریعۂ اظہار بنائے رکھا ۔ ان ملّی زبانوں کے طویل غلبے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی علاقائی اور قومی زبانیں ان سے متاثر ہوئیں اور متاثر رہیں گی ۔ بلوچی زبان بھی ان دونوں زبانوں کی خوشہ چینی سے مستثنیٰ نہیں لیکن عمومی اثرات کے علاوہ بلوچی پر فارسی کے خصوصی اثرات بھی مرتسم ہیں ۔

تاریخی واقعات اور بلوچی روایات متفق ہیں کہ بلوچ قبائل میر جلال خان کے زیر سرکردگی بارھویں صدی عیسوی میں مکران وارد ہونے شروع ہوئے ۔ وہ کم و بیش پانچ چھ سو سال تک شمالی و مغربی اور جنوبی و مشرقی

ایران کے درمیان گھومتے رہے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہؤا کہ ان کی زبان بلوچی پر اُس وقت کی فارسی (جو اوستا کی بگڑی ہوئی شکل تھی) اثر انداز ہوئی ۔ اسے بلوچی زبان کی خوش قسمتی سمجھیے کہ بلوچ اُس وقت یعنی ایران میں قیام کے دور میں اہل الحضر نہ تھے بلکہ اہل البدو تھے ، یعنی خیمہ بردار اور خانہ بدوش تھے ، ورنہ نہ صرف ان کی مخصوص زبان ہی فارسی میں مدغم ہو جاتی بلکہ جو علاقہ اب پاکستان میں شامل ہے ، اس پر ان کی یورش اور پیش قدمی بھی غالباً نا ممکن ہو جاتی ۔

بلوچستان میں ورود کے بعد مکران بلوچ قوم کا گہوارہ بنا ۔ گو مرورِ زمان اور سیاسی مواقع کی بنا پر ان کی اکثریت یہاں سے قلات ، سبی اور کچھی ہوتی ہوئی سندھ و گجرات اور پنجاب و سرحد کی طرف بڑھ گئی جہاں ان کی مخصوص زبان محفوظ نہ رہ سکی لیکن ان کے کچھ قبائل مستقلاً مکران میں بھی سکونت پذیر رہے ۔ یہ علاقہ چونکہ جنوبی ایران سے ملحق ہے بلکہ مکران ہی کا کچھ حصہ جنوبی ایران میں بھی واقع ہے ، اس لیے جب فارسی قوت و شوکتِ اسلام کی حاسل ہو کر نکلی اور ایک نئے عروج و صعود سے آشنا ہوئی تو مکرانی بلوچی زبان پر بھی لازماً اس کے اثرات مترتب ہوئے ۔ چنانچہ مغربی بلوچی بحیثیت زبان و ادب (جو ما قبل اسلام فارسی سے جزوی طور ہی پر متاثر تھی) فارسی کے نئے لسانی ظہور کی لپیٹ میں آ گئی ۔ بلوچی ادب کا مغربی یا مکرانی مکتب جو مُلا فاضل رند الملقب بہ ''غالبِ مکران'' مُلا قاسم رند ، مُلا رگام وشی رزم نگار اور مُلا عزت پنجگوری غزل گو و رومان نگار سے معنون و منسوب ہے ، خصائص ذیل کا مالک ہے [۱] :

۱- متقدمین کے بر عکس اس کے شعرا فوراً اپنا مدعا بیان نہیں کرتے تھے بلکہ حمد و نعت و منقبت کے بعد اصل مقصد کی نقاب کشائی کرتے تھے ۔

۲- متقدمین کے برعکس یہ شعرا اپنی نظم کبوتر یا عقاب کو مخاطب کرکے شروع نہیں کرتے تھے ۔

۳- متقدمین کے برعکس ان کی زبان پر عربی خصوصاً فارسی الفاظ و

۱- بلوچی شعری ادب پر ایک نظر، عطا شاد ، بولان ،کوئٹہ ۱۹۵۹-۱۹۶۰ع-

محاورات غالب ہیں ۔

لیکن اس مکتب نے بلوچی اندازِ نگارش میں جادہ ہائے نو تراش کر متاخرین کے لیے چھوڑے اور ان کی توجہ ایک سماجی شعور پر مرکوز کی ۔

مُلا فاضل کا ایک شعر ہے[1] :

غم خیال ءِ و عاشقی چاڑ ءِ
اسی دگر شغل ءِ آ دگر کار ءِ

(غم خیالات بلکہ تفکرات کے تسلسل کا نام ہے ، عاشقی ایک خواہشِ ناتمام ہے اور یہ دونوں اشغال ایک دوسرے سے مختلف ہیں) ۔

مُلا عزت بن للہ نے ایرانی بلوچستان کی بلوچ حسینہ مہر جان معروف بہ مُہرک بنت سامک کا مرثیہ لکھا ہے[2] :

من عاشق ءِ خدایاں پر دین ءِ مصطفیٰ یاں
عزت بن ءِ للہ یاں چو شہ مرید جلا یاں
کچکول عصا ءِ زیراں چو کابل ءِ فقیراں
ٹکڑ گدائی پنڈاں من مُہرک ءَ نہ گنداں

(میں خدا کا عاشق ہوں ، دین مصطفوی پر فدا ہوں ، میں عزت ابن للہ ہوں ، میں شاہ مرید کی طرح دل سوختہ ہوں ، عصا اور کشکول لے کر کابل سے آئے ہوئے فقیروں کی طرح در در گھومتا پھرتا ہوں لیکن مجھے مہرک نظر نہیں آتی) ۔

مُلا رگام وشی کہتا ہے[3] :

اگر قاروں بہ موسیٰ[4] مہرباں بت
پلنگ ءِ اشتراتی پاسپاں بت

۱- صابر ، عبدالرحیم ، قاضی : ''بلوچستان کی وادیوں میں'' داستان عزت و مہرک ۔

۲- ایضاً ۔

۳- ''بلوچی شعری ادب پر ایک نظر'' ، عطا شاد ، مطبوعہ بولان ، کوئٹہ ۱۹۵۹ع-۱۹۶۰ع ۔

شپ ءِ بست و نہم گر ساہکاں بت
اگر آتش گوں پنبہ ہم لساں بت
در و کیس گرگ نگھواں بساں بت
زر ءِ ماہی پہ ڈن و ہم تجاں بت
مگر گڈا منی صلع وتراں بت

(اگر قارون موسیٰ[۴] پر مہربان ہو سکتا ہے، اگر پلنگ شتروں کا پاسبان ہو سکتا ہے، اگر اُنتیسویں رات چاند رات ہو سکتی ہے، اگر آتش و پنبہ ہم وجود ہو سکتے ہیں، اگر بھیڑیا بکریوں کا نگھبان ہو سکتا ہے اور اگر مچھلی چٹیل میدان میں تیر سکتی ہے، تو پھر میں بھی اپنے عدو کے ساتھ صلح و آشتی کر سکتا ہوں)۔

ان اشعار سے فارسی اثر اظہر من الشمس ہے۔ یہ ناگزیر تھا اور اس کے تحت بلوچ اپنے قبائلی وجود سے نکل کر ملّی شعور کی پہنائیوں سے آشنا ہوتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے علامہ اقبال نے اسی ملّی شعور میں شناوری کرنے کے لیے اردو کے بجائے فارسی میں لکھنا شروع کیا اور اُن کی اردو پر بھی فارسی کی نمایاں چھاپ تھی۔

فارسی اس خطے کی سرکاری زبان بھی رہی۔ ریاست قلات میں تو ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ تک دربار میں فارسی ہی کا راج تھا۔ یہاں اب تک مساجد میں ابتدائی تعلیم اسی زبان میں دی جاتی ہے۔ یہاں فارسی کے متعدد نامور شعرا گزرے ہیں۔ رابعہ خضداری[۱]، جو رودکی کی ہم عصر تھی،

۱۔ سندھ اور مکران کے درمیان ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کے دارالسلطنت کا نام طوران تھا۔ غالباً بعد میں دارالسلطنت قزدار (خضدار) ہو گیا۔ (''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' حصہ دوم، صفحہ ۱۶۳)۔ لسترینج کی کتاب (''مسالک خلافت شرقیہ'') سے معلوم ہوتا ہے کہ ''طوران'' یا ''توران'' ایک علاقہ تھا جو مکران کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ اس کا دارالحکومت عربوں کے ورود کے وقت قزدار (خضدار) تھا۔ کبھی کبھی اس کے علاقے کے دو حصے بتائے جاتے تھے؛ ایک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اسی سر زمین سے متعلق تھی ۔ محمد عوفی رقم طراز ہے[1] :

"رابعہ بنت کعب القزداری اگرچہ زن بود اما بفضل بر مردان جہان بخندیدی ، فارسِ ہر دو میدان و والیِ ہر دو بیان بر نظم تازی قادر و در شعر فارسی بغایت ماہر و با غایت ذکاء خاطر و حدتِ طبع پیوستہ عشق باختی ۔"

ان نامور شعرا میں سے چند ایک براہوئی ، بلوچ اور پٹھان شاعر فارسی کے جید عالم بھی تھے ۔[2] ان میں قاضی نور محمد گنج آبوی (مصنف جنگ نامۂ میر نصیر خاں اول) ناطق مکرانی ، پیر محمد کاکڑ ، مُلا محمد حسن براہوئی ، اخوند زادہ عبدالعلی ، مولا داد ، مُلا فاضل ، یوسف عزیز مگسی ، مولانا محمد یعقوب ، مرزا احمد علی ، عایم اللہ عایم ، رہی ، زیب[3] مگسی وغیرہ خاص طور پر شہرت کے مالک ہیں ۔

در اصل اردو ، فارسی کا عطیہ ہے ۔ اُردو فارسی کی ہونہار لیکن فرمانبردار بیٹی تھی ۔ مادر فارسی نے اس کی تربیت کچھ ایسے کی ، اس کے حسن ظاہری کا اتنا خیال رکھا ، نوک پلک اور بناؤ سنگار کا ایسا اہتمام کیا کہ یہ نوخیز نٹ کھٹ بیٹی اپنے ہی جہال خلوت میں گرد و پیش کے عکس دیکھ دیکھ کر سمٹتی ، شرماتی اور آگے بڑھتی رہی ۔ بلوچستان میں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

طوران اور دوسرا بدرہا ۔ طوران کا دارالحکومت قزدار (خضدار) اور بدرہا کا قندربیل تھا جسے آج کل گنداوا کہتے ہیں (صفحہ ۳۳۱-۳۳۲) ۔ اغلب ہے طوران یا تو وہ مقام ہو جسے قزدار کہنے لگے یا کم از کم وہ قزدار کے پاس ہی واقع تھا ۔

۱۔ لباب الالباب ، حصہ دوم ، صفحہ ۶۱ ۔

۲۔ تفصیلات کے لیے ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب "بلوچستان میں فارسی شاعری" ملاحظہ فرمائیے ۔ اسے "بلوچی اکیڈمی" کوئٹہ نے شائع کیا ہے ۔

۳۔ "ثقافت اور ادب وادی بولان میں" ساتواں باب ملاحظہ فرمائیے ۔ "شعرگوئی در قلات و کوئٹہ" ہلال ، کراچی ۔ مارچ ، جون ۱۹۶۴ع ۔

اس کے پنپنے کے مواقع تھے اور ہیں ۔ یہ یہاں کے سب گروہوں کے ملاپ کا ذریعہ بنی اور اب تک ذریعہ ہے ۔[1]

بلوچستان کی دو اہم علاقائی زبانوں (بلوچی اور براہوئی) میں بہت سے عربی فارسی الفاظ تو اپنی اصل شکل ہی میں داخل ہیں ، جیسے اردو میں ہیں ۔ بعض کے تلفظ اور تحریر میں معمولی سا فرق آ گیا ہے ۔ اسی طرح عربی فارسی الفاظ بھی من و عن یا معمولی تغیر کے ساتھ ان زبانوں میں مستعمل ہیں ۔ مثلاً پہلی قسم میں آب بمعنی حرست[2] یا شان ، عجب بمعنی عجیب ، اجر بمعنی انعام یا عوض یا بدلہ ، ادب بمعنی تعظیم ، ارزاں بمعنی سستا وغیرہ بلوچی اور اُردو میں یکساں مستعمل ہیں ۔

لیکن فارسی کی سپر بمعنی ڈھال بلوچی اور براہوئی دونوں میں اسپر ہے ۔ پنجابی اور ہندی میں آسرا بمعنی سہارا یا بھروسا بلوچی میں آسرا بھی ہے اور آسرو بھی ۔ اُردو لفظ بچہ بلوچی میں بچک اور براہوئی میں بچو بن گیا ہے ۔ اردو لفظ ٹاٹ بمعنی پنجابی تپڑ بلوچی میں ٹپر اور براہوئی میں تُپر ہے جو نیچے بچھایا جاتا ہے ۔ اُردو لفظ ٹھگ بلوچی براہوئی دونوں میں ٹگ بمعنی ڈاکو ہے ۔ اردو لفظ جنج بمعنی برات دونوں زبانوں میں جن ہے ۔ اردو فارسی لفظ ریگ بمعنی ریت یا خاک ان دونوں زبانوں میں ریک ہے ۔ اردو لفظ لید بمعنی جانوروں کا فُضلہ بلوچی میں لڈ اور براہوئی میں پنجابی کی طرح لد ہے ۔ اُردو لفظ منزل بلوچی میں مزل اور براہوئی میں موزیل ہے ۔ اُردو لفظ ناس بمعنی نسوار بلوچی اور براہوئی میں اسی طرح مستعمل ہے ۔ لفظ آسان بلوچی میں عموماً آزمان اور براہوئی میں دونوں طرح استعمال ہوتا ہے ۔ پنجابی لفظ ہڑ بمعنی سیلاب بلوچی میں ہار بن جاتا ہے ۔ اردو لفظ بتی بلوچی اور براہوئی میں وٹ ہے ۔

۱۔ جب بلوچ یا براہوئی یا پٹھان آپس میں ملتے ہیں تو اردو ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔

۲۔ عبدالقیوم بلوچ ''بلوچی بوسیا'' ۔ صفحات ۱۲۱—۱۴۴ ۔

مزید تقابلی مطالعہ ملاحظہ فرمائیے ۔

زرعی ، مالیاتی اور شبانی اصطلاحات[۱] :

آبی : آب پاشی کی زمین ۔ اسے آوی بھی کہتے ہیں اور بناوا (بن آب) بھی کہا جاتا ہے ۔

انبار : گودام ، اناج گھر ، مقامی طور پر بمعنی کھاد بھی مستعمل ہے ۔

انبارچی : ذخیرۂ اناج کا محافظ نوکر ۔

انبار خانہ : ذخیرہ ، گودام ۔

انگوری باغ : انگوروں کا باغ ۔

آسی وان (آسیا بان) **:** چکی چلانے والا ۔

باغ : باغ ۔

بند : دریاؤں یا کھیتوں میں بند ، اسے پُل بھی کہتے ہیں ۔

بندوست : بندوبست ۔

بزگر : مزارع ۔

بیگار : زبردستی اور مفت مزدوری کرانا یا لینا ۔

چشا : بمعنی چشمہ ۔

غوا : بمعنی گائے ۔

حق سلکانہ : پنجوترہ ۔ پانچ فی صد معاوضہ جو نمبردار یا ملک سرکاری مالیہ وصول کرنے کے بدلے میں لیتا ہے ۔

ہود : بمعنی حوض ۔

اجارہ : بمعنی ٹھیکہ ۔

جریب : بمعنی پیمائش زمین یا آلۂ پیمائش ۔

جوال : بوری ۔ گوال (فارسی) بھی کہتے ہیں ، براہوئی میں گوال ۔ بلوچی میں گوالغ کہتے ہیں ۔ براہوئی والوں نے فارسی گوال ہی لیا ۔ عربی میں جوال ہے ۔

کاہ دان : بھوسہ جمع کرنے کے لیے خالی مٹی کا سٹور یا بھوسا جمع

۱- بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ، کوئٹہ ، صفحات ۳۷۶–۳۹۶ ۔

کرنے کا گڑھا -
کاریز : زمین دوز آبی نہر -
کاریگر : ہنرمند - براہوئی اور بلوچی میں بالعموم بیل کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ سارا دن کام کرتا ہے -
خشکاوا : خشک آبہ - وہ زمین جو محض بارش سے زیر کاشت آتی ہو -
کِشت : کاشت - کاشت کار کو کشت گر یا کشت گار کہتے ہیں -
مافی : وہ زمین جس پر مالیہ (محصول) معاف ہو -
محصول : سرکاری لگان (نقد یا جنس کی صورت میں) -
مالکی : حق ملکانہ -
میراث : بمعنی موروثی زمین -
میراو : فارسی میرِ آب - (بولنے میں میراب) جو کاریز کا پانی برابر برابر تقسیم کرتا ہے -
ِملک : بمعنی ملکیت -
ُمز یا ُمزد : بمعنی مزدوری -
نہال : چھوٹا پودا -
نہال خانہ : پھولوں کی نرسری - اسے ذخیرہ بھی بولتے ہیں -
پیوند : ایک بُوٹے کا دوسرے بُوٹے سے ملاپ کرنا -
پٹواری : پٹواری -
قلم : کسی بُوٹے کا حصہ لے کر نئے بُوٹے کی حیثیت سے لگانا -
رمہ : ریوڑ ، اُردو میں یوں آتا ہے : رمہ پالتے تھے ، رمہ چراتے تھے -
سیلابہ : وہ زمین جس میں سیلاب سے کاشتکاری ہوتی ہو -
شگوپا : شگوفہ -
شپانا : شبان (گڈریا) براہوئی میں شپان یا شوان بھی بولتے ہیں - بلوچی میں شوانغ کہتے ہیں -
تاک : انگور کی بیل ، یا کوئی بھی بیل -
توبرہ : گھوڑے کو دانہ کھلانے والا تھیلا -
تخم : بیج -

اُش : مساوی ہے فارسی اشتر بمعنی اونٹ کے -
زرخرید : وہ زمین جو اپنے پیسے سے خریدی جائے -
چار شاخا : گندم اُڑانے کا آلہ -
دو شاخا : گندم اُڑانے کا آلہ -
کہکشا : تنگڑ -
تبر : کلہاڑی -
زغ : بیلوں کا جؤا یا پنجالی - برے[1] کی تحقیق کے مطابق یہ فارسی لفظ 'جغ سے لیا گیا ہے - 'جغ بمعنی لکڑی کا جؤا جو بیل کی گردن پر ڈال کر چلاتے ہیں - براہوئی میں جغ کہتے ہیں -
ابا : عربی لفظ آب سے نکلا ہے - براہوئی میں بمعنی باپ - اُردو میں ابا ، بلوچی میں ابا اور سندھی میں ابو آتا ہے -
آباد : بسنا ، خوشحال ، گنجان آباد ، زیر کاشت - براہوئی میں بھی آباد ہی استعمال ہوتا ہے -
آباد سال : اچھا زرعی سال ، اچھی فصلوں کا سال - براہوئی میں مستعمل -
آبدار : عزت والا ، معزز - وہ کھیت جس میں پانی کھڑا ہو -
آچار : (فارسی) اُردو اور براہوئی میں مستعمل -
ادالت : (عربی عدالت) براہوئی میں 'ع' نہیں ہے بلکہ الف ہی آتا ہے -
آڑتی : براہوئی میں بمعنی آٹا - بلوچی آرت ، فارسی آرد ، اُردو میں بھی آرد استعمال ہو جاتا ہے -
اسل : (براہوئی - عربی کے 'عمل' سے ہے) فارسی ، اُردو اور بلوچی میں عمل استعمال ہوتا ہے -
آزسودہ کار : براہوئی میں بمعنی تجربہ کار - فارسی اُردو میں آزمودہ کار ہے -
بندغ : انسان ، مخلوق - بلوچی میں بندغ ، فارسی اُردو میں بندہ -
بنا : عمارت ، بنائے کہنہ (اُردو میں آتا ہے) - اصل عربی ہے ، ویسے

۱- برے ، سر ڈینس : ''دی براہوئی لینگویج''جلد دوم ، صفحہ ۱۵۰
عبدالقیوم بلوچ : ''بلوچی بومیا'' فرہنگ ، صفحات ۱۲۱ ـــــ ۱۴۴ -

فارسی ، اُردو اور براہوئی میں استعمال ہوتا ہے ۔

درست : تمام ، سب (براہوئی) بلوچی بھی درست ، پشتو دَرست ، فارسی درست ، اُردو درست بمعنی مکمل ۔

دُزّ : (براہوئی) چور ۔ بلوچی بھی دُزّ ۔ فارسی اُردو دُزد بمعنی چور ۔

گام : (براہوئی) قدم ۔ فارسی اُردو میں بھی یہی آتا ہے ۔

گیشتر : براہوئی میں بمعنی زیادہ ۔ بلوچی گیشتر ۔ فارسی ، اُردو میں بیشتر ۔

گوازی : براہوئی بلوچی میں کھیل ۔ فارسی اُردو میں بازی ۔

غلیم : بمعنی دشمن ۔ تینوں (براہوئی ، بلوچی اور پشتو) میں مستعمل ہے ۔ عربی ، فارسی اور اُردو میں غنیم ۔

ہمسایہ : (براہوئی) بمعنی پڑوسی ۔ بلوچی ، فارسی اور اُردو میں بھی ہمسایہ ہی استعمال ہوتا ہے ۔

ہُچ : بمعنی اُونٹ ۔ پشتو میں اُوش ۔ بلوچی میں ہُشتر ۔ فارسی میں اُشتر ۔ اُردو میں شتر ۔

جادو : فارسی کا لفظ ہے ۔ اُردو اور براہوئی میں استعمال ہوتا ہے ۔

ازم : (براہوئی میں بمعنی عزم) عربی ، فارسی ، اُردو اور بلوچی میں بھی مستعمل ہے[1] ۔

اُردو : (ترکی) فارسی اور بلوچی میں مستعمل ہے[1] بمعنی سازو سامان ، فوج ، فوج کا کیمپ ۔ براہوئی میں اُرد آتا ہے ۔

پیری : بڑھاپا ۔ فارسی ، اُردو ، براہوئی اور بلوچی سب میں یہی استعمال ہوتا ہے ۔

تہمت : الزام ۔ فارسی ، اُردو اور بلوچی میں مشترکہ آتا ہے ۔

تیار : یہ بھی ان تین زبانوں میں مشترک ہے ۔

جزم : پکا ارادہ ، یقین محکم (عربی) ۔ فارسی ، اُردو اور بلوچی میں مستعمل ہے ۔

۱۔ برے ، سر ڈینس : ''دی براہوئی لینگویج'' حصہ دوم سے مستفاد ۔ غیاث اللغات مطبوعہ کانپور ۔

ریش : (فارسی) بمعنی زخم ۔ اُردو اور بلوچی میں استعمال ہوتا ہے ۔
ذات : خود ، قوم ، قبیلہ ، اصلیت ۔ فارسی ، اُردو اور بلوچی میں آتا ہے ۔
ذامن : (بلوچی) عربی میں ضامن آتا ہے ۔
زہر ، زینت ، زیب : (بمعنی موزوں ، مناسب) شاگرد ، شال ، شام : (بمعنی شام کا وقت یا شام کا کھانا) شرم ، کرم : (کیڑا) کور : (اندھا) ۔
گرم : (hot) ، سار : (سانپ) ماہ : (مہینہ ، چاند) مجال : (طاقت ، جرأت) ۔
مراد : (کامیابی) مزار ، مشت : (مکا ، مٹھی بھر) سہان : ناپید ، نام : (شہرت ، عزت) نشان : (پتہ وغیرہ) نشانی : (یادگار) ننگ : (عزت ، حرمت) ۔
یار : یار فارسی ، اُردو اور بلوچی میں مشترک ہے ۔
زیانی : (بلوچی بمعنی نقصان) فارسی اور اُردو میں زیاں آتا ہے ۔
کاغذ : فارسی اور اُردو میں مستعمل ہے ۔ بلوچی میں کاگد آتا ہے ۔
گفتار : (فارسی اور اُردو) بلوچی گُپتار ۔
لُوچ : بمعنی ننگا ۔ فارسی ، اُردو اور براہوئی میں مشترکہ استعمال ہوتا ہے ۔
نابالغ : بلوچی میں نابالگ آتا ہے ۔
نقصان : بلوچی میں نُکسان لکھا جاتا ہے ۔ براہوئی میں نُسخان بھی کہتے ہیں ۔
نیک : عربی ، فارسی ، اُردو ، براہوئی اور بلوچی میں استعمال ہوتا ہے ۔
وام : بلوچی ، فارسی ، اُردو اور براہوئی میں مستعمل ہے ۔
برنا : جوان (فارسی) ، بلوچی اور براہوئی میں ورنا آتا ہے ۔
خاطر : دل ۔ بلوچی میں ھاتر (بلوچی میں 'ط' نہیں ہے) ۔
حاجی : بلوچی میں ھاجی ۔
حال : بلوچی میں ھال ، براہوئی میں بھی ھال ۔
حب : محبت ، دوستی ۔ عربی ، فارسی ، اُردو میں آتا ہے ۔ بلوچی اور براہوئی میں ھُب لکھا جاتا ہے ۔ (بلوچی اور براہوئی میں صرف دوچشمی * استعمال ہوتی ہے)

یاد : حافظہ ، یاد آنا ۔ فارسی اُردو میں رائج ۔ بلوچی میں یات مروج ۔
یاغی : بمعنی باغی ۔ بلوچی میں یاگی ۔ براہوئی میں بھی ایسے ہی استعمال ہوتا ہے ۔
یقین : عربی ، فارسی اور اُردو میں مروج ہے ۔ بلوچی میں یکین آتا ہے[۱] ۔

بلوچی اور براہوئی میں "مذہبی اصطلاحات" کم و بیش ویسے ہی استعمال ہوتی ہیں جیسے اُردو میں ، فرق صرف تلفظ میں ہوتا ہے ، جیسے یقین (یکین) نماز (نواز) روزہ (روچہ) ایمان (ایمان) حج (ھج) خدا (ھدا) آتا ہے ۔

اَگاڑی : (براہوئی)[۲] یعنی وہ رسی جو گھوڑے کی اگلی ٹانگوں میں باندھ کر کھونٹے میں اٹکا دیتے ہیں ۔
اُردو میں اَگاڑی بمعنی آگے کا حصہ ، سامنے ، گھوڑے کی رسی بولا جاتا ہے ۔ اس سے "اگاڑی پچھاڑی" بمعنی ذمہ داریاں اور "اگاڑی پچھاڑی تڑانا" بے قراری ظاہر کرنے کی خاطر استعمال ہوتا ہے ۔

ھپہ : (براہوئی) بچوں کی زبان میں ھپہ بمعنی کھانا ، غذا رائج ہے ۔
اُردو میں "ہپا" بولا جاتا ہے اور بچوں کی زبان میں کھانا ، غذا ۔ بچوں کے کھانے کی نرم کھچڑی وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ اس سے "ہپ کر جانا" بمعنی نگل جانا ، کھا جانا ، چٹ کر جانا بنا ہے ۔ "ہپ ہپ کرنا" یعنی پوپلوں کی طرح منہ چلانا ۔ ہپّو بچوں کی زبان میں کھانے پینے کی کوئی چیز ، پوپلی عورت اور "ہپ ہپانا" بھی ہانپنا وغیرہ

۱۔ انگریزی بلوچی ڈکشنری (سنڈیمن لائبریری کوئٹہ) ۔
روسان ، انور ، پروفیسر : "بلوچی لٹریچر اینڈ لینگویج" (مطبوعہ) جنرل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی اکتوبر ۱۹۶۷ع و جنوری ۱۹۶۸ع ۔
۲۔ برے ، سر ڈینس : "دی براہوئی لینگویج" جلد دوم ۔
کامل القادری ، شاہ : "براہوئی اور اُردو" یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ع ، صفحات ۳۰–۷۸ ۔

آتا ہے۔

اُردو اور براہوئی لفظ کی مماثلت ظاہر ہے۔ براہوئی میں ایک اور لفظ ''ھسّپا'' (بمعنی حیرت زدہ) مستعمل ہے جس کا تعلق سندھی ''ھسّپا'' (بمعنی اُداس ہونا) سے ہے۔

اٹکل : (براہوئی) قیاس ، ظن ، اندازہ ، تخمینہ کرنا ، اندازہ لگانا ، اٹکل چلانا وغیرہ معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ لفظ سندھی ، جٹکی سرائیکی اور بلوچی میں براہوئی کی طرح ہی بولا جاتا ہے۔ اُردو میں اٹکل بمعنی اندازہ ، قیاس استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے اٹکل پچو (بمعنی اندازے سے ، بغیر تحقیق کے) بنا ہے۔

بابو : براہوئی بمعنی باپ۔ اس کی اصل تامل ہے۔ اُردو میں میاں ، جناب ، تخاطب احترامی کے معنوں میں مستعمل ہے۔

بیر : براہوئی بمعنی ایک پھل۔ اُردو میں بھی یہی بولا جاتا ہے۔

بَیر : براہوئی میں بمعنی دشمنی ، ضد ، بدلا مستعمل ہے۔[1] اُردو میں بھی یہی معنی ہیں۔ نوشکی (کوئٹہ ڈویژن) کے لوگ 'ویر' بولتے ہیں۔ سندھی اور جٹکی سرائیکی میں بھی 'ویر' ہے۔

بیڑی : بمعنی جولان۔ لوہے کی وہ زنجیر جو مجرم کے پاؤں میں ڈالتے ہیں۔ اُردو میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز منّت کا وہ ڈورا یا سونے چاندی کی زنجیر جو ماں یا باپ لاڈلے بچوں کے پاؤں میں ڈالتے ہیں۔ مجازاً تعلقاتِ دنیوی بھی بولا جاتا ہے۔

براہوئی میں بیڑی بمعنی پانی کا جہاز ، بوٹ اور دخانی کشتی مروج

۱۔ بلوچی میں بھی بمعنی انتقام آتا ہے۔ چاکر کا شعر ہے :

ہُوتی بیر منی شاہی ئیں
من بالادء کلات زیدانی

(بہادروں کا انتقام بھی مجھے پیارا ہے جو میرے اُونچے قلعے پر حملہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں)۔
(قدیم بلوچی شاعری ، مرتبہ میر خدا بخش مری بلوچ ، صفحہ ۲۸)۔

ہے - اُردو میں ''بیڑا'' آتا ہے - بلوچی میں ''بیڑی'' استعمال ہوتا ہے -

بوھاری : براہوئی میں بمعنی جھاڑو ، بُہاری - اُردو میں (خاص کر اہل بہار) بُہارنا بمعنی جھاڑنا ، صاف کرنا ، جھاڑو دینا بولتے ہیں - پنجابی میں بُہاری - بلوچی ، سندھی اور جٹکی سرائیکی میں بوھاری مروج ہے - اُردو اور براہوئی کی مشابہت روشن ہے -

چوکھاٹ : (چوکھٹ) دروازے کی وہ چار لکڑیاں جن میں کواڑ لگائے جاتے ہیں - براہوئی کے علاوہ اُردو میں بھی انھی معنوں میں مستعمل ہے -

چُڑ چُڑ : براہوئی میں بمعنی چوں چوں کرنا ، چڑ چڑ کرنا ، چرکنا ، چرغنا ، ناگوار خاطر بات کرنا ، فضول باتیں کرنا -

اُردو میں بھی ''چڑ چڑ اور چڑھ چڑھ'' ان ہی معنوں میں آتا ہے - اسی سے چِڑنا یا چِڑھنا (بگڑنا ، ناراض ہونا) چڑانا (چھیڑ نکالنا ، غصہ دلانا) وغیرہ بنا ہے -

چُپ : بمعنی خاموش - ''چُپی'' بمعنی خاموشی ، راز داری براہوئی میں آتا ہے - چپ براہوئی کے علاوہ اُردو ، بلوچی ، سندھی اور جٹکی میں یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے -

چوشنگ : براہوئی میں چوسنا - سندھی اور جٹکی سرائیکی میں ''چوپن'' بلوچی میں چوسنگ ، پشتو میں چوش اور اُردو میں چوسنا -

دائی : (براہوئی) جنائی یا جنانے کا فن جاننے والی عورت - براہوئی کے علاوہ اُردو ، بلوچی ، پشتو ، جٹکی سرائیکی اور سندھی میں بھی مروج ہے - اُردو میں اس کے معنی میں تنوع ہے جیسے دایہ ، ماما ، انا وغیرہ - اسی سے کہاوت ہے : ''دائی کے سر پھول پان'' (ہر برائی بیچارے کمزور آدمی کے سر آتی ہے) - یا پھر مشہور ہے : ''دائی سے پیٹ چھپانا'' (جاننے والے آدمی سے بات چھپانا) -[۱]

دھوبی (دوبی) : کپڑا دھونے والا - اُردو میں بھی آتا ہے -

۱- جدید لغات اُردو ، صفحہ ۲۲۰ -

دھوں : براہوئی بمعنی دھؤاں ، دود - سندھی دوھوں ، جٹکی سرائیکی دوہاں ، بلوچی دوت اور اُردو دھواں -

ڈبی : براہوئی میں ڈبیا - (دبلی بھی بولتے ہیں) - پنجابی میں ڈبی ، بلوچی میں ڈبی یا دبلی[1] - سندھی اور جٹکی سرائیکی دبلی ، اُردو ڈبا اور ڈبیا -

ڈنڈ : جرمانہ ، سزا - براہوئی ، بلوچی ، سندھی ، جٹکی سرائیکی اور اُردو میں رائج ہے - پنجابی میں ڈن" -

ڈنڈا : لاٹھی - براہوئی ، بلوچی ، جٹکی سرائیکی اور اُردو میں مروج - سندھی میں ڈنڈو آتا ہے - پنجابی میں ڈنڈا -

ڈنگ : (براہوئی) بمعنی کاٹنا ، چبھونا ، ڈنک مارنا - اُردو میں ڈنک (جانوروں کا ایک عضو جو نوکدار اور زہریلا ہوتا ہے جیسے بچھو کا ڈنک ، بھڑ کا ڈنک) مجازاً نشتر ، تیز نوکیلے آلے کی نوک وغیرہ - اسی سے ''ڈنک مارنا'' (زہریلی چیز کا کاٹنا ، مارنا ، کاٹ کرنا) بنا ہے - براہوئی ''گ'' کا اُردو ''ک'' سے تبادلہ اکثر ہوتا ہے اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے - پنجابی ڈنگ -

ڈول : براہوئی میں بمعنی ظرف ، برتن ، ڈول - اُردو میں بھی ڈول ایک خاص برتن کا نام ہے -

ڈوم : براہوئی میں خانہ بدوش گویے" ، لوڑی ، میراثی - بلوچی ، سندھی ، جٹکی سرائیکی میں ڈومب ، اور اُردو میں ڈوم (گانے بجانے والا) ہے - پنجابی میں ڈوم ، میراسی ، گانے والا -

دبنگ : براہوئی میں بمعنی ڈوبنا - اُردو کے مصدر ''ڈوبنا'' سے اس کی مناسبت واضح ہے -

سمھبال : براہوئی نظر رکھنا ، نگرانی کرنا ، بلوچی اور جٹکی سرائیکی میں ''سنبھال'' - سندھی ''سنبھار'' اور اُردو میں سنبھال ، سنبھالنا -

---

۱- پاکستان میں اُردو ، صفحہ ۱۰۳ (مضمون ''بلوچی اور اُردو'' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر) امروز ، لاہور ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ع -

کجّل : کاجل - بلوچی ، سندھی اور جٹکی میں بھی ''کجل'' - یہ اصلاً سنسکرت لفظ کاجلہ ہے جس سے آردو ''کاجل'' بنا ہے - پنجابی میں کجل -

کپوت : براہوئی بمعنی کبوتر - بلوچی ''کپوت'' اور ''کبودر'' - اُردو ، سندھی اور جٹکی سرائیکی میں ''کبوتر'' -

کڑی : براہوئی ، سندھی ، جٹکی سرائیکی اور بلوچی میں بمعنی زنجیر ، چھلا استعمال ہوتا ہے - اُردو میں 'کڑا' مذکر کے لیے اور کڑی مؤنث کے لیے بمعنی لوہے کا حلقہ ، چھلا آتا ہے - مماثلت واضح ہے ، پنجابی کڑی -

کوٹنگ : قیمہ کرنا ، کاٹ ڈالنا ، ٹکڑے ٹکڑے کرنا - آردو مصدر کوٹنا اور کاٹنا سے اس کی نسبت ظاہر ہے - براہوئی میں 'کٹنگ' (کوٹنا) بھی مستعمل ہے - براہوئی مصدر کی نشانی ''انگ'' ہے - بسااوقات ''انگ'' کا الف حذف کر دیتے ہیں (تھڑنگ ، ہڑنگ یعنی کاٹنا استعمال ہوتا ہے) -

گھڑی : براہوئی اور اُردو میں بمعنی وقت کا ایک حصہ ، ساعت - پنجابی گھڑی بمعنی حصۂ وقت ، نیز گھڑے کی مؤنث -

کونڈا : (براہوئی) کھرل ، ہاون ، کونڈی (پتھر یا مٹی سے تیار کیا ہؤا) اردو میں کونڈا (آٹا گوندھنے کا مٹی کا برتن ، ناند ، پرات وغیرہ) پنجابی کونڈا ، کونڈی -

گاڈی : براہوئی ، بلوچی ، سندھی اور جٹکی سرائیکی میں بمعنی گاڑی ، چھکڑا - پنجابی اور اُردو میں گڈا (چھکڑا لادنے کی گاڑی ، مٹھا ، بنڈل) اور گاڑی (آدمیوں کے سوار ہونے کی بہلی ، بگھی ، ریل گاڑی وغیرہ) بولا جاتا ہے -

گڑھنگ : براہوئی (ایجاد کرنا ، کوئی نئی بات یا چیز بنانا) اردو (گڑھنا یعنی جھوٹی بات بنانا ، زیور وغیرہ بنانا یا تیار کرانا) -

لج ، لاج[1] : بمعنی شرم - اردو مصدر لجانا (شرمانا) علاوہ لاج شرم ، حیا کے معنوں میں آتا ہے - پنجابی لاج اور لج -

---

۱- اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ع -
اسی کتاب کا صفحہ ۳۲۰ بھی ملاحظہ فرمائیے : لج = لاج -

لٹ : براہوئی میں بمعنی لٹھ ، ڈنڈا ، چھڑی ، سونٹا ۔ اردو ، بلوچی ، جٹکی اور سندھی میں ''لٹھ'' بولا جاتا ہے ۔

لڑ : بمعنی صف ، قطار ، طرف ، جمعیت ۔ براہوئی کے علاوہ بلوچی ، پشتو ، جٹکی سرائیکی اور سندھی میں ''لڑ'' بولا جاتا ہے ۔ اردو میں لڑ بمعنی لڑی ، ڈور ، رسی کا بل ، قطار ، لائن ، وسیلہ ، زنجیر ، ٹولی اور جماعت آتا ہے ۔

لوٹ : براہوئی اور اُردو میں ان معنوں میں مروج ہے : وہ مال جو چھین کر لایا جائے ، مفت کا مال ، چوری کا مال ۔

موچی : اردو اور براہوئی میں جوتا گانٹھنے والا ، جوتا بنانے والا ۔ پنجابی میں موچی ۔

نہ : فارسی ، اردو اور براہوئی میں 'نہیں' کے معنوں میں مستعمل ہے ۔

والی : براہوئی میں کان کا زیور بال آتا ہے ۔ اردو میں ''بال'' ہے ۔ پنجابی میں بالی ، بالیاں ۔

ھڈ : براہوئی میں بمعنی ہڈی ۔ اُردو میں بھی ہڈی ہی بولتے ہیں ۔ پنجابی ہڈ ۔

تول : اردو کے علاوہ براہوئی ، بلوچی ، جٹکی سرائیکی ، پنجابی ، سندھی اور پشتو میں بمعنی وزن ، وزن کرنا ، تول ، تولنا مروج ہے ۔ پنجابی تول ۔

تولہ : مقدار ، ناپنے کا پیمانہ ۔ براہوئی اور اردو میں رائج ہے ۔

پورا : براہوئی اور اردو میں بمعنی لبریز ، کامل ، بھرا ہؤا ، پکا وغیرہ ۔

جھٹ : (جٹ) براہوئی اور اردو میں بمعنی جلد ، فوراً ، لمحہ میں ، بولا جاتا ہے ۔

جھڑکنگ : براہوئی بمعنی جھڑکنا ، برا بھلا کہنا ، ملامت کرنا ۔ اردو میں جھڑکنا ، جھڑک مستعمل ہے ۔

جُھکنگ : بمعنی جھکنا ۔ اردو مصدر جھکنا سے مشابہت واضح ہے ۔

جی : اردو اور براہوئی میں بمعنی جناب ، حضور ، ہاں ۔

پیچھاڑی : بمعنی پچھلا حصہ ، عقب ، پشت ، خاص کر وہ رسی جو

چوپایوں کے پچھلے دونوں پاؤں میں باندھی جاتی ہے ۔ اگاڑی پچھاڑی بمعنی آگے پیچھے بولا جاتا ہے ۔ اُردو میں بھی مستعمل ہے ۔ پشتو میں ''پیچھواڑی'' بولتے ہیں ۔ جبکہ اُردو میں یہ لفظ مکان کے پچھواڑے سے مختص ہے ۔[1]

جاگنگ : براہوئی بمعنی نگرانی ، پاسبانی کرنا ، جاگنا ۔ اردو میں جاگنا اور جگانا مصادر ہیں ۔[2]

جانی : بمعنی معشوقہ ، محبوبہ ، پیاری ۔ سنسکرت میں 'جانی' کے معنی محض بیوی آتا ہے اور اسی مخصوص معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے ۔ فارسی میں 'جانی' پیاری ، معشوقہ وغیرہ کے لیے آتا ہے ۔ بلوچی اور براہوئی میں دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ اردو میں محض محبوب ، محبوبہ اور لاڈ پیار سے بچوں یا عزیز ترین دوست کو جانی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں ۔

بھرتی : براہوئی میں بمعنی رجسٹر میں داخلے کا اندراج ، سپاہیوں اور فوجیوں کا تقرر ۔ غالباً اس کا تعلق اُردو میں مروج لفظ 'بھرت' (بمعنی اتنی چیز جتنی بھرنے کے لیے درکار ہے) سے ہے جس سے ''بھرتی'' (وہ چیز جو کسی چیز کے اندر بھری جائے) بنا ۔ علاوہ ازیں بیکار ، فضول (جیسے بھرتی کا شعر ، بھرتی کا مال وغیرہ) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔

۱۔ برے ، سر ڈینس : ''دی براہوئی لینگویج'' جلد دوم ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۷ء سے مستفاد ۔
رومان ، انور ، پروفیسر : ''دی براہوئی آف کوئٹہ قلات ریجن'' کراچی ، ۱۹۶۰ء ۔
اسی کتاب کا اردو ترجمہ ، از انعام الحق کوثر مطبوعہ ''ثقافت'' لاہور جنوری تا مئی ۱۹۶۴ء ۔

۲۔ اُردو کے ایک ادیب اور شاعر مسلم ضیائی نے اس سے ایک نیا لفظ ''جگوری'' وضع کیا ہے جس سے مراد ایسی صنفِ شاعری ہے جو بچوں کو خواب سے بیدار کرنے کے لیے گائی جائے ۔ یہ 'لوری' کے برعکس ہے جو بچوں کو بہلانے اور سلانے کے لیے گائی جاتی ہے ۔ (اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ء ، صفحہ ۷۳) ۔

اس کا مصدر بھرنا بمعنی پُر کرنا (مجازاً) تقرر کرنا ہے - بقول داغ :

دوزخ جگہ عذاب کی ، جنت ثواب کی
بھرتی کہاں کروں دلِ خانہ خراب کی[1]

بعض اُردو میں مستعمل الفاظ ویسے ہی یا ذرا فرق کے ساتھ بلوچی شاعری میں ملتے ہیں - ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

جاگہ = جگہ : گؤشتہ چاکر ءَ میرین ءَ
چن زیر پہ وت ءَ جاگا ہے
ہر جاگہ کہ تھئی دل لوٹیت

(میر چاکر نے جواب دیا ؛ اپنے لیے کوئی بھی علاقہ (جگہ) منتخب کر لو) -

ڈاچی = اونٹنی : ڈاچی آتکگنت دنزان ءَ
شیر = دودھ : شیر پہ نافغاں شنزان ءَ

[(گوہر) کی اونٹنیاں کانپتی اور غمگین آئیں ، تھنوں سے دودھ بہاتی ہوئی] -

لال = سرخ : پاد پیچاں گوں قباہاں
پاد ءَ لالیں موزغاں

(ریشمی کوٹ اور گلوبند پہنے ، ان کے پاؤں میں لال موزے چڑھے رہتے ہیں) -

کاٹار = کٹار[2] : کارچ و کاٹار نقر ہین انت
مُندری = انگوٹھی: دست ءِ مندری تنگویں

۱- کامل القادری ، شاہ : ''براہوئی اور اُردو'' یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ء -
کامل القادری ، شاہ : ''براہوئی مبین اور ہم'' ایلم ، مستونگ -

۲- ایک اور نظم میں آتا ہے :

کارچ و کاٹار منی تیغ خراسانی
سیاہ گوں سوچی دو تکین ، سنجاں

(میرا خنجر اور خراسان کی بنی ہوئی تلوار اور میری کالی گھوڑی موچیوں کے بنے ہوئے قیمتی ساز و سامان سمیت نذر ہیں) -
(قدیم بلوچی شاعری ، صفحہ ۱۱۴)

(ان کے خنجر چاندی کے بنے ہوتے ہیں اور ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں پڑی رہتی ہیں) ۔

موچی = موچی : دیست اِش موچی گرانڈ بورین
بستغی ءَ من مسّنه ءِ سایا

(انھوں نے ایک موچی کا دھاری دار دنبہ دیکھا جو چھجے کے سایے میں بندھا ہوًا تھا) ۔

جگ = دنیا : رند و لاشار من بن ءَ براتان
جگ سہی انت کہ حمزہ ذاتان

(رند اور لاشاری نسلاً بھائی بھائی ہیں ۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ حمزہ کی اولاد ہیں) ۔

لوہار = لوہار : او منی بیل گاگرا لوہار
مُلا محمد بکر ءِ اُستاد

(اے علاقۂ گاگر کے مشہور لوہار ! تم مُلا محمد اور بکر کے اُستاد ہو) ۔

واگ = باگ : گڈ ءَ بیبرگ سنگھیں گال آتکہ
واگ گپتگنت سردار ءِ

[تب بہادر بیبرگ (میر چاکر) کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کہنے لگا] ۔

ہتھیار = ہتھیار : مرد کہ ایوک و دست مورک بی
ہتھیار کہ مہ بنت اش

[(ترک نے کہا) اگر آدمی تنہا اور خالی ہاتھ ہو ، اس کے پاس ہتھیار نہ ہوں)] ۔

آنہی ءَ تفاقان چچوں بیت
(تو اس کے بچاؤ کے کیا امکانات ہیں ؟)

ہاتھی = ہاتھی : گڈ ءَ ہاتھی پرنیتنت خونی ئیں
ہاتھی آتکہ تک کپتہ

(وہ ایک بدمست اور خونی ہاتھی کو لے آئے جس نے چھوٹتے ہی میر چاکر پر حملہ کر دیا) ۔

سہم = خوف : بیورغ گونڈلاں رندی غان
سہمنیتہ جڑیں ہندی آن

(اے بیورغ ! تم دشمن کے تیروں کو دیکھ کر کانپ گئے ہو ، ہندوستان کی بنی ہوئی چمکدار تلواروں سے سہم گئے ہو) ۔

لٹھ = لاٹھی : داتئی دست لٹھے پرے گوخاں
سیر مگیں گامیشاں بہ چارینی

(اور گائے چرانے کے لیے اس کے ہاتھ میں چھڑی (لاٹھی) دے دی تا کہ وہ سرمئی بھینسوں کو چرائے) ۔

ڈھو = ڈھونا : من سر ءَ سیاہیں اشکراں ڈھوئیے

ڈھک = چھپ : نیں عومر ءِ پہنادی گوراں ڈھکئے

(تم اپنے سر پر ہمارے لیے پانی کے برتن ڈھوتے رہے اور اب عومر کے پہلو میں چھپے پھرتے ہو) ۔

چھورو = چھوکرے : درشتہ باغار اژ گیڈا
چھورواں الغار بستہ پہ دیم ءَ

(ایک گرگٹ مزری کے بُوٹے سے نکلا ۔ چھوکروں (لڑکوں) نے اس پر حملہ کر دیا) ۔

بہن بھائی = بہن بھائی[۱] :

اغ تہ پہ بار ءَ نہ کت خیر خواہی
من تئی بہن تو منی بھائی

(اگر تم گرگٹ کا بدلہ نہ لو تو میں (آج سے) تمھاری بہن ہوں گی اور تمھیں اپنا بھائی تصور کروں گی) ۔

ڈولی = ڈولی : پنجاہ کشتہ کل قرآن وان عالماں
ہر دو راجاں ڈولیاں برتھاں

۱- ڈیمز ، لانگ ورتھ : ”پاپولر پوئٹری آف دی بلوچز“ مطبوعہ ۱۹۰۷ع - [اس کا ترجمہ اور ”قدیم بلوچی شاعری“ (۱۳۰۰ع سے ۱۹۰۰ع تک) مولفہ میر خدا بخش مری بلوچ ، صفحات ۱۹ ، ۲۱ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۵۴ ، ۵۹ ، ۶۳ ، ۶۴] ۔

(مقتولوں میں پچاس قرآن خواں اور عالم جوان تھے ۔ دونوں قبیلوں کے مقتولوں کو ڈولیوں میں اٹھا لے گئے) ۔

کٹور = کٹورا : پُر نے ات منی روشان کٹور زردیں

(مگر میری زندگی کا پیالۂ سیمیں ابھی لبریز نہیں ہؤا تھا) ۔

رن = رن ، جنگ : ننگریں پیرو شاہ رن ءِ روش ءَ

ترا درپ اژ شیہک، لڑ ءَ بیتہ

(جس دن سخی پیرو شاہ نے جنگ لڑی ۔ جب شیہک کی مسلسل تلواریں تم پر پڑیں) ۔

لج = لاج : بور اژ لـّجانی خاطر ءَ داتغاں

پیادہ غیں پاداں تخت شوران آ تکغاں

(انھوں نے اپنی گھوڑیاں ان عورتوں کی خاطر دے دیں اور خود پاپیادہ رندوں کے دارالخلافہ شوران روانہ ہو گئے) ۔

چولھا = آزاد : بندغے من آزاد کـُھتاں چُلھی

(اپنے گھر کا ایک غلام آزاد کرتا ہوں) ۔

ہار : ریتغاں محتاجیں دل ءِ تاڑ ءَ سکـّو ءَ دوست تنگویں ہار ءَ

(دلِ مجروح میں آتشِ سوزاں لیے ہوئے معشوق کے پاس پہنچا جو سونے کے ہار پہنے ہوئے تھی) ۔

سنار : ست گھر ءَ سونار وے ننديت و ساتان ءَ گھڑی

[میں نے سنا ہے کہ (فتح پور) ست گڑھ میں ایک سنار ہے جو زیور بناتا ہے]-

دھؤاں : دکھات و دھوؤں آ کنات ڈینگ رڑاتاں جائید ءَ

[اے قلعے] ! تو جل کر راکھ ہو جائے اور تا قیامت تجھ سے دھؤاں اٹھتا رہے ! تو برباد اور ویران ہو جائے ! تجھ پر بادل بغیر برسے گزر جائیں اور تجھ میں تا قیامت مردار خور کرگس (گدھ) چیختے رہیں !] ۔

مہندی : بُرز کنت ولی مہندی رتکغیں دستان¹
جنت اش لرزان ءِ ملوکی آن
[وہ اپنے مہندی لگے نازک ہاتھوں کو اونچا اُٹھا اُٹھا کر اپنی نرم و نازک رانوں پر مارتی] -

بمصداق ''مُشتے نمونہ از خروارے'' ان الفاظ کے تقابلی مطالعے کے بعد ہم پروفیسر انور رومان سے متفق ہو سکتے ہیں² کہ ''اگر کوئی اسی طرح موازنہ کرتا جائے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اُردو ، بلوچی اور براہوئی فرہنگوں کا ۲۵ فیصد سے ۳۳ فیصد تک اشتراک ہے -''

اسی لسانی اشتراک کے باعث یہ نظریہ بھی پیش کیا جا چکا ہے³ کہ ''اُردو کی تشکیل کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی ، کیونکہ یہی بلوچستان ہے جو خلافتِ مشرقی کا صوبہٗ طوران ہوتا تھا اور محمد بن قاسم کی مہم کے بعد ایک زمانے تک اس علاقے میں عربی ، فارسی اور سندھی زبانیں بولنے

۱- بشکریہ ملک محمد پناہ سابق نائب صدر بلوچی اکیڈمی کوئٹہ - اُن کے غیر مطبوعہ مضمون سے استفادہ کیا گیا -
''قدیم بلوچی شاعری'' ، صفحات ۶۶ ، ۷۸ ، ۸۰ ، ۱۱۱ ، ۱۱۴ ، ۱۱۷ ، ۱۲۸ ، ۱۴۴ -

۲- راقم الحروف کے نام ان کا خط مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۶۷ع -

۳- اورینٹل کالج میگزین لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ع ، صفحہ ۳۶ -
عربوں کے حملے کے وقت سندھ میں پورا شمالی و مغربی حصہ ، پنجاب ، افغانستان کا وہ حصہ جو دریاے ہلمند تک ہے ، سارا بلوچستان اور موجودہ سندھ مع خلیج کَچھ شامل تھا - معجم البلدان نے اس کے پانچ صوبے بتائے ہیں اور اس کا پہلا صوبہ مکران (موجودہ بلوچستان) ہے - یہ بھی لکھا ہے کہ ''کرمان ، سجستان اور ہند (یعنی شمالی اور پوربی حصہ) کے درمیان کا تمام علاقہ سندھ میں شامل ہے'' (جلد ۵ ، صفحہ ۱۵۱) -
''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' جلد دوم ، صفحہ ۱۳۱ -
محمد بن قاسم ، شیراز سے مکران آیا تھا - (''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' جلد اول ، صفحہ ۸۶) -

والے لشکریوں کا میل ملاپ ہوتا رہا اور اُن کی بول چال سے ایک نئی زبان تشکیل پانے لگی۔''

یہ اُردو ہی ہے جس کے سبب بلوچستان کے لوگوں کو بر صغیر کے دوسرے باشندوں بالخصوص مسلمانوں سے رشتہ جوڑنے کا موقع ملا تھا۔ موجودہ دور تک اس خطے میں اُردو کی نشو و نما اس حد تک ہو چکی ہے کہ جب کوئٹہ میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا (۱۹۵۶ع) تو کئی لوگ جو ابتدا میں ریڈیو پر تقریریں نشر کرنے جاتے تھے، پشتو رسم الخط کی بجائے اُردو اور فارسی رسم الخط میں پشتو لکھتے تھے[۱]۔ علاوہ ازیں مشرقی بلوچی میں ان تمام حروف تہجی کی آوازیں موجود ہیں جو اُردو اور سندھی زبانوں میں مستعمل ہیں[۲]۔ ہیئت کے باب میں بھی بلوچی شعرا نے اُردو، فارسی اور انگریزی ادبیات سے استفادہ کیا ہے[۳]۔ سائی تاج بانو پہلی براہوئی شاعرہ اور نثرنگار ہیں جنھوں نے جذبۂ خدمت کے پیش نظر اپنے والد بزرگوار مولانا محمد عمر دین پوری کے نقش قدم پر چل کر براہوئی خواتین کی اصلاح حال کے لیے عملاً سعی فرمائی۔ آپ نے اُردو، فارسی اور عربی میں تعلیم پائی ہے[۴]۔ پشتو کے مشہور شاعر سید محمد رسول فریادی نے، جو تحصیل پشین کے علاقۂ گانگلزئی کے سادات میں سے ہیں[۵] (کوئٹہ ڈویژن کے بیشتر گویّوں کو فریادی کا کلام از بر ہے اور وہ انھیں بھنڈار کی صورت میں گاتے ہیں) اپنے اشعار میں مروجہ اُردو فارسی بحروں کی بجائے پشتو کے ملی اوزان میں شعر کہے ہیں، لیکن وزن کا خیال رکھنے کے باوجود وہ اپنے اشعار میں اُردو، فارسی اور عربی الفاظ اور محاوروں کے استعمال سے اجتناب نہیں برت سکے۔ قصہ مختصر موجودہ دور میں بلوچی، پشتو اور براہوئی کے بعض

۱۔ ''ثقافت اور ادب وادیٔ بولان میں۔'' صفحہ ۳۴، مطبوعہ بزم ثقافت کوئٹہ۔
۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۹۔
۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۱۔
۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۴۔
۵۔ ایضاً، صفحہ ۴۵۔

ادیب اور شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر اُردو کے الفاظ و محاورات بروئے کار لاتے ہیں[1] جس سے اس خطے میں اُردو کے نفوذ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - ہم اس مختصر لسانی مطالعے کو بنیادی اعداد کے تقابلی مطالعے کے بعد ختم کرتے ہیں[2] :

اُردو	براہوئی	فارسی	بلوچی	پشتو	پنجابی
ایک	اسٹ	یک	یک	یوہ	اک
دو	ارٹ	دو	دو	دوہ	دو
تین	مُسٹ	سہ	سے	درے	ترے ، تِن
چار	چہار	چہار	چہار	سلور	چار
پانچ	پنچ	پنج	پنچ	پنزہ	پنج
چھ	شش	شش	شش	شپژ	چھ
سات	ہفت	ہفت	ہفت	اوہ	ست
آٹھ	ہشت	ہشت	ہشت	اتھ	اٹھ
نو	نو	نہ	نو	نہ	نو
دس	دہ	دہ	دہ	لس	دہ ، دس

۱- یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے ''من ترا سمجھائیں این'' : میں تمھیں سمجھاؤں گا - اس میں سمجھنا مصدر اُردو سے بلوچی میں داخل ہؤا ہے ورنہ ''پوہ کنگ'' پہلے سے بلوچی میں مصدر موجود تھا - منی تیر نشانہ ءَ لگت : میرا تیر نشانے پر لگا - اس فقرے میں اُردو ترکیب کے علاوہ اُردو لگنا مصدر بھی آیا ہے ورنہ اسے بلوچی میں یوں پکارتے ''منی تیر ٹک بوت -'' بے مُلک کے نواب کا استعمال دیکھیے : ''فقط ہستے تو بے ملکے نوابے'' (فقط تم ایک بے ملک کے نواب ہو) - ''ھمے آواز گون روچ و شبان انت'' (یہی آواز دن رات کے دامن میں ہے) - (پاکستان میں اُردو، صفحہ ۱۰۴)

۲- رومان ، انور ، پروفیسر : ''کوئٹہ قلات کے براہوئی'' (انگریزی) صفحہ ۲۰ - ثقافت ، لاہور ، فروری ۱۹۶۴ع -

تصنیف و تالیف

شعر و شاعری :

''لسانی عواسل'' کے تحت بحث کرتے ہوئے ہم نے بلوچی شاعری سے ایسی مثالیں پیش کی تھیں جن میں اردو کے الفاظ بروئے کار لائے گئے تھے۔ مزید مطالعے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ بلوچی اشعار میں اُردو کے مصرعے یا شعر تک موجود ہیں۔ مثلاً ارنڈو خاں نوتھانی[1] نے قریباً سو سال پیشتر کہا تھا :

نوی اے میڑوا نندا نہال دراکھان کا بیٹا
نبی کے پاس جا کر بیٹھا نہال درکھان کا بیٹا

کہ گزایا جنگ ویلھایا کہیری زوار دوڑایا
عین لڑائی کے وقت میں کہیریوں نے ایک سوار دوڑایا
صاحب سے بات بولایا چڑھیا میری بدل آیا
صاحب کی خدمت میں رپورٹ کی اور میر یودر صاحب چڑھ آیا
حکم جو آپ فرمایا پکڑو راہ رستایا
اس نے خود حکم دیا کہ بگٹیوں کے راستے کو روکو

فتح میری بدل کیا میر یودر صاحب نے فتح کیا
پکڑ کر قید سب کی یا سب کو پکڑ کر قید کیا

۱- تاریخ بلوچستان ، از ہتو رام ، صفحات ۱۰۸ ، ۱۱۱ ، ۱۱۲ ، ۱۱۵ -

ہماری مسلسل کد و کاوش کامرانی سے ہمکنار ہوئی اور ہمارے ہاتھ سوا صدی پہلے کا ایک اُردو دیوان لگا جو مُلا محمد حسن کا ہے ۔ ہتو رام نے آپ کا شجرۂ نسب یوں قلم بند فرمایا ہے[1] :

شجرۂ نسب خاندان نایب خیل

آغا علی

نایب عبدالرحمٰن

نایب عبدالقادر — نایب محمد حسن — نایب محمد امین

نایب عبدالقادر: لاولد

نایب محمد حسن: سولا داد خاں — اللہ داد خاں

نایب محمد امین: محمد عظیم خاں — پیر بخش خاں

یہ خاندان[2] در حقیقت بدو زئی بنگل زئی کے ایک فرقے نہنگی زئی سے نکلتا ہے ۔ آغا علی کا نام علی خاں تھا ۔ وہ میر نصیر خاں اول (۱۷۵۱—۱۷۹۴ء) کے ہاں ملازم تھے ۔ جب میر نصیر خاں نادر شاہ کے حکم سے قندھار میں نظربند ہوئے تو اُس وقت بھی علی خاں نے خلوص اور وفا کیشی کا ثبوت بہم پہنچایا ۔ خان کی رہائی کے بعد یہ انعام و اکرام کے علاوہ آغا کے خطاب سے بھی نوازے گئے ۔ آغا علی خاں کا لخت جگر عبدالرحمٰن مدت تک کچھی کا نایب رہا ۔ وہ زیور علم سے آراستہ تھا ۔ اُس کے تین بیٹے تھے جو عالم ، زیرک اور مدبّر تھے ۔ لیکن اُن میں سے مُلا محمد حسن نمایاں شخصیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں ۔ انھیں والیانِ ریاست کا قرب نصیب ہؤا اور وزیر تعینات ہوئے ۔ سیاست و تدبر کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتے تھے ۔

۱۔ تاریخ بلوچستان ، از ہتو رام ، صفحہ ۳۰۰ ۔

۲۔ ایضاً ، صفحات ۳۰۰ ، ۳۰۱ ۔

نصیر خان دوم (۱۸۴۰ع—۱۸۵۷ع) اور مُلا موصوف خوشگوار فضا میں چھک سہک نہ سکے - چنانچہ خان نے انھیں قید میں ڈال دیا جہاں انھوں نے اپنی جان ، جاں آفرین کے سپرد کی -

نایب محمد حسن نے جہاں اپنی اعلیٰ انتظامی قابلیتوں کا لوہا مخالفین سے منوایا، وہاں علم و ادب اور شعر و سخن کی بزم آرائیوں کا سکہ بھی ہم عصروں کے دلوں پر بٹھایا - خوانینِ قلات کے درباری وقائع نگار اخوند محمد صدیق نے جو ان کا ہم عصر ہے، جہاں اُن کے سیاسی جوڑ توڑ کی تفصیل دی ہے ، وہاں علمیت اور شاعرانہ عظمت کو بھی تسلیم کیا ہے -

آپ بیک وقت بلوچی براہوئی ، فارسی اور اردو میں شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے - آپ کے پانچ قلمی دیوان دستیاب ہوئے ہیں - اُن میں چار تو فارسی زبان میں ہیں[1] - پانچویں قلمی نسخے کے دو حصے ہیں - پہلا حصہ فارسی میں ہے اور اکتالیس اوراق پر مبنی ہے - اس میں صرف مسدس ہیں - حصۂ اُردو کے اوراق اکتیس ہیں - اس نسخے کی لوح سنہری ہے - ہر ورق پر دوہرا سنہری حاشیہ موجود ہے - بعض عنوانات اور مقطعے سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں - کاتب گل محمد ساکن بلدہ طیبہ کنندہ ، تاریخ پانزدہم شہر رجب المرجب ۱۲۶۷ھ (مطابق ۱۶ مئی ۱۸۵۱ع) -

مجموعی طور پر قلمی نسخہ دیدہ زیب ہے - اُردو کے اشعار کی تعداد پانسو بائیس ہے - دیباچہ فارسی زبان میں رقم کیا گیا ہے[2] جس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ستایش ، آنحضرت صلعم پر درود اور پھر آل و اصحاب کا ذکر خیر ہے - بعد ازاں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ ''وہ الفاظ ہندی میں کماحقہ مہارت نہیں رکھتے - صرف اللہ کی مدد سے اور طبع آزمائی کی خاطر چند غزلیں ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اور متمنی ہیں کہ اگر سہو و خطا

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر ، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ -

۲- دیوان مُلا محمد حسن (خطی) ورق ۱ ب -

پائیں تو اصلاح فرمائیں ، امید ہے اس سے اجر عظیم پائیں گے ۔'' ملا محمد حسن بن عبدالرحمٰن براہوئی کے اردو دیوان میں سے چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے قریباً سوا سو سال قبل علمی مراکز سے دور ان وادیوں میں اردو کیونکر اپنا اثر جما رہی تھی :

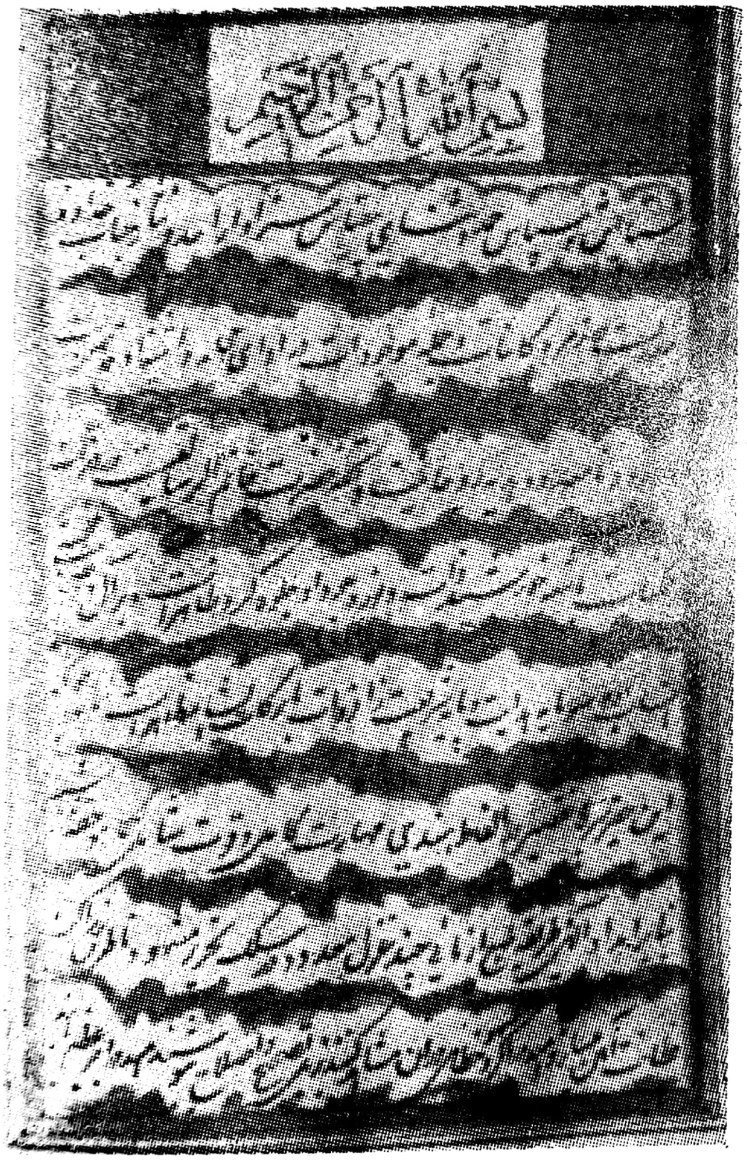
جب رخِ یار بے حجاب ہؤا
دل مرا شوق سیں کباب ہؤا
ہو گیا مست باغ میں بلبل
یار جوں مائلِ شراب ہؤا[۱]

مج پیا سیں ہو یار تج لب کا
دیدہ ہے انتظار تج لب کا
دل طپاں ہے دیکھو مرے دلکوں
شوق سیں بے قرار تج لب کا
ہے شفا بخش جان عشاقاں
لعل دو آب دار تج لب کا
سرخی پان کی دیکھ لو جاناں
سرخیش زیبدار تج لب کا
خال لب تیرا رہزن آدم
دانۂ شاہوار تج لب کا
پیالۂ میگوں نوش کر دلبر
ہے سبو پر خمار تج لب کا
حسن تیرا حسن کو احسن ہے
بوسہ خواہد ہزار تج لب کا[۲]

مکھ تیرا اے صنم چو گلِ نوبہار ہے
ہر تار تار زلف ترا طرزِ مار ہے

---

۱ و ۲- دیوان ملا محمد حسن (خطی) اوراق ۳ ا ، ۳ ا ۔





ملا محمد حسن کے اُردو دیوان (خطی) کا
پہلا اور دوسرا صفحہ (۱۸۴۷ء)

مکھ سیں ترا جو برقعہ اٹھایا چمن میں باد
خوشبو اُسی سبب سیں صفِ لالہ زار ہے
قد تیرا دیکھ کر قدِ سرو از خجالتے
پابند پا بہ گل لبِ جو شرمسار ہے
تیرے لباں میں ہے جو نہاں آب زندگی
ایسے صدف میں جاے دُرِ آب دار ہے[۱]

جاناں! تجھے دو لعل بدخشان کی قسم
تابندگیِ دو رخِ تاباں کی قسم
دہ روشنی تو کلبۂ تاریک کوں مرا
تیری شمع کو شمع شبستان کی قسم[۲]

گل و بلبل نے دیکھا باغ میں جو مکھ تیرا
شرم سیں دو[۳] نکل باغ کو ویرانہ کیا
جام جب بوسہ دیا تیرے لبِ شیریں کا
عہد و پیماں ترے لب سیں لبِ پیمانہ کیا
دل ترے ہات میں جو ہر دلِ دلدادہ دیا
آپ کو تا بہ ابد بیدل و دیوانہ کیا
شام جس جمع میں وہ شمع شبستان آیا
جمع کُوں جملہ اُوسیں شمع کا پروانہ کیا
جا ترا جس کی بغل میں صنم اک رات ہؤا
تا بصبحِ ازل او سجدہ بہ بُت خانہ کیا
مُکھ میں تیرا جو حسن صورتِ یوسف دیکھا
ہمچو یعقوب و زلیخا عجب افسانہ کیا[۴]

---

۱ و ۲- دیوان مُلا محمد حسن (خطی) اوراق ۵ ب، ۶ الف -
۳- مراد ہے گل و بلبل -
۴- دیوان مُلا محمد حسن (قلمی) ورق نمبر ۹ ب -

چلا گلشن میں وہ شوخِ پری زاد
گلستاں کو کیا اس جل سیں آباد[1]

ترے مکھ نے چھپایا ہے صنم اس چار اشیا کو
قمر کو ، مشتری کو ، شمس کو ، خورشیدِ اعلا کو
پری رخسار نے تیرے کیا شرمندہ در گلشن
سمن کو ، یاسمن کو ، لالہ کو اور پھول رعنا کو
درِ دندان و لب تیرے کیا کم قیمت اے مہ رو!
گہر کو ، لعل کو ، یاقوت کو ، لولوے لالا کو
حسن روشن کیا ہے وصف سیں تیرا بدن سارا
دہن کو، سینے کو ، جاں کو ، جگر کو ، چشمِ بینا کو[2]

یار کوں دیکھا خراساں میں جو در صحنِ چمن
واسطے اُس گل بدن گل پارہ کیا صد پیرہن
باد اٹھایا پردہ جب اُس چہرۂ گلرنگ کا
گل خجالت ہو ز خجلت بردہ سر اندر کفن
سرو دیکھا اُس قدِ سیمینِ سیم اندام کو
شرم سیں کہنا کہا ہے ایسہ سروِ سیم تن[3]

یہ کجی تیرے بھووں کی دیکھ کر عالم کہا
قوس ہے ، مہ ہے ، کماں ہے ، تیغِ جوہردار ہے
نیشِ مژگاں کو ترے میں اے پری رو! کیا کہوں
تیر ہے ، نوکِ سناں ہے ، ناوکِ خوں خوار ہے

---

۱ تا ۳- دیوان ملا محمد حسن (قلمی) اوراق ۹ ب ، ۱۰ ا ، ۱۰ ب -

دے حسن کے ہات میں جو ہے تمھارے ہات پر
جام ہے ، مینا ہے جاناں ، شیشہ ہے ، سرشار ہے[۱]

آبِ بقا کو پنہاں کیا یار نے لبوں میں
ظلمات کی طرف سیں ، ناحق گیا سکندر[۲]

خرامش تیرا دیکھا سروِ آزاد
ہؤا پابند از شرمِ خرامت
پریشاں تیرے مُکھ پر تار مُو کا
چھپایا صبح صادق کو چو شامت
نہیں جس دل کو تیرا درد جاناں
اُسیں کو تا قیامت ہے ندامت[۳]

رخ مرے یار کا گلزار ہے سبحان اللہ
لب ترا لعل شکر بار ہے سبحان اللہ
دستِ مشاطہ تری زلف کو چوُں شانہ دیا
کہا یہ تار سیہ ، مار ہے سبحان اللہ
تیرے مُکھ سیں چو صبا پردہ اٹھایا بہ چمن
شرم سیں چہرۂ گل ، خار ہے سبحان اللہ[۴]

تاریک ہے مُج باج شبِ عاشقِ مہجور
آ صبح و صفا یہ شبِ یلدا کو سحر کر[۵]

جاناں ! میانِ صفحۂ گلشن گذر کرو
صد عندلیب کوں بہ چمن بےخبر کرو

---

۱ تا ۵- دیوان مُلا محمد حسن (قلمی) اوراق نمبر ۱۱ ا ، ۱۱ ا ، ۱۲ ا ، ۱۲ ا ، ۱۲ ا ، ۱۸ ب -

کر تار تار زلف پریشاں کو باغ میں
ہر تارِ مو کو رشتۂ صد برہمن کرو
ہے تیرے واسطے شکر افشاں لب
شکر دہاں شکر بداں حسن کرو[۱]

تم اس زلفِ پریشاں کو کرو ژولیدہ و برہم
کہ کھولے گا کفِ صیاد دام آہستہ آہستہ[۲]

زلفِ شب گوں یار کا یا ابر ہے یا شام ہے
تار تار اُس موئیکا یا حلقہ ہے یا دام ہے
چشم اُس کا دیکھ کر مستی سیں بلبل نے کہا
دیدہ ایسا شوخ، یا نرگس ہے یا بادام ہے[۳]

کر مکھ سیں دور گیسوے پُر پیچ و تاب کوں
بے تاب کر ز تاب رخِ آفتاب کوں[۴]

دو دیدۂ خونریز و خدنگ افگنت ای یار
جادوی ہے، جادوی ہے، جادوی ہے واللہ
یہ دُر جو جھلکتا ہے ترے دونوں لباں میں
لولوی ہے، لولوی ہے، لولوی ہے واللہ
جاناں بجہاں جائے اماں ہے جو حسن کا
تری کوی ہے تری کوی ہے تری کوی ہے واللہ[۵]

---

۱ تا ۵۔ دیوان مُلا محمد حسن (قلمی) اوراق ۱۹ ب، ۲۰ الف، ۲۰ ب، ۲۱ ب، ۲۳ الف۔

ہے رونق اگر دیدۂ نرگس کو چمن میں
کب وہ ہے ترے دیدۂ جادو کے برابر
خم ہے اگر آں ماہِ نو و پشت کہاں کو
وہ خم نہیں تیرے خم ابرو کے برابر
گر ہیں لب شکر افشاں دو لب طوطی ہند
وہ لب نہیں تیرے دو لب خوشگو کے برابر[1]

باد اُٹھایا جو پردہ اُس گل سیں
نالۂ صد ہزارا آتا ہے
تیرے پابوس واسطے جاناں
صفِ گل شرمسارا آتا ہے[2]

مجلس خوباں میں جب وہ ماہرو نے مے پیا
لذت اُس لعلِ لبِ ساغر سیں پوچھا چاہیے
کیا کروں اوصاف میں او چشم تیر انداز کا
تیزی اُس کا نشتر و خنجر سیں پوچھا چاہیے[3]

بقتل عاشقاں وہ شوخ سرمست
دلاور ہے ، دلاور ہے ، دلاور
بہ بحر عشق جس نے غوطہ مارا
شناور ہے ، شناور ہے ، شناور[4]

یہ قد و قامت و خوبی سین در صف گلشن
چمن میں شور قیامت بپا کرے تو کرے[5]

---

۱ تا ۵- دیوان ملا محمد حسن (خطی) اوراق نمبر ۲۸ ب ، ۲۹ الف ، ۲۹ ب ، ۳۰ الف - ۳۰ ب -

نہیں خوشبو ترے مُو سیں جہاں میں
عبیر و عطر و مشک تر برابر
ترے دُردانۂ دندان کا جاناں
نہیں دُر دانہ و گوہر برابر
حسن کا یہ غزل در وصف دلبر
نہوں دیکھا بہ سیم و زر برابر[1]

مُلا محمد حسن کے اُردو کلام میں منقبت، ترجیع بند، مستزاد، مخمس اور رباعیات بھی موجود ہیں۔ رفیع سودا کی غزل پر مخمس کا پہلا بند یہ ہے:

تار تری زلف کا زنار کروں یا نہ کروں
سیر در صفحۂ گلزار کروں یا نہ کروں
بج بنا گرسیِ بازار کروں یا نہ کروں
کیوں نہ تسکینِ دل اے یار کروں یا نہ کروں
نالہ جا کر پسِ دیوار کروں یا نہ کروں[2]

ترے لب، دلربا شیریں ادا ہیں
نہ تیرے لب سیں لب شکر جدا ہیں
ترے رخسار پر یہ خطِ نوخیز
صفِ لشکر کا اول ابتدا ہیں[3]

میر مُلا محمد حسن خاں کے صاحبزادے میر مولا داد خاں بھی فارسی اور اُردو میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ وہ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ع میں پیدا ہوئے اور بتاریخ ۱۹ ذیقعد ۱۳۲۴ھ، ۴ جنوری ۱۹۰۶ع اللہ کو پیارے ہوئے۔ انھوں نے عام تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی[4]۔ ہتو رام نے

---

۱ تا ۳۔ دیوان مُلا محمد حسن (قلمی) اوراق ۳۱ الف، ۱۴ ب، ۲۷ ب۔
۴۔ دیوان مولا داد، صفحات ۱۷۲ تا ۱۷۴۔

لکھا ہے[۱] کہ مُلا محمد حسن جب قید ہو گئے تو اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔

''اور دربار کلات سے بالکل محروم ہو گئے۔ تب خان صاحب میر خدا داد خاں، خان کلات ہؤا۔ اس نے تمام جائداد اور ملکیت اس خاندان کی ضبط کرلی۔ مولا داد و اللہ داد وغیرہ پس ماندگان خاندان ہذا بباعث رشتہ داری سردار ملا محمد خان رئیسانی سے شامل ہو گئے، اور قندھار تک بھی اس کے ہمراہ گئے۔ البتہ جب سے مابین خان صاحب اور سرداران بروہی انجام و صلاحیت مشہور ہوئی، تب سے سرکار نے مولا داد خاں و اللہ داد خاں و عظیم خاں کو کچھ نوکری دی۔ چنانچہ فی الحال خان بہادر اللہ داد خاں مجسٹریٹ بولان کا ہے اور مولا داد خاں مبلغ پچاس روپیہ ماہوار پولٹیکل پنشن پاتا ہے اور عظیم خاں تھانہ دار لیوی بولان کا ہے اور جب سے میر محمود خاں صاحب خان کلات ہوئے ہیں انھوں نے کچھ حصہ ملکیت منضبطہ کا، جو خاص زر خرید بزرگان اس خاندان کا تھا، واپس کر دیا ہے۔ اب یہ لوگ زیر سایہ سرکار انگریزی آرام سے اور عزت سے گزران کر رہے ہیں۔''

مولا داد کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ آپ کے چچیرے بھائی محمد عظیم خاں کے فرزند ارجمند میر محمد امین خاں کی کوششوں سے آپ کا فارسی دیوان مرتب ہؤا اور لاہور سے چھپا[۲]۔ موصوف کے اُردو کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ ان اشعار میں محاورے وغیرہ کی غلطی تلاش نہ کیجیے، بلکہ فارسی شاعر نے اپنے خیالات کو اُردو میں ظاہر کرنے کی جو پُر خلوص

۱- تاریخ بلوچستان، صفحات ۳۰۱، ۳۰۲۔
نوٹ: اُن دنوں جس انداز پر اس خطے میں اُردو لکھی جاتی تھی، یہ تحریر اسی کا نمونہ ہے۔
۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، مطبوعہ بلوچی اکیڈیمی، کوئٹہ۔

شش کی ہے ، وہ قابل دید ہے :

یہ پری آئی مگر کشمیر سے
بن سنور کر ناز کی شمشیر سے
لے لیا دل میرا آہ نازک ادا
ناز کے انداز کی تزویر سے
اے دلِ ناداں سنبھل ، بچ ، دور ہو
اس نگاہِ شوخ عالمگیر سے
اُس پری کے وصل کا مشتاق ہوں
گر ہووے حاصل مجھے تقدیر سے
پھر مولا مل تو مجھ سے اے صنم
مل کے بیٹھیں جیسے شکر شیر سے

رحمت کہوں کہ ابرِ کرامت کہوں تجھے
یا سروِ بوستانِ لطافت کہوں تجھے
آواز تیری سن کے صنم بے قرار ہوں
جادو کہوں ، پری کہ علامت کہوں تجھے
یہ ناز ، یہ کرشمہ ، یہ غمزے کی برچھیاں
اب چاہیے کہ تیغِ شہادت کہوں تجھے
ناز و ادا نے کر دیا بے چین دل مرا
تجھ کو نہیں خبر تو میں غفلت کہوں تجھے
رحمت رکھا ہے نام تظلم نہ چاہیے
رحمت کرو کہ مطلعِ رحمت کہوں تجھے
جاناں کبھی تو دور سے چہرہ دکھائیو
تا صاحبِ عطا و سخاوت کہوں تجھے
مولا دیا قرار جو زر پر ترے کنار
تب دور سے میں خیر و سلامت کہوں تجھے

عید رمضاں اے صنم ! اک بوسہ دے افطار کا
شربتِ شیریں پلا دے لعل شکر بار کا
تیس دن روزے کے گزرے ، اب تو روز عید ہے
دے مجھے عیدی کا بوسہ ایک دو رخسار کا
محنتِ رمضاں سے جاناں خستہ و بیمار ہوں
سیبِ غبغب سے کرو دارو اسی بیمار کا
رات دن تسبیح پڑھ کر اب تو میں نے پھینک دی
اب ارادہ ہے تری زلفوں سے اک زنّار کا
وصل کا ساغر پلا دے یار سولا داد کو
تا ہووے سوتے لحد تک یاد اس خمار کا

سردار خیر بخش مری[1] ۱۹۰۲ء میں اپنے والد کی وفات پر قبیلۂ مری کے سردار مقرر ہوئے ۔ وہ آزاد منش ، سادہ اور بہادر بلوچ تھے ۔ انگریزی حکومت کے سخت مخالف تھے ۔ انگریزوں کے پُر شکوہ خطابات اور نوازشات سے بھی متاثر نہ ہوئے ۔

سبی دربار کا وہ مشہور تاریخی واقعہ جس میں بلوچستان کے تمام قبائلی سردار بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندے کی بگھی کو ریذیڈنسی سے ریلوے سٹیشن تک کھینچ کر لائے ، سردار خیر بخش مری کی جرأتِ رندانہ کا ثبوت ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندے نے شاہی جرگے کے تمام سرداروں سے کہا کہ اس کی بگھی کو سٹیشن تک کھینچ کر لے جائیں تو سردار خیر بخش ہی اکیلے سردار تھے جنھوں نے سخت جواب دیا تھا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر ملا مزار بنگلزئی نے ایک معروف نظم ”لاٹ ء بگّی“ لکھی ۔ یہ نظم اُردو ، فارسی ، سندھی ، براہوئی اور بلوچی میں ہے اور قومی بے ہمتی اور بے حمیتی کا مرثیہ ہے ۔

۱۔ تاریخ بلوچستان ، جلد دوم ، گل خان نصیر ، صفحات ۳۹۰—۳۹۱ ۔

چند اشعار سنیے :

ایجنٹ گورنر جنرل

فرنگی کہا تم سنو دوست یار
میں اپنے وطن کی طرف ہوں تیار
مری بات یہ ہے امیر لوگ چٹک
کہ کینچو بگی میری کو ریل تک

ایجنٹ گورنر جنرل ، نواب مری کا جواب سن کر گویا ہؤا :

فرنگی کہا تم نواب خوش رہو
کسی سے نہ اس بات کو تم کہو
امیر لوگ کا میں کروں امتحاں
کہ مجھ کو وہ کیسے دیں گے بیاں
ابھی جو نہ آئے مرے دام میں
کبھی وہ نہ آئیں گے فرمان میں
جب حاکم نے اُس وقت فرمان دیا
تو کرسی نشیں جملہ حاضر ہؤا
فرنگی کہا مجھ کو ٹیشن تلک
امیر لوگ لے جانا ہے تم کو حق

جو صاحب مرا پیر رنجور ہے
اسی کام سے بہت معذور ہے
اگر مجھ سے یہ کام لیں گے ضرور
اسی خاطر کروں گا ابھی دو مزور
فرنگی کہا تیرا انصاف ہے
یہی کام تیرے اوپر معاف ہے

یہ اشعار تقریباً پون صدی پہلے کی اُس بول چال کو پیش کرتے ہیں جو اس علاقے میں جاری و ساری تھی - ظاہر ہے کہ یہ طبقۂ خواص کی زبان نہیں ، طبقۂ عوام کی زبان ہو گی - زبان و بیان سے بالا ہو کر اس پر

نظر ڈالیں تو موضوع کے اعتبار سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعے نے ملا مزار بنگلزئی کی رگِ حمیت کو پھڑکا دیا اور انھوں نے قلبِ تپاں کی آواز و آہنگ سے اثر پذیر ہو کر یہ نظم کہہ ڈالی۔

کوئٹہ شہر کے مغرب میں ایک "کلی کرانی" واقع ہے جو چشتی مودودی خاندانِ سادات کا مسکن ہے۔ وہ عام طور پر سادات کرانی کے نام سے معروف ہیں۔ سید عابد شاہ (عابد تخلص) اسی کلی کرانی میں ۱۸۸۸ع کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ خود کہتے ہیں[1]:

خاص کر شہر کرانی گلشن و گلزار ہے
خوش ہوا پر لطف و سزیدار مزیدار ہے

آپ کے والد کا نام سید کرم بخش تھا جو اُس دور کے تعلیمی معیار کے لحاظ سے خاص مذہبی تعلیم رکھتے تھے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ عابد شاہ کو بھی مذہبی تعلیم دلائیں گے، لیکن عابد شاہ ابھی چار پانچ سال کے بچے تھے کہ وہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد اُن کے ماموں آغا سید عمر شاہ، جو سادات کرانی کے سردار تھے، ان کے سرپرست مقرر ہوئے۔ سردار عمر شاہ نے بھی مذہبی تعلیم پائی تھی جس کے باعث ان کا گھریلو ماحول مذہبی انداز کا تھا، جہاں فارسی کی درسی کتابوں کے علاوہ اسلامی تاریخ وغیرہ کا چرچا رہا کرتا تھا۔ اسی ماحول میں عابد شاہ کی زندگی کی ابتدا ہوئی اور اسی کے نقوش ان کے دل و دماغ پر آخری دم تک مرتسم رہے۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ہمارے مذہبی مدرسوں میں جو نصاب رائج تھا، اُس پر عابد شاہ نے خاطر خواہ عبور حاصل کیا۔ ویسے آپ کی سکول کی تعلیم واجبی تھی۔ اس کے باوجود ان کا فطری میلان تعلیمی مشاغل کی جانب زیادہ تھا۔ انھوں نے اپنے طور پر اُردو کا خاصا مطالعہ کیا۔ وہ فارسی کے پہلو بہ پہلو اُردو میں بھی شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے۔

موصوف بلوچستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں ای اے سی

۱۔ گلزار عابد، صفحہ ۴۲۔

کے عہدے تک پہنچ کر ۱۹۳۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ نے ۲۱ اپریل ۱۹۴۹ء کو وفات پائی[1]۔ خود فرما گئے:

خاک میں وہ مل گئے سب ذی حشم
کیجئے افسوس! کس کس کا شمار[2]
رہ گئی سب کی فقط نیکی بدی
مثلِ عابد ہے جہاں میں یادگار

عابد بلوچستانی نے اپنا ایک مختصر سا مجموعۂ کلام "گلزار عابد" کے نام سے ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں مطبع قاسمی واقع دیوبند سے چھپوایا تھا۔ اس کے کل صفحات اڑتالیس ہیں۔ آخری صفحے پر "التماس"[3] کے تحت درج ہے:

"ناظرین با تمکین خوشہ چینان خرمن سخن و قاریان خوش الحان کے خدمت اقدس میں عرض ہے کہ اگر اس میں کہیں غلطی پاویں تو اپنے دامنِ لطف و اصلاح کے سایہ میں چھپاویں کیونکہ انسان ضعیف البنیان کی ضمیر میں خطا و سہو کا مادہ کوٹ کوٹ کر ڈالا گیا ہے، اس سے بچنا ناممکن ہے۔

الراقم

سید عابد شاہ سکنہ موضع کرانی تحصیل و ضلع کوئٹہ بلوچستان
حال تحصیلدار کچا و ضلع چاغی

مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۵ء مطابق ۶ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ

نوشتم بہر این در یک زمانے کہ ماند بعد از من یک نشانے"

"گلزار عابد" میں سات سو شعر موجود ہیں جن میں سے سوا چار سو کے قریب فارسی، پونے تین سو اُردو اور صرف پانچ براہوئی کے ہیں۔

پہلے بھی لورالائی میں منعقدہ مشاعرے کے سلسلے میں عابد بلوچستانی

۱۔ "بلوچستان میں فارسی شاعری" عنوان "عابد شاہ عابد"۔
۲۔ گلزار عابد، صفحہ ۱۶۔
۳۔ یہ نصف صدی پہلے کی نثر کا نمونہ ہے جو اس خطے میں لکھی جاتی تھی۔

کے چند شعر پیش کیے جا چکے ہیں - اُردو کے مزید اشعار ملاحظہ فرمائیے جو قریباً پون صدی پیشتر کہے گئے تھے :

محمدؐ شافع ہے روز حشر کا　　محمدؐ شافع ہے سب عاصیوں کا
محمدؐ شافع ہے روز حشر کا　　محمدؐ ہے دوا ہر درد دل کا

میں عابد ہوں غلام ہر چار سرور کا
ابابکرؓ کا عمرؓ کا عثمانؓ کا علیؓ کا[1]

خون کر ڈالا ہے ظالم ! عاشقِ ناشاد کا
ہاتھ خونی ہے گواہ اس بانیٔ بیداد کا[2]
لاکھ دیکھی بیقراری عاشقِ بے چین کی
رحم شیوہ ہی نہیں اُس خوگرِ بیداد کا
ابروئے جاناں نہ دیکھی ہو تو جا کر دیکھ لو
نقشِ ثانی ہے بلا شک خنجرِ جلاد کا
شوخ چشمی تا بکے جاناں ، جلانا ! چھوڑ دے
ڈالنا اچھا نہیں ہے ظلم کی بنیاد کا
آرزوئیں پیٹتی ، روتی ہیں یا رب العباد
خون قاتل نے کیا ہے کس دلِ ناشاد کا
ہاتھ میں سر لے کے قاتل مجھ سے یوں کہنے لگا
کیا ثمر لایا شجر ہے عاشقِ ناشاد کا
سر جھکائے منتظر بیٹھے ہیں اپنے قتل کے
ہاتھ کیوں ہم پر نہ پھر پورا پڑے جلاد کا
ہاتھ جوڑے ، سو طرح منت سماجت کی مگر
رحم کیوں آتا کہ وہ شاگرد ہے شداد کا

۱- گلزار عابد ، صفحہ ٦ -
۲- ایضاً ، صفحہ ۴ -

دل نہیں قابو میں عابد نالۂ پر درد سے
خون قاتل نے کیا ہے کس دل ناشاد کا

یہ فلک کیا کیا ستم ایجاد کرتا ہے سدا
موسم گل میں کیا پھر یار سے ہم کو جدا ۱
مست و سودائی و مجنوں جنگلوں میں دشت میں
اُس بت بیداد سے کب تک رہوں گا میں جدا
تیغ ابرو ، خنجر مژگاں سے دل کو چیر کر
نیم بسمل کر دیا ہے یار با ناز و ادا
صدمۂ داغ جدائی اب سہا جاتا نہیں
وصل جاناں ہو میسر جلد اے میرے خدا
رنج کے پیچھے ہے راحت رات کے پیچھے ہے دن
شاد ہو عابد ! یہ ہاتف نے سنائی ہے ندا

دل بیتاب ! ذرا ٹھہر ، نہ کر آہ و فغاں
سن کے گھبرائے نہ وہ حور وش و رشک قمر ۲
جا تو دروازے پہ ہے کون وہ گھبرا کر بولے
شکل کو میری سیہ دیکھ کے مثل اخگر
رخ زیبا دو سیہ چشم کی سوگند تجھے
خستہ حالی کو مری دیکھ کے اب رحم تو کر
لطف سے یار نے اشہب کو بلایا ہے تجھے
عابد خستہ جگر ! شاد ہو ، اب نوحہ نہ کر

میری حالت ہے مثل ماہیٔ بے آب کے
زندگی لاؤں کہاں سے آب حیواں چھوڑ کر ۳

---

۱ تا ۳ - گلزار عابد ، صفحات ۵ ، ۱۷ ، ۱۷ -

بے قراری ، انتظاری حد سے گزری اے صنم
خواب و راحت چل بسے بادیدہ گریاں چھوڑ کر
اُس بتِ بے مہر کی الفت ہے غیروں سے سدا
عاشقِ دیوانہ کو با سینہ بریاں چھوڑ کر
بلبلانِ نغمہ سنج و قمریانِ صد ہزار
بر گلِ رخسار آویں باغ بستاں چھوڑ کر
ہجر میں گر مر بھی جاؤ عابدا کیا لطف ہے
بے کسی جاتی نہیں گورِ غریباں چھوڑ کر

فراق ہاتھ میں آوے تو قتل میں کر دوں
پھر آنسوؤں سے ادا کردوں خوں بہائے فراق[۱]
ہے داغ سینے پہ حافظ کے مثلِ بلبلِ صبح
یہاں تو عابدِ مسکیں بھی کر صدائے فراق

کر خوشی اے دل کہ کل کو عشق کے بازار میں
مژدہ آیا قتل کا ہے ، وعدۂ دیدار نہیں[۲]
لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے
ہانجی ہانجی کر تو عابد خلق سے کچھ کار نہیں

ہجرِ جاناں سے امکاں رہائی کی نہیں
عابدا کیا تری قسمت کی میں تدبیر کروں[۳]

فرقتِ یار خوشی میں مجھے یاد آئے اگر
گیت گاتے ہوئے رک جاؤں کہ گا بھی نہ سکوں[۴]
عابدا یار بلا کر مجھے آغوش میں لے
ایسا پھولوں میں خوشی سے کہ سما بھی نہ سکوں

۱ تا ۴۔ گلزار عابد ، صفحات ، ۲۱ ، ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۷ ۔

صبا یہ سینہ بریاں کا مفصل حال کہہ دینا
مبادا گر گزر تیرا بسوئے کوئے جاناں ہو[1]

بگفتم دل نذر کردم قبول افتد زہے عزت
تبسم سے کہا دل بر بمثل گیند چوگاں ہو[2]
مسیحا ہو نہیں سکتا علاجِ دردِ دل اپنا
کرے کیا مرحمِ عیسیٰ جو زخم نوک پیکاں ہو
ترا سوزِ نہاں عابد ہویدا کب ہو جاناں پر
ہویدا ہوگا تب اس پر نشانِ تیرِ مژگاں ہو

بقول داغ :

تب لطفِ زندگی ہے ، جب ابر ہو ، چمن ہو
پیشِ نظر ہو ساقی ، پہلو میں گل بدن ہو

بقول عابد بلوچستانی :

کہتر ز آب حیواں ساغر نہ ہوگا وہ بھی[3]
مئے لعل گوں ہو اس پر ساقی بھی سیم تن ہو

اُڑاتا خاک سر پر جھومتا مستانہ آتا ہے
ہزاروں اُنگلیاں اُٹھتی ہیں وہ دیوانہ آتا ہے[4]
نہیں معلوم غصے میں وہ کیوں تیور بدلتے ہیں
مگر دل میں خیالِ یوسفِ دیوانہ آتا ہے
بدل کر تیورِ رنگیں لبِ نازک سے یہ بولے
مگر وہ محتسب از جانبِ خم خانہ آتا ہے
بگڑ کر طبعِ نازک سخت تندی سے یہ بول اُٹھی
کہ عابد بھی ز سوئے خانۂ میخانہ آتا ہے

---

۱ تا ۴- گلزار عابد ، صفحات ۲۸ ، ۲۹ ، ۲۹ ، ۳۴ -

بگڑ کر دستِ عابد کو نکال اس جا سے اے یوسف
کہ قاضی بھر زجرش تند خو مستانہ آتا ہے

سیم تن ساتھ خواصوں کے لبِ جُو بیٹھی
لطف سے سن رہی تھی نالۂ کوکو بیٹھی[۱]
سبز چادر تھی لیے، سبز پری تھی گویا
اپنے لالوں میں لیے دانۂ لولو بیٹھی
گویا تھی اہلیا تسبیح لیے گلزار کے بیچ
ناز و انداز سے کرتی ہوئی ہوہو بیٹھی
کیسی تنہائی میں ہے حور وش رشک قمر
شور و غوغائے رقیباں سے بیک سو بیٹھی
عابدا ڈر کے تو جانا کہ وہاں ہوگے اسیر
باندھنے کے لیے زنجیر نما مو بیٹھی

کون ہے جو ہاتھ پکڑے میرے اس جلاد کا
کر دیا ایجاد صنعت سے ستم بیداد کا[۲]

رخِ تاباں کے تصور میں جو مستانہ بنوں
عقل و دانش کو فدا کر کے میں فرزانہ بنوں[۳]
گر تو ساقی بنے سے بادہ و پیمانہ تو دے
رندِ مستانہ بنوں مشرب میخانہ بنوں
عابدا حور کے بدلے بھی صنم کو مانگوں
حشر کے دن میں اگر لائقِ کاشانہ بنوں

بعض خاص موقعوں پر بھی عابد بلوچستانی نغمہ سرا ہوئے ہیں۔ مثلاً بتاریخ ۵ اکتوبر ۱۹۱۰ء مطابق یکم شوال شریف ۱۳۲۸ھ بروز عید الفطر

---

۱ تا ۳۔ گلزار عابد، صفحات ۳۷، ۴۵، ۴۶۔

بہ ظاہر صاف چوں بینا ہو باطن میں سیاہ اخگر
بچانا عابد احقر کو یا رب ایسے افسر سے

یا الٰہی والیٔ ہر دوسرا کے واسطے
فضل کر مجھ پر محمد مصطفیٰؐ کے واسطے[1]
غالب کر بر حسوداں ، زیر اُن کو کر دکھا
خواجۂ کونین احمد مجتبیٰؐ کے واسطے
عابدِ مسکین پر تُو رحم کر میرے رحیم
رزق و ایماں کر عطا سب انبیاء کے واسطے

نہیں ایزد کوئی ثانی ترا سارے زمانے میں
تو ہے بے مثل و واحد لاشریک اس کارخانے میں[2]
ثمر اشجار میں دیکھو ہیں رنگا رنگ بستاں کے
ہویدا ہے تری قدرت غرض سب دانے دانے میں
ہزاروں بلبل و طوطی و قمری کو جو میں دیکھا
ثنا و حمد میں تیرے تڑپتا آشیانے میں
تو وہ قادر ہے جو مٹی کو طاقت کیمیا بخشے
رکھا ہے زندگی تم نے ہمارا آب و دانے میں
ہوئے مسرور بے خود سب سنی تعریف قدرت کی
عجب دیکھا ہوں میں تاثیر عابد کے ترانے میں

سید غلام علی الماس ، جن کا ذکر ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' کے تحت ہو چکا ، ۱۹۰۸ء میں سنڈیمن ہائی سکول کے طالب علم تھے ۔ اُن دنوں قاضی عبداللہ جان کے ہاں مشاعرہ ہونا تھا ۔ آپ نے یہ غزل کہی تھی :

مریض عشق ہوں اور کمسنی ہے
الٰہی ! جان پر یہ کیا بنی ہے ؟

---

۱ ، ۲ - گلزار عابد ، صفحات ۳۲ ، ۲۵ و ۲۶ -

رہا کرتی ہیں افواجِ غم و یاس
ہمارا دل ہے یا اک چھاونی ہے
کٹے دل کے ، جگر کے لاکھ ٹکڑے
یہ مژگاں ہے کہ برچھی کی انی ہے
کیا کرتا ہے وہ مے کی مذمت
ہمیں تو شیخ سے اب دشمنی ہے
کر اے الماس ! اب اللہ ہی اللہ
غزل کو چھوڑ وقتِ جاں کنی ہے

لماس نے ۱۹۱۷ء میں ''پہلی تاریخ'' کے عنوان سے کہا تھا :

اے کہ تاریخِ یکم خوش آمدی خوش آمدی
اے کلیدِ گنجِ راحت آمدی خوش آمدی
دہر میں ماہِ رواں کی حکمرانی ہو گئی
ہستیٔ ماہِ گزشتہ اب کہانی ہو گئی
مٹھیاں گرما رہے ہیں دفتروں میں اہل کار
اور گھروں میں بیویاں ہیں آج وقفِ انتظار
پھونک دی ہے روح مقروضوں کی جان زار میں
بل چکانے جا رہے ہیں شوق سے بازار میں
ساقیا ! لے آج پیمانے پہ پیمانہ چلے
لیتے ہی تنخواہ میکش سوئے میخانہ چلے
جب کبھی آئی تو مہماں بن کے آ جاتی ہے تو
ایک ہی دن رہ کے بے پوچھے چلی جاتی ہے تو
پہلی عادت چھوڑ ، پہلی یوں ہی ترسایا نہ کر
جب مہینے بعد آنا ہے تو پھر آیا نہ کر
گر بیائی اے یکم بادا عروسانہ بیا
چشمِ ما روشن ، دلِ ما شاد روزانہ بیا

۱۹۲۴ع کے لگ بھگ الیاس گویا ہوئے : ''دشمن نما دوست'' :

میں اگرچہ مار ہوں لیکن نہیں ہوں یار مار
دوست دشمن کو پرکھنا آزمانا چاہیے
یار مارِ آستیں ہیں ، بے وفا بے اعتبار
چاپلوسی پر نہ اے الیاس جانا چاہیے

غلام علی الیاس لکھتے ہیں : ''میری جوانی میں ریڈیو ایجاد نہیں ہؤا تھا ۔ گراموفون پر ماسٹر لبھو کا گایا ہؤا گانا بہت سنا کرتا تھا ۔ غزل میں ایک شعر یہ تھا :

تم نہیں جانتے تسکین کی صورت کیا ہے
ہاتھ رکھنے سے کہیں دردِ جگر جاتا ہے ؟

غلط یا صحیح ، میرے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ معشوق کو عیسیٰ نفس اور رشک مسیحا کہا جاتا ہے ۔ یہ مسیحائی کیسی کہ ہاتھ رکھنے سے درد جگر ہی نہ جائے ۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے کچھ فحش جذبات ہیں ۔ معشوق کے ہاتھ رکھنے سے درد جگر چلا جانا چاہیے ۔ درد جگر جاتا ہے اور ضرور جاتا ہے :

جیتے جی بھی کبھی یہ دردِ جگر جاتا ہے ؟
پہلے سر جاتا ہے ، پھر دردِ جگر جاتا ہے
ہم نہیں جانتے تسکین کی صورت کیا ہے
ہاتھ رکھنے سے مرا دردِ جگر جاتا ہے
ہاتھ رکھنا تو بڑی بات ہے اے جانِ جہاں
پیار سے دیکھ لو ، بس دردِ جگر جاتا ہے
رہنے دے ، رہنے دے ، سینے میں اسے اے ہمدم
ہاتھ مت رکھ کہ مرا دردِ جگر جاتا ہے
چارہ سازو ! مجھے اتنا تو بتا دو للہ
کس دوا سے مرضِ دردِ جگر جاتا ہے ؟

کہتے ہیں کہ :

نہ تو دارو کی ضرورت ، نہ دوا کی حاجت
ہاتھ رکھنے سے فقط دردِ جگر جاتا ہے
ایک ٹھوکر سے کلیجے کو اُڑا کر کہنا
دیکھ ! اس طرح ترا دردِ جگر جاتا ہے
نوک شمشیر کو سینے پہ مرے رکھ کے کہا
"ہاتھ رکھنے سے کہیں دردِ جگر جاتا ہے؟"

درد جگر کی معقولیت ، فرض اور وقار ملاحظہ ہو :

دور ہی سے جو وہ عیسیٰ نفس آتا ہے نظر
بہرِ تعظیم مرا دردِ جگر جاتا ہے
عید کے عید مرا یار گلے ملتا ہے
سال کے سال مرا دردِ جگر جاتا ہے
اک عجب بات ہے ! الماس کہا کرتے ہیں
کھا کے ہیرے کی کنی دردِ جگر جاتا ہے

الماس - ۱۹۲۸ء"

کوئٹہ سے جانے کے بعد الماس کو یہاں کی یاد ستاتی تھی۔ خیرپور میں بیٹھ کر کہتے ہیں :

اے زمینِ کوئٹہ جب تیری آ جاتی ہے یاد
زخمِ دل پر اک نیا چرکا لگا جاتی ہے یاد
اے زمینِ کوئٹہ 'تو رشکِ صد کشمیر ہے
تختۂ جنت ہے ، تیری خاک بھی اکسیر ہے
دیوتائے حسن اور گلفام کا مسکن ہے تو
اک پرستاں ہے کہ کوہِ قاف کا دامن ہے تو
ہائے وہ بابو محلہ ، منڈیمن ہال اور پارک
مے اُڑاتے تھے جہاں ہم کھول کر بوتل کی کارک
عہدِ طفلی سے جوانی تک جو کاشانہ ہؤا
ہائے اب وہ کوئٹہ کیا ہم سے بیگانہ ہؤا

نام خود را نقش بر لوحِ دلِ ما کردہ ای
از غمِ دوری جگر را پارہ پارہ کردہ ای
چھٹ گئے مجھ سے عزیز و خویش اور لختِ جگر
مادرِ مشفق بھی اب آتیں نہیں مجھ کو نظر
گر کبھی حالت بری ہوتی دلِ مغموم کی
فاتحہ خوانی کو جاتا والدِ مرحوم کی
اشک بن کر چشمِ پرنم سے نکل جاتا غبار
اور دلِ اندوہ گیں کو ایک پل آتا قرار
ہم گئے ہم آشنا سے یار سے مشفق سے دور
آہ قسمت نے کیا معشوق کو عاشق سے دور
گر یہی حالت رہی تو جان کا حافظ خدا
بس یہی کچھ تربت الیاس پر ہوگا لکھا
"یک غریبِ خانہ ویراں بے وطن افتادہ است
بلبلے تفتہ جگر دور از چمن افتادہ است"

ڈاکٹر محمد اسحق صدیقی، تخلص "ناشط" ۱۸۹۱ء میں بریلی کے ایک متوسط درجے کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے علم و ادب کا شوق تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں آل انڈیا اردو کانفرنس بدایوں میں شریک ہوئے اور فرمایا:

بلبل شیدا اسیری میں ہے ناشط نغمہ سنج
طالب العلمی میں ہے ذوقِ غزل خوانی مجھے[1]

۱۹۱۰ء میں کہا تھا:

بتاؤں کیا تمھیں کس حال میں رہتا ہوں، کیسا ہوں
خدا کا شکر ہے، احسان ہے، زندہ ہوں، اچھا ہوں
بچوں کس طرح میں سوج تبسم سے حسینوں کی
بقولِ حضرتِ حافظ میانِ قعرِ دریا ہوں

۱- دیوان ناشط (قلمی) صفحہ ۱۵ -

ناشط ۱۹۱۶ع میں ڈاکٹر بنے ۔ تین سال تک ایران رہے ۔ واپس آ کر کسی فوجی ہسپتال میں متعین ہوئے ۔ جون ۱۹۲۱ع میں بلوچستان میں مقرر ہونے کے احکام ملے ۔ اُنیس سال بلوچستان کے مختلف مقامات میں گزارے ۔ بیشتر وقت موسیٰ خیل ، فورٹ سنڈیمن ، ہندو باغ اور سبی میں گزرا ۔ آخر اُن کی صحت خراب ہو گئی اور ۲ اکتوبر ۱۹۴۰ع کو بریلی میں رحلت فرما گئے ۔

ڈاکٹر صدیقی ادیب ، شاعر ، متواضع ، مہمان نواز ، شاہ خرچ اور بڑے دوست نواز انسان تھے ۔ اُن کا قلمی دیوان اُن کے لخت جگر ڈاکٹر حسن اشفاق صدیقی ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کوئٹہ کے پاس محفوظ ہے جو پانچ سو کے قریب اشعار پر مشتمل ہے ۔ زیادہ اشعار بلوچستان میں قیام (۱۹۲۱ع تا ۱۹۳۹ع) کے دوران کہے ہیں ۔ بعض نظمیں احباب کی فرمائش پر کہی ہیں ۔ اشعار کے ساتھ مقام اور تاریخ بھی درج کرتے جاتے ہیں ۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

"۱۹۲۱ع ، شارگ (بلوچستان)[۱] :

بفرمایش جناب بیلی رام شاطر انسپکٹر آف ورکس ، این ڈبلیو آر :

دل شکستہ ہوں بڑھادے آج تو شانِ شکست
اے انیسِ بیدلاں اے مرتبہ دانِ شکست
عرش سے ٹکرا گئی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
دیکھ اے دلدادۂ فتح و ظفر شانِ شکست
میری ہر تدبیر کو تقدیر دیتی ہے پلٹ
اس لیے کرتا ہوں بہرِ فتح سامانِ شکست
ہاں کبھی ہم بھی تھے گلزار ظفر مندی کے پھول
اب تو ہیں پروانۂ شمعِ شبستانِ شکست

۱- دیوانِ ناشط (خطی) صفحہ ۱۰۵ ۔

پر شکستوں کی رسائی ہے فرازِ عرش تک
پست ہو کر بھی ہے عالی شان ایوانِ شکست

شیشۂ مے کو بھی توڑو ، شیشۂ دل کی طرح
دل میں باقی رہ نہ جائے کوئی ارمانِ شکست

ربطِ الفت توڑنا ، توڑے ہوئے کو جوڑنا
یہ شکستِ جان و دل ہے ، وہ دل و جانِ شکست

آپ ہر دن اک نئے انداز سے دل توڑیے
التجا کرتے ہیں یہ جدت طرازانِ شکست

کامیابی نے دکھائی جب سے ناکامی کی شکل
دل میں رہتا ہے بجائے فتح ، میلانِ شکست

بنتی رہتی ہیں دو آنکھیں جوشِ غیظ و لطف سے
گاہ سامانِ شکست و گاہ درمانِ شکست

مٹ گیا ذوقِ گریباں گیریٔ فتح و ظفر
دل کو وہ راحت ملی ہے زیرِ دامانِ شکست

سلسلہ شعر و سخن کا پھر نہ شاید ٹوٹ جائے
ابتدا اس کی ہے اے ناشط ! بعنوانِ شکست

۲۷ جون ۱۹۲۲ء ، فورٹ سنڈیمن (بلوچستان)[1] :

میرے مخدوم ، میرے ذرہ نواز — عرض یہ ہے پس از سلامِ و نیاز
حسبِ فرمایشِ حضورِ اجمل — بھیجتا ہوں ، کونین دو بوتل
ایک کو آپ کام میں لائیں — صبح اور شام شوق فرمائیں
دوسری ہے برائے عبدِ کریم — تپ سے حالت اگر ہو اُس کی سقیم
صبح و نصف النہار و شام پیے — جائے مے ، اس دوا کے جام پیے

۱- دیوانِ ناشط (قلمی) صفحہ ۵۱ -

ان دواؤں کا اک بہانہ ہے شافی وہ خالقِ یگانہ ہے
فضل کر دے اگر وہ ربِ غفور ایک پل میں ہوں درد سب کافور
شیشۂ ادویہ بھی باز رہے دستِ دعوات بھی دراز رہے

۲۸ اگست ۱۹۲۳ء ، موسیٰ خیل (بلوچستان)[1] ۔ ایک دوست کو تاخیرِ جوابِ خط کی معذرت میں :

خط بھیجنے میں دیر ہوئی ، عذر خواہ ہوں
کوتاہیوں کا اپنی میں خود ہی گواہ ہوں
لیکن یہ خامشی مری وہ خامشی نہ تھی
جس میں نیازمندیوں کی چاشنی نہ تھی
خط بھیجنے میں لاکھ میں عاجل نہیں رہا
"لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا"

۲ ستمبر ۱۹۲۴ء ، موسیٰ خیل (بلوچستان)[2] ۔ موجودہ مسلمانوں کی حالت پر پانچ آنسو :

دولت کو لٹا بیٹھے ، عزت کو مٹا بیٹھے
باقی تھا فقط مذہب ، اُس کو بھی بھلا بیٹھے
ہم وقت کا کچھ مصرف سمجھے ہیں تو بس اتنا
اس بزم میں آ نکلے ، اُس بزم میں جا بیٹھے
یہ درد کی منت ہے ، وہ ضعف کا احسان ہے
اُٹھّے بھی تو کیا اُٹھے ، بیٹھے بھی تو کیا بیٹھے
سب قافلے والے ہیں منزل کی طرف راہی
سنتے ہیں بصد حسرت ہم بانگ درا بیٹھے
ہم بندۂ فرماں تھے اس بزم میں اے ناشط
جس وقت کہا اُٹھے ، جس وقت کہا بیٹھے

۱ ، ۲- دیوان ناشط (قلمی) صفحات ۲۵ ، ۹۳ ۔

۲۹ ستمبر ۱۹۲۹ع مشاعرۂ کوئٹہ :

اس درجہ خوگرِ ستمِ ناروا ہوں میں
نامہرباں کا ہے گماں مہرباں پر
اپنی نگاہِ ناز کو سمجھائیے حضور
بجلی گرا رہی ہے کسی ناتواں پر
فتنے بقدرِ حدِ نزاکت اُٹھائیے
للہ رحم کھائیے ننھی سی جان پر
راہِ سلوک طے ہو تو ملتی ہے راہِ جذب
مسجد سے ہو کے آئیے مے کی دکان پر
ناشط میں اپنے پوچھنے والوں سے کیا کہوں
کیونکر وجوہِ رنج کو لاؤں زبان پر[1] ؟

ہندو باغ (بلوچستان) بفرمایش ڈاکٹر محمد شفیق پشین :

ناشط کو کیوں نہ آئے پریشانیوں میں لطف
سودا کسی کی زلفِ پریشاں کا سر میں ہے[2]

۲۱ جون ۱۹۳۵ع ہندو باغ (بلوچستان) ، بفرمایش ڈاکٹر مدن گوپال شرما برق :

اُنھیں کو اس دلِ بیتاب کا بہلانا آتا ہے
جنھیں ترسانا آتا ہے ، جنھیں تڑپانا آتا ہے
چلا ہوں یوں‌تو اکثر دل میں عزمِ خانقہ لے کر
قدم اُٹھتے نہیں ، جب سامنے مےخانہ آتا ہے
جلو میں لشکرِ اطفال ہے پتھر لیے حاضر
عجب شان و تجمل سے ترا دیوانہ آتا ہے
ذرا سن تو سہی اے قصۂ مجنوں کے متوالے
ہمیں بھی اک دلِ برباد کا افسانہ آتا ہے

---

۱ و ۲- دیوان ناشط (خطی) صفحات ، ۱۰۳ ، ۹۹ -

کوئی اُسوقت دیکھے بے بسی توبہ کی اے ناشط
جب ان ہونٹوں تک اُنکے ہاتھ سے پیمانہ آتا ہے[1]

۳۰ جولائی ۱۹۳۱ع - فورٹ سنڈیمن - حسب فرمایش مولوی غلام نقشبند خاں :

سچ ہے لطفِ زندگانی اُس کو حاصل ہو گیا
جو نبیؐ کے نام لیواؤں میں شامل ہو گیا

بالیقیں دنیا و مافیہا سے مستغنی ہے وہ
سرورِ کونین کے در کا جو سائل ہو گیا

کیا بیاں میں آ سکے اُس کے تڑپنے کا مزہ
خنجرِ حبِّ محمدؐ کا جو بسمل ہو گیا

کشتۂ اُلفت تمھارا زندۂ جاوید ہے
چشم ظاہر بیں میں گو مُردوں میں شامل ہو گیا

ذرّۂ حبِ نبیؐ ناشط ہے جس کے قلب میں
جنت الفردوس میں وہ شخص داخل ہو گیا[2]

اخوند زادہ عبدالحق زبور جو ہلال بھی تخلص کرتے تھے[3]، ۱۹۰۳ع میں خانو زئی تحصیل پشین ضلع کوئٹہ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد بزرگوار علامہ عبدالعلی (۱۲۸۹ھ—۱۸۷۲ع تا ۱۳۶۴ھ—۱۹۴۴ع) ایک جید عالم تھے - اُن کی ذہانت اور تبحر علمی کا چرچا بلوچستان کے علاوہ قندھار، کابل، سندھ اور ہندوستان میں بھی تھا - کابل، قندھار اور دہلی سے علما خانو زئی آتے اور ہفتوں علامہ کے ساتھ علمی مباحث میں مصروف رہتے - آپ کا تعلق کاکڑ قبیلے سے تھا، پشتو اور فارسی کے عظیم شاعر تھے -

عبدالحق زبور گھر کی علمی فضا سے متاثر ہوئے اور اپنے والد سے کسبِ فیض کیا - گورنمنٹ سنڈیمن سکول کوئٹہ میں بھی طالب علم رہے

۱، ۲- دیوان ناشط (خطی) صفحات ۵۹، ۵۵ -
۳- اولس پشتو، کوئٹہ، خصوصی نمبر، ۱۹۶۳ع، صفحات ۳۷۹—۳۸۰ -
"ثقافت اور ادب وادی بولان میں" صفحات ۳۶، ۳۷، ۳۴۸ -

اور میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا ۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور چلے گئے ۔ وہاں اسلامیہ کالج لاہور میں علم کی پیاس بجھاتے رہے ۔ آپ کے ایک ہم جماعت پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی[1] (۳۴ مین روڈ سمن آباد لاہور) نے بتایا ''عبدالحق زبور ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے ۔ آپ کی زبان بڑی شستہ تھی ۔ اُردو میں خاصی دسترس رکھتے تھے ۔ کردار بڑا بلند تھا ۔ اپنی مشکلات کا اظہار نہ کرتے تھے ۔''

۱۹۳۲ع میں عبدالحق زبور نے سبی کے مقام پر خودکشی کر لی جس کی مختلف وجوہ بتائی جاتی ہیں ۔ یوں بلوچستان کا یہ ہونہار فرزند اور خلوص کا پیکر اُنتیس سال کی عمر میں اس دنیا سے منہ موڑ گیا ۔ افسوس صد افسوس ! زبور نے اپنی زندگی کے فلسفے کی تشریح اور اپنی خودکشی کی پیشین گوئی ان اشعار میں کی ہے :

یہ بربادی ، یہ ویرانی ، یہ خاک و خوں ، یہ میرا دل
الٰہی ! کیا کروں گا لے کے میں چشمِ جہاں بیں کو
یہ کیا کم ہے جہاں کے رسم و آئیں سے نہ میں بدلا
بدل سکتا نہ تھا گر میں جہاں کے رسم و آئیں کو

لاہور کے مشہور کارٹونسٹ اقبال احمد[2] کے بھائی ارشاد احمد خاں ، زبور کے بڑے قریبی دوست تھے ۔ اُن کو آخری خط میں سومن کا صرف یہ شعر لکھا تھا :

تو کہاں جائے گی ؟ کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

عبدالحق زبور کے والد علامہ عبدالعلی ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ع) کے لگ بھگ ریاست قلات کے وزیر معارف اور قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے ۔ ہلال کی خود کشی کے بعد بہت ہی کبیدہ خاطر ہوئے اور وزارت چھوڑ کر خانوزئی چلے گئے ۔

۱۔ راقم الحروف کی ملاقات مؤرخہ ۲۶ جون ۱۹۶۷ع ۔
۲۔ بشکریہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی ۔

زبور مرحوم پشتو ، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے - ان کے اردو کلام کا بیشتر حصہ اختر شیرانی مرحوم کے رسالے ''رومان'' لاہور میں چھپا - چند شعر یہ ہیں :[1]

دُختِ دبستان

شوخ ہے کتنی نگہ دختِ دبستانی تری
عقل کو ہوش آئے ساقی گر ہو نادانی تری
محو رہ اپنی نمو میں تو مری پروا نہ کر
بوالہوس ہوں میں ، بہشتِ حسن کا در وا نہ کر

لارنس باغ میں چاندنی رات

چاندنی سے بن گئیں نیلی فضائیں بحر نور
کہکشاں موجوں کا کف
بحر میں لا انتہا موتی ہیں غلطاں بے صدف
دور و نزد و نزد و دور
آ رہی ہے سطح پر سوے زمیں آبی پری
زہرہ گوں اس کی جبیں
نیم پنہاں چندنی بالوں میں جسمِ مرمریں
مائلِ خنیا گری
ساکنانِ بزمِ قدسی دم بخود ، سر خم ، خموش
عشق دستِ حسن میں مضراب ، میرا دل رباب
رقص میں ہیں عقل و ہوش

خزاں آ کر ملا دے خاک میں اس روئے رنگیں کو
بزعمِ باغباں بلبل دعا دیتی ہے گلچیں کو
تری زلفوں کے صدقے اور بھی شاید گراں کر دے
خرامِ فتنہٗ محشر ہمارے خوابِ سنگیں کو

۱- بیاض عبدالصمد درانی ، کوئٹہ -

قطعات

حسرتیں دل کی مٹائیں گے کبھی
اک نئی دنیا بسائیں گے کبھی
جس سے لرزش میں ہو ساری کائنات
وہ تمنا لب پہ لائیں گے کبھی

دردمندی کی حکایت کیا کروں
ہوتی ہے اُن کو شکایت کیا کروں
دیکھتی ہیں شش جہت آئینہ وار
اور آنکھوں کو ہدایت کیا کروں

میر محمد حسین (عنقا تخلص) بلوچ ۲۰ ستمبر ۱۹۰۷ء کو مچھ کی کوئلہ کان مچکان میں اُس وقت پیدا ہوئے جب ان کے والد محمد عبداللہ مرحوم اپنے کوئی دو سو مکرانی مزدوروں کو ہفتہ وار اُجرت بانٹ رہے تھے۔ بولان گزیٹیر میں مرقوم ہے کہ مچھ میں کوئلہ کان ۱۸۸۵ء کے قریب شروع ہوئی اور اس کے اولین کارکن مکرانی بلوچ تھے جو اس سے پہلے بنگال اور آسام میں کوئلہ کا کام کر چکے تھے۔ وہاں بھی ریلوے لائن بچھانے کے سلسلے میں گئے تھے اور یہاں بھی ریلوے لائن بچھانے کے لیے لائے گئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلا پرائمری سکول مچھ میں کھلا تو عنقا بھی داخل کیے گئے۔ پرائمری مچھ سے پورے بلوچستان میں اول رہ کر اور اسی طرح مڈل سیوی سے اور میٹرک کوئٹہ سے اول رہ کر مارچ ۱۹۲۴ء میں پاس کیا۔ بعض وجوہ کی بنا پر تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ٹیچر متعین ہوئے۔ چھ سال تک پڑھانے کے بعد کراچی پہنچے اور مختلف اخبارات کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ اُردو سے خاصا لگاؤ تھا۔ خود لکھتے ہیں:[۱] ''جون ۱۹۳۳ء میں نواب یوسف علی خان عزیز مگسی کی صدارت میں بمقام کوئٹہ میٹنگ ہوئی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے نام ایک یاد داشت بلوچستان کی طرف سے مرتب کی گئی جس کا ایک ممبر میں تھا۔ اُردو زبان کے متن میں میرا حصہ اہم تھا۔ اسی سے

۱۔ ''بلوچی دنیا''، ملتان، فروری ۱۹۶۷ء، صفحات ۳۷، ۳۸۔

متاثر ہو کر پارٹی کی طرف سے میں اخبار نکالنے کے لیے چنا گیا۔''
محمد حسین عنقا کو اخوند زادہ عبدالحق زبور سے شاعری اور فلسفے کا تلمذ رہا ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام ۱۹۳۴ء میں کراچی سے ''رحیل کوہ'' کے عنوان سے شائع ہؤا تھا جو سرورق سمیت ایک سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تقریظ غلام محمد بلوچ اور تعارف نسیم تلوی نے لکھا ہے۔ اس میں فارسی منظومات بھی ہیں لیکن زیادہ کلام اردو میں ہے۔ ''رحیل کوہ'' کی نظمیں، ہر شعر اور ہر لفظ مصنف کی ملک اور قوم سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ فہرست میں عنوانات کے ساتھ 'تقریبات' کے تحت ہر نظم کی ''شانِ نزول'' درج کی گئی ہے۔ ایک نظم ''برادران کوئٹہ''[1] ملاحظہ فرمائیے؛ یہ ان دنوں کوئٹہ ایسے شہر میں جمود کو نازیبا سمجھ کر لکھی گئی:

کہو بہر خدا اے کوئٹہ والو
تمھیں کیا ہو گیا اے کوئٹہ والو
حقیقت میں تمھیں ہو کارواں میر
ہو پیچھے کیوں بھلا؟ اے کوئٹہ والو
اگر سمجھوں تو کیا سمجھوں بتاؤ
مجھے بہر خدا اے کوئٹہ والو
سمجھتے یا نہیں ہو ہم کو بھائی
کہ ہم سے ہو جدا اے کوئٹہ والو
تمھیں کیا لت ہے معشوقانہ خو کی
کہ کھنچتے ہو ذرا اے کوئٹہ والو
تمھیں یا ننگ ہے یہ صحبت اپنی
کہ تم تو ہو بلا اے کوئٹہ والو
مگر عنقا کی یہ تم سے گذارش
سنو بہر خدا اے کوئٹہ والو

۱۔ رحیل کوہ، صفحات ۵۷، ۵۸۔

اخوت ، علم ، تہذیب اور اسلام
تمہارا کیا ہؤا اے کوئٹہ والو
یہ دن شکوہ طرازی کے نہیں ہیں
یہ چھوڑو مشغلہ اے کوئٹہ والو
تمہارے واسطے ہے سخت مضطر
تمہارا قافلہ اے کوئٹہ والو
اٹھو تا کارواں میری کوئی اور
نہ لیوے دیکھنا اے کوئٹہ والو

''فریاد''[۱] (پیارے نبی کی پیاری جناب میں) کا آخری بند یہ ہے :

اے نبیوں کے نگیں تجھ کو نبوت کی قسم
شافعِ اُمتِ عاصی ہے شفاعت کی قسم
تجھ کو صدیق ابوبکرؓ کے ایماں کی قسم
اور فاروق عمرؓ کی تجھے غیرت کی قسم
تجھ کو عثمان غنیؓ کی خوئے صدقہ کی قسم
اور علمِ علی حیدرؓ کی ثقاہت کی قسم
حریت کی ہے قسم تجھ کو صلاح الدیں کی
اور ہے خالدِ جانباز کی جرأت کی قسم
جن نواسوں کا بہا خون وطن کی رہ میں
اُن کی اس غیرتِ ملی و شجاعت کی قسم
جن صحابوں نے سر و مال لٹایا تجھ پر
اُن کی اس شوکت ایمان و محبت کی قسم
جن مسلمانوں نے اسپین میں ترا گاڑا علم
اُن کی اس جان سپاری و صداقت کی قسم
کر دعا بہر خدا حق میں بلوچستان کے
اس پہ ارزاں ہوں تا لطف و کرم یزداں کے

۱- رحیل کوہ ، صفحہ ۹۶ -

پیر بخش اصلی نام جسے بعد میں محمد نسیم سے بدل دیا گیا - سبی کے قریبی گاؤں تلی کے باسی تھے - اسی مناسبت سے 'تلوی' اُن کے نام کا ایک حصہ بن کر رہ گیا اور وہ ''نسیم تلوی'' کے نام سے مشہور ہوئے - اُنھوں نے ۱۹۳۳ع میں میٹرک پاس کیا ، پھر ٹیچر بنے - بعد میں آزادیٔ وطن کی ہم نوائی کی اور کراچی پہنچ کر صحافت کو اپنایا - آپ نے ایک مرتبہ دہلی جا کر وہاں سے ''ینگ بلوچستان'' جاری کیا لیکن وہ دوسری بار شائع نہ ہو سکا - واپس آ کر کراچی سے ''بلوچستان جدید'' جاری کیا[1] - اُس زمانے کا اُردو کلام ملاحظہ فرمائیے :

تلقینِ عمل[2]

خدا کی ذات پر تم کو اگر کچھ بھی بھروسا ہو
تو دیکھو کس طرح باطل ابھی معدوم ہوتا ہے
بڑائی اور عزت قوم کی خدمت میں پنہاں ہے
کہ خادم آخرش کو دوستو! مخدوم ہوتا ہے
ارادہ ہو اگر کامل ، بدل جاتی ہیں تقدیریں
غلط ، انسان کا سود و زیاں مقسوم ہوتا ہے
ترے ملک و وطن کو یہ بُری رسمیں ڈبو دیں گی
مگر افسوس پھر بھی ان کا تو محکوم ہوتا ہے
صداقت اور باطل میں ہمیشہ جنگ رہتی ہے
ظفر حق کی یقینی ہے ، تو کیوں مغموم ہوتا ہے
فنا کر دے نسیم اپنے تئیں جو راہ میں حق کی
وہی مغفور ہوتا ہے ، وہی معصوم ہوتا ہے

۱- ایلم ، مستونگ ، استقلال نمبر ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع ، صفحات ، ۲۰ ، ۳۰ -
۲- ینگ بلوچستان ، کراچی ، ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۴ع -

ذرا انقلاب دیکھ[1]

آتا ہوا جہان میں تو انقلاب دیکھ
سردار ڈر رہے ہیں ، ذرا اضطراب دیکھ
تو نے بہت سی دیکھی ہیں تبدیلیاں مگر
بدلا ہے کس طرح سے زمانہ شتاب دیکھ
جرگہ کے قصرِ ظلم میں آیا ہے زلزلہ
اس کشمکش کو دیکھ ، ثواب و عذاب دیکھ
مظلوم کی ہے آہ ، جو پہنچی ہے عرش پر
ظلمت کے اس اُفق پہ ذرا ماہتاب دیکھ
بڑھنے لگی ہیں غیر کی اب مہربانیاں
بدلے ہیں طور کس لیے عفو و عتاب دیکھ
عہد کہن کی یاد سے کیوں تلخ کام ہے
آنے لگا ہے دور نیا ، آب و تاب دیکھ
کہتے ہیں سازشی ہمیں مطلب پرست سب
پر اصلیت کا اُٹھ کے رہے گا نقاب دیکھ
ہونے لگی شکست ہے باطل کو اے نسیم
آتا ہے انقلاب ، ذرا انقلاب دیکھ

قیام پاکستان کے بعد نسیم تلوی نے نئے عزم کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنے کی ٹھانی - ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد اُنھوں نے کوئٹہ سے اخبار ''بلوچستان جدید'' جاری کیا - یہ اخبار روزنامہ تھا اور خوب چل نکلا - ایک ہی سال گذرا تھا کہ بلوچستان کے صحافی مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے - نسیم بھی ہمراہ تھے - واپسی پر لاہور میں حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہو گیا :

رُو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت[2]

۱- ینگ بلوچستان ، کراچی ، ۴ نومبر ۱۹۳۴ء -
۲- نسیم تلوی ، محمد حسن نظامی ، ایلم مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹٦٦ء -

یہ ہیں ۱۹۳۵ء کے زلزلے سے پہلے کے چند دیگر شعرا کے اُردو کلام کے نمونے :

پیام[۱]

نوخیز مسلم بلوچوں سے روئے سخن ، از محمد اشرف خاں ولی خان مستونگ :

سن تجھے اک بات کہتا ہوں اسی پر کر دھیان
گوشِ دل سے سن مری اس بات کو اے مہربان
تیرے خالق نے تجھے رستہ دکھایا مستقیم
جس پہ چلنے کی ہدایت کر کے بولا مسلمان
تجھ کو مسلم بول کر بولا ، ابھی مت خوف کر
تجھ کو پہنچے گا نہ کوئی کچھ گزند اور کچھ زیان
تو سلامت ہو گیا ہر خوف ، ہر اک عیب سے
کیونکہ تو سیدھی سڑک پر ہو گیا ہے رہ روان
تیرا رستہ صاف ہے کانٹوں سے بالکل پاک ہے
لے چلا اس پر ابھی اپنے عمل کا کاروان
تیرے ہاتھوں میں ہمیشہ ہو توکل کا عَلم
تا کہ اس کو دیکھ کر حیرت میں ہو سارا جہان
تو سراسر حق کے رستے پر ہے بے شک گامزن
تیری رفتار علی الحق المبین ہے بے گماں
کر رہا ہے عجز میں اشرف ابھی یہ التجا
پھر دکھا دے یا خدا مسلم بلوچوں کی وہ آن

داستان غم

از آزار ذگر مینگل نوشکی[۲] :

کر دیا مجبور دل نے غم سنانے کے لیے
تجھ کو اے روٹھے بلوچستان منانے کے لیے

۱۔ ینگ بلوچستان ، کراچی ، ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء -
۲۔ بلوچستان جدید ، کراچی ، ۱۶ اپریل ۱۹۳۴ء -

نیم بسمل کر کے چھوڑا اس لیے صیاد نے
جھاڑتا تھا اپنے پر میں آشیانے کے لیے
جل گئی ہے شمع پروانوں کی اب قلت نہیں
جوق جوق آئیں گے اپنے کو جلانے کے لیے
اشک باری کرتے ٹوٹا رشتۂ تارِ نگہ
حسرتیں باقی رہیں دل کو ستانے کے لیے
بزم میں باقی نہ ساقی ہے ، نہ ہم مشرب کوئی
چھوڑ سے ، آزار چل ، اب زہر کھانے کے لیے

دردِ وطن

از آزار ذگر سینگل نوشکی[1] :

پھر زباں پر آ گیا ذکرِ وطن بے اختیار
کفر کے جور و ستم سے آنکھ ہے پھر اشک بار
آرزو تیری ، خیال و شوق تیرا اے وطن
روح پھر بے خود ہے مانندِ بوئے مشکِ ختن
پائمالیِ حقوق و حالتِ زار و نزار
اے وطن ! تیری طرف سے دل ہے کتنا داغ دار
میرا سب کچھ اے وطن تیرے لیے قربان ہے
میرا سر ہے ، میرا دل ہے ، میرا مال و جان ہے
کیوں کریں آزار شعروں پر خراب اپنا دماغ
کیا مزہ ہے نغمہ خوانی میں جہاں ہوں بوم و زاغ

تضمین بر صدائے یوسف عزیز

از مجاہد بلوچستانی[2] :

تمناؤں کی بربادی کو دیکھا جا نہیں سکتا
ضروری ہے کہ اب لبریز یہ پیمانہ ہو جائے

۱- بلوچستان جدید ، کراچی ، ۸ جون ۱۹۳۴ء -
۲- بلوچستان جدید ، کراچی ، ۱۶ اپریل ۱۹۳۴ء -

انھی فرزانگوں نے ملک کا بیڑا ڈبویا ہے
ضروری ہے کہ یکسر ملک سب دیوانہ ہو جائے
وطن والو وطن کی آن کا اب یہ تقاضا ہے
کہ یہ صیدِ زبوں آباد یا ویرانہ ہو جائے
رفیقانِ مکرم کو گرفتار بلا کر کے
کہیں آزادیِ ملت کا خواب افسانہ ہو جائے

شاعر اور قوم

از میر مٹھا خان خضر مری بلوچ[۱]:

پھر آ گئی فصل بہاری پھر طوطیٔ دراج و سار
ہیں خوش کہ وہ دن آ گئے جن کے لیے تھے بیقرار
گل ہے محو خواب ، سرگرم ترنم ہے ہزار
سنبل نے ہے کھولی ہوئی یاں اپنی زلف مشکبار
ہے محوِ آئینہ وہاں سرو ، کنار جوئبار
ہنستے ہیں وقت سحر گل بے سبب بے اختیار
رکھتی ہے جنت کا اثر یہ صبح کی باد بہار
نرگس کی آنکھیں کیوں نہ ہوں نشہ سے مے کے پُر خمار
ہر شاخ ہے یوں جھومتی جس طرح رند بادہ خوار
لوٹیں نہ کیوں اہل چمن اس موسمِ گل کی بہار
مل سکتے ہیں کس کو بھلا یہ عیش کے لیل و نہار
طاری گلشن پر ہؤا اک عالمِ کیف و خمار
انجمن میں الغرض کوئی نہیں اب ہوشیار
ہاں ایک شبنم ہے جسے معلوم ہے پایانِ کار
معلوم ہے اس کو کہ ہیں دن فصل گل کے تین چار
ہونے کو پامال خزاں ہے دو دن میں ہے فصل بہار

۱- البلوچ ، کراچی ، ۳ ستمبر ۱۹۳۳ء

اہل چمن کے غم میں کیوں روتی ہے ہردم سوگوار
غفلت پہ اہل باغ کے روتی ہے شبنم بار بار
رہتا ہے غم میں قوم کے شاعر بھی یوں ہی سوگوار
کرتی ہے غفلت قوم اگر ہوتا ہے دل اُس کا فگار

آ گیا وقتِ امتحانِ بلوچ

از نصیر مینگل نوشکی[1] :

آ گیا وقتِ امتحانِ بلوچ — اب ہے کچھ اور آسمانِ بلوچ
قید سے کیوں اُنھیں ڈراتے ہو — طفلِ نادان نہیں جوانِ بلوچ
خوفِ زنداں نہیں بلوچوں کو — جان پر کھیلنا ہے شانِ بلوچ
ملک و ملت کے واسطے قربان — مال و دولت، عزیز و جانِ بلوچ
ہو ہی جائے گی ایک دن آزاد — آج گر بند ہے زبانِ بلوچ
زورِ باطل سے نہیں دب سکتا — آزما دیکھ تو کمانِ بلوچ
کچھ نہیں ہے مگر خدا کے سوا — جس پہ ہے انحصارِ شانِ بلوچ
رکھ توقع نصیر خالق پر — ہے وہ خلاق پاسبانِ بلوچ

مصرعِ طرح

''ترا جلوہ شام و سحر دیکھتا ہوں''۔ از عنقا[2] :

شفق کی ضیا باریوں کی قسم ہے
ترا جلوہ شام و سحر دیکھتا ہوں
خبر لائے تیری گلی کی تو مانوں
ہوا کو یونہی در بدر دیکھتا ہوں
میں ''اقرار'' لینے پہ کیوں اُس سے اَڑ جاؤں
کہ اُس کا دہن تنگ تر دیکھتا ہوں

۱۔ البلوچ، کراچی، ذیقعد ۱۳۵۲ھ، فروری ۱۹۳۴ء ۔
۲۔ بلوچستان جدید، کراچی، ۲۴ مئی ۱۹۳۴ء ۔

مگر یہ تری آنکھ کا شیفتہ ہے؟
کہ ابرو کو خم کردہ سر دیکھتا ہوں
سوا یاس و حرماں کے یاں کیا دھرا ہے؟
تجھے دل میں کیوں جلوہ گر دیکھتا ہوں
گریزاں ہے تیرا تصور کہ میں بھی
پریشان اپنی نظر دیکھتا ہوں
نہیں ہے تری گر نگاہوں سے ترساں
یہ کیوں غم کو اندر جگر دیکھتا ہوں
مبارک ہے بے یار جینے سے مرنا
کہ اک شمع تو قبر پر دیکھتا ہوں
اُسے دیکھ پایا ہے شاید سحر نے
شکستہ رخی کے اثر دیکھتا ہوں
رہا میں تو عنقا کہ اُن کی کمر کو
مدام اپنا مدِ نظر دیکھتا ہوں

وفائے جفا نما[۱]

مسلماں سائلِ تعلیمِ قرآں ہوتے جاتے ہیں
علمبردار باطل کے پریشاں ہوتے جاتے ہیں
جگایا ٹھوکروں نے خواب سے افرنگ کے ہم کو
ہم اُن کے دم بہ دم ممنون احساں ہوتے جاتے ہیں
ہے جب سے برقِ استبداد سرگرمِ شرر باری
مرے بیدار شیرانِ نیستاں ہوتے جاتے ہیں
جہاں میں پاسِ ناموسِ وفا کے واسطے اپنی
غلامانِ محمدؐ زیب زنداں ہوتے جاتے ہیں
پتنگوں کی طرح سے نوجوانان وطن میرے
شعاعِ شمع آزادی پر قرباں ہوتے جاتے ہیں

۱- بلوچستان جدید، کراچی، ۸ مئی ۱۹۳۴ء -

مرے اہل وطن کے گرچہ پتھر کے ہیں دل لیکن
شرر بن کر ہم ان کے دل میں پنہاں ہوتے جاتے ہیں
مری اس رات دن ، شام و سحر کی خونفشانی سے
شہیدانِ محبت گل بداماں ہوتے جاتے ہیں

ربِ اکبر کی بارگاہ میں

از صبا[۱] بلوچستانی :

ہم مسلمانوں کی سن فریاد اے رب زماں !
اپنے پیارے دوست کی اُمت کی جانب کر دھیاں
ہر طرف مسلم کو دیکھا مفلس و خوار و زبوں
اور کافر کامران و کامگار و شادماں
غیر مسلم با مراد اور آہ ! مسلم نا مراد
ہے عجب احوالِ عالم اور عجب دورِ زماں
اور آزادی تو کیا ، ان کے زبان و گوش و چشم
بند رہنے کے لیے ہیں سب کے سب مجبور یاں
اب نہیں اس سے زیادہ طاقتِ بارِ ستم
اب بلوچستاں کے حق میں پھیر دورِ آسماں
اے صبا کر عرض پیشِ حق بہ چشمِ اشک بار
اپنے مسلم بھائیوں کی آفت اور داستاں

مُلا محمد حسن (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کے دو بیٹے تھے : مولا داد خاں اور اللہ داد خاں ۔ اللہ داد خاں کے فرزند شیر علی خاں علی آغا ، علی زئی مستونگ (قلات ڈویژن ، حال تحصیل دار بھاگ) فارسی اور اُردو میں شعر کہتے رہے ہیں ۔ زلزلے سے پیشتر اُن کا کلام اکثر کراچی کے اخبارات میں چھپا کرتا تھا ۔ اُن کے اُس دور کے اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے :

۱- ینگ بلوچستان ، کراچی ، ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۴ع ۔
(صبا در اصل شیر علی خاں علی کا فرضی نام ہے) ۔

خستگیِ وطن کا راز پنہاں

گلستانِ بلوچستان کے گل ہیں چاک دامانی
کہ اس کی بلبلیں سب ہو گئیں محبوس زندانی
نہ داناؤں کے حق میں ہے نہ نادانوں کے حق میں ہے
عجب ہے گردشِ گردوں کی یہ گردون دورانی
بلوچستانیوں کی یا الٰہی ! ایسی حالت کیوں ؟
وطن ایک اور ملت ایک ، لیکن یہ پریشانی ؟
مرے اے ہمنوا ! آؤ ، بہائیں خون کے آنسو
گلستاں زار ہو جائے بلوچستاں کی ویرانی
فضا کا اے علی ! یہ اقتضا ہے بر ملا آئے
زباں پر اب وطن کی خستگی کا راز پنہانی

درسِ ترقی

جہالت سے اگر جاہل کو تم کو روکنا ہے پھر
بلوچستاں میں اک گشتی جماعت کی ضرورت ہے
وطن کی شمع پر پروانہ سا جلنے کے ہو شائق
تو جل جاؤ کہ جلنے کا یہی وقت اور ساعت ہے

ترانۂ علی

فغاں کیا ہے زباں تک بھی نہ ہو طاقت رسائی کی
جگر کا خون پی کر مثل مجنوں کُو بکُو رہنا
اُفق پر شام غم سے ہے اگر ظلمت تو کیا ڈر ہے
بہ امیدِ طلوعِ خاورِ ''لاتقنطوا'' رہنا
خدا وہ دل نہ دے جس میں نہ ہو فکر وطن ہردم
وبالِ دوش وہ سر ہے کہ ہو بے آرزو رہنا

ایک غزل کا مطلع :

تیرے خرامِ ناز نے مجھ کو کیا بےہوش بس
اس ناز و اس انداز سے سارا جہاں مدہوش بس

زلزلے کے بعد علی نے یوسف عزیز کی وفات پر کہا :

رہتی ہیں آنکھیں اشکبار دل سے نکلتے ہیں شرار
ہے جان و تن بھی بیقرار تجھ بن کہاں دل کو قرار
اے یوسفِ عالی مقام منظورِ جملہ خاص و عام
دل کا لہو بہتا ہے دیکھ تن زار غم سہتا ہے دیکھ
غمگیں جہاں رہتا ہے دیکھ بندہ علی کہتا ہے دیکھ
افسوس و حسرت یوسفا
تیری جدائی سے سدا

جناب نبی بخش اسد بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں بلوچستان آئے ۔ مختلف عہدوں پر تعینات رہ کر پچپن سال کی عمر میں ۱۹۳۴ع میں ریٹائر ہوئے ۔ پھر لس بیلہ ریاست میں وزیر بھی رہے ۔ ۱۹۴۷ع کے بعد وفات پائی اور کوئٹہ میں دفن کیے گئے ۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے ۔ آپ تقسیم ملک کے وقت امرتسر میں تھے ۔ وہاں سے ہجرت کی تو سارا کلام وہیں رہ گیا اور ضائع ہو گیا ۔ آپ کی اولاد اہم عہدوں پر تعینات ہے اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہے ۔ آپ کے بعض اشعار ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' کے تحت پیش کیے جا چکے ہیں ، مزید اشعار ملاحظہ فرمائیے :

عروسِ جواں

ایک بے نقاب ڈولی کو دیکھ کر[1] :

سرِ شام کالی گھٹا چھا رہی ہے
ہوا مژدۂ جاں فزا لا رہی ہے

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۸ نومبر ۱۹۳۹ع -

ہٹو اور بچو کی صدا آ رہی ہے
چلی آ رہی ہے سر راہ ڈولی
عروس ایک ڈولی میں ہے بھولی بھولی
نگاہوں میں بیباکیاں گو نہیں ہیں
اگر شوخیاں ہیں تو سب سو رہی ہیں
مگر پھر بھی سفاکیاں ہو رہی ہیں
خدا جانے سرمے کی تحریر کیا ہے
نوشتہ ہے کیا اور تقدیر کیا ہے
ہوا سر سے آنچل کو سرکا رہی ہے
اور آویزے گیسو میں الجھا رہی ہے
حسینہ ادھر سخت شرما رہی ہے
یہ عریانیاں گر پیا دیکھ لے گا
نہ جانے وہ جی میں ہمیں کیا کہے گا
کہاں کی عروس اور کہاں کی یہ ڈولی
فقط شاعرانہ تھی یہ بولی ٹھولی
گریز اب بیاں ہو کہ تشبیب ہو لی
اسد پیش آں شاہ روز شفاعت
ببر ہدیۂ حسن صدق و ارادت

حسن رائگاں[1]

روہیڑا (گلنار کوہی) کے پیڑ کو دیکھ کر (پانچ بند۔ پہلا اور آخری مندرج ہے):

داماںِ کہسار کے دشت بے آباں میں
ریگِ رواں میں قریۂ ویران کے
منظر حیراں میں

۱۔ پاسبان، کوئٹہ، ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء۔



جناب نبی بخش اسد

اک درخت روپہیڑا سبز اور پھولا پھلا
مادرانہ مہر سی شبنم صبح بہار
دھو رہی ہے بار بار آستین ناز سے
دامن گرد و غبار
پھر زبان حال سے کہہ رہی ہے جال سے
حیف حسن رائگاں مجبور امر کن فکاں

ہلالِ عید[1]

کہا میں نے فرازِ آسماں پر
نظر کر دلربا زلفیں ہٹا کر
ترے ابرو کا بھی اے فتنہ پرور
خدا نے کر دیا موجود ہمسر
بگڑ کر مجھ سے فرمایا کہ جی ہاں
مرا کل کھو گیا تھا ایک جھومر
کیا میں نے سوال از آسماں تھا
مگر جو ہے جواب از ریسماں ہے
بلا کا ہے تجاہل عافارنہ
مرے فہم و ذکا کا امتحاں ہے
کہا قصہ اسد کوتاہ کیجیے
ہلالِ عید کرب و درد جاں ہے
مہینہ بھر کے روزوں کا اثر ہے
خمیدہ ضعف سے پشت قمر ہے

غزل[2]

خدا را نہ پوچھو میں کیا جانتا ہوں
'الف' جانتا ہوں ، نہ 'با' جانتا ہوں

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۱۲ نومبر ۱۹۴۰ء -
۲- پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ مارچ ۱۹۴۲ء -

مجھے علم اور جہل سے واسطہ کیا
زمانہ سب اچھا برا جانتا ہوں
گواہ مچھلیاں ہیں مرے دست و پا کی
تلاطم میں بھی تیرنا جانتا ہوں
یہ تسخیر دل اور کواکب کی گردش
طبیعات کا اقتضا جانتا ہوں
حسینوں کی محفل کا ماحول و منظر
پریشانیوں کی فضا جانتا ہوں
مزاج اُن کا پوچھا تو ہنس کر یہ بولے
نوازش ، کرم ، مدعا جانتا ہوں
تصوف میں گو دسترس کچھ نہیں ہے
مگر راہِ صدق و صفا جانتا ہوں
''ہمہ اوستی'' سے اسد توبہ توبہ
کہ مخلوق کو بھی خدا جانتا ہوں

اسد کے کلام پر مبنی ایک پمفلٹ بھی چھپا تھا جو ''سلام و التجا'' (بحضور سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) پر مبنی ہے - اس کے چار بند اور تیس شعر ہیں - ابتدا اور انتہا دیکھیے :

باعثِ ایجادِ عالم نورِ یزداں کو سلام
سیدِ اولادِ آدم ظلِ سبحاں کو سلام
مطلعِ صبحِ سعادت، مہرِ تاباں کو سلام
مصدرِ جود و کرم ابرِ بہاراں کو سلام
دستگیرِ عاجزاں پشت و پناہِ بےکساں
دلنوازِ عاشقانِ خستہ حالاں کو سلام
افتخارِ تازیاں و مایۂ نازِ عجم
بادشاہِ انس و جاں و شاہ شاہاں کو سلام

معدنِ خوبی و خیر و مصدرِ حسن و جمال
خاندانِ ہاشمی کے مہرِ رخشاں کو سلام

یا خدا بہر محمد مصطفیٰؐ
افسر و سالارِ فوجِ انبیاؑ
عظمتِ شیخینؓ و عثمانؓ و علیؓ
خاصتہً معصومی آل نبیؐ
صفدران خیبر و بدر و حنین
نورِ چشمِ فاطمہؓ حسنؓ و حسینؓ
شاہ ابوالخیر اعنی مخدوم اسد
موردِ الطافِ اللہ الصمد
از برائے صاحبِ خلقِ عظیم
صحتِ کامل عطا کر اے کریم

نذیر احمد شیخ کا ذکر ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' میں ہو چکا ہے - آپ کوئٹہ میں تین سال (تقسیم ملک سے چند سال پہلے) قیام پذیر رہے اور یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے - آپ کا مزاحیہ اور تفریحی نظموں کا مجموعہ ''حرفِ بشاش'' کے نام سے ۱۹۶۵ء میں آئینۂ ادب چوک مینار انار کلی لاہور نے چھاپا - اُس کے صفحات ۲۳۴ اور قیمت پانچ روپے پچاس پیسے ہے - اس کا تعارف جناب ممتاز حسن نے سپرد قلم فرمایا ہے - لکھائی چھپائی موزوں ، سرورق جاذب نظر -

''مزاح و تفنن ، شعری ادب کی ایک جیتی جاگتی روایت ہے جو تفریحی پہلو کے ساتھ ساتھ اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں بھی معاون ہوتی ہے - نذیر احمد شیخ کی طبیعت میں فطرت نے ایک خاص لچک رکھی ہے - زمانہ ان کے ساتھ ساز کرے یا نہ کرے ، وہ زمانے کو اپنے ساتھ چلانا جانتے ہیں - معروف شخصیتوں پر مزاحیہ رنگ میں نقد کرنا اُن کا

کمال ہے''۔ سید ضمیر جعفری اُن کے متعلق کہتے ہیں[1] :

شاعر ، سائنسدان ، قلندر ، رند ، امیر ، فقیر
شعر طبیعت ، سائنس روٹی ، رندی شغلِ کبیر
پیر ستارہ گیر
واہ رے شیخ نذیر

کوئٹہ میں قیام کے دوران نذیر احمد شیخ نے ''مثنوی شیر و خر'' کے علاوہ مندرجہ ذیل نظمیں لکھیں[2] جو ''حرفِ بشاش'' میں شامل ہیں :

شعر کی آمد (صفحہ ٦٦) ، بیل سے خطاب (صفحہ ۷۷) ، سگرٹ نوش کا روزہ (صفحہ ۱۱۵) ، غلامی (صفحہ ۱۲۲) ، ساقی نامہ (صفحہ ۱۲۳) ، کائنات (صفحہ ۱۴۰) ، غمِ روزگار (صفحہ ۱۴۷) ، جونیر (صفحہ ۱۴۸) ، فراموش کردند عشق (صفحہ ۱۴۹) ، چور کی سیر (صفحہ ۱٦۹) ، شاعرِ بے مقام (صفحہ ۱۸۳) ، شاعر کی بخشش (صفحہ ۱۸۴) ، بھارتی بابو (صفحہ ۱۸٦) ، مہملات کا بستر (صفحہ ۲۰۳) ۔

انھی نظموں کے چند اشعار ، جو ''وادیٔ شال'' میں کہے گئے ہیں ، پڑھیے اور سر دھنیے :

یاراں فراموش کردند عشق

حسن بولا میں تو روتا ہوں تمھاری جان کو
اور تم کو کچھ خیالِ دیدۂ پرنم نہیں
عشق نے اک آہ کھینچی اور نرمی سے کہا
سچ اگر پوچھو ڈیئر ! تو آج کل انکم نہیں

۱- حرف بشاش ، صفحہ ۵۸ ۔
۲- نذیر احمد شیخ کا خط (۹ اسلم فلیٹ بستی کاریگر ، دی مال ، واہ چھاؤنی) راقم الحروف کے نام ، مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹٦۷ع ۔

جونیئر

خود کشی کا تو ارادہ بھی نہ دل میں لائیے
گر کسی دفتر میں جا کر "جونیر" کہلائیے
جاہلِ مطلق بھی ہو گر "سینیر" دب جائیے
وہ کہے "ہم بولتا ہے" تم کہو "فرمائیے"
اپنی قسمت اور ذہانت کو ہمیشہ کوسیے
افسرِ اعلیٰ کے لیکن رات دن گن گائیے
اردلی اور دفتری تک آپ کے اُستاد ہیں
اب غلاموں کی غلامی کے مراتب پائیے

شاعرِ بے مقام

کھا بیٹھا ہے عرصہ ہؤا سب باپ کی پونجی
اب قرض طلب کوئے پٹھاناں میں ملے گا
جب اُس کو صلہ دینے کو ڈھونڈے گا زمانہ
مل جائے گا، پر گورِ غریباں میں ملے گا

شاعر کی بخشش

نہ روٹی، نہ کپڑا، نہ زر بخشتا ہوں
فقط گھر کو نورِ نظر بخشتا ہوں
نکھٹّو سہی، ہو کے صورت پہ لٹّو
حسینوں کو دل اور جگر بخشتا ہوں
کمر جس حسیں کی نظر آئے غائب
لقب اُس کو رشکِ قمر بخشتا ہوں
کوئی مجھ کو بخشے نہ بخشے میں خود کو
خطابات شام و سحر بخشتا ہوں
جو بے کار ہو، میرے اشعار گائے
نکمّا سہی، کچھ ہنر بخشتا ہوں

بہت اُنس دیوانگی سے ہے مجھ کو
خرد کو میں اذنِ سفر بخشتا ہوں
"گدا ہوں مگر وہ گدائے غنی ہوں"
کوئی داد دے دے تو گھر بخشتا ہوں

پیروڈی (جوش ملیح آبادی سے معذرت کے ساتھ) :

سہملات کا بستر

کبھے پنبۂ سرِ بالیں جنوں کو سنگ طفلاں ہے
کبھے وحشت شکارِ تنگیٔ مقدارِ بستر ہے
ز بس سیر گلستاں آئینہ سرو و صنوبر کا
برنگِ طوطیِ رنگیں پریدن کارِ بستر ہے
بنایا خوفِ اژدر سے نشیمن شاخِ آہو پر
حذر سوجِ صبا مرغ چمن بیزارِ بستر ہے
محیطِ دشت دو عالم تماشا گاہِ مجنوں کا
مگر بعد از شکار گرگِ نر حقدارِ بستر ہے
بسان تیشۂ فرہاد عاجز روبکار آیا
کہ تکیہ زیر پا افتادہ برخوردار بستر ہے

پیروڈی (مرزا غالب سے معذرت کے ساتھ) :

غمِ روزگار

دل اُن کو پیش کر کے کہا اضطراب میں
اب نوکری دلائیے اپنی جناب میں
عاشق ہؤا ہوں دیکھیے دو ڈگریوں کے ساتھ
بے روزگار پھرتا ہوں عہدِ شباب میں
کہنے لگے کہ تم تو ہو کالج سے فیض یاب
کیا کچھ پڑھا نہیں تھا کمانے کے باب میں ؟
میں نے کہا کہ علم بہت سے تھے پڑھ لیے
لیکن یہ ایک علم نہیں تھا نصاب میں

سچی جو ہم سے پوچھو تو کالج میں تھا ہی کیا
لے دے کے ایک عشق تھا وہ بھی کتاب میں
اس کی ہی مشق کے لیے فاقوں سے تنگ آ
حاضر ہؤا ہوں خدمتِ عزت مآب میں

مولانا بشیر احمد صمصام اورینٹل ٹیچر احمد یار ہائی سکول مستونگ (قلات ڈویژن) کا یہ ترانہ خاصا[1] مشہور تھا :

خدایا کون ہے ثانی ترا سارے زمانے میں
ترا ہی نور ہے دونوں جہاں کے کارخانے میں
تری حمد و ثنا کرتے ہیں تیرے گیت گاتے ہیں
گل اپنی کیاریوں میں ، بلبل اپنے آشیانے میں
جہاں بھر کی جہاں بانی کے لائق ذات ہے تیری
جسے قدرت ہے پوری مارنے میں اور جلانے میں
جہاں کے پتے پتے پر تری قدرت کا جلوہ ہے
اٹھانے میں بٹھانے میں ، گھٹانے میں بڑھانے میں
کریں کوشش ، بڑھیں آگے ، کریں علم و ہنر حاصل
کہ جس سے نام ہو جائے ہمارا اس زمانے میں
دعا صمصام کی ہے خان کا اقبال دائم ہو
رہے کوشاں رعایا کے لیے راحت بڑھانے میں

غزل از رفیق ضیا دالبندین[2] :

خواہش ہے کچھ حصول کی تو بے یقیں نہ ہو
ہوں لاکھ مشکلیں تو شکن پر جبیں نہ ہو
بحرِ توہمات کے سینے کو چیر دے
گوہر کی آرزو ہے تو ساحل نشیں نہ ہو

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء
۲- پاسبان ، کوئٹہ ، ۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء

دل کی لگی کو دل میں دبایا ہے اس لیے
دُودِ فغاں سے ظلم نمایاں کہیں نہ ہو
بجھ جائے لمحہ بھر میں یہ تیرا چراغ حسن
میری نگاہِ شوق اگر آتشیں نہ ہو
وحشت خدا کے واسطے لے چل مجھے ، جہاں
قرب و جوار میں کوئی اپنا مکیں نہ ہو

ملا ہے داغِ رسوائی مجھے جو تیری محفل سے[1]
یہی حاصل مسافر کو ہؤا کرتا ہے منزل سے
مرا مسکن ہے بحرِ یاس کی تاریک پستی میں
مجھے کیا واسطہ گرداب و طوفان موج و ساحل سے
ابھی تک وہ صنم نا آشنائے دردِ الفت ہے
سنا تھا بارہا دل کو ہؤا کرتی ہے رہ دل سے
طریقہ ہے عجب ہی کشتیٔ دل کا ، مسافر کو
سزا دیتی ہے جتنا دور ہوتی ہے یہ ساحل سے
رہیں گے حشر تک آباد میرے دل کے ویرانے
ہزاروں محفلیں لے کر اٹھا ہوں تیری محفل سے
مری بے چینیاں اکثر بدل جاتی ہیں راحت میں
تصادم جب کبھی مشکل کا ہو جاتا ہے مشکل سے
دبایا ہے ازل ہی سے فلک نے بے طرح ہم کو
وگرنہ ہم سخن ہوتے کبھی اُس ماہ کامل سے

۱۹۴۱ع میں ہی میر گل خاں نصیر ذکر مینگل (سابق کسٹم آفیسر پسنی بندر) نے استعفیٰ کے بعد اپنے جذبات سے متاثر ہو کر ایک نظم

۱- پاسبان ، کوئٹہ ، ۴ نومبر ۱۹۴۱ع -

لکھی تھی - عنوان تھا ''ندامت کے آنسو''۱ ملاحظہ فرمائیے :

کیوں بگڑتے ہو دلِ ناشاد ! تم ہر بات پر
ضرب یوں کاری لگی ہے کیا ترے جذبات پر ؟
اب ہؤا محسوس تم کو تیرِ غم کھانے کے بعد
نوجوانانِ وطن کے دیس سے جانے کے بعد
شرم اب آتی ہے تم کو ، روٹھ اب جاتے ہو تم
خشک اب ٹہنی ہوئی ہے ٹوٹ اب جاتے ہو تم
اب ندامت کا پسینہ پونچھتے ہو بدنصیب
آ گیا ، جب ہاتھ عزرائیل کا ، سر کے قریب
بے بہ بے غداریوں سے آج گھبرایا ہؤا
غیر کا روندا ہؤا ، دشمن کا ٹھکرایا ہؤا
دوستوں سے عہد و پیمانِ وفا کو توڑ کر
دشمنانِ قوم سے عہدِ وفا کو جوڑ کر
خون پی کر ان ضعیفوں ، بیکسوں کا بےحیا
لقمۂ تر کے لیے کی قوم سے تو نے دغا
وعدہ و اقرار سب بھولے قسم اللہ کا
خیال تک آیا نہیں تم کو کلام اللہ کا
ملک و ملت کے جو نغمے رات دن گاتے رہے
روح آزادی کو ان نغموں سے شرماتے رہے
روح کو تیری نہ ہوگا حشر تک حاصل قرار
ٹھوکریں کھاتا رہے گا تا ابد تیرا مزار
پیٹھ پھیری تم نے کیوں ان سرفروشوں سے بتا ؟
کیوں جدا تم ہو گئے ان گرم جوشوں سے بتا ؟
چند سکّوں کے لیے قومی حمیّت بیچ دی
شرم کیوں آئی نہیں تم کو جو عزت بیچ دی

۱- نجات ، کراچی ، ۱۸ مئی ۱۹۴۱ع -

نخل آزادی کی بنیادیں ہلانے کے لیے
قوم کا سرمایہ غیروں پر لٹانے کے لیے
مل گئے اغیار سے جاہ و حشم کے واسطے
اُس سراب آسا وزارت اور رقم کے واسطے
اے قتیلِ عشوۂ منصب، امارت کی غلام
ایسے غداروں سے میری لاکھ توبہ، صد سلام

بلوچ قوم سے خطاب

از بہرام مینگل، مستونگ[1]:

صبح و شامِ نو دکھا دے اے بلوچی نوجواں!
بن فدائی قوم کا، دنیا کو دے تو امتحاں
کر وہ قربانی کہ جس میں زندگی کا راز ہو
راہ آزادی کی جو مسدود ہے، وہ باز ہو
منتشر اجزا کو لا تو ایک پرچم کے تلے
بِک نہ تو ارزاں کہ ہے تو بے بہا، سبکی نہ لے
جرأتیں عشاق کی مت پوچھ ہر ناکام سے
دل جلوں کا حال پوچھو آ کے تم بہرام سے

ہماری آہیں

عبدالحق پاکستانی، صدر شعبۂ ادب بلوچستان، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کوئٹہ[2]:

ہر آہ بھی اب نعرۂ مستانہ بنے گی
اشکوں کا ہر اک قطرہ گہر ہو کے رہے گا
دہلیزِ فرنگی پہ یہ گو آج جھکا ہے
اک دن تو سرافراز یہ سر ہو کے رہے گا

۱- الحق، سبی، ۱۶ نومبر ۱۹۴۶ع -
۲- الحق، سبی، ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ع -

تاریک نظر آتا ہے جو گھر وہی اک دن
جولانگہِ خورشید و قمر ہو کے رہے گا

مزاحیہ غزل

از نذر کوئٹہ[1] :

ایک کافر پہ مر رہا ہوں میں
چار سو بیس کر رہا ہوں میں

کچھ دمے کا مرض نہیں مجھ کو
دم بدم آہ بھر رہا ہوں میں

سبزۂ خط کو میں سمجھتا ہوں
مدتوں باربر رہا ہوں میں

''ڈیم یو'' کی مجھے نہیں پروا
اُن کے ٹامی سے ڈر رہا ہوں میں

مگسی بلوچوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے[2] - اسی کے سردار قیصر خان کے تین بیٹے تھے - اُن میں سردار گل محمد خان زیب اور یوسف علی خان عزیز (اُن کا تفصیلی ذکر ''تحریکات آزادی'' میں ہو چکا ہے) زیادہ شہرت رکھتے ہیں - سردار گل محمد خان المتخلص بہ زیب ۱۸۸۳ع میں جھل مگسی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ع میں وفات پائی - خود کہتے ہیں :

زیب ! گردی نہاں بخاک آخر گر بزر ہمسرِ کیان باشی

یوں تو ذی ثروت سرداروں میں سے تھے لیکن عادات درویشانہ اور طبیعت قلندرانہ پائی تھی - دنیوی جاہ و جلال کی بجائے بےنیازی اور سادگی

۱- الحق ، سبی ، ۱٦ مارچ ۱۹۴۶ع -
۲- ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر ، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ -

کو اپنایا ۔ بقول خود :

مرادِ سلطنت را ترک کردم بہر درویشی
چو ابراہیم ادھم ملک و ساماں دادم و رفتم

زندگی کا بیشتر حصہ علم و دانش کے حصول اور علمی و ادبی سرمایے کے مطالعے میں صرف کیا اور علمی مراکز سے دور بیٹھ کر علم کی شمع کو اس طرح روشن کیے رکھا کہ آج اسی کے طفیل زیب کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا ۔ یہ وہ لگن ہے کہ جسے نصیب ہو گئی اسے پھر تاج و تخت کی ضرورت نہیں رہتی ۔ زیب کے فارسی کلام کے دو دیوان چھپ چکے ہیں ۔ تیسرا (ارمغان عاشقاں) ابھی طباعت کے زیور سے مزیّن نہیں ہؤا۔ اردو کا ایک دیوان بھی دستیاب ہؤا ہے جو خطی ہے ۔ کل اوراق ... ہیں ۔ اس میں مخمسات ہی مخمسات ہیں ۔ جن شعرا کے اشعار پر مخمسات لکھے ہیں ، اُن کے نام ہیں : سراج الدین بہادر شاہ ظفر ، مرزا رفیع سودا ، خواجہ میر درد ، مومن خاں مومن ، مولانا نیاز احمد بریلوی ، غالب ، ذوق ، تراب کاکوروی ، خواجہ حیدر علی آتش ، انشاءاللہ خاں انشا ، محمد اشرف خاں المتخلص بہ خاں شاگرد مصحفی لکھنوی ، نظیر اکبرآبادی ناسخ لکھنوی ، سعادت یار خاں رنگین ، نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی سراج اورنگ آبادی ، سوز ، امانت لکھنوی ، جرأت ، داغ ، حالی تاباں رضوی دہلوی وغیرہ ۔

زیب جس شاعر کی غزل پر مخمس کہتے ہیں ، عنوان میں اُس کا سنہ وفات بھی درج کر دیتے ہیں ۔ اس خطی نسخے میں مخمسات حروف تہجی کے اعتبار سے قلم بند کیے گئے ہیں ۔ کاتب کا نام اور سال درج نہیں ہے ۔ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ نسخہ پچیس تیس سال پہلے کا ہے ۔ ان مخمسات کے چند بند پیش خدمت ہیں ۔

بہادر شاہ ظفر

زیبا ! فنا پذیر ہے ہر چیز و ہر بشر [۱]
یکساں ہیں حادثات سے خورشید اور قمر

۱۔ مخمساتِ زیب (اُردو) خطی ، ورق ۱ ب ۔

وہی ایک ہے قدیم جسے کچھ نہیں خطر
کیا پائے کہنہ ذات کو اس کے کوئی ظفر
واں عقل کا نہ دخل ، نہ ہرگز دلیل کا

درد

مری آمد کو اے دلدار ! برا کیوں مانا[۱]
جب بنا زیب خریدار برا کیوں مانا
سن کے مشتاق کی گفتار ، برا کیوں مانا
درد کے ملنے سے اے یار ! برا کیوں مانا
اُس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

مومن

سیکھے نہ سخن سنجی کے فن اور ہنر ہم[۲]
منظوم سخن لکھ کے پروتے ہیں گہر ہم
کرتے ہیں سخنداں کے لیے زیب سفر ہم
انصاف کے خواہاں ہیں ، نہیں طالبِ زر ہم
تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

غالب

تھا طبیب گرچہ حاذق مگر اس جگہ خجل ہے[۳]
مجھے رنج ہجر کا ہے ، نہ یہ دق ہے ، نہ یہ سل ہے
جو ہے درد دل سے فارغ تو بشر بھی مشتِ گل ہے
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

---

۱ تا ۳ ۔ مخمسات زیب (اردو) خطی ، ورق ۳ ب ، ۴ الف ، ۶ الف ۔

بہادر شاہ ظفر

سکّہ جو کھوٹا ہو کب جلوہ گری سے ہو کھرا[۱]
کھوٹے سکّے سے نہیں ہوتی کبھی بیع و شرا
دل میں کینہ نہ رہے گا کبھی جب نفس مرا
دل کے آئینے کو تو صاف تو کر دیکھ ذرا
اُس کی صورت تجھے آئے گی نظر آپ سے آپ

خواجہ حیدر علی آتش

لباس جب کہ پہنتا ہے شاہ خوباں سرخ[۲]
میں دیکھ کرتا ہوں اشکوں سے اپنے داماں سرخ
چو شاخ مرجاں ہوتی ہے میری مژگاں سرخ
ہُوا نہ حسن سے خالِ سیاہِ جاناں سرخ
نہ کر سکا رخِ کافر کو نورِ ایماں سرخ

نظیر اکبر آبادی

دوست کو کرنا فرامُش شان مشتاق نہیں[۳]
مے میں بِن محبوب کے تاثیرِ تریاقی نہیں
دیکھ کر یہ حال اب کچھ دل میں حظ باقی نہیں
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے[۴] کو ہم

جرأت

شعر سے ہے تجھے اے زیب بغایت الفت[۴]
نظم تیری ہے عجب اثر بھی ہے پُر لذت

---

۱ تا ۴۔ مخمسات زیب (اُردو) خطی ۔ ورق نمبر ۱۱ ا، ۱۸ ا، ۴۰ ا، ۵۰ ا، ۵۵ ا۔

آفریں تم پہ جو کرتے ہو سخن میں محنت
غور کیجے تو یہ مشکل ہے زمیں اے جرأت
اس میں دیکھیں کہے کوئی اور بھی اشعار کہ تو

میرزا داغ

دل کو جو لے وہ سبز خراماں تمھیں تو ہو[1]
جس کا سخن ہو سحر وہ جاناں تمھیں تو ہو
جو نور جاں ہے وہ مہِ تاباں تمھیں تو ہو
کہتے ہیں جس کو حور وہ انساں تمھیں تو ہو
جاتی ہے جس پہ جان مری جاں تمھیں تو ہو

حالی

اگرچہ کہ رکھتے ہو طاقت زیادہ[2]
مگر مت کرو عیش و عشرت زیادہ
میانہ روش میں ہے راحت زیادہ
بڑھاؤ نہ آپس میں اُلفت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

جرأت

زہے شمس الضحٰی بدرالدجٰی فخر ہمہ اُست[3]
رحیمے رحمتؐ للعالمینے قلزمِ قدرت
چلی اُس کی نبوت سے ولایت ، نعمت اور برکت
سپہرِ معرفت حق کا ہے وہ مہرِ اُلوہیّت
کہ جس کا دین روشن آئنہ ہے حق نمائی کا

زیب مگسی کے مخمسات واضح کرتے ہیں کہ اُن کا مذاق کتنا ستھرا اور اُن کا مطالعہ کتنا وسیع و عمیق تھا کہ اُنھوں نے اُردو ادب کے

۱- مخمسات زیب (اُردو) خطی ، ورق ۵۶ ب ، ۵۹ ا ، ۶۸ ب -

گھرہائے گراں مایہ سے اچھے اشعار چنے ، پھر اُن پر اپنا محل تعمیر کیا ۔ ان مخمسات کے مطالعے کے بعد قاری یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ یہ سخن ور علمی مرکزوں سے دور افتادہ مقام کا رہنے والا ہے اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار بطریق احسن نہیں کر سکتا ۔

براہوئی ، بلوچی ، سندھی ، سرائیکی اور اُردو کا شاعر تاجل[1] ۱۹۴۴ء میں ایک سو تیرہ سال کی عمر میں فوت ہؤا ہے ۔ تاجل کے کلام کا زیادہ حصہ عوامی شاعری پر مشتمل ہے ۔ اس کا ابتدائی کلام طنز و تعریض سے بھرپور ہے لیکن بعد کے کلام میں حزن و ملال پایا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے آخری دور میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا اور یوں اس کے سوز و گداز نے شعوری جذبے کو اور زیادہ گرما دیا تھا ۔ تاجل کا اصل نام تاج محمد (قبیلہ بنگل زئی) تھا لیکن شاعری کی دنیا میں وہ تاجل ہی کے نام سے مشہور ہؤا ۔ اس کے والد درمیانے درجے کے زمیندار تھے ۔ اس لیے تاجل کا بچپن کھیتوں ہی میں گزرا ۔ جوان ہؤا تو کھیتوں سے متعلق تمام کام خود سنبھال لیے ۔ زمینداروں کا اپنے مزارعوں سے غیر انسانی سلوک دیکھ کر اُسے بہت ہی کوفت ہوتی تھی ۔ چناں چہ اس کے شعروں میں جا بجا اس قسم کے اشعار ملتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ ایک رات تاجل بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلا اور اپنے کھیتوں کا رخ کیا لیکن راستہ بھٹک کر ایک کھلے میدان میں جا پہنچا جہاں اسے چار سفید ریش بزرگ بیٹھے ہوئے نظر آئے ۔ تاجل ان کے قریب گیا تو انھوں نے بیٹھنے کے لیے کہا ۔ احوال پرسی کے بعد قرآن شریف سے کچھ آیتیں سنانے کی فرمائش کی ۔ تاجل نے بچپن میں کچھ آیتیں حفظ کر لی تھیں ، وہی خوش الحانی سے سنائیں ۔ بزرگوں نے خوش ہو کر اس کے

۱۔ ڈاکٹر این اے بلوچ آف سندھ یونیورسٹی حیدر آباد کا تاجل سے متعلقہ فرستادہ مواد ، مؤرخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۶ء ۔

''تاج محمد تاجل'' از عبدالرحمٰن براہوئی ''بلوچی دنیا'' ملتان ، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء ۔

حق میں شاعر ہونے کی دعا کی ۔ وہ اس واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے :

پاک مرسل کے سچے چار یاروں کے طفیل
شاعری مجھ کو ملی میل بھی دل سے دھلی
شکر کرتا ہوں سدا دل کا ملا ہے مدعا

سرائکی زبان میں بھی اس عطیے کے متعلق ایک قطعہ کہا ہے :

لالہ دا سر لال ہویا خود مالک دا اقبال ہویا
گل وچ ہسی کن وچ کنڈل تاج کلنگی نال ہویا

تاجل نے اپنی شاعری میں جہاں اپنے ملک کے غریب لوگوں کی ترجمانی کی ہے ، وہاں معرفت کی بھی باتیں کہی ہیں ۔ والد کی وفات کے بعد وہ زیادہ دنوں تک اپنے گاؤں ''گلن'' (تحصیل بالا ناڑی ، ضلع کچھی ، قلات ڈویژن) میں نہ ٹھہر سکا ۔ اُس پر اکثر مستی کا عالم طاری رہتا تھا ، اس لیے جلد ہی اپنے کھیتوں کو کاشتکاروں کے حوالے کر کے آزاد ہو گیا ۔ اس کے بعد دشت پیمائی اس کا مشغلہ بن گیا ۔ عموماً فقیروں کی صحبت میں رہتا ۔ جب اُن سے فرصت ملتی ، جنگل کی طرف نکل جاتا ۔ اس طرح دس سال بیت گئے ۔ اس دوران میں اس کے اشعار عوام تک پہنچ کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے ۔ وہ جہاں جاتا تھا ، لوگ قدردانی کرتے اور شوق سے کلام سنتے تھے ۔ ایک دن وہ قصبہ ''تیری'' میں اپنے ایک درویش دوست سے ملنے گیا ۔ وہاں کے لوگوں کے اصرار پر اپنا کلام ''یک تارے'' پر سنانے لگا ۔ آواز بہت سریلی اور پرسوز تھی ۔ نزدیک ہی گاؤں کے ایک زمیندار کا مکان تھا ۔ گانے کی آواز پر ایک حسین و جمیل عورت نے مکان سے جھانک کر تاجل کو دیکھا اور کچھ دیر محویت کے عالم میں رہی ۔ تاجل کی بھی نگاہ اس پر پڑ گئی ۔ محبت کا جادو چل گیا اور دونوں ایک دوسرے کے لیے تڑپنے لگے ۔ تاجل نے اپنے درویش دوست کی معرفت اس عورت سے شادی کا پیغام زمیندار کو بھیجا اور چند روز بعد تاجل کی ''لعلین'' کے ساتھ شادی ہو گئی ۔ وہ لعلین کو اپنے گھر لایا اور دونوں خوشیوں کی دنیا میں رہنے لگے ۔

تاجل کا گانا سننے کے لیے لوگ اُس کو دور دور تک بلاتے تھے ۔

جب بڑھاپا آ گیا تو لعلین نے بھی ساتھ دیا اور تاجل کے ساتھ مل کر گانے لگی اور اس طرح تاجل اور لعلین نے براہوئی ادب کو گیتوں سے مالا مال کر دیا ۔ لعلین نے تاجل کی وفات سے چار سال بعد وفات پائی ۔

انگریز آئے تو تاجل کو بھی انگریزی زبان کا ایک لفظ پسند آیا ۔ وہ تھا میڈم (Madam) ۔ اس کا براہوئی میں تلفظ ''مڈم'' ہے ۔ شاعر نے اپنی بیوی کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ تاجل کا یہ شعر براہوئی زبان کا سب سے پہلا اور واحد شعر ہے جس میں انگریزی لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

تاجل کہ فقیرے تپنا مڈم کہ زہیرے

ترجمہ : تاجل تو ایک فقیر ہے لیکن اپنی مڈم (میڈم) کو دیکھنے کا مشتاق ہے ۔

محمد صادق خاں شاذ کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔ وہ غزل ، نظم اور رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن میں شعر کہتے ہیں ۔ فن تاریخ گوئی کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں اور ارتجالاً مادہ نکالنے کا ملکہ بھی ہے ۔ ان دنوں راج گڑھ لاہور میں قیام پذیر ہیں ۔

چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔[1] مضمون کی بے ساختگی دیکھیے :

یوں بزم میں کہتے ہیں وہ افسانہ ہمارا
اک شاذ بھی مشہور ہے دیوانہ ہمارا
کیوں حضرت دل! دیکھ لیا عشق کا انجام ؟
آخر کو جنازہ ہی نکالا نہ ہمارا ؟

ندرتِ خیال کی مثالیں :

گردن پہ تیغِ یار کا احسان رہ گیا
ہم سر کٹا کے اور گراں بار ہو گئے

۱۔ پاسبان ، کوئٹہ ، ''شاذ کی شاعری پر طائرانہ نظر'' از محشر رسول نگری ، ۴ نومبر ۱۹۴۴ع ۔

کچھ ایسا تیرے تصور میں کھو گیا ہوں میں
کہ سر بہ سر تری تصویر ہو گیا ہوں میں

نہ نکلی پر نہ نکلی حسرت پرواز سینے سے
قفس کی تیلیاں اُلجھیں جو کھولے بال و پر میں نے

شیخ کو کس انداز میں پیش کرتے ہیں :

فرشتہ سمجھتے تھے ہم شیخ جی کو
مگر حشر میں وہ بھی انسان نکلا

صنعتِ مراعات النظیر کی مثال :

جذب صادق ہو تو پھر شاذ صنم چیز ہے کیا
اپنے نزدیک تو اللہ بھی کچھ دور نہیں

فلسفۂ الٰہیات کا اہم نکتہ سنیے :

سمٹ گیا تو بسا آ کے قلبِ مومن میں
کھلا تو وسعتِ عالم میں بھی سما نہ سکا

نثار احمد نام ، محشر تخلص (رسول نگر کی مناسبت سے رسول نگری کہلائے) - ۲۹ مارچ ۱۹۱۶ع کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد بزرگوار میاں الٰہی بخش ۱۸۹۰ع میں بلوچستان آئے تھے - پہلے محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے ، پھر محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی اور یہیں وفات پائی - محشر صاحب نے میٹرک ہی سے شعر کہنا شروع کیا - اُن دنوں یہاں ایک صاحب مدحت زبیری بی اے ملٹری آڈٹ میں ملازم تھے ، جو میرٹھ کے رہنے والے تھے اور شاذ و نادر ہی شعر کہتے تھے ، لیکن علم عروض میں ماہر تھے - محشر نے ان سے سبقاً سبقاً عروض سیکھا اور اصلاح کے معاملے میں اپنی طبع خدا داد ہی کو اُستاد بنایا - کسی اُستاد کی شاگردی اختیار نہیں کی -

۱۹۳۱ع میں میٹرک پاس کیا - بعد میں بلوچستان کی مشہور ادبی انجمن ''بزم ادب'' میں شامل ہو کر اُردو زبان و ادب کی خدمت کا آغاز کیا - آپ نے بزم ادب کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ''سب

سے پُر لطف بات یہ ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے بلوچستان میں اُردو کی ترویج و ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ، بلکہ بعض ہندوؤں کی طرف سے جب یہاں ہندی سبھا بنانے کی کوششیں ہوئیں تو ناکام ہو کر رہ گئیں ۔،،

آپ ،،بزم ادب،، کے جنرل سیکرٹری بھی رہے ۔ آپ کا ذکر ،،ادبی انجمنیں اور مشاعرے،، میں آ چکا ہے ۔ آپ تقسیم ملک تک باقاعدہ مشاعروں میں شامل ہوتے رہے مگر تقسیم ملک کے بعد شاذ ہی کسی مشاعرے میں حصہ لیا بلکہ کچھ عرصے کے بعد مشاعروں میں جانا قطعاً ترک کر دیا ۔

آپ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں جن کی کیفیت ذیل میں درج ہے :
آپ نے غزلوں کا کوئی مجموعہ جان بوجھ کر نہیں چھپوایا ، البتہ پاک و ہند کے رسائل میں منظومات و غزلیات جستہ جستہ چھپ چکی ہیں اور ریڈیو پاکستان کے تمام سٹیشنوں سے نشر ہوتی رہتی ہیں :

۱- تیغ و قرآن : سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ ، لکھائی چھپائی ، کاغذ اعلیٰ ۔ ضخامت ۹۸ صفحات ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ اسلامیہ سٹیشنری مارٹ ، قندھاری ، بازار کوئٹہ ۔

اس کے سرورق پر یہ شعر درج ہے :

اک ہاتھ میں شمشیر ہو اک ہاتھ میں قرآن
اے مومنِ جانباز تری شان یہی ہے

اس میں ،،تیغ و قرآن،، کے جلیل القدر موضوع پر نہایت قیمتی نظمیں جمع کر دی ہیں ۔ اُن میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں : فقر و جہاد ، حسینؓ اور اسلام ، آزادی ، اسلامی حکومت ، مرد مجاہد ، جوہر اسلام ، اسلامی نظریۂ جنگ ، عید قرباں کا پیغام ، محمدؐ ۔

چند اشعار یہ ہیں :

قرآن سے لرز اُٹھے ارض و سما تو کیا
نادان ! یہ کتاب امانت خدا کی ہے
دینی ہے تجھ کو حق کی گواہی بہ ہر قدم
دنیا میں تیرا کام شہادت خدا کی ہے

کرنی پڑے گی عدل پہ قربان قومیت
مکر و دغا نہیں ، یہ سیاست خدا کی ہے

سونپ کر سب کچھ اُسے ہو جا اُسی کا اے ندیم
عقل کو آزاد کر لے کاوشِ انجام سے

اے شیخ ! ترے فقر کا منکر ہے زمانہ
دنیا کو دکھا معجزۂ گرم نگاہی

دو لفظوں میں پنہاں ہے مقصد تری ہستی کا
یا دل کی نگہبانی ، یا حق کی نگہبانی

دامنِ تاریخِ ملت میں کمی کس شے کی ہے
اُسوۂ فاروق رض بھی ہے ، مسلکِ شبیر رض بھی

فنا کی آندھیوں میں بھی چراغ حق جلائے جا
فرشتۂ اجل کو دیکھ کر بھی مسکرائے جا

تیغ زن ہوتے نہیں ذاتی خصومت کے لیے
ہم تو لڑتے ہیں فقط حق کی حفاظت کے لیے

نفس انساں بھیڑیا ہے خوف عقبیٰ کے بغیر
ہے تنِ بے روح ہر قانون تقویٰ کے بغیر

۲- نظام نو: ضخامت ۴۸ صفحات ، قیمت آٹھ آنے ، کوئٹہ میں طبع ہوئی -

سرورق پر یہ شعر درج ہے :

اُٹھ کہ ضربِ پے بہ پے سے یہ جہاں برہم کریں
اپنی خاکستر سے پیدا اک نیا عالم کریں

اس کے پس منظر میں دوسری عالمگیر جنگ، یورپ کا زمانہ ہے۔ 'ابلیس' اُفقِ مغرب سے عالمِ انسانی کو حقارت آمیز لہجے میں مخاطب کرتا ہے:

خواب سے میں نے جگایا روحِ چنگیزی کو پھر
کر دیا میں نے شعارِ عام، خوں ریزی کو پھر

روحِ مغرب جواب دیتی ہے:

میری ہر تعلیم کا تخمین و ظن انجام ہے
میرے دم سے ساری دنیا کشتۂ اوہام ہے

روحِ مشرق کروٹ لیتے ہوئے کہتی ہے:

آج باطل کے مقابل میں ٹھہر سکتا ہے کون
سامنا طاغوت کی فوجوں کا کر سکتا ہے کون

اس کے بعد شاعر نے عالم بالا پر اہم ترین فرشتوں کو آپس میں انھی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ پھر ''آوازِ حق'' کے تحت آتا ہے:

مشرق و مغرب کو پھر آئینِ نو کی ہے تلاش
روحِ انسانی پہ کر دے زندگی کا راز فاش
عقلِ آوارہ عناں کو دعوتِ اسلام دے
پھر جہاں والوں کو میرا آخری پیغام دے

اسی آخری پیغام کی وضاحت کرتے ہوئے شاعر نے مغربی تہذیب کی حقیقت بتائی ہے اور اسلام سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ مثلاً:

مغربی تہذیب کی بنیاد نفیِ ذاتِ حق
دینِ حق کی ابتدا و انتہا اثباتِ حق
اُس کا بنیادی تصور خلق بے خلاق ہے
اور یہاں نام خدا ہر زہر کا تریاق ہے
غرب میں وحی و رسالت اک خیال خام ہے
اور محشر کا عقیدہ حاصلِ اوہام ہے
دین حق کی یہ اقالیمِ ثلاثہ ہیں اساس
ہو نہیں سکتا بغیر ان کے کوئی وحدت شناس

دین حق یا دین فطرت کے تقاضوں کو ظاہر کرنے کے بعد کہتے ہیں :

ہو خلافِ دینِ فطرت جو نظامِ زندگی
اس کے ہاتھوں میں نہیں رہتی زمامِ زندگی
اہل حق کی آہ و زاری کا جواب آنے کو ہے
اس جہاں میں اور بھی اک انقلاب آنے کو ہے
ہو رہے ہیں عالم افلاک میں کچھ مشورے
اس نظامِ زندگانی کو بدلنے کے لیے

بعد ازاں یہ مشورہ دیتے ہیں :

امتِ وسطیٰ بناؤ ملّتوں کو توڑ دو
بندۂ حق بن کے ساری نسبتوں کو توڑ دو
دو خدایانِ جہاں کو دعوت آئینِ حق
اہل دنیا کو بلاتے جاؤ سوئے دینِ حق
جتنے بڑھتے جائیں گے روئے زمیں پر حق پرست
سہل ہوتی جائے گی ہر لحظہ باطل کی شکست
شرعِ قرآں کا تقاضا عام ہوتا جائے گا
ہر نظامِ ماسویٰ ناکام ہوتا جائے گا
رفتہ رفتہ اک مکمل انقلاب آ جائے گا
پھر جہاں میں حق کا دور کامیاب آ جائے گا

۳- **مثنوی صحیفۂ فطرت** (حصہ اول) - سنہ طباعت ۱۹۵۷ء ، طابع و ناشر میاں افتخار یوسف ، پاکستان پریس کوئٹہ ، ضخامت ۹۵ صفحات ، قیمت ڈیڑھ روپیہ -

یہ مثنوی اُس دور میں لکھی گئی جب محشر صاحب کی زندگی ''قال'' سے ''حال'' کی منزل میں داخل ہو چکی تھی - بقول اُن کے :

جنونِ عشق نے کھولے ہیں جو رموزِ حیات
ضمیرِ شعر میں ان کو سمو کے لایا ہوں

حقیقتوں کے گہرہائے تاب دار ہیں یہ
کہ جن کو تارِ نظر میں پرو کے لایا ہوں

''صبح نو'' میں حق کے ایسے کامرانی کے دور کی بشارت دی گئی ہے جس کی خاطر آسمان سے امر حق نازل ہو چکا ہے۔ اس انقلاب نو کے لیے قدرت کے نہاں خانے میں ایک نیا انسان بنایا جا رہا ہے جو زمین پر حقیقی معنوں میں نیابتِ الٰہی کا فرض ادا کرے گا:

معنیِ توحید کا آئینہ دار   اک نیا نقش، اک نرالا شاہکار
شاہدِ حق، نائبِ پروردگار   اعتبار عالم نااعتبار
طالبِ حق کے لیے تفسیرِ حق   دشمنِ حق کے لیے شمشیرِ حق

اس کی پہچان یہ بتائی ہے:

اس کا ظاہر پیکر مولا صفات   اس کا باطن مظہرِ عرفانِ ذات

یہ حق کا شاہکار ایمان و عشق کی غیر فانی قوتوں سے انقلاب برپا کرے گا، اسی لیے آپ مدعیانِ اسلام کو مشورہ دیتے ہیں:

عشق و ایماں کی صفت پیدا کرو   اور پھر اسلام کا دعویٰ کرو

زندگی میں مقصد کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ محشر رسول نگری کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کے لیے عظیم ترین مقصد رضائے الٰہی ہے:

مقصدِ ہستی رضائے دوست ہے   مغزِ ایماں ہے یہ، باقی پوست ہے

اس مقصد کے حصول کے لیے حق سے غیر معمولی عشق بھی ضروری ہے جس کی بہترین اور مکمل مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے مل سکتی ہے۔ بقول محشر:

عشق کیا ہے؟ اتباع مصطفیٰؐ   عشق کیا ہے؟ صبر و تسلیم و رضا

جس کو اللہ تعالیٰ کے قرب کی خواہش ہو، اس کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا ہے:

پہلے وہ انساں کی دلداری کرے   درد کے ماروں کی غمخواری کرے

کیونکہ رازدارانِ حقیقت کا یہی شیوہ رہا ہے:

برگِ گل پر گوہر شبنم بنے   زخم دل دیکھا جہاں مرہم بنے

اسی سلسلے میں حضرت علیؓ کا ایک واقعہ دلچسپ انداز میں

صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے جس سے مضمون کی اثر انگیزی میں اضافہ ہوا ہے۔ مثنوی میں زندگی کے مسائل کو حکایات کے ذریعے پیش کرنے کا انداز پرانا ہے۔ مولانا رومی کے ہاں اس کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ محشر رسول نگری نے مسائل کی توضیح کے لیے طبع زاد حکایات کے بجائے تاریخ اسلام کے مستند واقعات قلم بند کر دیے ہیں۔ مثلاً قلب و نظر کی عفت کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:

نفس کو قابو میں رکھ اور تن کے رہ
ان زلیخاؤں میں یوسف بن کے رہ

حضرت خنساءؓ جب راہ حق میں اپنے چاروں بیٹوں کو قربان کر چکیں تو فرط شوق میں جھوم کر کہنے لگیں:

گیت گاؤں کیوں نہ اُس کی حمد کے
جس نے بیٹوں کی شہادت سے مجھے
خدمتِ دیں میں مکرّم کر دیا
دامنِ مقصود میرا بھر دیا

محشر نے فقط نظریات ہی پیش نہیں کیے بلکہ عمل پر بھی ابھارا ہے اور آخری مشورہ یوں دیتے ہیں:

اب نہ آہِ صبح گاہی چاہیے — خون سے حق کی گواہی چاہیے

محشر صاحب نے اس مثنوی میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرنے کے لیے اُردو زبان کو منتخب کیا ہے۔ اس سے جہاں اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس زبان میں حقائقِ زندگی ادا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، وہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حقائق و معارف کے بیان کے لیے اُردو زبان کے دامن کو وسعت دینے میں بلوچستان کے شاعر نے کیا قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ توقع ہے کہ اس مثنوی کے مزید حصے جلد طباعت کے مراحل طے کر لیں گے۔

۴۔ **فخر کونینؐ**: (حصہ اول) سر ورق چہار رنگا، جاذب نگاہ، ضخامت $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ سائز کے ۱۹۲ صفحات۔ پہلی بار جنوری ۱۹۶۱ء میں کوئٹہ میں

چھپی تھی - دوسری دفعہ اکتوبر ۱۹۶۲ع میں پنجاب بک ڈپو سرکلر روڈ لاہور سے شائع ہوئی - قیمت پانچ روپے، اشعار کی تعداد ایک ہزار چار سو ستر -

اس حصے میں آنحضرتؐ کی ولادت سے ہجرت تک کے واقعات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے - مختار صدیقی نے ایک پُر مغز تنقیدی دیباچہ لکھا ہے جو قاری کے ذوق کی تسکین کے علاوہ آفاقی اور مقصدی ادب کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے - کتاب مسدس میں ہے جس کا ہر بند ایک خاص ربط و تسلسل کا حامل ہے - مختار صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ ''نظم کا تخلیقی محرک جو جذبہ ہے، اس میں آرزو مندی کا گداز ہے - جوش اور جذبے کی یہ شیفتگی اس نظم کو ایسے خلوص سے مالا مال کرتی ہے جو بلاغت کی جان ہے'' - محمد طاہر فاروقی کے الفاظ میں اتنا اضافہ اور کیجیے کہ ''یہ گداز، جوش اور جذبہ غمازی کرتا ہے مصنف کے دل کی گہرائیوں کی اور اسی لیے اس میں بلا کا اثر اور تاثیر نظر آتی ہے'' -

سید اقبال عظیم کے الفاظ میں: ''سیرتِ رسولؐ کے جس پہلو کو مصنف نے نمایاں طور پر ابھارا ہے، وہ حضورؐ کا رحمتِ عالم ہونا ہے اور ابتدا سے انتہا تک مصنف نے اپنے اس مقصد کو فراموش نہیں کیا - واقعات کی تاریخی ترتیب اور سوانح کی مربوط تدوین سے اس نظم کو ایک فائدہ یہ بھی پہنچا ہے کہ نظم میں تسلسل بیان کے لطف کے ساتھ ساتھ وہ تاثر بھی پیدا ہو گیا ہے جس کے بغیر کوئی شعری تخلیق قابل توجہ نہیں ٹھہر سکتی - اس کے علاوہ شاعر کو فن اور اظہار خیال پر بھی پوری قدرت حاصل ہے اور کہیں کہیں بند کے بند استادانہ ہیں جن سے شاعر کی مہارت اور پختہ کاری کا ثبوت ملتا ہے'' -

فخر کونین مختلف عنوانات اور منظومات پر مشتمل ہے - اسے منظوم کتابِ سیرت سمجھنا بے جا نہ ہوگا - اس کی عظیم خوبی اس کا جوہر صداقت اور خلوص بیان ہے - علاوہ ازیں روایت و درایت کی موضوعی صحت پر اس کی بنا رکھی گئی ہے -

۵- **فخر کونینؐ** کا دوسرا حصہ جولائی ۱۹۶۴ع میں منظرِ عام پر آیا - اس کی ضخامت دو سو پچپن صفحے ہے - طابع و ناشر میسرز پاکستان پریس

جناح روڈ کوئٹہ ہیں - گردپوش دیدہ زیب اور قیمت پانچ روپے ہے - کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ ہے -

اس میں ہجرت سے فتح مکہ تک کے واقعات خاصی تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں - اس حصے میں اشعار کی تعداد ایک ہزار سات سو پچیس ہے - یوں دونوں حصوں میں مجموعی طور پر اشعار کی تعداد تین ہزار ایک سو پچانوے ہو جاتی ہے اور اس لحاظ سے فخر کونینؐ اُردو ادب کا سب سے طویل مسدس ہے - دوسرے حصے کا دیباچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تحریر کیا ہے - انھوں نے موضوعاتی اور غیر موضوعاتی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے - اُن کا ارشاد کتنا درست ہے کہ ''کتاب میں شاعر نے قرآن و حدیث اور سیر و تواریخ کے مستند مآخذات سے استفادہ کیا ہے - شاعرانہ قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ آیات قرآنی ، احادیث نبوی اور اقوال صحابہؓ کرام کے بعض عربی فقرے تلمیحاً اس خوبصورتی سے نظم میں داخل ہو گئے ہیں ، گویا ان کا تعلق عربی سے نہیں ، اُردو کے روزمرہ سے ہے - اسی کے ساتھ نظم کو سجانے اور موثر بنانے کے لیے الفاظ کی سحرکاریوں اور تخیل کی گل ریزیوں سے بھی کام لیا گیا ہے ؛ اس طرح کہ نفس مضمون کی صحت و نزاکت کہیں مجروح نہیں ہونے پاتی -'' مولانا ماہر القادری کے الفاظ میں[1] : ''عقیدت و محبت کا دریا ہے جو اس مسدس میں ہلکورے لے رہا ہے - انداز بیان شگفتہ ، فکر سلجھی ہوئی اور تخیل پاکیزہ - بعض مقامات پر تو شاعری اپنے عروج کمال پر پہنچ گئی ہے -'' مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی تھی کہ کسی جگہ بھی شاعرانہ مبالغے اور غلو سے کام نہیں لیا گیا - اس انداز کی نظموں کی ابتدا شبلی نعمانی نے کی تھی مگر اُن کے بعد کیفی چڑیا کوٹی اور محمود اسرائیل وغیرہ نے بھی اس روایت کو قائم رکھا - حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام اس سلسلے کی ایک بڑی مربوط اور کامیاب کوشش ہے - محشر رسول نگری نے اس انداز میں تازگی کو قائم رکھتے ہوئے بڑی کامیاب کوشش کی ہے - ہر واقعے کا مستند

۱- روزنامہ انجام ، کراچی ، ٦ ستمبر ۱۹٦۵ع ٦

حوالہ کتاب کے آخر میں درج ہے ۔ وہ خود لکھتے ہیں :

دشوار ہے یہ مرحلۂ نعت کس قدر
میں چل رہا ہوں تیغ برہنہ کی دھار پر
سر مست ہوں اگرچہ فروغِ نشاط سے
رکھتا ہوں ایک ایک قدم احتیاط سے

حوالے کے لیے صرف کتابوں کے نام دیے گئے ہیں ، اگر صفحات کے نمبر بھی ہوتے تو افادیت بڑھ جاتی ۔

دونوں حصوں میں تار و پود اور نظم کا ربط و تسلسل ، تناسب اور حسن تعمیر اس طرح ہے کہ دو چار ٹکڑے متن سے علیٰحدہ کرکے بطور مثال پیش کرنا نامناسب ہوگا لہٰذا دونوں حصوں سے جستہ جستہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

روزِ ازل سے پہلے بھی مولائے کُل تھے آپؐ
آدم تھا ما و طیں میں کہ ختم الرسل تھے آپؐ
وہ رحمتِ تمام ہے آفاق کے لیے
آیا ہے وہ مکارمِ اخلاق کے لیے

اسمائے رسول پاکؐ کی شرح کے تحت محمدؐ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مشتق ہے حق کے نام سے یہ نامِ حق نما
محمود ہے خدا تو محمدؐ ہے مصطفیٰ
یہ نام سرِّ خاص ہے معراج حمد کا
احمدؐ ہے ابتدا تو محمدؐ ہے انتہا
یہ نام وہ ہے جس پہ مشیّت کو ناز ہے
تکمیلِ بندگی میں خدائی کا راز ہے

پیغمبر اسلام کے دورِ شباب سے متعلق فرماتے ہیں :

مشتاق تھے جو خالقِ ارض و سما کے آپؐ
رہتے تھے ہر گناہ سے دامن بچا کے آپؐ

اک پیکرِ جمیل تھے شرم و حیا کے آپؐ
فرطِ ادب سے چلتے تھے نظریں جھکا کے آپؐ
اُلجھا کسی حسین سے نہ دامن نگاہ کا
بے داغ تھا شباب رسالتؐ پناہ کا

آپؐ کی عبادت کے متعلق کہتے ہیں :

یکتا تھے کیفیاتِ مقامِ فنا میں آپؐ
رہتے تھے محو لذتِ ذکرِ خدا میں آپؐ
ہوتے تھے غوطہ زن کبھی بحر رضا میں آپؐ
رہتے تھے معتکف کبھی غارِ حرا میں آپؐ
تھی روز و شب جبیں درِ حق پر جھکی ہوئی
اُس حسنِ لایزال سے تھی لو لگی ہوئی

بعثتِ محمدیؐ کا مقصد بیان فرماتے ہیں :

باطل کی طاقتوں سے وہ ٹکرائے بے خطر
دنیائے آب و گل سے مٹائے فساد و شر
تا آستانِ حق پہ جھکے آدمی کا سر
تابع ہوں امرِ حق کے خدایانِ بحر و بر
انسانیت کی نشو و نما ہو جہان میں
پیہم فروغِ صدق و صفا ہو جہان میں

معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

سب کو دکھا دیا بشریّت کا ارتقا
مردانِ حق کی ہوتی ہے پرواز تا کجا
حجت تھی کفر کے لیے معراجِ مصطفیٰؐ
مانے مگر نہ پھر بھی حریفانِ ناسزا
اہلِ رضا کو سرمۂ "ما زاغ" مل گیا
تارِ نظر سے عشق کا ہر چاک سل گیا

عصمتِ انبیاء کا ذکر کس حسین پیرایے میں کیا ہے ، دیکھیے :

بے داغ ہر رسول کا ہے دامنِ حیا
نبیوں کی عصمتوں کا محافظ ہے خود خدا
پیغمبری ہوئی ہے ازل میں جنھیں عطا
اُن پر نگاہ رکھتی ہے خود ذاتِ کبریا
ایک ایک لمحہ اُن کا خدا کی نظر میں ہے
گوہر کی آبرو بھی تو آبِ گہر میں ہے

دوسرے حصے کے پہلے عنوان ''آفتاب رسالت'' میں دکھایا گیا ہے کہ جب دنیا کفر و جہالت کی تاریکیوں میں گم تھی ؛ اُس وقت مکہ سے ایک آفتاب اُبھرا جس نے سراج منیر بن کر ان تاریکیوں کو دور کر دیا ۔ محشر گویا ہوتے ہیں :

ہنگامۂ جہاں ہے رسالت مآب سے　　قائم یہ سلسلہ ہے اسی آفتاب سے
پایا اسی نے نام ''سراجِ منیر'' کا　　یہ آئینہ ہے حسنِ ازل کے ضمیر کا

رسول کریمؐ کی سادگی اور محنت کی قدر کا ذکر ''خدا کا مزدور'' میں کیا گیا ہے ۔ اذان کی تاثیر کو سرودِ حلال کہتے ہیں ۔ ''تحویل کعبہ'' میں نماز کے لیے کعبہ کے تعین کا ذکر ہے ۔ آنحضرت صلعم کی شخصیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :

ہیبت سے کانپتا تھا جو ملتا تھا پہلی بار
ہوتا تھا جب قریب تو بنتا تھا جاں نثار
وہ سادگی کہ صبح نخستیں بھی شرمسار
وہ دلبری کہ روز ازل سے جہاں شکار
خُلقِ محمدی میں کچھ ایسا کمال تھا
اس تیر سے قلوب کا بچنا محال تھا

''حدیث دلبری'' ، ''کشف محبت'' ، ''رسول کی محبوبیت'' اور ''حلقہ بگوشانِ رسولؐ'' بھی آنحضرتؐ کی شان میں نذرانۂ عقیدت ہیں جو آپ

کی بے مثال جاذبیت اور کشش کی آئینہ دار ہیں۔ ایک شعر دیکھیے :

مقصودِ کبریا ہے کمالِ محمدیؐ !
کامل بہ شانِ خود ہے جمالِ محمدیؐ !

صحابۂ کرامؓ کے بارے میں یہ دو شعر حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہیں :

یہ جھلکیاں ہیں احمدؐ مرسل کے نور کی
معجز نمائیاں ہیں نبیؐ کے ظہور کی
پرتو ہے سب میں آپؐ کے خلقِ عظیم کا
کیا زندہ معجزہ ہے رسول کریمؐ کا

''سترِ جہاد'' کے تحت، کہتے ہیں :

دولت کے واسطے نہ حکومت کے واسطے
اُٹھتی ہے تیغ ، حق کی حفاظت کے واسطے

''کفر و دین کی جنگ'' میں حضور پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز حربی مہارت پیش کی گئی ہے :

تنہا ہی ایک فوج تھے نبیوں کے بادشاہؐ
حضرتؐ کی زد پہ آ کے نہ ٹھہری کوئی سپاہ
جوشِ وغا سے ہوتی تھی جب گرم رزم گاہ
لیتے تھے آ کے اوٹ میں حضرتؐ کی سب پناہ
ہر مرحلے پہ آپؐ ہی سینہ سپر ہوئے
سب معرکے نبیؐ کی شجاعت سے سر ہوئے

اس پہلو کے ساتھ ہی رسول کریمؐ کا ''الطاف عام'' دکھایا گیا ہے۔ جس شخص میں یہ حربی طاقت تھی وہی رحمت کا مظہر بھی تھا جس نے انسانیت کی راہیں اپنے عفو و کرم سے دنیا کو دکھا دیں :

پیغام زندگی تھا نبیؐ کی نمود میں
انسانیت پھر آئی عدم سے وجود میں

اسی طرح مختلف موضوعات کے تحت آنحضرت صلعم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں جس قسم کا واقعہ بیان کیا

گیا ہے ، اس کی مناسبت سے اظہار میں شکوہ ، دبدبہ ، لچک ، حلاوت اور شیرینی پائی جاتی ہے - میدانِ کارزار کا ذکر کرتے ہیں تو رزمیہ انداز ہے - جناب سیدہ رضؓ کے مثالی عقد کا تذکرہ آتا ہے تو لہجہ اور ہے - سردار کونینؐ بیٹی کو جہیز میں کیا دیتے ہیں ؟ محشر کے الفاظ میں سنیے :

میکے سے لے چلی ہے مشقت جہیز میں
دی ہے نبیؐ نے فقر کی دولت جہیز میں
پائی ہے اُس نے چادرِ عفت جہیز میں
حضرتؐ سے لے گئی ہے وہ جنت جہیز میں
بیٹی کوئی نہ باپ سے دولت یہ پا سکی
اخلاقِ حق سے یوں نہ گھر اپنا سجا سکی

آنحضرت صلعم کی عالمگیر نبوت کا ذکر کتنا پیارا ہے - ملاحظہ ہو :

ہر ملک اور قوم کے رہبر ہیں مصطفیٰؐ
شیرازہ بندِ اسود و احمر ہیں مصطفیٰؐ
ہر دورِ زندگی کے پیمبر ہیں مصطفیٰؐ
آئینۂ صفات کا جوہر ہیں مصطفیٰؐ
رحمت بھی ان کی عام ہے بعثت بھی عام ہے
خیر الوریٰؐ کا فیضِ ہدایت بھی عام ہے

حضرت بلال رضؓ کی طرح مسجد نبوی بھی تو "نقیبِ حشمِ پیغمبرؐ" ہے جہاں زمانۂ رسولؐ میں روز و شب حضرت بلال رضؓ کی بانگِ اذان بلند ہوتی تھی - محشر رسول نگری کی نظم "نقیبِ حشمِ پیغمبرؐ" (مسجد نبویؐ) کے بارے میں 'ماہ نو'[1] میں مندرج ہے :

"اس شہ پارے کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ بہ قول مصنف گزشتہ برس کوئٹہ کے ایک تعلیمی ادارے کے پرنسپل اسے نقل کر کے حج کے موقع پر مدینۂ منورہ لے گئے تھے اور وہاں بارگاہ نبویؐ

۱- ماہ نو ، کراچی ، سیرت رسولؐ نمبر ، جولائی و اگست ۱۹۶۳ ، صفحہ ۶۷-

کے حضور اسے مجمع کثیر میں پڑھ کر سنایا تھا جس کے عجیب و غریب اثرات اسی شب میں نے کوئٹہ میں محسوس کیے۔''

ایک بند پہلے پیش ہو چکا ہے، مزید تین بند (پہلا، تیسرا اور آخری) یہ ہیں:

اے یادگارِ طاعتِ سردارِ دوسرا
اے رازدارِ صحبتِ محبوبِؐ کبریا
آتی ہے تجھ سے آج بھی خوشبوئے مصطفیٰؐ
تجھ کو شمیمِ زلفِ محمدؐ کا واسطا
جام اک ولائے ختم رسلؐ کا پلا ہمیں
دیکھا ہے تیری آنکھ نے جو کچھ دکھا ہمیں
ہم سے بیان کر تو سراپائے مصطفیٰؐ
لفظوں ہی میں دکھا رخ زیبائے مصطفیٰؐ
رکھتے ہیں دل میں ہم بھی تولّائے مصطفیٰؐ
یہ تیغ ہے، یہ سر ہے، یہ سودائے مصطفیٰؐ
بے شک جنونِ عشق کا تو امتحان کر
لیکن حدیثِ محفلِ جاناں بیان کر
میں پا گیا ہوں تیری ادائے خرام سے
موج صبا تو آئی ہے باب السّلام سے
کہنا یہ جا کے سیّد خیرالانامؐ سے
للّٰہ ایک جرعہ محبت کے جام سے
گردش میں تا بہ حشر ہے پیمانہ آپ کا
ہے محشرِ غریب بھی دیوانہ آپ کا

''فخر کونین'' وادیٔ بولان کے ایک عظیم شاعر اور پاکستان کے مایۂ ناز فنکار اور ادیب کا ایک علمی و ادبی شاہکار ہے۔ یہ کتاب حسن اور حقیقت کا ایک نادر امتزاج ہے۔ اس سے اُردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ اس تخلیق پر ''وادیٔ بولان'' اگر مسرت و طمانیت سے جھوم اٹھے تو بجا

ہے بالکل بجا ہے ۔ اس کا انگریزی ترجمہ مقصود عالم ملک عنقریب پیش کرنے والے ہیں ۔

پروفیسر آغا صادق حسین نقوی (صادق تخلص) ۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو ڈیرہ سیداں متصل سلطان پور لودھی (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۴۳ء میں کوئٹہ آ گئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے ۔ علم عروض پر آپ کو عبور حاصل ہے ۔ اسی سلسلے میں ''جوہر عروض'' ایک کتاب بھی لکھی ہے ۔ آپ نے یہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ بقول انور رومان[1]: ''آپ بے شمار نوجوانوں کے استاد اور رہنما ہیں ۔ مشرقی پنجاب ہاتھ سے جانے کے بعد تو وہ یہیں کے ہو رہے ہیں ۔ اُن کے تلامذہ میں مقامی اور غیر مقامی دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں ۔''

آغا صادق کے اُردو کلام کے دو مجموعے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئے ہیں ۔ پہلے مجموعے کا نام ''نوا'' ہے جس میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ۔ دوسرا مجموعۂ کلام 'صبح صادق' ہے جس میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک کی نظمیں ، اشعار اور غزلیں شامل ہیں ۔ دونوں کتابیں طاہرہ نقوی نے شارع نجم الدین کوئٹہ سے شائع کی ہیں ۔ ''نوا'' کی قیمت دو روپے اور ''صبح صادق'' کی پانچ روپے ہے ۔ ''نوا'' کے چھیانوے اور ''صبح صادق'' کے دو سو چونسٹھ صفحات ہیں ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ موزوں ——— صبح صادق کا تعارف سر عبدالقادر مرحوم کا تحریر کردہ ہے ۔

دونوں مجموعہ ہائے کلام کے مطالعے[2] کے بعد قاری کا ذہن پچیس تیس سال پہلے کے شعری میلانات اور ادبی شعور کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور وہ ادبی تاریخ کے موجودہ دور میں فکری ، تہذیبی اور شعوری ارتقا کا اندازہ بآسانی کر لیتا ہے ۔ آغا صاحب کے بعض اشعار میں اقبال کے لب و لہجہ اور

۱۔ بلوچستان کا ایک شاعر ، انور رومان ، الحمرا ، لاہور ، جنوری ۱۹۵۵ء ۔
۲۔ ادبی دنیا ، لاہور ، فروری مارچ ۱۹۶۷ء ۔

مضامین کا خاصا اثر ہے ، جیسے :

یہ تہذیب لائے گی کیا رنگ صادق
بہت بستیاں بے نشاں دیکھتا ہوں

کوند رہی ہیں بجلیاں ، پردۂ جاں کی خیر ہو
نغمہ نواز کون ہے ، سوزِ دروں کے ساز میں

غریب کا اقتدار ہوگا ، غریب اب تاجدار ہوگا
غلام و آقا کا پردۂ امتیاز اب تار تار ہوگا

ابر میں ، برق میں ، تاروں میں ، چمن زاروں میں
مجھ کو انسان کی تقدیر نظر آتی ہے

آغا صاحب نے فرد اور جماعت کے رشتے کو ''بصائر کائنات'' ، ''غم حیات'' اور ''غم ذات'' کے عنوانات کے تحت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ اپنی شاعری کی کلید اس طرح بیان کرتے ہیں : ''میری نگاہ میں زندگی خود شعر ہے ۔ مجھے ذرّہ ذرّہ سوزونیت سے ہمکنار نظر آتا ہے ۔ شعر میں زندگی ہی کی تصویریں دیکھتا ہوں ۔ زندگی شعر پر اثر انداز ہوتی ہے ، پھر شعر سے اثر پذیر بھی ہو جاتی ہے ۔ اس طرح شعر خود زندگی کو بلند کر دیتا ہے ، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ زندہ رہنے کے لیے شعر کہتا ہوں یا شعر کہنے کے لیے زندہ ہوں ۔''[1]

آغا صاحب کی دونوں کتابوں کے نام ''نوا'' (نوائے سحری کا آغاز) اور ''صبح صادق'' (روشنی کا مظہر) اُن کے پیغام کی دو آوازیں ہیں جن میں وہ ہمیں پرانی اقدار کی حفاظت کا پیغام دیتے ہیں ۔ اُنھیں شرافت کے مٹتے ہوئے نقوش کا غم ہے ۔ اُن کے ہاں مزدور کے نالوں کی گونج سنائی دیتی ہے ۔ وہ سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کیے بغیر نہیں رہتے

۱۔ صبح صادق ، صفحہ ۱۸ ۔

وہ روشنی دکھانے کے بعد منزل کے لیے محبت کی صدا لگاتے ہیں - یہ صدا اُن کی غزلوں میں اس طرح گونج رہی ہے :

کہیں نہ دوست مرے مجھ سے بدگماں ہو جائیں
کہ دشمنوں کے دلوں میں سمائے جاتا ہوں

میں صفحۂ عالم پہ ہوں تحریر اُنھیں کی
وہ مجھ کو مٹا دیں گے تو اچھا نہ کریں گے

مجھ پر نگاہِ مہر و محبت رہے مدام
اے دردِ زندگی میں ترا نورِ دیدہ ہوں

جفائے دوست کا شکوہ نہیں مجھے صادق
کہ آشنائے شکایت نہیں زبانِ وفا

اہلِ وفا نہ مٹ سکے گردشِ روزگار سے
جامِ جہاں نما کی طرح آئینہ ہے غبار بھی

شمع کی لو کیا پیغام دیتی ہے ؟ ملاحظہ ہو :

بڑھ بڑھ کے یہ محفل سے کہا شمع کی لو نے
کٹتا نہیں جو سر ، وہ سر افراز نہیں ہے

وہ اپنی ہنسی میں بھی دوسروں کو شامل کرنا چاہتے ہیں ، لیکن اس کی تہ میں بھی مقصدیت پوشیدہ ہوتی ہے - ''شکر خند'' کے نام سے ''صبح صادق'' میں جو طنزو مزاح موجود ہے ، اُس پر یہ بات صادق آتی ہے جیسے :

خدا سے ان دلوں ہم آہ ! اتنا بھی نہیں ڈرتے
کہ جتنا نازنیں نرسیں سول سرجن کی موٹر سے

اب مجھے فرصت تلاوت کی کہاں لیکن کبھی ؟
سورۂ یاسین سنتا ہوں گراموفون میں

اسی پر ہے تہذیب کا اب مدار
کہ رخ سے ہو نسوانیت آشکار
نزاکت کی مردوں کو بھی آرزو
''تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو''

ملے گی منزل عرفاں نہ ان مشینوں سے
خدا بھی کیا نظر آئے گا دور بینوں سے

آغا صادق کا ایک اور مجموعہ بھی شائع ہؤا ہے ''چشمہ کوثر'' ۔ ناشرہ طاہرہ نقوی ، ۳۔۷۵ سی گلگشت ملتان ، ہدیہ دو روپے ، سال اشاعت ۱۹۶۷ع ، ضخامت ۹۲ صفحات ، لکھائی چھپائی اور کاغذ مناسب ۔

اس مجموعے میں رباعی ، سلام ، قصیدہ ، مرثیہ ، نعت ، منقبت ، مسدس اور مخمس ہے ۔ اس کا مقصد مصنف کی زبان سے سنیے :

''ائمہ اطہار کے ذکر مقدس سے میرا مقصد زیادہ تر تلقین اخلاق اور تشکیل کردار ہے جس کا قوم میں فقدان ہے ۔ اگر یہ مقصد کسی حد تک حاصل ہو گیا تو سمجھوں گا کہ اشاعت کی محنت ٹھکانے لگی ورنہ اظہار عقیدت کا فرض تو ادا ہو ہی جائے گا ۔''

علاوہ ازیں آغا صادق کے منظوم اُردو کلام کے یہ آثار ابھی تک چھپ نہیں سکے[1] :

کیف و کرب ، رگ سنگ ، تلخ و شیریں ، خلوت و جلوت ، نکات حیات ، زخمہ و ساز (کلام اقبال پر تضمینیں معہ نثری تشریحات) ، حریم عصمت (معاشرتی نظمیں) ، پریشان (آزاد نظمیں) ، رنگ و بو (مناظر قدرت پر نظمیں) شہر نامہ ۔

۱- بشارت ، مظفر گڑھ ، ۸ جولائی ۱۹۶۶ع ۔

پروفیسر انور رومان[1] ''بلوچستان کا ایک شاعر'' میں لکھتے ہیں کہ ان کی اس انقلابی اور باغیانہ روح اور اس عزم فتح کو دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ اشعار دیکھیے :

پرانی ٹوٹ گئی اور بن گئی دیوار
اٹھو اسیرو کہ عزمِ شکستِ زنداں ہے

صدیوں جو زر و سیم کے حلقوں نے بنا ہے
اس دور میں یہ دام تو برداشت نہ ہوگا

مظلوم کو زمیں سے اُٹھا کر گلے لگا
ظالم کو آسماں سے گرانے کا عزم کر

جو بے پناہ حسن اور نغمگی ان کی غزلیات پیش کرتی ہیں ، وہ آغا صادق ہی کا حصہ ہے - یہ ممکن نہیں کہ قاری اُن کی غزلیات پڑھ کر یہ محسوس نہ کرے کہ آغا صادق نے نظمیں لکھ کر غزل پر ظلم کیا ہے ؛ کیونکہ غزل ان کی انقلابی روح کی سیمابی کیفیات کو اس رعنائی اور دلفریبی سے اپنے اندر سمو لیتی ہے ، گویا وہ انھی مضامین کے لیے پیدا ہوئی تھی - اور اُردو ادب میں آغا صادق کا مقام ان کی غزلیات ہی سے متعین ہو سکتا ہے - سنیے :

غمِ حیات سے بھی انتقام لینا ہے
اندھیری رات سے بھی انتقام لینا ہے
جھلک دکھا کے مری زندگی کو لوٹ لیا
توقعات سے بھی انتقام لینا ہے
ذرا پنپنے دو انسان کی اخوت کو
تعصبات سے بھی انتقام لینا ہے

۱- الحمرا ، لاہور ، جنوری ۱۹۵۵ع -

ذرا جھلکنے دو شمعِ رخِ حقیقت کو
توہمّات سے بھی انتقام لینا ہے
یہ کائنات رہی ہے جو عدل کی دشمن
تو کائنات سے بھی انتقام لینا ہے

لیکن انتقام لینے اور بدلنے کا مقصد کیا ہے ؟ وہ معمارِ انقلاب کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں :

اُبھریں گے زندگی کے ادارے نئے نئے
فرسودہ کرم خوردہ اداروں کا غم نہ کر

اور اس کے بعد وہ اپنا مطمحِ نظر پیش کرتے ہیں :

جب انسان انسان کا غم خوار ہوگا
عداوت سے ، نفرت سے بیزار ہوگا
بشر بھول جائے گا اطوار شر کے
بدل جائیں گے زاویے جب نظر کے
تو سمجھوں گا اُس روز کو عید آدم
اُسی روز نکلے گا خورشید آدم

آغا صادق کی نظموں کا ایک مجموعہ بچوں کے لیے بعنوان ''طفلستان'' بھی چھپ چکا ہے ۔ یہ سڑسٹھ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ کل تینتالیس نظمیں ہیں ، جن میں منظوم پہیلیاں بھی شامل ہیں ۔ اسے مصنف نے کوئٹہ سے خود چھپوایا ہے ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سوزوں ہے ۔ ان نظموں کے لکھنے سے مصنف کا مقصد بچوں کے تعلیمی شوق کو ترقی دینا معلوم ہوتا ہے ۔ ''دعا'' سے ان نظموں کی ابتدا ہوتی ہے ۔ کہتے ہیں :

پرندوں کو دلکش نوا دینے والے
گلوں کو چمن میں کِھلا دینے والے
گھٹاؤں کے ہرکارے دوڑانے والے
پہاڑوں کے پتھر جما دینے والے
مری مشکلوں کو بھی آسان کر دے
زمانے کی بگڑی بنا دینے والے

"گھڑی کی کہانی، گھڑی کی زبانی" میں فرماتے ہیں :

میں دانا کے لیے ہوں درسِ حکمت
مگر نادان کی شان امارت

بعض نظمیں بلوچستانی ماحول کی عکاسی کرتی ہیں؛ مثلاً بادام کے درخت، انگور کی بیلیں، لٹن روڈ کوئٹہ کا ایک منظر، برف باری وغیرہ۔ برف باری کے دو شعر یہ ہیں :

دیکھ پہاڑ پہ برف کا تودا ہاتھی پر بِلّور کا ہودا
گوری چٹّی اُجلی بانکی یہ ہے بہار بلوچستان کی

سید صغیر حسین اصغر انبالوی ۱۹۲۲ء میں انبالہ سے لاہور آئے۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ نہ صرف عالمانہ اور ادیبانہ تھا بلکہ شاعرانہ بھی تھا۔ اس کا یہ لازمی نتیجہ نکلا کہ آپ میں بھی غیر شعوری طور پر شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ لاہور کی ادبی محفلیں اپنا جواب آپ تھیں۔ اصغر لاہور پہنچے تو اختر شیرانی مرحوم سے قربت میسر آئی اور اس تقریب نے اُس ذوق کو جو انھیں قدرت نے عطا کیا تھا اور ماحول اور حالات نے سنوارا تھا، بروئے کار لانے میں مدد دی۔ آپ کھل کر شعر گوئی کی جانب مائل ہوئے اور خوب شعر کہے۔ اس زمانے کے اکثر بہترین رسائل میں کلام چھپا، لیکن افسوس کہ وہ ضائع ہو گیا۔ آپ ۱۹۲۸ء میں لاہور سے کوئٹہ آ گئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ بلوچستان بھر کے مختلف مقامات میں سالہا سال بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ کسی جگہ اتنے سال رہنا اس مقام کو آبائی وطن کی سی حیثیت دے دیتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کا مجموعۂ کلام "دست سبو" کوئٹہ ہی سے ناشرین بزم ارتقائے ادب کوئٹہ نے شائع کیا جو ایک سو ساٹھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ مناسب۔ سرورق خیال انگیز۔ مجموعے کے آغاز میں عیش فیروز پوری کا یہ شعر درج ہے :

کیا خوشگوار دور مئے خوشگوار تھا
دست سبو میں دامنِ لیل و نہار تھا

عیش کا ایک قطعہ بھی اس کتاب کی زینت ہے - تقریظ ارمان عثمانی نے لکھی ہے - اصغر کا یہ مجموعۂ کلام نعت اور منقبت کے علاوہ زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے - اسی لیے ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے 'مقدمہ' میں ان غزلوں کا مطالعہ کرنے سے قبل تاریخ کے آئینے میں غزل کی روایات کی ایک جھلک بھی دکھائی ہے جو خوب ہے -

اصغر کی غزل میں غم دوراں کی بجائے غم یار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں - وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں :

کہاں شوق غزل خوانی ، کہاں یہ عالم اے اصغر
یہ ناموزوں سے نالے ہیں نکل آئے ہیں جو دل سے

کوئی حسن شعر میں ہو تو عجب نہیں ہے اصغر
کہ ہے دوست کا عطیہ مری فکر شاعرانہ

میں آج بھی ہوں گلشنِ عالم سے بے نیاز
میں نے تو عمر کی ہے بسر بزمِ یار میں

خون جگر کی آمیزش سے اشعار کی آبیاری ہوتی ہے :

اس کشمکش میں گزری ہے اپنی تمام عمر
ساحل پہ آ گئے کبھی طوفاں میں آ گئے

یہ شرمگیں منفعل نگاہیں ، یہ گرم آنسو یہ سرد آہیں
نہیں نہیں تم نہ سر جھکاؤ مجھے کسی سے گلہ نہیں ہے

محبت کی مختلف کیفیات دیکھیے :

آج اُن پہ مرا حال ہؤا آئینہ شاید
آج اُن کی ہنسی میں مری آنکھوں کی نمی ہے

ان کی نوازشاتِ مسلسل کا شکریہ
آنکھوں میں آ گئے وہ ، کبھی دل میں آ گئے

پھر نشیمن ہؤا آباد جو ویراں ہو کر
پھر قریب آئی ہیں کچھ بجلیاں حیراں ہو کر

یقیناً آنکھ میں آنسو بھر آئیں ، رنگ اُڑ جائے
کبھی بھولے سے بھی سن لے اگر وہ داستاں میری

اے دوست لبِ یار سے واقف نہیں دنیا
یہ میرے ہی گلزارِ تصور کی کلی ہے

اصغر نے اکثر اشعار میں محض تزئین شعر اور رنگ آمیزی کی خاطر ساغر و مینا کا ذکر کیا ہے اور اس حیثیت میں اُنھوں نے بعض خمار آگیں شعر کہے ہیں ، جیسے :

ہائے وہ لغزش مستانہ کہاں سے لاؤں
جو اُٹھا کر ترے قدموں پہ گرا دے مجھ کو

حضور ساقیٔ محفل ہمیشہ اے اصغر
ہجوم غم میں بھی میں مسکرا کے پیتا ہوں

اصغر کے کلام میں الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں بلکہ سادگی اُن کی ممتاز خوبی ہے - کہتے ہیں :

صورت کدۂ دہر نہیں اپنی نظر میں
کافی ہے وہ صورت کہ مرے دلمیں بسی ہے

خدا کے واسطے موسیٰ کو بے نقاب نہ کر
خدا کے واسطے رخ پر نقاب رہنے دے

جب بگولا کوئی دیکھا مجھے گھر یاد آیا
خاک آلودہ نظاروں کی قسم کھاتا ہوں

''باریکی'' دیکھیے:

کبھی جو آئے بھی تو آئے کس ادا کے ساتھ
وہ آنکھ اٹھا نہ سکے، ہم نظر ملا نہ سکے

ہنستے ہنستے تو نکل آتے ہیں آنسو لیکن
ہم تبسم کو ترستے رہے گریاں ہو کر

جذبے کی کارفرمائی ملاحظہ ہو:

کٹاری تھی، چھری تھی، تیغ تھی، خنجر تھی، پیکاں تھی
غرض وہ اک نگاہِ ناز کیا تھی، آفت جاں تھی

اُس طرف ہے پردۂ رخ اس طرف بیمار غم
کون جانے پہلے اس دنیا سے اُٹھ جائے گا کون

بقول ڈاکٹر محمد اسلم قریشی: ''عام شاعروں کی طرح اصغر کا کلام بھی شاہین تخیل کی فلک شگاف پرواز سے تہی دامن نظر آتا ہے لیکن عندلیبِ پر بستہ کی نازک پھڑپھڑاہٹ کے لطف سے خالی نہیں'' مثلاً:

ہجومِ شوق دل کو اس ادا سے گدگداتا ہے
پلٹ جاتی ہیں سوجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

سر دھن رہا ہے جوشِ وفا میں ہوا کے ساتھ
انداز قیس پردۂ محمل میں آ گئے

اس خطے میں ''دست سبو'' کی اشاعت نیک فال ہے کیونکہ اصغر انبالوی اس سرزمین کے بہت پرانے شاعر ہیں اور آپ کو یہاں کی ادبی تاریخ کا ایک مکمل باب سمجھا جا سکتا ہے۔

نام غلام محمد، تخلص جمیل، ۵ فروری ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا ؤ اجداد امرتسر سے آ کر کوئٹہ میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ بچپن ہی سے آپ کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ حصول تعلیم کے بعد آپ نے درس و تدریس کو اپنایا۔

کوئٹہ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں دل کھول کر حصہ لیا ۔ مختلف رسائل اور اخبارات (مثلاً عالمگیر ، شبستان اور میزان وغیرہ) میں ان کا کلام چھپتا رہا ۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بھی ان کا کلام نشر ہوتا رہا ۔ آپ نے ۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء کو وفات پائی ۔ جمیل مرحوم کے قلمی دیوان کا نام ''نقش جمیل'' ہے ۔ عیش فیروز پوری کے اصلاح یافتہ تھے اور انھوں نے اپنے کئی شعروں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے ۔ مثلاً :

پھلیں پھولیں نہ کیونکر یہ مری غزلیں سرِ محفل
تلمذ ہے جمیلِ زار ، عیش ایسے سخن‌ور سے

لطفِ نسیمِ عیش کے یہ گل کھلائے ہیں
ورنہ بہار نظم سے میں کوسوں دور تھا

وہ پرانے رنگ میں کہتے تھے اور کلاسیکی شاعر تھے لیکن اُن کا انداز اور اسلوب اپنا اور اچھوتا تھا ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

ہمارے بعد یہ عقدہ کھلا اُس بے وفا بت پر
ستم کرنا ستم ہے ، مہربانی مہربانی ہے

جستجو کس کو کنارے کی ہے بحرِ غم میں
وصل ممکن ہو جہاں ، ہے وہی ساحل اپنا

عبث ذکرِ عمرِ گزشتہ ہے اب
بسر ہونے والی بسر ہو گئی

دیکھیے چمکا ستارہ وہ مری قسمت کا
دیکھیے دیکھیے ! وہ بام پہ آیا کوئی

ضبط مرا شعار ہے ، ورنہ ہر ایک آہ سے
سر پر آسماں نہ ہو ، زیر قدم زمیں نہ ہو

میں سوتے سوتے موت کی نیند آج جاگ اُٹھا
وہ چلتے چلتے کہہ گئے آئیں گے خواب میں

لطف اُٹھا رہا ہوں میں یار کے انتظار کا
اے شبِ ہجر اور بھی عمر تری دراز ہو
ذروں میں نور اُسی کا ہے ، پھولوں میں رنگ اُسی کا ہے
دیکھنے کے لیے مگر دیدۂ امتیاز ہو

تیری رحمت کا دیا ساتھ گناہوں نے مرے
میں خطا کار ہؤا جب ، تُو خطا پوش ہؤا

عاشق ہے تو پیدا کر تُو دیدۂ بینا بھی
ہر ذرے میں مجنوں کو محمل نظر آتا ہے
ہم بحرِ محبت کے بے خوف شناور ہیں
ہر موج کے پردے میں ساحل نظر آتا ہے

ان میں سے اکثر مضامین دوسرے شعرا نے بھی سلکِ شعر میں پروئے ہیں لیکن جمیل کی سلیس زبان ، لفظوں کی برمحل تکرار اور بے ساختگیٔ انداز نے ان شعروں کے مضامین کی کہنگی کو جدت میں بدل دیا ۔

وہ حسن و عشق کو نہ صرف گرمیٔ حیات سمجھتے تھے بلکہ ان کے یہاں ہر چیز کی ہستی انھی پرمنحصر تھی ، جیسا کہ ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے :

سوز و ساز عشق سے خالی جو ہے وہ دل نہیں
شمع جو بے نور ہے وہ لائقِ محفل نہیں

اک حسن کی شوخی ہے ، اک عشق کی مستی ہے
قائم انھیں دونوں سے ہر چیز کی ہستی ہے

میں جنسِ محبت کی تعریف کروں کیونکر
ہر چیز سے مہنگی ہے، ہر چیز سے سستی ہے

اُن میں ایک غیر مختتم غمزدگی اور حرماں نصیبی پائی جاتی تھی۔ دیکھیے:

جس کی نہ سنے کوئی جمیل آج وہی ہوں میں
جس کو نہ کہے کوئی وہ افسانہ میں ہی ہوں

اے تمناؤں کے گلزار میں پھلنے والو!
یاد بھی آیا ہے برباد تمنا کوئی؟

اُن میں ایک شدید احساسِ محرومی و ناداری پایا جاتا ہے۔ یہ محرومی و ناداری بنیادی طور پر تو انفرادی تھی لیکن وہ اپنے گرد و پیش کی محرومی و ناداری کو بھی خوب غور سے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اگر کسی طرح اُن کی محرومی و ناداری دور ہو سکے تو وہ اپنے گرد و پیش میں کسی کو بھی محروم و نادار نہ رہنے دیں۔ یہ تصور نہایت خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ اس شعر میں اُجاگر ہوا ہے:

غیر کے گھر میں وہ بت ہے تو اندھیرا ہے یہاں
میرے گھر ہوتا تو ہر گھر میں اُجالا ہوتا

اُنھیں آلام کی ظلمتوں کو دور کر کے اُجالا پھیلانے کی دھن لگی ہوئی تھی اور اسی اُجالے کی تلاش ہی میں شاید وہ ملکِ عدم کو روانہ ہوئے۔

مشعل (تفصیلی تذکرہ حصۂ نثر میں ملاحظہ فرمائیے) میں درج تیرہ منظومات ان شعرا کی تخلیق ہیں: بشیر احمد فاروق، امانت بخاری، تحمل حسین جوہر، ایم محبوب، آغا صادق، نثار احمد محشر رسول نگری، گل خان نصیر، عبد اللطیف فرحت، عبدالرحمٰن غور، قیوم راشد، سردار انور، ارشد صدیقی، مذاق العیشی۔ چند شعر یہ ہیں:[1]

۱- مشعل، صفحات ۱۳ تا ۳۲۔

بشیر احمد فاروق

جن کی شمشیر ہو دیں اور سپر ہو قرآں
گردنیں قیصر و کسریٰ کی جھکا دیتے ہیں

اس جہان رنگ و بو پر پھر شباب آیا تو کیا
ڈوب کر پھر آسماں پر آفتاب آیا تو کیا
گر تری دنیا کے دل میں انقلاب آیا نہیں
ذرے ذرے پر جہاں کے انقلاب آیا تو کیا

امانت بخاری

بنائے آشیاں کی کوششیں کیا کیا نہ کیں میں نے
جہاں تنکے ملے کچھ، طرح رکھ دی بس وہیں میں نے

تحمل حسین جوہر

شاعر کا دل بھی ہوتا ہے اک بحر بیکراں
لہر آ گئی تو موج کو ساحل بنا دیا

ایم محبوب

چھپ کر نہیں کہتے، روبرو کہتے ہیں
جو کچھ سنتے ہیں، ہو بہو کہتے ہیں
بندوں کو خدا سے جو ملا دیتا ہے
اُس ربطِ نہاں کو ہم سبو کہتے ہیں

نثار احمد محشر

نظر آتا نہ زمانے میں کوئی خاک نشیں
مجھ کو فطرت نے اگر کچھ بھی اُبھارا ہوتا
کاش تنکا ہی بناتا مجھے صناعِ ازل
ڈوبتے کا تو زمانے میں سہارا ہوتا

وہ مری یاد میں چھپ چھپ کے بہاتے آنسو
میں سرِ نوکِ مژہ صبح کا تارا ہوتا
کیا ہے مقصد مری تخلیق کا حیران ہوں میں
اے خدا کون سے افسانے کا عنوان ہوں میں

گل خان نصیر

کیسے مانوں کہ یہاں ختم رعونت ہوگی
جب کہ فرعون بنا بیٹھا ہے فرزانہ وہی
کیسے مانوں کہ یہاں ہوگا شریعت کا نفاذ
جب کہ ساقی ہے وہی ، شاہد وہے خانہ وہی
کیسے مانوں کہ بدل جائیں گے ان کے انداز
جبکہ ہے نعرۂ لا دینی و مستانہ وہی
کیسے میں قطرۂ بے مایہ کو دریا کہہ دوں
کیسے میں خاک کے ذرے کو ثریا کہہ دوں

عبداللطیف فرحت

کوئی کہتا ہے محبت ہے غریبی کا کفن
آرزوؤں کا ، اُمیدوں کا شکستہ سا مزار
رقص کرتی ہیں جہاں دن کو گھٹائیں کالی
جن پہ منڈلاتی ہو آوارہ سی راتوں کی قطار
جانے اس رازِ محبت کی حقیقت کیا ہے؟
میری ہمدم ، میری ہمراز ، محبت کیا ہے؟

عبدالرحمان غور

اور یہ تہذیب کا دلدادہ مہذب انساں
آج کہتا ہے عناصر کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک ذرے کی حقیقت کو سمجھتا ہے مگر
اُس کے نزدیک جہاں ساز خدا کچھ بھی نہیں

آج اس دشمنِ اخلاق کے ہاتھوں سے کہیں
تیسری جنگ کے آغاز میں کچھ دیر نہیں

ارشد صدیقی

اک سکوت مستقل ہے میرے افسانے کے بعد
محفلِ عالم ابھی تک گوش بر آواز ہے

مذاق العیشی

کبھی میرے دلِ حیرت زدہ کے روبرو آؤ
کبھی ایسا بھی ہو آئینے میں آئینہ گر بیٹھے

قیوم راشد القریشی بی اے کا مجموعۂ کلام ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ میں چھپا ۔ اس کا نام تھا ''بربط ناہید''۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر ، سرورق پسندیدہ ، ضخامت چونسٹھ صفحے ، قیمت ایک روپیہ ، پیش کردہ حلقہ ارباب ادب کوئٹہ ، ملنے کا پتہ دانش محل پرنس روڈ کوئٹہ ۔

اس میں مصنف کی نظموں اور رباعیوں کا انتخاب دیا گیا ہے ۔ تعارف پروفیسر انور روسان نے لکھا ہے ۔ انھوں نے قیوم راشد کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔ قیوم راشد کا انداز بیان اُلجھاؤ سے پاک ، سادگی اور تاثر سے لبریز ہے ۔ بقول انور روسان[۱] ''اس کی نظموں کے ہر بند کے ساتھ ساتھ قاری بھی رواں ہو جاتا ہے ۔ ایک ایک مصرع گویا ایک ایک قدم ہے جو شاعر اور اس کے قاری حقیقی مسرت کی طرف اُٹھا رہے ہیں :

اُٹھا دو یہ شمعِ فروزاں اُٹھا دو
مغنّی کے یہ ساز و ساماں اُٹھا دو
کرو اب نہ مجھ کو پریشاں اُٹھا دو
نہ روکو بہت دور جانا ہے مجھ کو''

۱- بربط ناہید ، صفحہ ۷ ۔

پھر گویا ہوتے ہیں[1]:

اسیروں کو قیدِ الم سے چھڑانے
گلستاں سے گلچیں کی ہستی مٹانے
اک عزمِ مصمم کا سکہ جمانے
نہ روکو بہت دور جانا ہے مجھ کو
اخوت کی دنیا بسا کر رہوں گا
میں بغض و عداوت مٹا کر رہوں گا
وطن کو وطن پھر بنا کر رہوں گا
نہ روکو، بہت دور جانا ہے مجھ کو

مجموعے میں خالص جذباتی نظموں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ ''تصویرِ آرزو''، ''چھُپ گئے'' اور ''صحن چمن'' اس ''نوعیت کی کامیاب نظمیں ہیں۔ چند مزید اشعار ملاحظہ ہوں[2]:

تجھے[3] آخری شب کی تاریکیوں میں
سحر کے چمکتے ستاروں میں دیکھا
سنی تیری آواز ویرانیوں میں
تجھے جلوہ گر کوہساروں میں دیکھا
سمندر کی موجوں میں پوشیدہ گاہے
کبھی نغمہ ریز آبشاروں میں دیکھا

لاکھ غمازی کرے میری یہ از خود رفتگی
راز کی باتیں مگر راشد بتا سکتا نہیں

گیت اک ''بربطِ ناہید'' پہ گا لوں تو چلوں
زنگ خوردہ سہی، تلوار اٹھا لوں تو چلوں

۱- بربط ناہید، صفحہ ۲۲، ۲۳۔
۲- بربط ناہید، صفحات ۱۶، ۳۹، ۲۸۔
۳- خدا کو۔

میری نظروں میں کھٹکتا ہے بہاروں کا شباب[1]
چوٹ سی دل پر لگاتا ہے ستاروں کا شباب
ہو گیا آتش بداماں لالہ زاروں کا شباب
آہ ! اس عالم میں عرض مدعا کس سے کروں ؟
خود غرض دنیا میں امید وفا کس سے کروں ؟

خوبیٔ وقت سے سامان بہار آ جائے[2]
گلشن عشق میں پھر جان بہار آ جائے
یعنی وہ شمع شبستان بہار آ جائے
بجھ چکا میرے شبستان محبت کا چراغ

قیوم راشد کی انفرادیت جس مکمل، مؤثر اور پُرشکوہ انداز میں رباعی میں اُبھرتی ہے، شاید نظم میں نہیں - اس کے ہاں یہ صنف سخن اس کی تپش، کاوش اور رجائیت کی ترجمان ہے اور اُس قربت کو نمایاں کرتی ہے جو اُسے زندگی سے حاصل ہے اور جو اس کے مشاہدے کی جامعیّت اور اس کے فن کی طلسمیت ہے :

بھونچال میں تھل کانپ رہے ہوں جیسے
یا شیش محل کانپ رہے ہوں جیسے
ان مست سی آنکھوں میں لرزتے ہوئے اشک
پانی پہ کنول کانپ رہے ہوں جیسے
بے معنی ہے کائنات میرے آگے
ہر چیز ہے بے ثبات میرے آگے
محروم عمل، جنّ و ملائک کیا ہیں
جھک جاتے ہیں شش جہات میرے آگے[3]

۱- بربط ناہید، صفحہ ۴۲ -
۲- ایضاً، صفحہ ۴۸ -
۳- ایضاً، صفحہ ۱۳ -

اصل نام سید شمس الضحیٰ ہے[1] - لکھتے ''ش ضحیٰ'' ہیں اور اسی نام سے مشہور ہیں - آپ ۲۰ جولائی ۱۹۲۴ع کو مظفر پور (صوبۂ بہار) میں پیدا ہوئے - پٹنہ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی -

اُردو ادب سے آپ کی دلچسپی خاندانی ورثہ ہے - ''کاشف الحقائق'' کے مصنف نواب شمس العلماء سید امداد امام اثر مرحوم آپ کے نانا ہوتے تھے - بہار اور بنگال کے معروف شاعر علامہ جمیل مظہری آپ کے پھپھیرے بھائی ہوتے ہیں - تاریخ میں فارسی کی متصوفانہ شاعری کے سلسلے میں بہار کے مشہور صوفی بزرگ شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کا ذکر کیا جاتا ہے - اُن سے ش ضحیٰ کو جدی نسبت ہے -

آپ کی شاعری کی ابتدا غالباً سنہ ۱۹۴۰ع میں ہوئی - کراچی آنے تک ''شمس ہاشمی'' کے نام سے لکھا کرتے تھے اور ان کی نظمیں ندیم (گیا)، معاصر (پٹنہ) اور آج کل (دہلی) وغیرہ میں چھپی تھیں -

۱۹۴۷ع میں کراچی آئے اور ۱۹۴۸ع کے اوائل میں کوئٹہ پہنچ گئے - آپ ۱۹۵۴ع تک گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں جغرافیہ کے لیکچرار رہے - آج کل کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور خاموشی کے ساتھ علمی خدمات انجام دے رہے ہیں -

آپ نے کوئٹے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا - آپ کی گزشتہ ادبی زندگی (۱۹۴۷ع-۱۹۵۴ع) ایک مکمل دور ہے - اس دور کی چند نظموں کے سوا بیشتر نظمیں کوئٹہ میں کہی گئی ہیں جو ماہ نو[2] اور اور ادب لطیف کے علاوہ کوئٹہ کے مقامی اخبار زمانہ، اخبار بلوچستان وغیرہ میں بھی شائع ہوتی رہیں - نظموں کے علاوہ بلوچستان پر چند مضامین

۱- تذکرۂ مسلم شعرائے بہار، جلد دوم، کراچی، ۱۹۶۷ع، صفحات ۱۸۷ تا ۱۹۲ -

۲- نئی آوازیں، ش ضحیٰ، نیاز احمد، ماہ نو، کراچی، مارچ ۱۹۵۳ع -

بھی شائع ہوئے تھے جن کا ذکر ''نثر نگاری'' میں آئے گا۔
ش ضحیٰ کی پہلی نظم جو کوئٹہ میں لکھی گئی تھی، اس کا عنوان تھا:
''علامہ اقبال کی خدمت میں'' - اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ رعنائی بیان کی بلندی و تازگی اور اقبال کی تصانیف اور اشعار کے فنکارانہ ذکر نے نظم میں ایک امتیازی رنگ پیدا کر دیا ہے - سب سے بڑھ کر اس میں وہ واقعیت جھلکتی ہے جو اُردو شاعری میں عام نہیں:

'بال جبریل' کی سوگند تجھے! دیکھ تو لے
اپنے جانباز شہیدوں کا لہو لایا ہوں

تیری آواز کی تاثیر تھی یا 'ضرب' کلیم
جس نے پھر شوکت اسلام کا در کھول دیا

قرطبہ جا کے لٹائے تھے جو آنسو تو نے
مہر و مہ بن کے کراچی میں درخشاں ہیں آج
فرطِ غم یہ ہے کہ مژدہ یہ سنائیں کس کو
مورِ بے مایہ نہیں، ہم تو سلیماں ہیں آج

کھول دے روزنِ فردوس، خودی کے صدقے
اپنے دیرینہ نشیمن کی بہاروں کو تو دیکھ
دیکھ، کشمیر کی وادی میں تبسم اپنا
سر بکف مردِ مجاہد کی قطاروں کو تو دیکھ

قیام پاکستان نے نئے روزن وا کر دیے - ان کی جھلک ش ضحی کی اُن نظموں میں دکھائی دیتی ہے جو یوم آزادی کی تقریب پر لکھی گئیں - ندرتِ فکر و احساس کے عالم میں شاعر کا تخیل اس نوع کے شگفتہ مناظر

کا تصور کرتا ہے :

یہ قمقموں کے گلستاں ، یہ روشنی کے پھول

شاعر کو احساس ہے کہ ابھی پاکستان کے عروج و ترقی کا آغاز ہے اور خبر نہیں کہ آیندہ اس کی بہار کیا سے کیا ہو جائے :

کچھ ایسے پھول ہیں جن کو ابھی کھلانا ہے

بڑھے چلو کہ بلاتی ہے کہکشاں تم کو

اور یہ سب پاکستان کے اولوالعزم فرزندوں کی ہمت پر موقوف ہے :

تمھارے جوش میں مضمر ہے جوش ہستی کا

جشن آزادی کی اس پہلی نظم سے کہیں زیادہ دلچسپ وہ ساقی نامہ ہے جو ''پندرہ اگست'' کے عنوان سے اگست ۱۹۵۰ع میں شائع ہؤا تھا۔ شاعر کی نظر پاکستان میں خوش تریں امکانات دیکھتی ہے :

رگ و پے میں غلطاں ہیں شمس و قمر
تجلی فزا ہے مری ہر نظر

اس سلسلے میں سب سے اہم زندگی کا نیا بھرپور احساس ہے جو ان کے ہر ہر لفظ سے چھلکا پڑتا ہے :

ہمالہ سے بحر عرب تک ہے نور
فضا نیلی نیلی ، ہوا میں سرور
ندی اور نالوں میں برپا ہے شور
نئی زندگی ہے ، نیا اس کا زور

ش ضحیا ، زندگی اور قدرت کے مختلف پہلوؤں سے متاثر ہوتے ہیں لیکن دوسروں سے مختلف انداز میں کیونکہ ان کی نظر بڑے نازک حقیقی مناظر کا مشاہدہ کرتی ہے ۔ وہ ذوق نمو میں گویا ہوتے ہیں :

کاریز کا سیم پاش پانی　　یہ اس کی چھپی چھپی روانی
اے وادیٔ شال تیرے قرباں　　ہم کو بھی یہ بانکپن سکھا دے

اسی نظم کے اس بند میں مشاہدہ کتنے سہانے روپ میں جلوہ گر

ہوتا ہے :

گلشن میں مچی ہوئی ہے ہلچل ہر شاخ سے پھوٹتی ہے کونپل
کانٹوں پہ نکھار آ رہا ہے کلیوں کا سرک رہا ہے آنچل

مشاہدے کے ساتھ تخیل کی کارفرمائی کیا رنگ لاتی ہے ؟ یہ ش ضحیٰ کی مشہور نظم ''برفباری سے پہلے'' میں دیکھیے :

ہمک ہمک کے وہ شاخوں سے پھوٹنے والو
مرے شریر شگوفو ! کرو بھی فکر رفو
مرے حسین گلو ! اب تمھارے شیشے میں
نظر فروزیٔ شبنم کا دور ختم ہؤا !
تمھارے خندۂ پیہم کا دور ختم ہؤا
''چھنک پڑیں گے فضا میں جو برف کے گھنگرو''

ش ضحیٰ کی نظموں میں بلوچستان خصوصاً کوئٹہ کا منظری ماحول کبھی پس منظر ، کبھی پیش منظر کا کام کرتا ہے ۔ آپ کی مشہور نظم ''آئینے ہیں غلطاں غلطاں'' کوئٹہ کی برف باری پر لکھی گئی جو بے حد پسند کی گئی ۔ عین برف باری کے وقت کی عکاسی یا منظر کشی کے لیے آپ کو تشبیہ و استعارہ کے علاوہ ایک خاص تکنیک اختیار کرنی پڑی اور آپ کی یہ تکنیک موضوع سے ہم آہنگ ہو کر بہت کامیاب ثابت ہوئی ۔ وہ نظم یہ ہے[1] :

صبح سویرے اٹھ کر جیسے کوئی چھڑائے مانگ کی افشاں شاداں ، شاداں
ہنس ہنس جیسے کوئی دکھائے اور چھپائے جلوۂ تاباں ، نازاں نازاں
بزم میں جیسے ساقیٔ مہ وش سیمیں ساغر چھلکائے ، بجلی کو چمکائے
صہبا برسے ، مستی اُمڈے ، اُمڈے اک ایسا طوفان ، میخانہ بہہ جائے
دیکھ رہا ہوں چپکے چپکے جھلمل جھلمل نظّارے
عرش سے گرتے اُجلے اُجلے رم جھم رم جھم صدہا پارے

۱۔ ش ضحیٰ کی کوئٹہ میں کہی گئی اٹھائیس نظموں کا مختصر مجموعہ پیش نظر ہے ۔

بوجھ سے جن کے کہساروں کے شانے بھی تھک تھک ہارے
عریاں عریاں شاخوں پر ہے سحر کسی کا سلسلہ جنباں
پیہم رقصاں !
آئینے ہیں غلطاں غلطاں
آئینوں میں اُمڈا اُمڈا جلوۂ فطرت
چار طرف ہے لہرایا سا نغمۂ رحمت
جیسے یزداں ،
چھیڑ رہا ہے سازِ زمستاں
ٹھہرا ٹھہرا ایک تسلسل ، سلجھا سلجھا خواب پریشاں
دیدۂ و دل ہیں حیراں حیراں !!

خان لیاقت علی خاں کی شہادت پر ش ضحیٰ نے جو نظم کہی تھی ، اُس کا عنوان تھا ''کیا ہؤا آہ ، اے عندلیب چمن''۔ یہ نظم اپنی تکنیک کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی ۔ آخری بند دیکھیے :

ہم اپنی تمناؤں کا کنول
معمور کریں گے نکہت سے ، نکہت کو لٹاتے جائیں گے
جو ساز انھوں نے چھیڑا تھا وہ ساز بجاتے جائیں گے
کونین کو ان کے نغموں سے ہم رقص میں لاتے جائیں گے

ش ضحیٰ اپنی داخلی کیفیت کا اظہار کس انداز سے کرتے ہیں ، ملاحظہ فرمائیے ۔ اُن کی ایک نظم (غیر مطبوعہ ، کوئٹہ ۱۹۴۹ع انور رومان کے نام) کا آخری حصہ ہے جو انور رومان کے اس سوال کا جواب تھا کہ ''آج کل چپ کیوں ہو ؟؟''

خزاں ہو ، یا بہار ہو
کلی ہو ، خار ہو کہ سنگ و خشت کا مزار ہو
یہی ہے میری اس عظیم زندگی کا مدعا
کہ ایک خوشنما فریبِ زندگی لیے ہوئے
مرا قلم رکا رہے

زباں سے کچھ نہ کہہ سکوں
حیات کی حماقتوں کو مصلحت کے آئینے میں دیکھتا رہوں

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون ''اُردو شاعری گذشتہ سال میں''[1] میں ش ضحیٰ کی بعض نظموں کو سراہا ہے۔ نیاز احمد کا کہنا ہے:[2]

''ش ضحیٰ ہمارے اُن ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے سب سے پہلے یہ بشاشت آفرین اثر (پاکستان کے قیام کے بعد کی خوشگوار فضا کا اثر) محسوس کیا۔ اپنے نوجوان دل کی دھڑکنوں کو اچھوتی نظموں میں سمو دیا اور بلوچستان کی حد تک خاک وطن کو اس طرح آئینہ دکھایا ہے کہ یہ ایک دل آویز عکس بن کر ہماری نظروں میں سما گئی ہے۔''

عبدالرحمٰن غور، سبی سے کوئی آٹھ میل دور ''کچھ ولہاری خاں'' میں منشی لال خاں بلوچ کے ہاں تولد ہوئے۔ کم سنی میں والد وفات پا گئے۔ اس طرح انھیں تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی۔ بچپن ہی سے علم و ادب سے شغف تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں بمقام سبی ''ادارۂ ادب بلوچستان'' کی بنا ڈالی گئی تو آپ نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ بعد میں اس ادارے کے زیر اہتمام آپ کی چند کتابیں شائع ہوئیں۔ آزادیٔ وطن کی خاطر خاکسار تحریک میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ بعد میں خدمتِ لوح و قلم کے جذبے سے مختلف اوقات میں معلم، میثاق الحق، اتحاد، نعرۂ حق، زمانہ، قاصد، ساربان اور نوائے وطن وغیرہ میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ان دنوں ''صبح نو'' کوئٹہ سے منسلک ہیں۔

عبدالرحمٰن غور کا پہلا مجموعۂ کلام فروری ۱۹۳۹ء میں ''پھندے'' کے نام سے چھپا۔ اسے غور نے بلوچستان پریس کوئٹہ سے چھپوا کر ادارۂ ادب بلوچستان سبی سے شائع کیا۔ ضخامت چونسٹھ صفحے، قیمت بارہ آنے، لکھائی چھپائی مناسب، سر ورق سادہ تھا۔

اس مجموعے میں غور کے ابتدائی دور کا کلام درج ہوا ہے۔ غور کا

۱۔ ماہ نو، کراچی، استقلال نمبر ۱۹۵۶ء۔
۲۔ ماہ نو، کراچی مارچ ۱۹۵۳ء۔

دوسرا مجموعہ ''متاع ُبردہ'' ۱۹۶۷ع میں طباعت کے زیور سے مزین ہؤا ہے ۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات ، نیوز پرنٹ ، لکھائی چھپائی واضح ، سرورق سادہ ، قیمت اڑھائی روپے ۔ ناشر مکتبۂ بلوچی دنیا ، ملتان ۔

بلوچوں میں بجار (امداد ِ باہمی) ایک رسم چلی آتی ہے جس کے باعث بلوچ معاشرے میں شادی بیاہ ، مرگ ، کارو باری نقصان اور خون بہا تک کے اخراجات مل کر برداشت کیے جاتے ہیں ۔ ''متاع ِ بردہ'' کے اخراجات بھی اسی اچھی رسم سے پورے کیے گئے ہیں جس میں کئی صاحبان نے حصہ لیا ہے ۔ اس بات کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ''متاع ِ بردہ'' کا منظر عام پر آنا انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کوششوں کا مرہون ِ منت ہے ۔

''متاع بردہ'' کے شروع میں فیض احمد فیض ، سردار محمد خاں باروزئی اور غور نے بغیر کسی عنوان کے اپنے خیالات پیش کیے ہیں ۔ غور کا یہ مجموعۂ کلام غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے ۔ ان کی شاعری میں محبوب کے غم سے زیادہ غم روزگار کا تذکرہ ہے :

ایک دم بھی گراں گزرتا ہے
اتنا کم بھی گراں گزرتا ہے
زلف و کاکل کا ذکر مت پوچھو
پیچ و خم بھی گراں گزرتا ہے
غم دوراں فزوں ہؤا اتنا
تیرا غم بھی گراں گزرتا ہے

ان کے رگ و پے میں روزگار کا غم رچ گیا ہے ۔ اُنھیں زندگی نے لگاتار غم ہی غم دیے ہیں ۔ اُن کے یہ انفرادی غم شعر کے سانچے میں ڈھل کر انفرادی نہیں رہتے بلکہ مکمل معاشرے اور ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ چنانچہ وہ ''نذرانۂ عقیدت'' کے تحت گویا ہوتے ہیں :

مری حیات کا حاصل ہے دیدۂ گریاں
حضور! آج یہی اشک بار لایا ہوں
جہاں کا درد ہے سرمایۂ حیات مرا
ستم زدہ ہوں ، دل ِ غم گسار لایا ہوں

مجھے ملال ہے ، میں باعث سکوں نہ بنا
دلِ غریب کی غمگیں پکار لایا ہوں

لٹن روڈ کوئٹہ کے چنار کے درختوں کے کٹنے کا منظر ہو یا کسی کاریز کے سوکھنے کا سانحہ (''چشمہ کی موت'' ملاحظہ فرمائیے) اُن کے جذبات اور احساسات ایک ہی نہج پر اُبھرتے ہیں - وہ واقعات کی تہ میں پہنچ کر انسانی زندگی کا انجام دیکھ لیتے ہیں اور بے تکلفی کے انداز میں کہتے ہیں :

ضعیفی ہے مرگِ تمنا کی صورت
ازل سے یہ دنیا کا دستور دیکھا

جس طرح علامہ اقبال نے 'صقلیہ' کو دیکھ کر تاثر لیا تھا یا جس طرح خاقانی شروانی کی روح 'ایوانِ مدائن' کو دیکھ کر تڑپی تھی ، اسی طرح غور نے سبی میں جاکر اعظم کے پرانے تاریخی قلعے کی ویرانی سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی ہے بعنوان ''ایک ویرانے کا خطاب'' - آخری شعر ملاحظہ ہو :

دیکھ لے مجھ کو ، تری عبرت کا کاشانہ ہوں میں
بزم اُلفت کا نشاں ، ویران میخانہ ہوں میں

وہ صنائع بدائع اور ابہام سے اُلجھنے کی بجائے جذبے کی سچائی اور تخیل کی پُرکاری کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک نمائش گاہ کو دیکھ کر انتہائی سادگی کے ساتھ بچوں کی مانند ہر چیز کو خریدنے کے خواہش مند ہیں — مگر قیمت کہاں سے ادا کریں - آخری بند دیکھیے :

رنگ روپ کے پردوں میں
دنیا کے راز چھپائے
رنگ روپ کی صرف نمایش
دل کو کیا بہلائے
زہرہ جبینوں سی یہ دکانیں
اور دل ترسا جائے !

''ترسا جائے'' میں اُنھوں نے دل کی تمام اُمنگوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو انفرادی بھی ہیں ، اجتماعی بھی اور امارت پر طنز بھی ہے۔ وہ اس خطے کے مردِ قلندر یوسف علی خان عزیز مگسی کو بھی فراموش نہیں کرتے ۔ اُن کی زبان سے کہلوایا ہے :

وفور شوق میں اپنے قدم بڑھائے چلو
بڑھے چلو کہ بڑی دور ہے ابھی منزل

غور کو اپنے وطن کی عزت اور حرمت کا پورا پورا احساس ہے ۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ انسان کی آزادی کے بھی متمنی ہیں ۔ ''نگار آزادی''، ''اے وطن'' اور ''اے وادیٔ بولان'' نظمیں انھی جذبات کی مظہر ہیں ۔ غور کسی خاص اصول یا نظریے کا پرچار کرنے کے بجائے انسانیت کے آفاقی نظریے کا درس دیتے ہیں ۔ وہ عوامی شاعر ہیں اس لیے ان کے مخاطب انسان اور محض انسان ہیں ۔ وہ اپنے فن کے ذریعے عام لوگوں میں کردار کی بلندی اور ایسی خوبیوں کا دور دورہ چاہتے ہیں جو برائیوں سے پاک ہوں ۔ وہ خشک فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑتے بلکہ وہ ہمیں زندگی سے اُنسیت پیدا کرنا سکھاتے ہیں ۔ گھنگھور گھٹاؤں اور اتھاہ تاریکیوں میں محبت کی مشعل کو جلائے رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں :

ساری دنیا میں مہر و وفا کے لیے
ہم بھی زندہ رہیں ، تم بھی زندہ رہو

وہ اپنی بلند ہمتی کا اظہار یوں کرتے ہیں :

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکی
وہ اک چراغِ سرِ رہگذار ہم بھی ہیں

غم لاکھ سہی زیست کے اے غور مگر ہم
کب گردشِ حالات سے مغلوب ہوئے ہیں

ہمیں نے زیست کو ہر طرح تازگی بخشی
ہمارے حوصلے دنیا میں سود مند ہوئے

غور ایک چمکتی دمکتی صبح کے منتظر ہیں اور اس کا اظہار ''طلوع اُمید''، ''میں تمھارے لیے ہوں''، ''نگار صبح طرب''، ''اُٹھ ترے دور کا آغاز ہؤا'' اور ''مشورہ'' وغیرہ میں کرتے ہیں :

کلی کلی کو نہ ترسے گی اب فضائے چمن
ہم آج جھوم کے مثل سحاب اُٹھے ہیں

جعفر طاہر کا ذکر ''روابط'' میں ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے کوئٹے میں جو کنیٹوز لکھے وہ ملک کے مشہور پرچوں میں چھپے مثلاً ہمایوں، ماہ نو، ادب لطیف وغیرہ۔ اسی دور کی ایک غزل ہے جو ''نقوش'' کے غزل نمبر میں چھپی۔ آپ نے کوئٹہ میں جو غزلیں کہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

عرصۂ ظلمتِ حیات کٹے ہم نفس! مسکرا کہ رات کٹے
ثمر آرزو کا ذکر نہ چھیڑ چھونے پائے نہ تھے کہ ہات کٹے
کاش ہر زلف تیغ بن جائے کاش زنجیر حادثات کٹے
اے بقائے دوام کے مالک کس طرح عمر بے ثبات کٹے
آدمی جستجوئے راہ میں ہے تجھ کو ضد ہے رہِ نجات کٹے
شب خلوت سخن کی داد اور سر بزم بات بات کٹے

کوئٹے میں جناب جعفر طاہر کو اپنی شاعری کا میڈیم ملا۔ گویا کینٹوز اور کوئٹہ کی لفظی مناسبت آج بھی آپ کا سرمایۂ فن ہے۔ بعد میں ان کینٹوز میں بہت تبدیلیاں کی گئیں لیکن Pattern وہی رہا۔ آپ کی ڈکشن، نغمگی، بحروں کی دلآویزی اور تشبیہات و استعارات کی دلکشی وہی رہی جس کا شعور آپ کو پہلی بار اسی چمنستانِ رنگ و بو میں ہؤا تھا۔ ایک نو مشق شاعر کے پہلے کینٹو کی یہ لائنیں دیکھیے :

شبستانِ شاہنشہی کی شب آہنگ شمعوں کی روشن لویں کپکپائیں
در و بام پر طلعتیں جل بجھیں سونی سیجوں پہ شہزادیاں تلملائیں
نشوں میں لہکتی بہکتی ہوئی پرفشاں خوشبوؤں کے علم لڑکھڑائے
زمرّد کی زرکار مہتابیوں، شعلہ رخ شہ نشینوں کے دل ڈگمگائے
نہ وہ نقرئی بانہوں کے پھیلتے دائروں کی لپکتی لچکتی کمانیں
نہ وہ انگلیوں کے سَنَا برق نیزے، نہ وہ ناچتے ابروؤں کی سنانیں

وہ کافور نا ساختہ رنگ سینوں پہ لہراتی زلفوں کے سیلاب سہمے
وہ شنگرف رُو زانوؤں کی حنائی فصیلوں کے دامن میں مہتاب سہمے
نہ اب زرگر چرخ کے طشتِ دُر بار شب میں ستاروں کے موتی درخشاں
نہ وہ طمطراقِ نگارانِ گردوں نہ وہ کاروبار نگیں سائے گرداں
نہ زہرہ نگاہوں کے نغمے نہ وہ دید بانانِ عالم کی حیرت نگاہی
نہ وہ یک نشستانِ بزم مسرت نہ وہ راز دارانِ اسرار شاہی
وہ بکھرے ہوئے ڈھیر ہر سمت کمخواب و ابریشم و اطلس و پرنیاں کے
وہ خوابوں کے جھولوں میں سمٹے ہوئے جسم آہو نگاہانِ جادو بیاں کے
گماں ہو جیسے میں دیکھے کوئی ان حسینانِ نوخیز و نوخاستہ کو
کوئی دل شکستہ صنم گر جو اصنام زیبا سجا کر کہیں چل دیا ہو
نہ وہ ناچتی تتلیوں کے جواہر نگاریں پروں سے مزین قبائیں
نہ وہ چاند کی شوخ کرنوں کی مانند شانوں سے ڈھلتی پھسلتی ردائیں
نہ عشقِ ابد ماجرا کے فسانے نہ حسنِ برشتہ کی جادو نوائی
فقط اب سراسیمہ لہروں کے نوحے دھوئیں کی لکیروں کی ریزہ سرائی
وہ تیروں کے بستر پہ تابوت جاگے بپھرنے لگے سر بریدہ جنازے
کراں تا کراں گوش تا گوش گونجے گرفتہ دلوں کے پرانے تقاضے
پر اسرار غاروں عفونت بھری خندقوں نے اُگل دیں شہیدوں کی لاشیں
وہ نورانی جسموں پہ طوق و سلاسل کے ناپاک پنجوں کی نیلی خراشیں
وہ لہراتے محشر صفت زلزلوں کے علم، دندناتے دھندلکوں کے طوفاں
سمندر، زمیں، آسماں، عرش گہوارۂ گرد باد قیامت میں گرداں
گرانڈیل سایوں کے لانبے لبادوں میں لپٹی ہوئی مرمریں بارگاہیں
فتادہ سفیدار و سرو و صنوبر سیہ سوختہ سیم تن شاہراہیں
وہ سینوں کے سنسان ساحل پہ کتنی سیہ بختیوں کے گراں خواب سائے
دل آشوبیوں دشت پیمائیوں ہول انگیز ناکامیوں کے بنائے
نہ اب کوئی نوشابہ کج ادا و گل اندام سرمایۂ داستاں تھی
نہ سینے کے زخمے پہ تسکین کا ہاتھ باقی نہ سانسوں میں صہبا رواں تھی

پچھلے دنوں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کے مصنف

سی رچرڈ وی ویکس ہیں ۔ کتاب کا نام ''پاکستان ـــ گروتھ اینڈ برتھ آف اے نیشن'' ہے ۔ اس میں حفیظ ، جوش ، فیض ، راشد ، تبسم وغیرہ کے علاوہ جعفر طاہر کے متعلق لکھا ہے : ''جعفر طاہر ـــ اُردو ادب میں کینٹو کے نئے سٹائل کا موجد ـــ جو پُرشکوہ الفاظ و تراکیب بروئے کار لاتا ہے ۔''

علاوہ ازیں جعفر طاہر کے کینٹوز کو مولانا رشید احمد صدیقی نے بھی سراہا ہے ۔

جادو بیاں شاعر جعفر طاہر کی ان کامرانیوں میں ''وادیٔ شال'' کا بھی اہم حصہ ہے ۔ اس لیے کوئٹے کے ادبی حلقے فخر سے اپنا سر بلند کر سکتے ہیں ۔

سر زمین بلوچستان کا ایک فرزند ''سہیل بوستانی'' معاشرے کی دکھتی ہوئی رگوں پر گہری نظر ڈالنے کا عادی ہے ۔ اس کی ایک نظم ''بھکارن''[۱] ملاحظہ فرمائیے :

ترے ہونٹوں پہ یہ بے چین تبسم کیوں ہے ؟
کیوں یہ افسردگی چھائی ہے تری آنکھوں میں
تو چھپا لاکھ مگر آنکھ ہے غمّاز تری ! !
تیرے گرتے ہوئے آنسو ہی بتا دیتے ہیں
تیرے افسردہ خیالات ، یہ گم گشتہ خوشی
مجھ کو روداد ترے غم کی سنا دیتے ہیں
میں سمجھتا ہوں بھکارن ہے ، تو دکھیاری ہے
زندگی موت کے آغوش میں تو پاتی ہے
تری آہوں کے لپکتے ہوئے شعلوں میں مجھے
لاش جلتی ترے ارماں کی نظر آتی ہے

مستءِ توار (للکار) آزاد جمالدینی کا مختصر مجموعۂ کلام ہے جو بلوچی زبان میں ہے ۔ انجم قزلباش نے اُس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے ۔ بلوچی

۱ ۔ کلمۃ الحق ، سبّی ، آزادی نمبر ، ۱۴ اگست ۱۹۵۱ع ۔

متن اور اُردو ترجمہ ایک ساتھ چھپا ہے۔ اس کے ناشر ہیں انجم قزلباش منیجر ''بلوچستان پبلی کیشنز'' خوب چند روڈ کوئٹہ، قیمت آٹھ آنے، کل صفحات ۳۶ ——— یہ مجموعہ قریباً چودہ سال پہلے شائع ہؤا تھا۔

آزاد کی شاعری سادگی اور سچائی سے بھرپور ہے[1]۔ وہ ہلکی پھلکی بحروں اور عام فہم زبان میں اپنے ماحول کی نہایت چابک دستی سے عکاسی کرتا چلا جاتا ہے اور سچائی اور توانائی سے ایک ایسی منزل کا پتہ دیتا ہے جہاں دائمی اور عالمگیر محبت ہے۔

آزاد، تکنیک اور موضوع کی ہم آہنگی سے ایک ایسا گہرا تاثر پیدا کرتا ہے کہ شعر سننے والے کا دل اور دماغ متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ تشبیہوں اور استعاروں سے کم سے کم مدد لینے کے باوجود اپنے ضمیر کی آواز سے دوسروں کو متاثر کرنے کا ڈھنگ بخوبی جانتا ہے۔ ''ما امن لوٹان'' (ہم امن چاہتے ہیں) کا ایک بند دیکھیے:

خالق نگہوان	معبود نے بھی مقدس قرآن میں
امن آء بہ قرآن	امن کی بے انتہا تعریف کی ہے
چنکّس فراوان	اور اسی لیے ہم بلوچ بھی
تعریف کتہ جوان	جنگ سے نفرت کا اعلان کرتے ہیں
گُشتہ بلوچان	کیونکہ ہم انسان ہیں اور
لعنت بہ جنگ ءَ	
استن ما انسان ما امن لوٹان	دائمی امن کے خواہاں ہیں

غزلیہ اشعار کا نمونہ:

منی بانک! منی کیگد! منی ساہ
غم آء تاریک شپانی ماہ و ہمراہ!

(میری نازک اندام، پیاری محبوبہ! تو غم کی اندھیری راتوں میں

۱- امروز، لاہور، ۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء۔

چاند کی طرح میرے جیون میں اُجالا کرتی ہے) ۔

سنگتان اے وتی دیوان آء ِمروک ِء آچ َء
اُف کنت روک ِء کنت ِگس ِگس ِء حندان َء بروت

(ساتھیو ! اپنی محفل کی بجھی ہوئی شمع کو روشن کردو تاکہ اس کی روشنی مسکراتی ہوئی گھر گھر پہنچ سکے) ۔

نہ بیت معلوم وتی َاء قدر آزات
کہ آبریشم وتی ، دیم آء تہار انت

(آزاد کی قدر و منزلت کا اس کے اپنوں کو علم نہیں ہے ، جیسے ریشمی کپڑوں میں ملبوس شخص کو ریشم کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا) ۔

وادی بولان میں : (تفصیلی ذکر حصۂ نثر میں دیکھیے) ۔ یہ تیئیس منظومات ہیں جو ان شعرا سے متعلق ہیں : آغا صادق ، اختر واحد قاضی ، محشر سیوہاروی ، نسیم زیدی ، افضل کوٹلوی ، گلزار ، قمر ، جمیل بھٹی ، کوثر اعوان ، ابراہیم شفیق اور اسلم منہاس ۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے : [1]

آغا صادق

میں وہ شاعر ہوں جو بیدار ہے ، بیدار کرتا ہے
جو نیکی کا محافظ ہے ، بدی پر وار کرتا ہے
وہ شاعر ہوں جو امکانات ِ فردا کا اشارہ ہے
میں وہ شاعر ہوں کہ جس کو رفعتوں نے خود پکارا ہے
دماغی عیش جس کی شاعری پر چھا نہیں سکتا
ادب بہر ِ ادب کے پیچ و خم میں آ نہیں سکتا

کسی کو یاد کیا اور آنکھ بھر آئی
حسیں تھا جرم تمنا حسیں سزا پائی
یہ نکتہ شیخ و برہمن سمجھ نہیں سکتے
کہ دشمنی سے ہے نوع بشر کی رسوائی

۱- وادیٔ بولان میں ، صفحات ۹۹ تا ۱۲۸ ۔

جیا تو موت کی آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
مرا تو زندگیوں نے مری قسم کھائی

اختر واحد قاضی

کہیں مسکراتی ہیں بجلیاں تو کہیں شرر کی گرفت ہے
کہیں راہزن کا ہے ڈر ابھی کہیں راہبر کی گرفت ہے
مری بے رخی کی نہ بات کر تو فلک نشیں ہے میں در بہ در
ترے حسن پر، مرے عشق پر ابھی سیم و زر کی گرفت ہے

مجھ سے جدا ہے میرا سایہ چار طرف ہیں لاشیں بکھریں
یادوں کے کچھ ڈھیر لگا کر بیچ میں بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس سے کہوں اور کون سنے گا کوئی نہیں ہے میرا ساتھی

محشر سیوہاروی

ستاروں کی، نہ خورشید درخشاں کی ضرورت ہے
مقام رہبری کو پھر اک انساں کی ضرورت ہے

نسیم زیدی

ظاہری نظریں جسے کہتی ہیں موت
زندگی کا پُر سکوں انداز ہے

افضل کوٹلوی

دے رہا ہے آج ساقی جام بھر بھر کر اُنھیں
جن کی نظروں میں نہیں کچھ احترام میکدہ

اس پاک انجمن سے ابھی تک نہ مٹ سکی
تفریق خاص و عام، تعجب کی بات ہے

گلزار حسین گلزار

لوگ کہتے ہیں محبت کفر ہے
مدتوں پہلے تو یہ اسلام تھا

جمیل بھٹی

رہبروں کے میں نے کھائے ہیں فریب اتنے جمیل
ہر قدم پر اب گزرتا ہے گماں ، دھوکا ہؤا

لطیف کوثر اعوان

رہوں میں کس لیے ماضی کے غم میں مبتلا کوثر
مرے پیش نظر دنیائے مستقبل کی باتیں ہیں

افلاس کا اس دور میں یہ حال ہے کوثر
جیسے کوئی میخانے میں اک بوند کو ترسے

دھنک : مرتبہ مرکز ادب کوئٹہ ، طابع و ناشر قلات پبلشرز ، مستونگ ، سالِ اشاعت ۱۹۶۲ع ، ضخامت ۱۲۸ صفحات ، قیمت دو روپے -

یہ بلوچستان کے چند نغمہ طرازوں کے مختلف نوع کے نغموں کا مجموعہ ہے جس میں آغا صادق ، ارشد امروہوی اور اخگر سہارنپوری جیسے پختہ مشق فنکاروں کی تخلیقات بھی ہیں اور عین سلام ، رفیق راز ، افضل کوٹلوی ، شاداں امرتسری ، عطا شاد اور ضیارضوی جیسے نوجوانان آتش نفس شاعروں کے نغمات بھی - علاوہ ازیں اور بھی کئی ایک نغمے ہیں جن کے نغمہ طراز (فضا ، شفق ، ضیا ، جمیل ، اختر ، تمنا ، عابد ، ارشاد ، یونس) اپنے دھیمے دھیمے سروں میں کوئٹہ ، مستونگ اور مکران کے علاقوں میں اُردو کے نقیب بنے ہوئے ہیں -

گویا 'دھنک' بلوچستان کے اٹھارہ شاعروں کے کلام کے انتخاب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے - چند شاعروں کے کلام کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے :

آغا صادق : نظمِ آزادی کے کچھ اشعار :

آزادی اک بادل
اس بادل کو ہر کھیتی پر چھاجوں جل برسانے دو
آزادی اک پیڑ
پیڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں ، ہم سب کو سستانے دو
آزادی اک نغمہ
اس نغمے کی سریلی دھن پر سب کو ساز بجانے دو
آزادی اک نور
اس کی جوت سے ہر بستی میں امن کے دیپ جلانے دو
آزادی اک خواب
خواب کو ایک حقیقت کا اب روپ دھار کر آنے دو

غزلیہ اشعار

ہے تنگیٔ داماں بھی مجھ میں وسعت کا امکاں بھی مجھ میں
سمٹوں تو ذرہ بن جاؤں ، پھیلوں تو صحرا بن جاؤں

افسانہ بھی وہی ، ابھی کردار بھی وہی
بدلی ہے صرف سرخیٔ افسانہ دوستو

بہت ہیں گردش میں جام ساقی ، مگر یہ کیا اہتمام ساقی
جو تشنہ لب تھا وہ تشنہ لب ہے جو نیم جاں تھا وہ نیم جاں ہے

ارشد امروہوی : محمد صبغۃ اللہ صدیقی ، تخلص ارشد ۔ بلوچستان کے مشہور شاعر ۔ ۱۹۰۱ع میں امروہہ یو پی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۸ع میں کوئٹہ آئے ۔ اُس وقت سے اُردو ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں ۔ حضرت سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں ۔ آپ نے ہر صنف میں خامہ فرسائی کی ہے ۔ شعرا کی تربیت میں بھی اچھا خاصا حصہ لیا ہے ۔ فنِ تاریخ گوئی اور خوش نویسی میں بھی اُستاد ہیں ۔ غزلیہ اشعار :

کتنی صدیوں میں جنت بنی ہے زمیں
اس کے در پے ہے پھر فطرتِ جنگجو

اپنا چمن بہار کی حسرت میں رہ گیا
لاکھوں چمن بہار کے سانچے میں ڈھل گئے
کتنی طلوع ہو چکیں صبحیں خبر نہیں
ہم شام انتظار کے سانچے میں ڈھل گئے

ان سفینوں کو بھی آخر کچھ کہو
بڑھ کے طوفانوں سے جو ٹکرا گئے

عشق پھیلے تو حد کون و مکاں سے گزرے
اپنے مرکز پہ سمٹ جائے تو انساں ہو جائے

شگفتِ لالہ و گل ہے چمن لیکن
وہ کیا بہار جو دل کے کنول کھلا نہ سکے

اخگر سہارنپوری : حضرت احمد سہارنپوری کے شاگرد رشید ۔ نعتیہ اور تغزل دونوں رنگ خوب ہیں ۔ ترنم سونے پر سہاگہ ہے :

سینکڑوں ارماں ہزاروں حوصلے دیدار کے
میرے قلبِ مختصر میں جذب ہو کر رہ گئے

جو ہمت تری دستگیری کرے گی تو دم میں حوادث کا منہ پھیر دے گی
تری ڈولتی ناؤ زد میں ہے جس کی وہ طوفاں کناروں کا پیغام ہوگا

عین سلام کی ایک کامیاب نظم ''بلوچستان'' کے دو شعر :

کوہساروں کے یہ بلند انبار — ناتراشیدہ سے بتوں کے امین
کتنے مینار ، کتنے تاج محل — کروٹیں لے رہے ہیں زیر زمین

رفیق راز :

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یہاں تک ہے وہاں تک ہے
جہاں زندگی یارو ! قفس سے آشیاں تک ہے

تیرے غم کو لیے دار تک آ گیا
میں ترا ہی رہا میرے پیارے وطن

رقص تاریکیوں کا جاری ہے
کیا یہی صبح کی سواری ہے ؟

افضل کوٹلوی :

زندگی کا راستہ دشوار تر ہوتا رہا
اور مسافر عشق کا گرم سفر ہوتا رہا
داستانِ شام غم بڑھتی رہی بڑھتی رہی
قصۂ صبح مسرت مختصر ہوتا رہا

ادھر تو ابھی ظلمتِ شب ہے عام
سحر اس طرف ضو فگن ہی سہی

جس سے بیدار ہو روحِ انسان
ہوں اُسی شعر و ادب کی باتیں

شاداں امرتسری :

آدمیت کا بھرم رکھنے کو شاداں آج تک
ہم بہائے جا رہے ہیں اپنی شریانوں کا خون

ایک نظم 'سراب' کا آخری بند :

یوں ہی کب تک حقیقتوں سے مفر
دام تزویر کاش ٹوٹے بھی !
آدمی این و آں سے چھوٹے بھی !
دور کی جنتوں کی کس کو خبر ؟

ضیا رضوی :

ہم اپنا دل جلائیں چراغوں کے ساتھ ساتھ
یہ تیری انجمن کا پرانا اصول ہے

میں دستِ گل فروش پہ بیعت نہ کر سکا
شاید اسی لیے مرے دامن میں دھول ہے

انساں گزر رہا ہے خدا کے قریب سے
حسنِ بہشت و دانۂ گندم پہ ٹال دو

عطا شاد :

میں نے پوچھا کہ عطا دل کیا ہے
آپ کہتے ہیں پگھل کر دیکھو
غم کی منزل ہے، گزر جائے گی
دل کی راہیں تو بدل کر دیکھو

زندگی درد کی آغوش میں دم لیتی ہے
ہم اسے پیار کی لوری سے سلا دیتے ہیں
غم فراموشی کا وقفہ ہے خوشی بھی ہو کہ موت
ابتدا ہے جسے انجام سمجھ لیتے ہیں

بات ایسی تو نہیں ہے مگر اے جانِ وفا
کیا کروں، کچھ نہ کہوں یہ بھی مرے بس میں نہیں

فضا نہٹوروی :

آزاد کیا خود کو، زندان و سلاسل سے
ذہنوں کو غلامی سے آزاد نہیں کرتے

شفق سہارنپوری :

گلوں کے روئے شگفتہ سے صاف ظاہر ہے
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے
کسی کی یاد سے غفلت میں جو کٹے ہیں شفق
وہ لمحے زیست کے گزرے تو رائیگاں گزرے

جمیل بھٹی :

کون جانے کون دیوانے تھے وہ
زیست کے جو پیچ و خم سلجھا گئے
ظلمتِ ماحول کا عالم نہ پوچھ
چاند کتنے ہی یہاں گہنا گئے
موت کی راہوں پہ چل کر ہم جمیل
زندگی کی منزلوں تک آ گئے

سوال یہ ہے کہ ہنسنے پہ کیوں ہے پابندی
سوال یہ نہیں پھولوں کو کیوں ہنسی آئی

رہنما بھی رہزنوں سے کم نہ تھے قافلوں کو راہ میں بھٹکا گئے

عابد شاہ عابد کا خمیر بلوچستان کی مٹی سے اُٹھایا گیا ہے۔ وہ پاکیزہ اور بے داغ اُردو لکھتا ہے۔ اُسے فطری طور پر شعر سے لگاؤ ہے :

خرابِ دشتِ جنوں ہو گئے مگر عابد
نگاہِ اہلِ زمانہ میں خار ہیں ہم لوگ

گر تمھیں خوشنودیٔ صیاد کا احساس ہے
نو گرفتار و قفس کو آشیاں کہتے رہو

۱۸۷۵ع میں ایک انگریز پولٹیکل افسر مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز، آئی سی ایس، ایم آر اے، ایس (لندن) نے جو ڈیرہ جات، سبی اور دیگر بلوچی علاقوں میں تعینات تھے، بلوچوں اور ان کی زبان سے دلچسپی پیدا کی۔ جس کے نتیجے میں اُنھوں نے اپنی ملازمت کے دوران (۱۸۷۵ع - ۱۸۹۶ع) مختلف بلوچ معتبروں، شاعروں اور گویّوں سے بلوچی کی قدیم اور مروجہ نظمیں سن سن کر رومن رسم الخط میں نقل کرنی شروع کیں۔ یہ اشعار انھوں نے صرف اُن علاقوں سے یکجا کیے جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں پہنچے تھے۔ وہ مکران، خاران اور ایرانی بلوچستان نہ جا سکے، ویسے وہاں

بھی قدیم بلوچی اشعار دستیاب ہو سکتے تھے۔

مسٹر ڈیمز نے ۱۹۰۷ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کے ذریعے سے یہ مجموعہ بعنوان ''پاپولر پوئٹری آف بلوچیز'' انگریزی ترجمے کے ہمراہ شائع کرایا۔ ایک ہزار نسخے طبع ہوئے۔ دوبارہ اشاعت کا بندوبست نہ ہؤا، جس کے نتیجے میں یہ کتاب نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی سوائے بڑے بڑے کتب خانوں کے نایاب ہے۔

مسٹر ڈیمز کی اس سی سالہ محنت کا اندازہ بلوچی زبان کو جاننے والے یا اس زبان کے عالم ہی کر سکتے ہیں۔ اس خدمت کا صلہ شاید ہی کبھی دیا جا سکے۔

میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ بی اے، ایل ایل بی بیرسٹر ایٹ لاء نے اس نایاب کتاب کا بعنوان ''قدیم بلوچی شاعری'' (۱۳۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک) اُردو میں ترجمہ کیا ہے جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کی اجازت سے بزم ثقافت کوئٹہ نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ ضخامت ۳۹۷ صفحات (بڑی تقطیع)، قیمت بارہ روپے۔ پیش لفظ کے جی علی صدر بزم ثقافت کوئٹہ و ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے تحریر کیا ہے۔

اس کا مقصد بیان کرتے ہوئے مؤلف و مترجم نے لکھا ہے:

''میں نے بلوچی شاعری کا اُردو ترجمہ کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ صحیح پاکستانی بننے کے لیے ملک کی مختلف زبانوں اور ان کے بولنے والوں کے رہن سہن سے واقف ہونا ہمارے لیے ضروری ہے اور ہر زبان کو حق حاصل ہے کہ وہ زندہ رہے اور اس کے بولنے والوں کے رہن سہن اور رسم و رواج سے، جسے ہم ثقافت کا نام دیتے ہیں، مل جل کر پاکستانی ثقافت کا تانا بانا تیار ہو۔ اس کا اجارہ دار صرف ایک شخص، صوبہ یا زبان نہیں ہو سکتا، اور نہ ہونا چاہیے، لہٰذا اُردو ترجمہ اُردو جاننے والوں کو بلوچی زبان اور بلوچوں کے طور و اطوار سے کسی قدر واقف کرے گا اور نتیجۃً یہ ایک دوسرے کو اور قریب محسوس کریں گے جو بذات خود

ایک اہم قومی خدمت ہے۔"[۱]

میر خدا بخش نے "قدیم بلوچی شاعری" میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل کی ہیں جو ڈیمز کی دسترس سے باہر تھیں یا رہیں۔ ترجمہ سیدھا سادا اور عام فہم ہے! نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مختصر ترین بحر کی نظم کا ابتدائی حصہ پیش کرتا ہوں:

گوشیت کہنگراں	سنو اے میرے رفیقو!
بیلو کین نہ غاں	کینہ اور بغض چھوڑ دو
شاہی ، استّبلاں	اے میرے امیر دوستو!
گوز دار ، گپتاراں	سنو میری بات کو
شیئر ، د پتراں	سنو شاعر کے شعر کو
لال او ریتھ غاں	جو موتی جڑتا ہے
گال او گوشتہ غاں	جو غزلیں کہتا ہے

(میر خدا بخش مری ، صفحہ ۱۸۱)

میر بکر ولد میر گوہرام لاشاری جنگ ِ سی سالہ کے کافی بعد اپنے برباد شدہ لاشارستان کو دیکھتا ہے تو بے اختیار چیخ اُٹھتا ہے:

دوراں بلوچ دھلیں تھ غاں	افسوس بلوچ خوشحالی اور آسائش نہ سہ سکے
چاکرو گوہرام بیرو تھاں	غرور و تکبر میں چاکر و گہرام ٹکرائے
ہوتاں پرے لاف سیرے ہا	دولت و قوت کے خمار میں ان بہادروں نے جنگ مول لی
بیل گوں ہروں نادا تھ غاں	اور ہاتھیوں کے پیروں تلے روندے گئے

(میر خدا بخش مری ، صفحہ ۹۷)

۱- قدیم بلوچی شاعری ، صفحہ ۱۲ -

سرمست بلوچستان : مصنفہ ذکیہ سردار بلوچ ، تابع و ناشر بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۔ سال اشاعت ۱۹۶۵ء ، قیمت چھ روپے ، ضخامت ۲۵۱ صفحات ۔ سرورق خیال آفریں ۔

یہ کتاب چار ابواب (باب اول : بلوچ قوم ، اس کے خصائل اور رسمیں ۔ باب دوم : سوانح حیات حضرت طوق علی مست ۔ باب سوم : حضرت مست کی کراسات و شاعری ۔ باب چہارم : مجموعہ کلام حضرت مست) پر مبنی ہے ۔ مست توکلی اُنیسویں صدی کے عظیم ترین بلوچی شاعر و صوفی تھے ۔ یہ کتاب اُن کے حالات زندگی اور کلام پر مشتمل ہے ۔ مصنفہ کی زبان اور انداز بیان دونوں مؤثر ہیں ۔ آپ لکھتی[1] ہیں :

"حضرت طوق علی مست در اصل عاشق حقیقی تھے ۔ سمو سے ان کا عشق تو محض ایک زینہ تھا جس نے حُسن کامل یعنی شاہد حقیقی کی طرف آپ کو متوجہ کیا ۔ اس لیے آپ کا عشق بھی کامل تھا اور ہوا و ہوس سے پاک ، نہایت قوی اور مشتعل تھا ۔ اس‌لیے آپ کے کلام میں شیفتگی ، وفا شعاری ، جان نثاری و جان بازی ، واقعیت اصلیت اور جوش و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ آپ کو اپنی قوم و وطن و سر زمیں سے بھی والہانہ محبت تھی ۔ آپ اپنے سنگلاخ پہاڑوں سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی سعدی اور حافظ نے شیراز اور ایران کے سبزہ زاروں سے کی ہے ۔ آپ نے اپنے ماحول سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے" ۔

مست توکلی کے کلام کا نمونہ دیکھیے ۔ وہ اپنی محبوبہ سمبو کی زلفوں کی تعریف یوں کرتے ہیں :

ژ منب ژ لنتھی زا مُری چھیڑاں

ترجمہ : اُس کی گندھی ہوئی چوٹیاں زامر کی طرح لٹک رہی ہیں ۔ (زامر ایک جنگلی پودا ہے جو پہاڑوں کی ڈھلوان میں اُگتا ہے ۔ اُس کی

۱۔ سرمست بلوچستان ، صفحہ ۱۰۰ ۔

نرم و نازک شاخیں گھوڑے کی دُم کی طرح نیچے لٹکتی رہتی ہیں ، اس لیے
زلفوں کو زامر سے تشبیہ دی ہے) -
معشوق کی رفتار کی بابت فرماتے ہیں :

سمو ءِ لوڈگونین گون کہنی د کونتراں

ترجمہ : کبوتروں نے سمو کی چال اپنائی ہے -
انتہائے شوق میں حسرت سے کہتے ہیں :

سمو تھئی لوڈانی بلہ زیراں

ترجمہ : سمو ! میں تیری اس متوالی چال کے قربان جاؤں اور تیری
بلائیں لے لوں -
وہ اپنی محبت کا اظہار ایک عجیب انداز سے کرتے ہیں :

دوست لونگ ٹاری ءِ رستہ ماں ارغونی گراں
لیٹروے باں سمو تھئی سر جیزاں چھراں

ترجمہ : دوست میرا لونگ کی ٹہنی ہے - سرد و بلند سایہ دار چٹانوں
کے سایے میں پرورش پائی ہے -
کاش میں اونٹ ہوتا اور سمو کی دور دراز کی قیام گاہوں اور چراگاہوں
میں گھومتا پھرتا -
سمو کی تعریف میں ارشاد ہوتا ہے :

دوست منی وٹی شہد شیرانی
دوست منی روشنائی تہا رانی

ترجمہ : دوست میرا دودھ اور شہد کا پیالہ ہے ، دوست میرا اندھیروں
کے لیے اُجالا ہے -
سمو کی نازک اندامی سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں :

دوست منی سکھیں خذمتاں لوٹھی
چیٹھ لوٹھی چھوں تھنگچھی میں ُچھکاں
سانبھ لوٹھی چھوں گھر غیں بہاناں

ترجمہ : میرا دوست حد درجہ خدمت چاہتا ہے ، اس کو ایسی پرورش
کی ضرورت ہے جیسے نوزائیدہ بچے کو چاہیے - وہ ایسی پرداخت چاہتا ہے

جیسے کہ گھوڑے[1] کے بچے کو ضرورت ہوتی ہے۔
ایک مقام پر مست تو کلی دوسرے شعرا کا ذکر کر کے اپنے بارے میں کہتے ہیں۔ اُردو میں ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :

شعر وہ ہیں جو سخی بیورغ نے کہے ہیں
قول وہ ہیں جو جام عمر نے کہے ہیں
سخاوت وہ ہے جو زر زوال (نوز بندغ) نے کی ہے
عشق وہ ہے جو لیلٰی مجنوں نے کیا ہے
میرے شعر حقیقت اور صداقت پر مبنی ہیں

عطا شاد کا مقام پیدائش سنگانی سر۔ تربت (مکران) سنہ پیدائش ۱۹۳۸ع ، تعلیم بی اے ہے۔ آپ ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں پروگرام پروڈیوسر ہیں۔ شوق شاعری سکول کے زمانے سے ہے۔ چھٹی جماعت میں ایک دعائیہ نظم لکھی۔ تربت ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ثروت حسین نے حوصلہ افزائی کی ، پھر ایک غزل لکھی۔ ثروت صاحب نے عبدالباقی بلوچ (جو اُن دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے) کی موجودگی میں عطا شاد سے وہ غزل پڑھوائی۔ انھوں نے بھی حوصلہ افزائی کی اور شوق کو جاری رکھنے کے لیے کہا۔

آپ نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں بھی تعلیم حاصل کی۔ کالج میگزین ''بولان'' (حصۂ اُردو) کے تین سال تک ایڈیٹر رہے۔ حلقۂ تحریر و تنقید اور مرکز ادب کے جلسوں میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ کالج میں ''اُردو کا بہترین

۱- بلوچ قوم کے افراد گھوڑوں کے بہت شوقین ہیں اور نہایت کوشش سے انھیں پالتے ہیں۔ گھوڑے کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کی پرورش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ نرم گھاس اور مکھن میں شہد ملا کر کھلاتے ہیں۔ اُس کے پاؤں کے نیچے ریت بچھاتے ہیں تاکہ نازک سم زخمی نہ ہوں اور اُسے تکلیف نہ پہنچے۔ اس لیے حضرت مست نے گھوڑے کے بچے جیسی پرورش کی تشبیہ دی ہے۔ (سر مست ِ بلوچستان ، صفحہ ۱۰۸)۔

شاعر'' کا انعام بھی پایا ۔ آپ کا اُردو کلام 'افکار' اور 'نئی قدریں' وغیرہ میں شائع ہوتا ہے۔ ''بلوچی نامہ'' مرکزی اُردو بورڈ ، لاہور کے لیے تیار کیا ہے جو منظر عام پر آ چکا ہے ۔ بلوچ نظموں کا منظوم اُردو ترجمہ ''چاند ہالے میں ہے'' اشاعت کا منتظر ہے ۔

عطا شاد کے متعلق ''دھنک'' میں کیا صحیح رائے درج کی گئی ہے :

''کوئی کیسے باور کرے کہ کوثر میں دُھلی ہوئی اُردو لکھنے اور بولنے والا یہ نوجوان خطۂ مکران کی پیدا وار ہے ۔ عطا شاد شعر پڑھتا ہے تو اُس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں ۔ شعریت اور لطافت خود اُٹھ اُٹھ کر اس کا منہ چوم لیتی ہے ۔ عطا شاد ریڈیو پاکستان کوئٹہ ہی کا سرمایہ نہیں بلکہ بلوچستان کے تمام ادبی حلقوں کی امانت ہے ۔ طبع زاد اشعار کے علاوہ اُردو شعر کو بلوچی کے قالب میں ڈھالنا اور بلوچی نوادر ادب کی قلبِ ماہیت کر کے اُردو کا لباس پہنا دینا ، اور اس طرح کہ کہیں جوڑ نہ کھلے ، عطا شاد کی خدا داد ذہانت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔''[1]

عطا شاد نے عین سلام کے اشتراک سے ''بلوچی لوک گیت'' کا منظوم اُردو ترجمہ کیا ہے جسے زمرد حسین بھٹہ (قلات پبلیشرز ، مستونگ) نے ۱۹۶۵ء میں قلات پریس مستونگ سے ٹائپ میں چھاپا ۔ سرورق حنیف راسے صاحب نے تیار کیا ۔ ضخامت ۱۴۱ صفحات ، قیمت ساڑھے چار روپے۔ یہ مجموعہ جاذب توجہ ہے ۔

مترجمین نے کوشش کی ہے کہ ترجمے کی ہیئتی حیثیت وہی رہے جو اصل گیت کی ہے ۔ اسی کے باعث ان ترجموں میں بلوچی بحروں کے علاوہ کہیں کہیں بلوچی الفاظ اور ترکیبیں بھی ملتی ہیں ۔ بلوچی لفظوں اور ترکیبوں کا دانستہ استعمال صرف ایک تجربے کی خاطر کیا گیا ہے اور اس کا مقصد محض اُردو زبان و ادب کی ترویجی افادیت ہے ۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ اس کوشش میں گیت کی معنوی حیثیت اُلٹ پلٹ نہ

۱۔ دھنک ، مستونگ ، ۱۹۶۲ء ، صفحہ ۸۷ ۔

ہونے پائے اور معنویت و تاثر کو قائم رکھنے کے لیے کہیں کہیں گیتوں کی اصل ہئیت سے تفاوت بھی ملتا ہے۔ بسا اوقات ایک ہی گیت کے روایتی لہجوں اور تلفظات میں فرق نظر آتا ہے۔ وہاں مترجمین نے وہی وزن اپنایا ہے جس سے گیت کی مجموعی اثر آفرینی، ہم آہنگی اور ربط قائم رہ سکتا تھا۔

بلوچی لوک گیتوں کی ایک بڑی خوبی ان کی دھن یا گت ہے۔ کوئی گیت جو معنوی لحاظ سے کسی ایک صنف سے تعلق رکھتا ہے، گت یا مخصوص طرز آہنگ اسے کسی دوسری صنف میں پسندیدہ بنا دیتا ہے۔ مترجمین نے لوگ گیت کے اس عوامی معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے گیتوں کی صنف بندی کے وقت گت یا طرز موسیقیت کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

گیارہ صنفوں کے گیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

سوت: بلوچی لوک گیتوں کی مقبول ترین صنف ہے جو بلوچستان کے کم و بیش سبھی علاقوں میں مستعمل ہے۔ اس میں مسرت و بہجت کے جذبات کے علاوہ کبھی کبھی جدائی اور غم کے مرقعے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

اوستارہ سری[1]:

مار ڈالے گی یہ خوش خرامی تری
مست رفتار ہے جیسے کبک دری

اوستارہ سری

تیرا رنگین ملبوس، کشکو گوری[2]
تو چمکتے ہوئے چاند کی ہے پری

او ستارہ سری

۱- اے سلمہ ستاروں سے مزین دوپٹے والی۔
۲- ایک خاص بلوچی کشیدہ لباس پہننے والی۔

آیار زباد[1] افشاں :

تو زیب خراساں ہے
اس ہجر سے موت آساں
آیار زباد افشاں

کوہ و دمن بھی کرتے ہیں تیرا ہی انتظار
تو کھو گئی کہاں مری روٹھی ہوئی بہار
ہیں بلبلیں بھی نالہ کناں اے گل وفا
کیا ہے مری خطا

ہالو : شادی بیاہ کے موقعوں پر گایا جاتا ہے ۔ اس کی خصوصیت ''ہالو ہلو'' کی لگاتار تکرار ہے ۔ اس کا رواج مغربی اور وسطی بلوچستان میں عام ہے ۔ مثال :

اس چاند سی بنّو پہ میری زندگی قربان ہے
دیکھو تو کاجل کو بھی ان آنکھوں پہ کتنا مان ہے
ہالو ہلو ہالو ہلو ہالو ہلو ہالو ہلو[2]
ہلو ہالو خوشی کے گیت گاؤ
مناؤ جشن ناچو گن گناؤ
ہلو ہالو بنا ہے میر[3] دولہا

سپت : لفظ صفت سے اثر پذیر ہے ۔ یہ عام طور پر حمدیہ ، نعتیہ اور مناقب سے متعلق مضامین پر مبنی ہوتا ہے ۔ اسے بچے کی پیدائش پر کئی راتوں تک زچہ کی خاطر گاتے ہیں ۔ ضلع مکران کا یہ مرغوب لوک گیت عموماً ایک یا دو شعروں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ جیسے :

فرد : پھول سا بچہ مرا پاسباں اُس کا خدا

۱- زباد : ایک خوشبو ۔
۲- مہمل الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں ۔
۳- دولہا کا فرضی نام ۔

کورس : پاسباں اُس کا خدا اس پہ ہو ظل الہ

لولی : (لوری) میں عام طور پر بہادرانہ اور شجاعانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے ۔ ایک بند دیکھیے !

مرے لال :
منے !
اگر جنگ میں تو بھی کام آ گیا
میں دلھن کی طرح سج کے ہالو ترے نام پر گاؤں گی
ایک تجھ سا جیالا سپوت اور دوں گی جنم
(مجھ کو موتک[1] سے کیا واسطہ)
اے مرے لاڈلے
میرے دل کے سہارے
نظر کے اُجالے
مرے چاند منے

موتک کا ایک بند یہ ہے :

میں جو زندہ ہوں تو موت اس کو نہیں آ سکتی
ہاں اسے موت نہیں آ سکتی
نئے تحفے ، نئے جوڑے لے کر
اک دن آئے گا ضرور آئے گا

عین سلام کوئٹہ قلات ریجن کا ایک معروف نوجوان سخن ور ہے ۔ ”چکیدہ“ آپ کا تخلیقی شاہکار ہے جو متعدد جدید نظموں اور چند غزلوں پر مشتمل ہے ۔ عنوان کی مناسبت غالب کے اس شعر سے ہے :

ہوں درد مند ، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ ، گہ اشک چکیدہ ہوں

سال اشاعت ۱۹۶۶ء ، ضخامت ۱۴۹ صفحات ، قیمت پانچ روپے ، ناشر زمرد حسین بھٹہ ، قلات پبلیشرز مستونگ ، مطبوعہ قلات پریس مستونگ ۔

۱۔ موت کے سوگ میں گایا جانے والا گیت ۔

ٹائپ میں شائع ہؤا ہے ، سر ورق معنی خیز ہے ۔

عین سلام کی یہ نظمیں (''بے ہنر نیکی کا کرب'' ''ایک لڑکی'' ''انتظار'' ''رات کی سازش'' وغیرہ) اُن کی تخلیقی شاہکار سمجھی جا سکتی ہیں ۔ یہ جدید شاعری کے اُس گروہ کی غمازی کرتی ہیں جو ندیم ، ظہیر ، فیض ، ابن انشا اور احمد راہی وغیرہ سے عبارت ہے ۔ اُن میں وہی باتیں ہیں جو جدید شاعری کا خاصہ ہیں ۔ جدید شاعری سماجی ماحول کا بڑھتا ہؤا شعور اور عام طور پر بدلتے ہوے انسانی اقدار کا ادراک ہے ۔

عین سلام شعریت کے ملکہ سے بخوبی واقف ہیں ، متنوع موضوعات پر قلم اُٹھانا جانتے ہیں ، ماحول کی ترجمانی اُن کا شیوہ ہے ۔ وہ نباض ہی نہیں مرض کی علامات بھی بیان کرتے ہیں ۔ وہ پختہ ذہن کے مالک ہیں ۔ اگرچہ وہ جدید نظم کے شاعر ہیں مگر ان کا طرز فکر مغربی نہیں مشرقی ہے ۔ ان کی قدریں مشرقی اور ماحول اپنا ہے ، پرایا نہیں ۔ وہ ایلیئٹ وغیرہ کے نقال نہیں ، اپنے احساسات اور تاثرات کے شاعر ہیں ۔

یہی حال اُن کی غزل کا ہے ۔ وہ غزل کی بوقلمونیوں اور عطر بیزیوں سے قاری کے مشام جان کو معطر بناتے اور فرحت بخشتے ہیں ۔ ان کا غم ایک شخص کا ذاتی غم ہے ۔ ان کی غزلوں سے ان کے ناتمام عشق کی بو خو آتی ہے ۔ وہ روایت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ علاج غم کے لیے ساقی کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں ۔ بعض اوقات وہ غیر مانوس الفاظ بھی غزل میں سلیقے سے نباہ جاتے ہیں ۔ غزل کے شعروں میں ردیف اور قافیے کی بندش کا یہ حال ہے کہ سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں بھی قافیے نکالنے کی دھن سر پر سوار ہے ۔ مثلاً مذاق کے وزن میں طاق ، واق ، راق اور حاق کے قافیے نکالے گئے ہیں ۔ (چکیدہ ، صفحہ ۱۰۵) جو اُن کے اپنے ماحول میں بولی جانے والی دوسری زبانوں کا پرتو لیے ہوئے ہیں ۔

عین سلام کی بیشتر غزلوں میں وحدت پائی جاتی ہے ، مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے :

کتنا ہشیار ہؤا ، کتنا وہ فرزانہ ہؤا
تیری مستی بھری آنکھوں کا جو دیوانہ ہؤا (صفحہ ۱۰۹)

اس غزل میں وحدت تاثر بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ اس قسم کی اور بھی چند ایک غزلیں 'چکیدہ' میں موجود ہیں ۔

سلام کے اکثر اشعار تغزل کا بھرپور مظہر ہیں ۔ چند صاف ستھرے شعر ملاحظہ فرمائیے :

رات دن اس طرح گزرتے ہیں
ہم نہ جیتے ہیں ، اور نہ مرتے ہیں

آپ کو دیکھ کر یہ سوچتا ہوں
آسماں سے بھی لوگ اُترتے ہیں

جو اپنے دل سے تھے مجبور ہو گئے منصور
اگرچہ مصلحتوں نے ہزار سمجھایا

ہم وہ رخسار وہ لب بھول گئے
زندگی کرنے کا ڈھب بھول گئے

رات دن محو رہا کرتے تھے
جانے کیا تھی وہ طلب بھول گئے

آنکھ کا پانی کب سوکھا ہے
یہ پتھر دم تک ہیں گیلے

آپ سے مل کر سلام
بڑھ گئی کچھ بے کلی

بھلانا چاہا تھا مرحوم آرزوؤں کو
جو چھڑا ساز تو نکلی صدائے واویلا

دل کو راس آئیں تو پھول ، نہیں تو پتھر
اپنوں کی ہوں یا ہوں بیگانوں کی باتیں

اب کہاں عہد وفا کی پاسداری ، اب کہاں
جو حقائق تھے وہ افسانوں میں ڈھل کر رہ گئے

مری حیات کی تاریکیاں سمٹ نہ سکیں
بجا کہ ماہ ہوئے آپ ، آفتاب ہوئے

یہ غزل بے نظیر ہے :

تہِ داماں چراغ روشن ہے
زیست میری بقا کا بچپن ہے
شکوۂ ظلم و جور کس سے کریں
آدمی آدمی کا دشمن ہے
ایک الاؤ ہے یہ دہکتا ہؤا
تمھیں جس پر گمان گلشن ہے
پھنک رہا ہے چمن چمن لیکن
آپ فرمارہے ہیں ساون ہے
کون ہستی کے سلسلے کو بجھائے
ایک سے ایک دیپ روشن ہے
زندگی سے کہاں فرار ، سلام !
سینۂ مرگ میں بھی دھڑکن ہے

اس خیال میں سلام ساحر اور فیض سے متاثر نظر آتے ہیں :

کم نہ ہوئے دنیا کے دھندے
گو اکثر تیری یاد آئی

غم دوراں کا ہو بُرا ورنہ
آپ کی یاد کب نہیں دل میں

یہاں وہ احسان دانش اور صوفی تبسم سے قریب ہیں :

اپنی وسعت میں کھو گئے ہوں گے
تیرے آشفتہ سر اگر چپ ہیں
آمد انقلاب ـــــ کیا کہیے
چپ ہیں افلاک ، بام و در چپ ہیں

جدید نظم سے چند بند ملاحظہ ہوں :

بے ہنر نیکی کا کرب

اس زمین و آسماں کے درمیاں
زندگی کی گرم بازاری میں
ہم سب ہیں خسارے کی متاع نفع اندوز
احتیاط خود فریبی سے دکانوں کو سجائے
مطمئن خوش فہمیوں کے کرب سے
گھات میں بیٹھے ہیں گاہک کی
مگر گاہک کہاں

نظم ''میں'' پوری یہ رہی :

کبھی اپنی صورت جو آئینے میں دیکھتا ہوں
تو یہ سوچتا ہوں
کہ میں وہ نہیں ہوں
جو میں ہوں

''طلسم آئینہ خانہ'' کا ایک بند :

کوئی بتائے
کہ کوئی ایسے میں جائے بھی تو کہاں
پریشاں ہوں کہ اک تند و تیز طوفاں میں گھر گیا ہوں
مگر مرا دامن دریدہ ابھی تلک خشک ہے
میں حیران ہوں

''ایک منظر دو تاثر'' کا پہلا بند :

چودھویں شب کو صبح سے کچھ قبل
چاند کی شکل یوں نکھرتی ہے
خواب میں جیسے کوئی دوشیزہ
آئینہ دیکھ کر سنورتی ہے

''محرومی کا فیضان'' :

اپنی محرومی کا فیضان نہ پوچھ !
جو بھی صورت ہے بھلی لگتی ہے
تیری ہم شکل ہے ہر شکل یہاں
ہر گلی تیری گلی لگتی ہے

آج زندگی کی موجودہ برق رفتاری سے انسان پریشان ہے ۔ انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ وہ اسلاف کے مقابلے میں خوش حال ہے مگر وہ مطمئن نہیں ۔ زمانے کی یہ تیز رفتاری انسانی پریشانیوں اور گوناگوں اضطراب کا مظہر ہے ۔ یہ نظم انھیں خیالات سے عبارت ہے :

رفتار زمانہ برق آسا
اور اک دنیا ہے عجلت میں
. . . .
جس کو دیکھو بھنایا ہؤا
جس کو دیکھو اُکتایا ہؤا

عین سلام اپنے خیالات کو شعر میں ڈھالنے کی خاصی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجربات و مشاہدات غزل اور نظم کے اشعار میں بلا تکلف ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں ۔ مجموعی طور پر شاعرِ موصوف کی یہ تخلیقی کوشش حوصلہ افزا ہے ۔

ان کی نظموں کا ایک اور مجموعہ ''برفاگ'' زیر طبع ہے ۔ توقع ہے موصوف کی یہ کوشش بھی معنی خیز ہوگی ۔

ثریا فخری علامہ حاجی احمد فخری کی صاحبزادی ہیں ۔ علامہ فخری (۱۸ اگست ۱۸۹۰ء—۲۲ دسمبر ۱۹۶۵ء) نے مولانا حالی سے کسب فیض کیا تھا اور اُن کی تربیت مولانا وحید الدین سلیم کے زیر سایہ ہوئی تھی ۔ علامہ دنیائے ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے ۔ خاص طور پر بقول بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم جتنی غائر نظر اصول تراجم پر علامہ فخری نے ڈالی تھی کسی نے نہیں ڈالی ۔ آپ نے متعدد اہم کتابوں (آکسفورڈ ڈکشنری ، دولت اقوام ، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام وغیرہ) کے

ترجمے کیے۔ آپ کی چند اور کتابیں بھی موجود ہیں۔ وہ ایک گوشہ نشین بزرگ تھے۔ ان کا قول تھا:

ناکامی جاوید بصد شوق گوارا　　گردن در باطل پہ جھکائی نہیں جاتی

ایسے ماحول میں ثریا فخری کو ذوق شعر و ادب وراثت میں ملا۔ اُنھوں نے ۱۹۴۷ع میں اس وقت شعر کہنے شروع کیے جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ ۱۹۵۵ع میں آپ لیکچرر ہو کر کوئٹہ آئیں اور قریباً دس سال تک یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیتی رہیں اور مختلف ادبی اور سماجی انجمنوں کی عہدے دار بھی رہیں۔ کوئٹہ کے اخبارات میں آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ کوئٹہ کے مشاعروں میں لوگ آپ کا کلام سنتے اور پسند کرتے رہے۔ کوئٹہ میں ریڈیو سٹیشن کے قیام کے بعد آپ کی ادبی سرگرمیوں کا حلقہ اور وسیع ہو گیا۔ آپ نے گرلز کالج میں مجلس فارسی کے باقاعدہ اجلاس منعقد کرائے۔

ثریا فخری کو کوئٹہ بہت پسند ہے، شاید اس لیے کہ بہت پرسکون ہے۔ یہاں رہ کر انسان شعر و ادب کی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ پھر اس کے قدرتی مناظر ان کی حساس طبیعت کو بہت راس آئے۔ آنھوں نے جب پہاڑوں پر چاندنی کی چادر بکھری ہوئی دیکھی تو بے ساختہ پکار اُٹھیں:

یہ پہاڑوں پہ پھیلی ہوئی چاندنی
کان میں جانے چپکے سے کیا کہہ گئی
جھنجھنانے لگے آرزؤں کے تار
بج اٹھا میرے من کا سریلا ستار
یہ روپہلے اجالے کی ہلکی پھوار
رات کی سانولی۔سی دلھن کا سنگار
یہ پہاڑوں پہ پھیلی ہوئی چاندنی
کان میں جانے چپکے سے کیا کہہ گئی

اور پھر چاند سے یوں ہم کلام ہوتی ہیں:

اے ماہتاب! کیا ترے پہلو میں دل نہیں؟
کیوں میرے حال زار پہ ہوتا نہیں غمیں

تجھ کو تو یاد ہوگی ابھی داستان دوش
تونے تو اس کے قول سنے تھے بگوش ہوش
میں غم سے جل رہی ہوں تجھے کچھ خبر نہیں
تغییر روزگار کا تجھ پر اثر نہیں

اور پھر چاند ہوا کے جھونکوں اور بادلوں کی روانی میں ان کو بے قرار سا نظر آتا ہے:

یہ پہاڑوں پہ پھیلی ہوئی چاندنی
کانپتی ، کپکپاتی ، لرزتی ہوئی
میرے جذبات کی طرح سے بے قرار
اپنے دامن میں تارے سمیٹے ہوئے
جس طرح میری آنکھوں میں اشکوں کے تار
کانپتی ، کپکپاتی ، لرزتی ، ہوئی
یہ پہاڑوں پہ پھیلی ہوئی چاندنی

اور پھر ان کو چاند میں اور خود میں مماثلت نظر آتی ہے:

چاند کیا میری طرح سے تو بھی
ہے رہِ زندگی میں آوارہ
کشتۂ گردشِ مسلسل ہے
غم زدہ ، بدنصیب ، آوارہ
بارگاہ فلک میں تجھ کو بھی
جرأت پیش و پس نہیں ہوتی
راحت جاوداں تو کیا شے ہے
فرصت یک نفس نہیں ہوتی
کیا ترا دل بھی میرے دل کی طرح
رنج و آلام کا دفینہ ہے
ہے شکایت سے سر بسر معمور
شکوۂ جور کا خزینہ ہے
کیا مری طرح تو بھی اے مہتاب
اپنی محرومیوں سے ہے با ہوش
کیا مری طرح تجھ کو بھی ہے یہ حکم
دکھ اُٹھاؤ مگر رہو خاموش

ثریا فخری کی غزلیں ریڈیو پاکستان سے بھی گائی جاتی ہیں - یہاں چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں - اکثر یہ کوئٹہ میں لوگوں نے خود اُن کی زبان سے بھی سنے ہوں گے :

دائم بنا دیا خلش انتظار کو
لگ جائے آگ اس دلِ امیدوار کو
اب شوق سے نہ آؤ کہ ہم نے بنا لیا
جزوِ حیات کشمکشِ انتظار کو
آوارگانِ دشتِ جنوں اپنے ساتھ ساتھ
بھٹکا رہے ہیں گردشِ لیل و نہار کو
آؤ کسی کے نام کو عنواں بنائیں ہم
رنگیں کریں حدیثِ غمِ روزگار کو
ہم کو جہاں تمھارے نقوشِ قدم ملے
منزل سمجھ لیا ہے اسی رہگذار کو

غم کا گلہ نہ خواہشِ کیف و سرور ہے
کتنا اداس آج دلِ ناصبور ہے
جو تیرے التفات سے سرمست تھا کبھی
جورِ فلک سے آج وہ دل چور چور ہے
ایسا تو ہم پہ چرخِ کہن مہرباں نہ تھا
اس چشمِ فتنہ زا کا اشارہ ضرور ہے
غم ہر کسی کو ہیں مگر احساس غم نہیں
مجھ کو شعور غم ہے ، یہ میرا قصور ہے
افسردہ دل میں حسرت و حرماں کے باوجود
ہلکا سا ارتعاش تمنا ضرور ہے
آنے کو اب بھی جھوم کے آتی ہے فصل گل
لیکن مرا قفس ہی گلستاں سے دور ہے

ترا غم ہؤا نمایاں کئی صورتیں بدل کے
کبھی کیف نغمہ بن کے کبھی ، اشک خوں میں ڈھل کے

یہ نجوم و ماہ تاباں فقط ایک شب کے مہماں
مرے غم کی شمع سوزاں کبھی بجھ سکی نہ جل کے

تجھے یاد بھی نہ ہوں گے ، مرا جزو زندگی ہیں
ترے وعدہ ہائے فردا مری حسرتوں میں ڈھل کے

نہ جنوں کے ولولے ہیں ، نہ خرد کے مرحلے ہیں
یہ کہاں بھٹک رہی ہوں تری بزم سے نکل کے

وہ ، جفا شعار آئے جو پیام صبح لے کر
مری شمع زندگی بھی کہیں بجھ نہ جائے جل کے

یہی نظم گلستاں ہے ، یہی حکم باغباں ہے
کہ پیالہ تو پیالہ ، کوئی آنکھ بھی نہ چھلکے

جنھیں ہر کسی نے سمجھا تھا امین لالہ و گل
وہی باغباں خوش ہیں اُنھیں پاؤں میں مسل کے

یہ سحر تھی کیا ثریا ؟ ہمیں جس کی آرزو تھی
وہی ہر طرف سیاہی ، وہی ہر طرف دھندلکے

رشید نثار ۱۵ اگست ۱۹۲۷ع کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے ۔ بی اے تک تعلیم پائی ۔ سکول کی تعلیم تلوک چند محروم کے آغوش شفقت میں حاصل کی ۔ آپ نے پہلا شعر چھٹی جماعت میں کہا اور میٹرک تک پہنچتے پہنچتے آپ کے اشعار ماہنامہ ''بیسویں صدی'' اور روزنامہ ''شہباز'' میں چھپنے لگے تھے ۔ آپ کے ایک قطعے پر ''شہباز'' کے اُس وقت کے مدیر جناب وقار انبالوی نے بڑی اچھی رائے لکھی تھی ۔ تقسیم ملک سے پہلے کراچی کے اخبارات ''بلوچستان جدید'' اور ''حیات'' کے ادارۂ تحریر میں شامل رہے ۔ اُن دنوں قومی اور طنزیہ نظمیں لکھیں ۔

آپ ۱۹۵۳ء میں کوئٹہ آئے اور یہاں بارہ سال تک رہے - یہیں ادبی ذوق کی تکمیل کی - بزم ارتقائے ادب کوئٹہ کی تشکیل جدید (جو ۱۹۵۶ء کے اواخر میں ہوئی) کے وقت سے لے کر بزم کے خاموش ہو جانے تک بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - آپ نے حلقۂ ارباب ذوق کوئٹہ کی ترتیب و تشکیل میں بھی اچھا خاصا پارٹ ادا کیا اور صحت مند تنقید کو رواج دینے میں خاصی محنت کی -

کوئٹہ کے دوران قیام میں رشید نثار کا کلام عموماً ''نعرۂ حق'' کوئٹہ میں چھپتا رہا - کبھی کبھی ماہِ نو ، افکار ، ادبی دنیا ، لیل و نہار ، قندیل اور لاہور وغیرہ میں بھی آپ کا کلام شریکِ اشاعت ہوتا رہا - آپ نے روایتی شاعری بھی کی ہے اور آزاد شاعری بھی - آزاد نظموں کا ایک مجموعہ اور ایک مجموعہ پابند نظموں کا زیر ترتیب ہے اور غزلوں کا انتخاب جاری ہے -

آزادی سے پیشتر آپ کے پاؤں پر ایک زخم ہو گیا تھا جس نے ایک ناسور کی شکل اختیار کر لی - آپ نے اپنی اس حالت پر بے شمار شعر کہے ہیں لیکن یہ شعر آپ کو زیادہ پسند ہے :

پاؤں میں زخم ، دل میں جلن ، آنکھ میں لہو
میں بے قصور ہوں ، مجھے اتنی سزا نہ دے

ہر زخم میں ہے ایک دریچہ کھلا ہؤا
دل تیرے غم میں ساغرِ عالم نما ہؤا
تیری نظر تھی بزم جہاں میں جھکی ہوئی
میری جبیں پہ نقشِ وفا تھا سجا ہؤا
پھر آ گیا ہوں آج سرِ منزلِ مراد
میں گردشِ حیات کے رخ موڑتا ہؤا
تیرے بغیر کوئی بھی شاید نہ پڑھ سکے
آنکھوں میں ہے جو حرفِ تمنا لکھا ہؤا
دشتِ وفا سے آج بھی اُٹھتی ہیں آندھیاں
مدت ہوئی کہ سانحۂ کربلا ہؤا

روشن ہؤا تو خونِ وفا شمع دل بنا
جب بجھ گیا تو شعلۂ رنگ حنا ہؤا
چلتا ہوں لے کے آج بھی ماضی کی روشنی
فردا کی ظلمتوں میں تجھے ڈھونڈتا ہؤا
تو تھا ، ترا خیال تھا یا ذوق جستجو
گزرا ہے کون میری طرف دیکھتا ہؤا
وہ دولتِ خلوص لٹائی کہ آج تک
جس پر ہوئے نثار وہی بے وفا ہؤا

(فروری ١٩٦٣ع)

''وادیٔ چلتان'' میں کہتے ہیں :

تیرے ہر گوشے میں ہے اک گلستانِ رنگ و بو
کوئٹہ ! اے وادیٔ چلتاں ! جہانِ رنگ و بو[1] !
جب درختوں سے گزرتی ہے خنک بادِ صبا
مشک سے معمور ہو جاتی ہے وادی کی فضا
سلسلہ کہسار کا آیاتِ عظمت کی کتاب
شاہدِ فطرت کے جلوے آفتاب و ماہتاب

''اجنبی چاند'' ١٩٥٩ع میں آزاد تلازمۂ خیال کے تحت لکھی گئی تھی ۔ اُس وقت کوئٹے کی فضاؤں میں یہ نیا تجربہ من و عن اور بغیر کسی نظرثانی کے ملاحظہ ہو :

پسِ مُردار چاند اُبھرا ہے
دھیرے دھیرے پہاڑ کی چوٹی
میری آنکھوں میں جگمگا اٹھی
میرے سینے میں روشنی پھیلی

١- فیض الاسلام ، راولپنڈی ، اپریل ١٩٥٦ع ، صفحہ ٣٢ -

کوہِ چلتان کے کناروں پر
دودھیا روشنی کی لہریں ہیں
شبنموں کی پھوار گرتی ہے
زندگی اور کچھ نکھرتی ہے

شہر کی پُرسکون گلیوں میں
چاندنی رقص کرتی جاتی ہے
اجنبی آہٹوں کی آوازیں
تھرتھراتے حسین لمحوں کو
محفلوں میں بچھاتی جاتی ہے

محفلیں غرقِ جام و مستی ہیں
سرخ گالوں پہ شبنمی قطرے
چاند کی ضو سے جھلملاتے ہیں
نرم و نازک وجود ہنس ہنس کر
ایک انگڑائی بنتے جاتے ہیں
کتنی پلکوں کے ریشمی سائے
چاند کے ساتھ ساتھ اُبھرتے ہیں
رقصِ جام و سبو پہ مرتے ہیں

میں اکیلا ہوں چاند کی مانند
چاند میرا نہیں تو کس کا ہے
کون جانے کہ چاند اُبھرا ہے

صادق نسیم نے ۲۳ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ٹیکسلا کے ایک نواحی گاؤں خورم میں ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ پرائمری کے بعد تمام تعلیم راولپنڈی میں پائی۔ تعلیم کے بعد فوج کی ملازمت اختیار کی اور ۲۷ جون ۱۹۵۸ء سے ۱۵ دسمبر ۱۹٦۵ء تک کوئٹہ میں قیام پذیر رہے۔ راولپنڈی

میں تقسیم ملک کے وقت انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری تھے۔ اسی طرح کوئٹہ میں بھی اردو کی خدمت کی سوجھی۔ حلقۂ ارباب ذوق کے سیکرٹری رہے۔ بزمِ ارتقائے ادب کے معاونین کے ساتھ مل کر بھی کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کوئٹہ میں جشن کوئٹہ کی نمایش کی طرف سے آل پاکستان مشاعرہ، ریلوے اکاؤنٹس اکیڈیمی کی طرف سے متعدد آل پاکستان مشاعرے اور گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی طرف سے ایک آل پاکستان مشاعرے کا انعقاد کیا۔ تنقیدی شعور کو عام کرنے کے لیے تنقیدی نشستوں کا انتظام کیا۔ کوئٹہ گورنمنٹ کالج میں دو سال ایم اے (اُردو) کے طالب علم رہے لیکن ۱۹۶۵ء میں فوج نے واپس بلا لیا لہٰذا امتحان نہ دے سکے۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:[۱]

"کوئٹہ سے مجھے بے حد محبت ہے اور کوئٹے کی ہواؤں، فضاؤں اور موسموں نے مجھے شعر کہنا سکھایا ہے۔ میں ذہنی طور پر اب بھی کوئٹہ میں ہوں۔ میں نے جتنے شعر کوئٹہ میں کہے، اتنے اچھے شعر میں کہیں بھی نہیں کہہ سکا اور آج کل جتنے رسالوں میں میری غزلیں چھپ رہی ہیں، وہ سب میری کوئٹہ کی کہی ہوئی غزلیں ہیں۔"

آپ نے صرف کوئٹہ پر جو شعر کہے ہیں، اُن میں سے چند ایک یہ ہیں:

ہر زخم دل میں سوزِ تمنائے یار تھا
یخ بستہ کوئٹے میں بھی میں شعلہ بار تھا

سن کر خزاں سے میرا فسانہ سلگ اُٹھا
جیسے ہر اک چنار مرا غم گسار تھا

۱۔ صادق نسیم کا خط ۷۰ کیمبرج روڈ راولپنڈی کینٹ سے راقم الحروف کے نام۔ مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۶۷ء۔

یہ خواب خواب سا منظر یہ مہکی مہکی فضا
کہ جیسے کوئی فسانہ سنا رہی ہے ہوا

کس نے آواز دی بہاروں کو
آگ سی لگ گئی چناروں کو

نکہت و نور کو کچھ نذر نہ کرنے پائے
مجھ سے دو اشک ہی دامانِ سحر نے پائے

پھر شگفتِ گل بادام کی رُت آ پہنچی
کیوں نہ بردوشِ ہوا آج کوئٹہ جاؤں

کسے خبر ترے در تک پہنچ سکی کہ نہیں
صبا کے ساتھ گئی تھی نگاہ بے قابو

فراق یوسف گم گشتہ کم نہ تھا صادق
کہ میرے ہاتھ سے کنعان کوئٹہ بھی گیا

صادق نسیم کا کلام نقوش، فنون ، اوراق اور ادبی دنیا جیسے بلند پایہ معیاری رسائل میں چھپتا رہتا ہے ۔ غزلیات کا مجموعۂ کلام بعنوان ''گرد طلب'' جلد مارکیٹ میں آجائے گا ۔ آپ نے کوئٹہ کے مختلف مشاعروں میں جو غزلیں پڑھیں ، ان کے چند شعر حاضر خدمت ہیں :

جب بھی تری قربت کے کچھ امکاں نظر آئے
ہم خوش ہوئے اتنے کہ پریشاں نظر آئے
کانٹوں کے دلوں میں بھی وہی زخم تھے لیکن
پھولوں نے سجائے ۔ تو نمایاں نظر آئے
اک اشک بھی نذرِ غمِ جاناں کو نہیں پاس
ہم آج بہت بے سروساماں نظر آئے

ٹوٹا جو فسونِ نگہِ شوق تو دیکھا
صحرا تھے جو نشّے میں گلستاں نظر آئے
دیکھوں تو ہر اک حسن میں جھلکیں ترے انداز
سوچوں تو فقط گردش دوراں نظر آئے
جو راہِ تمنا کے ہر اک موڑ پہ چپ تھے
جب دار پہ پہنچے تو غزل خواں نظر آئے
صادق کی نگاہوں ہی کو ٹھہراؤ نہ مجرم
آئینے ہر اک دور میں حیراں نظر آئے

اپنے ہر آئینۂ زخم کو جب چمکایا
ایک ہی عکس کئی رخ سے جھمکتا پایا
آج تخئیل کی ندرت نے رلایا پھروں
تیرے پیکر کو جو ملبوس وفا پہنایا
تو مغنیٔ ازل کا کوئی شہپارہ ہے
جس کو فطرت نے بہت دھیمے سروں میں گایا
میں ترے شعلۂ آہنگ کا پروانہ ہوں
مدتوں جلتا رہا ، راکھ نہ ہونے پایا
جس کو مشکل سے بھلایا تھا سرِ شام نسیم
چاند نکلا تو وہی ماہ لقا یاد آیا

ردائے مے میں نہاں مثلِ رنگِ مینا ہو
میں تیرا آئینہ بن کے خود اپنا پردا ہوں
تری نظر کی کم آمیزیوں سے نکھرا ہوں
میں تشنگی کے نشے سے بھی جھوم اُٹھتا ہوں
ستارے جس کے عناں گیر ہیں ، وہ ذرہ ہوں
مجھے تلاش تو کر ، میں بھی ایک دنیا ہوں

طلسم شوق سے نکلوں تو پھر بتاؤں گا
تری طلب کا سمن زار ہوں کہ صحرا ہوں
ابھی تو میرے مغنی کو بھی نہیں معلوم
شکست ساز کی جھنکار ہوں کہ نغما ہوں
بہ فیضِ موج نکھرتا ہے میرا حسنِ تراش
کہ ایک عمر سے میں سنگِ راہِ دریا ہوں
نظر سے صاف جھلکتے ہیں دل کے ویرانے
وہ حال ہے کہ اب آئنے سے بھی ڈرتا ہوں
سنی ہے ہر صدفِ غنچہ سے تری آواز
تلاش گوہر خوشبو میں جب بھی نکلا ہوں
فضائے شب ہے کہ حسرت کدے کا سناٹا
نوائے تار نفس سے بھی کانپ اٹھتا ہوں
میں آج توڑ کے زنجیر آرزو اے دوست
صبا کے ساتھ کہیں دور جانے والا ہوں
جلا ہوں جب سے چناروں کی آگ میں صادق
وطن میں آکے بھی کچھ اجنبی سا لگتا ہوں

شعیب احمد عباسی (تخلص حزیں) مشہور مردم خیز قصبے امروہہ میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ بی اے جامعہ عثمانیہ (دکن) سے کیا۔ ۱۹۵۶ء میں کوئٹہ میں ریڈیو سٹیشن قائم ہؤا تو کوئٹہ پہنچ گئے۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں خاطرخواہ حصہ لیا۔ بلوچستان کی قدیم تاریخ سے اُنھیں خصوصی لگاؤ رہا۔ اس سلسلے میں اُن کے متعدد مضامین مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کا ایک مضمون مری قبیلے کے متعلق پہلے روزنامہ ''امروز'' لاہور میں چھپا، اس کے بعد ملک کے متعدد اخباروں اور رسالوں نے اُسے نقل کیا۔ ''اُردو ڈائجسٹ'' نے بھی یہ مضمون شائع کیا تھا۔ ''قلات کے گبر بند''، ''خاران کے گنبد''، ''مکران ایک معمہ'' اور ''خضدار''— یہ مضامین مقامی اخباروں کے علاوہ بعض

قومی اخباروں میں بھی چھپے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے :

پتی پتی پہ تحریریں اک بہار اتنی تفسیریں
کس زندانی پر کیا بیتی چیخ رہی ہیں کیوں زنجیریں
ڈھونڈھیں آؤ خزاں کے مسکن غنچہ و گل کے سینے چیریں
وہ تو کہیے راس ہے زنداں ورنہ حزیں اور یہ زنجیریں

یہ اور بات ہے تابِ نگاہ ساتھ نہ دے
فروغِ جلوہ سے ذوق نگاہ کم بھی نہیں

اب تجلی میں نہیں برق کا انداز حزیں
اب طلب میری فسانا نہیں ہونے پاتی

افسوس تو یہ ہے سن نہ سکے ہم عیش نظر کے دیوانے
تھے لالہ و گل کے دل میں بھی کچھ سوز دروں کے افسانے
ہر شام سجے گی محفل اور ہر صبح بنیں گے افسانے
روتی ہی رہے گی شمع حزیں ، جلتے ہی رہیں گے پروانے
یہ کس نے کہا دیوانوں کو ، تحریک بہاراں لازم ہے
کیا عہد گل و لالہ کے بغیر آباد نہ ہوں گے ویرانے ؟
کہنے کو بہاریں ہی آئیں ، دل سے غمِ فردا کم نہ ہؤا
یہ زیست تو آخر ہار چکی اب موت چلی ہے بہلانے
جلووں سے گریزاں ہونے کا الزام نہ رکھ دیوانوں پر
ناواقفِ رسمِ دید نہیں ، مجبور جنوں ہیں دیوانے
یہ دیر و حرم تو دو ہی نشاں ہیں ، اہل جنوں کی لغزش کے
اب کس کو خبر ہے کتنی جگہ چکرا کے گرے ہیں دیوانے
منزل کا سکوں تو خیر حزیں ، منزل کا یقیں بھی کھو بیٹھے
کچھ ایسے اُلجھے راہوں میں یہ ہوش و خرد کے دیوانے

پھر لے کے جنوں کا نام حزیں اُٹھا تو ذوق نظارہ
اب ساتھ کہاں تک دیتے ہیں یہ قلب و نظر معلوم نہیں

ڈاکٹر عبدالحمید (حمید تخلص) کاکڑ، ۱۹۱۴ع میں پیدا ہوئے۔ آپ کوئٹہ سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ چشمہ اچوزی کے رہنے والے تھے۔ سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ سے میٹرک کے بعد اندور میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ پانچ سال اندور میں رہے اور وہاں سے ذوق شعر گوئی پیدا ہؤا۔ پہلی غزل حضرت مضطر خیر آبادی کی صدارت میں پڑھی۔ اس کے بعد بہ سلسلہ ملازمت کوئٹہ چلے آئے اور گاہے بہ گاہے شریک مشاعرہ ہوتے رہے۔ ملازمت ترک کرنے کے بعد باقاعدہ کوئٹہ میں رہائش پذیر ہو گئے اور ذاتی پریکٹس شروع کر دی۔ اسی اثنا میں کئی ادبی انجمنوں کے صدر اور نائب صدر رہے جن میں سے دو کے نام یہ ہیں: بزم ثقافت کوئٹہ اور بزم ارتقائے ادب کوئٹہ۔ طرحی مشاعروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ آپ اگست ۱۹۶۷ع کے پہلے ہفتے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

رفتید ولی نہ از دل ما

ڈاکٹر حمید کاکڑ کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی علمی و ادبی مجالس ہمیشہ وادیٔ شال کے ادب دوست مکینوں کو نہ صرف یاد ہی رہیں گی بلکہ رلاتی رہیں گی۔ آپ کی مادری زبان پشتو تھی اور پشتو میں بھی اچھے شعر کہتے تھے لیکن اُردو سے آپ کی شیفتگی اور وارفتگی ہمیشہ یادوں کے اُفق پر اُبھرتی رہے گی۔ آہ! کتنی جاذب توجہ اور پر خلوص شخصیت تھی۔

پرتو عمر چراغیست کہ در بزم وجود
بہ نسیم مژہ برہمزدنی خاموش است (صائب)

آپ کے اُردو کلام سے انتخاب ملاحظہ فرمائیے یہ آپ کی موت کے حادثۂ عظیم سے دو تین روز پیشتر کیا گیا تھا:

کچھ اس انداز سے بہار آئی
پھول کانٹوں سے ہم کنار ہوئے

پی رہا ہوں روئے ساقی دیکھ کر
جام کو ٹکرا رہا ہوں جام سے

ہماری عرض تمنا پہ چپ تو ہیں لیکن
نظر جھکائے ہوئے مسکرائے ہیں کیا کیا

کسی دن مہرباں ہو کر نگاہ لطف بھی کر دو
ہمیشہ ہی جفا ہو گی، ہمیشہ ہی ستم ہو گا

پھر شب ہجر جنوں سلسلہ جنباں ہو گا
چاک پھر صبح قیامت کا گریباں ہو گا
قدِ جاناں کا گلستاں میں جب آئے گا خیال
نخل ماتم مجھے ہر سروِ گلستاں ہو گا

ابر اُٹھا ہے میخانہ نشیں جھوم رہے ہیں
ہر جام پہ ساقی کے قدم چوم رہے ہیں

نقش پا ہے نہ رہ گذر کوئی
اب کدھر جائیں تیرے دیوانے

مدت ہوئی فرعون کو غرقاب ہوئے
فرعون کی اولاد مگر باقی ہے

اپنا سر یار کے قدموں پہ سرِ میخانہ
شام سے تا بہ سحر ہو تو غزل ہوتی ہے

ساقیا سوئے خرابات جو ہم آئے ہیں
تیری خاطر ہی ترے سر کی قسم آئے ہیں
تم نہ آؤ گے تو آ جائے گی شام فرقت
میرے گھر ایسے ہی مہماں کے قدم آئے ہیں

یقیناً اے حمید آ جائے گا انداز مے نوشی
خدا کا نام لے کر بیعتِ پیرِ مغاں کر لیں

کون مونس ہے مرا کون مرا ہمدم ہے
صرف اس دل کے علاوہ کہ جو وقفِ غم ہے

شب کے نالوں نے اُٹھایا ہے مکاں بالائے سر
آج ہے اے دوست ! اپنا آشیاں بالائے سر

نہ وہ آئے ہیں ، نہ وہ آئیں گے ، مری آنکھ پھر بھی ہے منتظر
شبِ انتظار کا سامنا ، مرے اعتبار کی بات ہے

اب تم سے دوبارہ ملنے کا ، معلوم ہوُا ، امکان گیا
تم منہ سے کہو اب یا نہ کہو مطلب میں تمھارا جان گیا

حاصل ہوُا نہ عشق میں کچھ بھی تمام عمر
سو سو طرح سے موردِ الزام ہو گیا
کچھ کچھ حمید میں بھی ہوں دیوار کے قریب
کچھ کچھ قریب وہ بھی سرِ بام ہو گیا

اب کیا کہیں دل ہاتھ سے جاتا رہا کیونکر
یہ حادثۂ کوئے صنم یاد رہے گا

میرے ہر تار گریباں پہ ہے احساں اُن کا
آمدِ موسمِ گل وجہِ جنوں ہو تو غلط

رہِ حیات میں دامن بچاؤں کس کس سے
ہزار دام بچھے ہیں قدم قدم ساقی

بہت حیران ہوں گے سننے والے
ہمارا ذکر اور تیری زباں سے

حمید پر نظر حسن مہرباں ہے ابھی
قریبِ تشنہ دہن بحرِ بیکراں ہے ابھی

جب بہار آئیگی اچھلے گا جنوں بھی اے دوست
پھر نہ دامن ہی رہے گا ، نہ گریباں ہوگا

میں اور شرحِ درد کروں اُن کے رو برو
اے دوست ! یہ مجال مجھے کم سے کم نہیں

آپ جب بھی چاہیں آ کر دیکھ لیں
دل میں اور آیا گیا کوئی نہیں
شوق سے تم جام اُٹھاؤ اے حمید
میکدے میں پارسا کوئی نہیں

جس نے جب دیکھا اسی حال میں دیکھا شاید
اُس کو ہنستے ہوئے دیکھا مجھے گریاں دیکھا

آئے تو خالی ہاتھ سرِ بزمِ کائنات
لیکن چلے تو سینکڑوں ارماں لیے ہوئے

تم کہے جاؤ کہ دیوانہ ہے سودائی ہے
میں کہے جاؤں کہ یہ حوصلہ افزائی ہے
ایک تُو ہے کہ نہ آیا کبھی حسبِ وعدہ
اک تری یاد ہے جو شام و سحر آئی ہے
اُن کے گیسو کا تصور ہے کہ جاتا ہی نہیں
یہ بلا بھی شبِ غم ساتھ لگا لائی ہے

یوں محو خرام آج ہے وہ سروِ خراماں
ایک ایک قدم موجِ نسیمِ سحری ہے

اس طرح سے مہماں ہوئی شام جدائی
ہم ہاتھ ہی دھو بیٹھے ہیں اُمید سحر سے

سید ماہر علی شاہ المتخلص بہ‌ماہر افغانی ۸ مارچ ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد بزرگوار سید محبوب علی شاہ ریٹائرڈ سول جج بلوچستان تھے ۔ وہ ۱۹۳۵ء کے زلزلے کے بعد لاہور گئے تھے ۔ ماہر افغانی زیادہ عرصہ بلوچستان میں رہے ہیں ۔ بیشتر عرصہ تو کوئٹہ میں رہے لیکن دو دو چار چار سال لورا لائی ، سبی اور قلعہ سیف اللہ میں بھی والد کے ہمراہ گزارے ۔ ۱۹۴۷ء سے کوئٹہ ہی میں سکونت پذیر ہیں ۔ اِس سے پہلے ملازمت کے سلسلے میں دہلی بھی رہے ۔ وہاں ریڈیو کے علاوہ مشاعروں میں بھی شرکت فرمائی ۔ اُردو شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۰ء میں ہوا ۔ بعد ازاں فارسی اور انگریزی میں بھی شعر کہنے لگے ۔ دو سال تک روزنامہ ''زمانہ'' کوئٹہ سے وابستہ رہے اور روزانہ فکاہی مضامین یا انشائیے یا قطعات یا اخلاقیات سے متعلق مضامین لکھے ۔ آپ اب تک کوئٹہ کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے ہیں ۔ یہاں آپ کی بعض نظمیں بہت پسند

کی گئی ہیں - (''نغمہ'' پہلے باب میں درج کر چکے ہیں) - مشاعروں میں کئی بار تقاضا ہوتا رہتا ہے - آپ کراچی اور کوئٹہ کے ریڈیو پروگراموں میں بھی شامل ہوتے رہتے ہیں -

نمونہ اشعار ملاحظہ فرمائیے :

واقعہ ہے واقعہ

پہلا اور آخری بند (تقسیم ملک سے پہلے لکھی گئی)[1] :

شور ہے آسام میں ، بنگال و یاغستان میں
خطۂ پنجاب میں ، سندھ و بلوچستان میں
مصر میں ، ایران میں ، ترکی میں عربستان میں
زندگی مسلم کی پوشیدہ ہے پاکستان میں

ٹکڑے ٹکڑے کاسۂ سر ہو کہ اب گردن کٹے
چپہ چپہ یا ہمارے واسطے زندان بنے
خون کا دریا بہے یا خاک کا ریلا اُٹھے
زندگی مسلم کی پوشیدہ ہے پاکستان میں

کولڈ ویو[2]

بلوچستان کی اصطلاح میں اسے قندھاری ہوا بھی کہا جاتا ہے مگر میری دانست میں ''کولڈ ویو'' زیادہ وزن دار عنوان ہے :

یہ کولڈ ویو ، خدا کی پناہ ہے ماہر
کہ اب تو گھر سے نکلنا بھی ہو گیا دشوار
جتن ہزار کرو ، کپکپی نہیں جاتی
قریب بیٹھ کے فائر پلیس کے بھی تو یار
چمٹ گئی ہے مجھے تو یہ جونک کی مانند
یہ کیا مذاق ہے ، پوچھے کوئی تو آخر کار

۱- خورشید ، کوئٹہ ، ۲۸ جولائی ۱۹۴۹ء -
۲- خورشید ، کوئٹہ ، ۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء -

مگر یہ موقع کہاں ہے کے ہو کے پیش حضور
میں ہاتھ جوڑ کے ہوں التجا سے عرض گزار
کہ مجھ غریب نے وہ کون سی خطا کی ہے
جو ہو گیا ہوں مقیّد میں گھر میں اے سرکار
خلافِ طبع کوئی بات میں نے کی تو نہیں
سوائے اس کے کہ کچھ اب کے دیکھ کر آثار
میں ایک کوٹ کا باوا خرید لایا ہوں
اگرچہ وہ بھی ہے ایسا کہ جس کا دل ہے فگار
یہ سامنے کا ہے عالم کہ پارا پارا ہے
عقب کی سمت سے چھلنی کی طرح زار و نزار
نہ یہ کباڑیے ہوتے ، نہ یہ کباڑ ہوتا
نہ قصہ رائی کا سرکار یہ لپاڑ ہوتا
نہ آپ کو میں تنومند یوں نظر آتا
نہ آدمی سے میں اس طرح گور خر بنتا
کرم خدا کے لیے ہو کہ خستہ کام ہوں میں
حضور آپ کے بچوں کا بھی غلام ہوں میں

قیس اس بات کے ادراک سے محروم رہا
وحشتِ دل کے لیے وسعتِ صحرا کم ہے

نہ کتہ فقط درِ پیرِ مغاں سے ملتی ہے
مذاقِ مے ہو تو مے آسماں سے ملتی ہے
نہیں چمن کے جو پردے میں کوئی مے خانہ
تو پھر شراب گلوں کو کہاں سے ملتی ہے
میں جب خیال کی جولانیاں دکھاتا ہوں
تو پھر رسید مری آسماں سے ملتی ہے

کوئی مذاق نہیں راز داریِ فطرت
یہ اک سند ہے، بڑے امتحاں سے ملتی ہے

حیات و موت کے مابین فاصلہ یہ ہے
ابھی چراغ جلا تھا، ابھی چراغ بجھا

بجلی مری آنکھوں میں ہے لہرائی ہوئی سی
ناگن کی کمر کی طرح بل کھائی ہوئی سی
اے گردش ایام لگا زور ہو جتنا
میں نے بھی ہے جینے کی قسم کھائی ہوئی سی

یہ کھلے ہیں ترے رخسار پہ اشکوں کے کنول
یا گراں بار کوئی قافلۂ شبنم ہے
زندگی ہے تو بہر حال ہے جینا لیکن
خواہش زیست بہ عنوان تمنا کم ہے

صباحتِ صبح گل ستاں میں جمال آرا شباب تیرا
کلی کے نازک لبوں پہ رقصاں تبسمِ لاجواب تیرا
اسی پہ تکیہ کیے ہوئے ہوں کہ ذوقِ جلوہ پہ رحم کھا کر
کوئی ہوا کا شریر جھونکا اُلٹ ہی دے گا نقاب تیرا
نہ ہوں نگاہیں بھی میری خیرہ تجھے بھی یکدم گراں نہ گزرے
اُٹھا رہا ہوں میں ہلکے ہلکے سہج سہج سے نقاب تیرا

کوئٹہ سے متعلق ایک نظم کے چند شعر، جن میں پہاڑوں کا ذکر ہے، ملاحظہ ہو:

زرغون اک طرف ہے بہ اندازِ دلبری
مردار اک طرف ہے بہ اورنگِ آسماں
کچھ کم نہیں کسی سے تکاتو کی شان بھی
ہے وہ بھی ہر لحاظ سے ہمرنگِ دیگراں

کہتا ہے دل کہ ہاتھ بڑھا کر سنبھال لوں
لہرا رہا ہے ناز سے دامانِ چیلتان

کوئٹہ ہے خوبصورت ، کوئٹہ ہے دل پذیر
گرمیوں میں باغ جنت ، سردیوں میں زمہریر
اسکے دامن میں رواں ہے ایک ایسی جوئے شیر
تیشہء فرہاد سے ممکن نہیں جس کی نظیر

سید کامل القادری (مقام پیدایش صوبہء بہار) کو علم و ادب اور شعر و سخن سے لگاؤ ورثے میں ملا ہے ۔ آپ تقسیم ملک کے بعد پہلے کراچی ، پھر ۱۹۴۹ء کے وسط میں کوئٹہ میں وارد ہوئے ۔ کوئٹہ اور یہاں کے لوگ اتنے پسند آئے کہ اسی سرزمین کے ہو کر رہ گئے ۔ چنانچہ آپ نے بلوچستان کی تاریخ ، تہذیب ، تمدن ، رسم و رواج ، زبانوں اور لوگوں کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کیا ۔ اب تک متعدد مقالات حیطہء تحریر میں لا چکے ہیں ۔ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں ۔ بعض اخبارات سے بھی متعلق رہے ہیں ۔ پچھلے سال 'نوکین دور' کوئٹہ کا 'مکران نمبر' شائع کرانے کے لیے بڑی جانفشانی سے کام کیا ۔ اُردو میں شعر بھی کہتے ہیں اور نقادانِ فن کے مطابق خوب کہتے ہیں ۔ شعر گوئی کی ابتدا کے متعلق لکھتے ہیں : ''میری ادبی زندگی کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی ۔ عمِ محترم حضرت مولانا ابوالحسنات قادری نے میرے شعری مزاج کی تشکیل و تعمیر کی جانب بڑی توجہ کی اور اب بھی کبھی کبھی جو کچھ کہہ لیتا ہوں ، یہ اُنھی کے روحانی فیضان کا نتیجہ ہے ۔ دورانِ قیام علی گڑھ میں مشاعروں کا ایسا چسکا پڑا کہ پورے ہندوستان کی سیر ہو گئی ۔''۱

کلام کا نمونہ دیکھیے :

۱- بلوچ قبائل ، مترجم سید کامل القادری ، صفحہ ۵ ۔

بلوچ نوجوانوں سے (رباعی)

سرخیٔ حسن و محبت ہی جلا پا جاتی
کاش تم محوِ رخِ حانی و شیریں ہوتے
مشکِ نافہ کی طرح پھیلتی خوشبو ہر سُو
گلِ لالہ کی طرح دہر میں رنگیں ہوتے

غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے :

مثالِ چشمۂ سیماب گوں ہیں ایک فطرت میں
نہیں ہم میں کوئی دشتی ، کہستانی ، بیابانی
ہماری ذات وابستہ حرم کے بعد اُن سے ہے
ہم اپنے دشت و صحرا کی نہ کرتے کیوں نگہبانی

موج در موج
(ایک مکالمہ)

ساحل : سیماب وار پھرتی ہے کس جستجو میں تُو
نا آشنائے لذتِ دنیائے رنگ و بو
موج : اُفّوہ ! یہ درشت کلامی ، یہ گفتگو
ہے حرکتِ دوام یہاں زندگی کی خُو
اس اضطراب و کشمکشِ لحظہ لحظہ سے
عرفانِ ہست و بود کا بھرتی ہوں میں سبو
ساحل : نازاں نہ ہو تو رقصِ دوامی پر اس جگہ
منزل کا کچھ پتا بھی ہے اے جانِ آرزو
بہتر ہے اب مری طرح تو جم کے بیٹھ جا
تجھ میں اگر ذرا ہے حقیقت کی جستجو
ہوتی ہے اس جماؤ سے تہذیبِ آب و تاب
اک قطرۂ حقیر کو ملتی ہے آبرو

لب

اور اپنی قوم کی یہ ماہ پیکر لڑکیاں
سنگِ مرمر کی چٹانیں اور آزر کا خیال
کیسے کیسے ہیں یہاں نقش و نگار
اے رم آہو مری موج خیال
کوئی سمو، کوئی شیریں، کوئی حانی ان میں ہے
کوئی لیلیٰ، کوئی عذرا، کوئی مریم ان میں ہے
کوئی رادھا، کوئی میرا، کوئی روپا اُن میں ہے
عصمت و عفت میں ہیں جو آفتابِ نیم روز
مسکراتی، لڑکھڑاتی، چہل کرتی لڑکیاں
شمہ کوہستان سے جیسے ہو کوئی آب جو
مسکراتی، لڑکھڑاتی، جانبِ میدان رواں
ان میں میری بنتِ عم
قوم کی وہ آبرو
ہائے وہ ماہِ منور، اپنے گھر کی روشنی
چھوڑ کر کوہ و کمر کی پُر کشش رعنائیاں
وہ حرم میں بوڑھے خواجہ خیل کے بس جائے گی
چند اُونٹوں کے عوض بک جائے گی
اور ہمارے سینکڑوں کڑیل جوان
گھر بسانے کی تمنائیں لیے
مثلِ شاخِ بے ثمر
سوکھ کر رہ جائیں گے
حسرت و ارماں لیے دنیا سے یہ اُٹھ جائیں گے

عقاب اور چیونٹی

(ایک مکالمہ)

عقاب:
حیرت سے دیکھتا ہوں میں تیری یہ رسم و راہ
ننھی سی جان اس پہ تو رکھتی ہے کج کلاہ

چیونٹی : میری کلاہِ کج میں ہے اک شانِ دلبری
ورنہ فلک سے نیچی تو رکھتا کبھی نگاہ ؟

عقاب : پھرتی ہے ہنستی کھیلتی اک قافلہ لیے
جیسے کہ یہ زمیں ہے فقط تیری سیرگاہ
اے کاش تو بھی میری طرح آ کے دیکھتی
کیا آسماں کا رنگ ہے ، کیا حسنِ مہر و ماہ

چیونٹی : نا آشنائے روشنی مہر و ماہ تو
کس کا ہوا ہے آج تلک خیر خواہ تو
خود کامیوں نے تیری عطا کی وہ زندگی
بھولا معاشرت کی ہر اک رسم و راہ تو
اپنوں سے کٹ کے اب تو خلا میں ہے گرمِ سیر
اے کاش اپنے حال پہ کرتا نگاہ تو

نوحہ

وقت کے زندگی بخش دانش ورو !
کچھ کرو ، کچھ کرو ، کچھ کرو ، کچھ کرو
آسمانوں کی تسخیر جائز سہی
یہ زمیں بھی توجہ کی محتاج ہے
خوف و دہشت سے سمٹی ہوئی یہ زمیں
جس پہ صدیوں سے بس موت کا راج ہے
کچھ کرو !

خود کلامی

یہ کس کی سواری ہے دوش صبا پر
سحر کے جھروکے سے لہراتی زلفیں نظر آ رہی ہیں
"یہ اک نازنین ہے"
ہمارے وطن پر بھی چشم کرم ہو !

کہ مدت سے ہیں ہم بھی مشتاق دید و نظر کے
یہ کس کی سواری ہے دوشِ صبا پر
کہ سرگوشیاں جس کی کوہ و کمر میں
ہماری نگاہیں بھی زرتار رتھ پر جمی ہیں
"یہ اک مہ جبیں ہے"
مری مہ جبیں تُو
ہماری زمیں پر قدم اپنا رکھ دے
اجازت ہماری ہواؤں کو دے دے
ہوائیں — جو مشرق و مغرب سے چلتی رہی ہیں
ترے جسم کی اور ترے پیرہن کی
معطر فضاؤں میں گُم ہوں
ترے عارض و لب کی افشاں چُرا لیں

ساحلِ مکراں سے ٹکرا کر بکھر جاتی ہے موج
پھر بطرزِ دلربائی دوڑ کر آتی ہے موج
ہے کہیں شبنم، کہیں آنسو، کہیں ابر رواں
اپنی ہستی کو مٹا کر بھی سنور جاتی ہے موج
اور جب خلوت کا اک لمحہ ہُوا اس کو نصیب
کامل ناداں وہی آبِ گہر لاتی ہے موج

جام دُرک: از سید کامل القادری۔ ناشر قصرالادب جگو والا، تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۳ء، ضخامت (میگزین سائز) ۶۸ صفحات، سرورق ذوق جمال کا نمونہ۔

کتاب کے ابواب کی تخصیص اس طرح کی گئی ہے: عہد، افسانہ و افسوں، متداول کلام، زبان، بشنو از نے۔ بعد میں اختتامیہ بھی موجود ہے۔ جام دُرک اٹھارھویں صدی کے شاعر تھے۔ اُن کا[1] تعلق دربار قلات سے

۱۔ جام دُرک، صفحہ ۲۳۔

وابستہ نظر تو آتا ہے لیکن نزاکتِ تعلقات کا علم نہیں ہوتا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعرانہ عظمت و کمال کے باعث لوگوں نے انھیں ''ملک الشعرا'' کے خطاب سے نوازا ۔ وہ بلوچی زبان کی عشقیہ شاعری میں منفرد مقام کے مالک ہیں ۔ بقول مصنف[1] : ''جام درک کی انفرادیت ، زبان کی پاکیزگی ، اسلوب کی رنگینی اور مشاہدات کی ندرت کے ساتھ ساتھ اُس کے دلِ حرماں زدہ کی لالہ کاری سے ترکیب نشو و ارتقا پاتی ہے ۔ جو صدمۂ فراق سے خونچکاں ہے ۔ لہٰذا اس کی شاعری اپنے عہد میں بھی پسند کی گئی اور دور حاضر میں بھی ۔ وہ نوجوان شاعروں کا محبوب ہے'' مصنف کا اسلوب نگارش قاری کے دل میں رچتا جاتا ہے ۔ جام درک کی شاعری کے نمونے یہ ہیں[2] (بلوچوں کی قومی خصوصیت کا بیان) :

ہنچشیں بلوچ دردانغیں	''موتی کی مانند بلوچ
دور زماں ءِ پنہاں	زمانے کے نشیب و فراز
لیغارو نے دھنیزیں بیت	(اور) گرد و غبار سے آلودہ نہیں ہوتا
چھو سُہر و الماس ءِ مثال	بلوچ ایسے سونے اور الماس کی مانند ہے
زنگیں شہھ نمیاں نبیت	جسے نمی سے ہرگز زنگ نہیں لگتا''

صرف اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو (مرقع نگاری میں خونِ جگر سے رنگ بھرا ہے)[3] :

''میرے دل نے تیرا قد و قامت تراشا ہے
تو میدان میں چرنے والا ہرن بن جا !
میں شکاری بن کر تیری گھات میں رہوں
تو صبا رفتار تازی بن جا
(تو) میں تجھ پر سوار ہو کر چابک لگانے والا بن جاؤں
تو میدان میں اُگا ہؤا پھول بن جا
(تو) میں شہد کی مکھی بن کر بھنبھناؤں

۱- جام درک ، صفحہ ۶۴ -

۲ و ۳- جام درک ، صفحات ۱۳ ، ۶۳ -

اور یوں اس پھول کا منہ چوم لوں !"
'عجز و نیاز عشق کا اظہار'[1]

"تو مچھلی ہے ، میں تیری ہنسی ہوں
'تو نیلی جھیل ہے ، میں اُس میں تیرنے والا ہوں
'تو پہاڑی کبوتر ہے ، میں شکرہ ہوں
'تو دودھیل گائے ہے ، میں تیرا دوہنے والا ہوں"

میر عبدالباقی بلوچ سر زمینِ مکران سے تعلق رکھتے ہیں - اُردو کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے[2] :

ہم ہیں اور شہر شہر رسوائی
وہ ہیں اور شوق جلوہ آرائی
جب وہ ہنس کے مرے قریب آئے
زندگی ساز بن کے لہرائی
شام سے تا سحر قیامت ہے
اک مسلسل خیال آرائی
تلخیٔ دہر کی دہائی ہے
لوٹتا ہے فسون زیبائی
پھر تمنا ہے گوش بر آواز
پھر کہیں سے کوئی صدا آئی
خار زاروں میں بارہا باقی
کام آئی ہے آبلہ پائی

آج آہ آتشیں پھر دل مرا برما گئی
زندگی اے زندگی کیا تو بھی اب گھبرا گئی
ان کے ہونٹوں پر تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر
برق سی کوندی ، گری ، تڑپی ، اُٹھی لہرا گئی
جب کبھی آیا مجھے ترک محبت کا خیال
اُس نے چھیڑا سازِ دل اور زندگی لہرا گئی
اج باقی مدتوں کے بعد جانے کس لیے
پھر سر محفل وہ دزدیدہ نظر شرما گئی

۱- جام درک ، صفحہ ۳۶ -
۲- نوکین دور ، کوئٹہ مکران نمبر مارچ ، ۱۹۶۷ء ، صفحہ ۳۴ -

میری ہستی پہ جو چھائے تھے وہ دلدار گئے
شکر صد شکر محبت کے فسوں کار گئے
یاس و اندوہ میں اغیار کا شکوہ کیسا
چھوڑ کے جب مجھے تنہا مرے غمخوار گئے
ہم کہاں اور تری بزم طربناک کہاں
بے خودی تھی جو ترے در پہ کئی بار گئے
ہم کو تو دُرد تہہ جام کی حسرت ہی رہی
اور ہوں گے جو تری بزم سے سرشار گئے

نور محمد ہمدم سوکڑ تحصیل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازیخان میں ۲۰ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک بلوچ قبیلہ سلغانی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں کوئٹہ ڈویژن میں بسلسلہ ملازمت آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ آپ آغا صادق کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔ غزل، نعت، نظم اور اقبال اور خسروؒ کے کلام پر خمسے لکھے ہیں۔ ترنم قابل داد ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ آپ کا کلام مقامی اخبارات کے علاوہ ملک کے معیاری رسائل میں بھی چھپتا رہتا ہے۔ نمونہ کلام دیکھیے:

ایک اہل درد دل یوں زینت عالم رہے
پھول کی پتی پہ جیسے قطرۂ شبنم رہے
چشم تر آئینۂ راز دو عالم ہے مجھے
اک شہنشہ کو مبارک اس کا جام جم رہے

تختۂ دار پر میرے ساتھ ہیں شیشہ و سبو
موت سے بھی حسین تر رخت سفر کی بات ہے
صدائے غم میں ترنم نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی میں آہ و فغاں گم نہیں تو کچھ بھی نہیں
اک آدھ گل کا تبسم نہیں بہار کی شرط
کلی کلی پہ تکلم نہیں تو کچھ بھی نہیں

شراب زیست کی لذت نہ ڈھونڈ ساحل پر
بھنور بھنور سے تصادم نہیں تو کچھ بھی نہیں

مائل بہ کرم ہو کر ہی رہی وہ نگاہ بہ فیض جذبۂ دل
ہر چیز جہاں وہ ٹھہر جائے ہمدم کا جگر ہو جاتی ہے

شمع مغموم سے انجم سے سکوت شب سے
بات کرنے کا ہنر ہو تو غزل ہوتی ہے

سید عابد رضوی بی اے اپریل ۱۹۳۶ع میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ اُردو ادب کے مطالعے کا شوق والد صاحب (سید غلام شاہ پوسٹ ماسٹر کراچی) سے ورثے میں ملا ۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ع میں کوئٹہ کے ایک مقامی مشاعرے میں شرکت کی ، اس کے بعد اب تک کوئٹہ میں ہونے والے ہر مشاعرے (کم و بیش) میں شریک رہے ۔ مقامی مشاعروں کے علاوہ لورالائی ، مستونگ ، قلات ، نوشکی ، لاڑکانہ ، دادو اور روہڑی کے مشاعروں میں شرکت فرمائی ۔ تراب گوالیاری ، ناز اکبر آبادی ، قابل اجمیری مرحوم اور اثر جلیلی (شاگرد جلیل مانک پوری) سے مشورے طلب کیے ہیں ۔ غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے ، خاص طور پر مغربی صنف سانیٹ بہت دل پسند صنف ہے ۔ عابد کی سانیٹ نگاری کے سلسلے میں ایک موقع پر مرحوم نیاز فتح پوری نے لکھا تھا[1] :

”ہر چند اُردو میں سانیٹ کہنے والے بہت کم ہیں ۔ ان میں سید عابد رضوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان کے سانیٹ اکثر میں نے مختلف پرچوں میں دیکھے ہیں ۔“

ایک سانیٹ اور ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

یادیں (سانیٹ)

نہ سن ہم سے ہمارے درد محرومی کے افسانے
جبین وقت کو دیکھا ہے ہم نے پرشکن ساقی

۱- نگار ، نومبر ۱۹۶۳ع - عابد سے پیشتر ش ضحیٰ اور تراب گوالیاری نے بھی اچھے سانیٹ لکھے ہیں -

فروغ سوز پروانہ نہ شمع انجمن ساقی
جہان دل میں ہر سو پھیلتے جاتے ہیں ویرانے
کہیں حد نظر تک اب یگانے ہیں نہ بیگانے
کبھی ہم بھی رہے ہیں انجمن در انجمن ساقی
ہمیں بھی لے کے پھرتی تھی کبھی دل کی لگن ساقی
مگر اب یاد بن کر رہ گئے وہ آئینہ خانے
چراغ سحر تم نے ان اندھیروں میں جلایا ہے
فلک نور سحر برسائے گا تم یاد آؤ گے
تمھارے دم سے اخلاص و طلب کا بول بالا ہے
جہاں ذکر وفا چھڑ جائے گا تم یاد آؤ گے
زمانہ بھولنا چاہے تو کیسے بھول سکتا ہے
کہ جب عہد کرم یاد آئے گا تم یاد آؤ گے

غزلیہ اشعار

صدیوں کے دکھ درد کو میرے آج چلے اپنانے لوگ
میں تو تھا ہی سودائی اب خود بھی ہوئے دیوانے لوگ
پھول کی خوشبو سے ہیں دل کی اک اک دھڑکن تک سو روپ
کیا کیا شکلیں عشق نے بدلیں پھر نہ اسے پہچانے لوگ
دیدہ و دل کی ویرانی نے سب کو بے خبر بنا ڈالا
یہ جانی پہچانی دنیا یہ جانے پہچانے لوگ
ان آنکھوں کی گہرائی میں سنا تھا عابد ڈوب گیا
گھڑ لیتے ہیں کیسے کیسے بے بنیاد فسانے لوگ

عابد رضوی کوئٹہ کی متعدد ادبی اور ثقافتی انجمنوں سے منسلک رہے ہیں ۔ آج کل ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں پی پی ہیں ۔

شعر کے علاوہ نثر میں بھی لکھتے ہیں ۔ تنقیدی مضامین ، ترجمے ،

ریڈیو ڈرامے ، فیچر اور تمثیلچے سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں - انگریزی کتاب Play Production کا اُردو ترجمہ اور نثری ڈراموں کا ایک مجموعہ چھپنے کے لیے تیار ہے -

فقیر بخش بگٹی مضامین لکھنے کے علاوہ اُردو میں شعر بھی کہتے ہیں اور مسلم تخلص فرماتے ہیں - ۱۹۴۸ع سے اب تک کے کلام کا مجموعہ موجود ہے - اس کا نام ہے ''ندائے ہاتف''- یہ مجموعہ اب تک غیر مطبوعہ ہے - اس میں پانسو کے لگ بھگ اشعار ہیں - مسلم کے اسلوب شعر گوئی کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا :

رحمت سے تیری کچھ بھی نہیں ہے بعید گر
پاؤں وہ رحم جس سے خودی و خدا ملے

نہتا ہوں میں بے چارہ سہارا دے مجھے یا رب !
مری تیغِ صداقت تیز تر ، بُرندہ تر کردے !

مسلمانی ؟ مسلمانی ہے تقلید محمدؐ بس
وگرنہ سب ہے بولہبی ! کوئی ہوتا نہیں مسلم

عہد حاضر کی سیاست :

آج ہے آدم کی بستی اس سے ویران ہو رہی
ہے عیاں انجام اس کا لیک ہے پردے کی اوٹ

گر بحر ہے متلاطم ، تم بھی کرو مشاقی
طوفان سے لڑ جاؤ گھاتوں سے جو کہ ڈالے

ملک محمد رمضان بلوچ ، لہڑی کے رہنے والے ہیں[۱] اور ڈومکی قبیلہ کی بالا چھانی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں - والد کا نام بالاچ خان تھا - آپ نے ابتدائی تعلیم قصبہ لہڑی کے پرائمری سکول میں پائی - بعد میں دینی تعلیم بھی حاصل کی - سنہ پیدائش ۱۹۲۲ع ہے - آپ ۱۹۳۶ع سے ۱۹۴۶ع تک

۱- ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع ، صفحہ ۲۷ -

ریاست قلات کی ملازمت میں رہے۔ "ریاست قلات میں اصلاحات کے لیے بے چینی" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا، جس میں مقامی سیاست پر تنقید کے بعد مطالبۂ پاکستان کی مکمل حمایت کی گئی تھی۔

ملک صاحب قلات میں ملازمت کے دوران ابتدائی ایام میں انجمن اسلامیہ مستونگ کے سیکرٹری رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ہفت روزہ "الحق" سبی کی ادارت میں آئے۔ اُنھی دنوں آپ نے پاکستان کی پُر زور حمایت کی۔

قیام پاکستان کے وقت تک آپ "الحق" سبی کے مدیر تھے۔ بعد ازاں ماہنامہ "معلم" سریاب کوئٹہ اور ہفت روزہ "تنظیم" کوئٹہ کی ادارت سے منسلک رہے۔ آپ نے ۱۹۵۴ءمیں اپنا اخبار "ساربان" مستونگ سے جاری کیا اور اب تک اس سے متعلق ہیں۔

بقول مولانا عبدالباقی درخانی: "ملک محمد رمضان بلوچ بلوچستان کے سیاسی کارکن، بے باک صحافی اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ موصوف آج بھی سیاست و ادب میں اُسی طرح سر گرم ہیں جس طرح کہ وہ اب سے چونتیس سال پہلے تھے۔"

آپ بڑی شستہ اُردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ آپ کو یہ قطعات بہت پسند ہیں:

طوفان کی موجوں سے گزرنا سیکھو
اسلام کے ناموس پہ مرنا سیکھو
ہر سیلِ حوادث سے ملاؤ پنجہ
خورشید کی مانند اُبھرنا سیکھو

گو جادۂ حیات میں خطرے ہزار ہیں
آفاق و کائنات میں خطرے ہزار ہیں
بے خواہش حیات تو کودو بلا خطر
دیکھو نہ بات بات میں خطرے ہزار ہیں

شفق ایسی ڈھلی ہے صورتِ آئینہ آنکھوں میں
کہ جیسے چشم ساقی میں سما جاتا ہے میخانہ
فراز عرش سے تا فرش جتنے بھی مقام آئے
رقم ہوتے گئے دل پر کیا جب فکر فرزانہ

سنگینئی حالات کا شکوہ نہیں کرتے
بے مہر عنایات کا شکوہ نہیں کرتے
احساس سُجھا دیتا ہے ہر ایک کو ورنہ
ہم تیری کسی بات کا شکوہ نہیں کرتے

کس حُر نے گوارہ یہ کیا ہے کہ کرے گا
احساس پہ پابندی خیالات پہ تعزیر
وہ مرد نہیں اپنی روایات کا کوئی
پہنائی نہ ہو جس نے کہ حالات کو زنجیر

عیش فیروز پوری، فیروز پور (مشرقی پنجاب، بھارت) کے ایک متمول گھرانے کے فرد تھے۔ تقسیم ملک کے بعد کوئٹہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ نسیم بھرتپوری کے شاگرد اور فراق کے اُستاد بھائی تھے۔ قدیم رسم کے مطابق کئی شاگرد ہیں۔ مشہور شاگردوں میں مذاق العیشی اور بہار کوئٹی کے نام نمایاں ہیں۔ قدیم رنگِ تغزل کے دلدادہ تھے۔ رباعی اور غزل کہتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں کوئٹہ چھاؤنی کے مشاعرے میں پڑھی گئی غزل کا ایک شعر یہ ہے:

ترے آتے ہی آئی یہ ترے بیمار میں طاقت
کہ دنیا سے اُٹھا جو اُٹھ نہیں سکتا تھا بستر سے

آپ فروری ۱۹۶۸ء کے آخری ہفتے میں فوت ہوئے۔

اثر جلیلی، جلیل مانک پوری جانشین امیر مینائی کے شاگرد رشید ہیں۔ کوئٹہ میں سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔ غزل اور مقالات خوب لکھتے ہیں۔ کوئٹہ کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں۔

آج کل ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے متعلق ہیں ۔ آپ کے کلام کا نمونہ پیشتر درج کیا جا چکا ہے ۔ چند مزید شعر یہ ہیں :

حد ادراک سمجھتا ہوں جسے
وہ تری زلف کا خم ہو شاید

منحصر ذوقِ تماشا پر ہے معیار جمال
جم گئی جس پر نظر وہ شے حسیں ہو جائے گی

مغرور ہے ناخدا کچھ ایسے
جیسے کہ مرا خدا نہیں ہے

دلیلِ عصمتِ یوسف بھی ہے جرم زلیخا بھی
ہزاروں نام ہیں اک چاکِ دامن کے زمانے میں

ایک نظم "تقدیر" کا آخری بند دیکھیے :

دولتِ قلبِ تپاں ، کشمکش بیم و رجا
اک خلش بھر خلش ایک طلب بھر طلب
دل کی دھڑکن بھی زمانے میں بڑی نعمت ہے
یہی جینے کا سبب اور یہی مرنے کا سبب
قابلِ دید ہے یہ منظر جبرِ تقدیر
عشق اِدھر نالہ بلب حسن اُدھر خندہ بلب

حضرت علیؓ کے مرثیے کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیے :

ہے پریشانِ ستم کاکلِ لیلائے سحر
زرد ہے فرطِ الم سے رخ زیبائے سحر
سر بہ خم سوگ میں ہے انجمن آرائے سحر
بوجھ سے غم کے دوتا ہے قدِ بالائے سحر

ہر کرن مہر جہانتاب کی اک سولی ہے
قلزم گریۂ خوں ہے کہ شفق پھولی ہے

اسلم افغانی ایک مقامی نوجوان شاعر ہیں جن کا مستقبل روشن نظر آتا ہے ۔ اُن کے آباؤ اجداد امیر عبدالرحمٰن خاں کے زمانے میں افغانستان سے نقل مکانی کر کے کوئٹے میں آباد ہو گئے ۔ آپ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے بھی طالب علم رہے ہیں ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

سب کا ہوں میں چارہ گر آپ میں لاچار ہوں
میں شجر سایہ دار ، دھوپ کا ہوں خود شکار

اسلم وہی انساں کہ تھا مسجود ملائک
ذلت سے اُسے خاک بسر دیکھ رہا ہوں

گلشن میں گر بہار بھی آئے تو کیا مجھے
میں گلشن حیات میں شاخ بریدہ ہوں

درخت کرتے ہیں جو آسماں سے باتیں
تو سب سے پہلے وہی پائمال ہوتے ہیں

دیار غیر اگر فردوس سے بڑھکر بھی دلکش ہو
مگر اپنا وطن ہے دوستو اپنا وطن پھر بھی

نہ ہو اندھیرا تو پھر اُجالے کا فائدہ کچھ نہیں ہے اسلم
خوشی کی ہوتی نہ تجھ کو کاوش تو غم شناسا اگر نہ ہوتا

اب بھی ٹھنڈی ہو آتشِ نمرود
کوئی پیدا کرے تو عشقِ خلیل
یوں مقدر سے لڑ رہا ہوں میں
جیسے دریا میں گاڑے کوئی کیل

ہے زمانے میں عام عریانی
گویا پتھر کا یہ زمانا ہے

جب سلامت ہے کوئٹہ اسلم
اپنی نظروں میں لکھنؤ کیا ہے

بلوچستان میں پچھلے سوا سو سال میں شعر و شاعری کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ۔ ہماری انتہائی کوشش یہ تھی کہ کوئی ایسا شاعر نظر انداز نہ ہو سکے جس کا بلوچستان سے گہرا تعلق رہا ہو اور وہ صاحب دیوان ہو ۔ خدا کا شکر ہے کہ کم و بیش ایسے تمام شعرا ہمارے اس جائزے میں شریک ہو گئے ہیں ۔ گو بلوچی منظومات میں بھی اُردو کے الفاظ و تراکیب اور بعض اوقات تو پورے پورے مصرعے بھی ملتے ہیں ، تاہم خالص اُردو شاعری میں بلوچستان میں تاجِ اولیت ملا محمد حسن براہوئی کے سر پر ہے ۔ ان کے دور سے لے کر اب تک اُردو بلوچستانی شعرا کے اظہار و ابلاغ کا نہایت کامیاب ذریعہ رہی ہے بلکہ یوماً فیوماً اُن کا جذبہ اظہار اُردو کی قوتِ اظہار سے بھی کام لے رہا ہے اور اس میں ایک قابل فخر انداز میں اضافہ بھی کر رہا ہے ۔

سوا سو سال کے اس دور میں ہمیں تین قسم کے شعرا سے سابقہ پڑتا ہے ۔ اول وہ شعرا جن کے خاندان و قبائل پشت ہا پشت اور قرن ہا قرن سے بلوچستان کی سرزمین میں پیوست ہیں مثلاً ارنڈو خاں نوتھانی ، ملا محمد حسن ، میر مولا داد ، ملا مزار بنگلزئی ، سید عابد بلوچستانی ، عبدالحق زبور ، محمد حسین عنقا ، نسیم تلوی ، اشرف خاں ، آزار ذگر مینگل ، میر مٹھا خان مری ، گل خاں نصیر ، شیر علی ، بہرام مینگل ، سردار گل محمد زیب ، تاج محمد تاجل ، عبدالرحمٰن غور ، آزاد جمالدینی ، عطا شاد ، عابد شاہ ، ڈاکٹر حمید ، میر عبدالباقی ، فقیر بخش بگٹی ، ملک رمضان بلوچ ، سہیل بوستانی ، یوسف عزیز مگسی ، حریم اوستوی ، اسلم افغانی وغیرہ ۔ دوم وہ شعرا جن کے خاندان انگریزی اقتدار کے بعد بصیغہ ملازمت یا کاروبار کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر حصوں میں گئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے ۔ ان میں سید غلام علی الماس ، نبی بخش اسد ، محشر رسول نگری ، اصغر انبالوی ، غلام محمد جمیل ، ارشد امروہوی ، آغا صادق ، رفیق راز ، عابد رضوی ، جمیل بھٹی ، اختر واحد قاضی ، عیش فیروزپوری ،

نور محمد ہمدم ، اثر جلیلی اور ماہر افغانی وغیرہ شامل ہیں۔۔۔سوم وہ شعرا جو ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں کچھ عرصہ بلوچستان میں مقیم رہے اور وہاں کی فضا میں نغمہ گر و نغمہ پرداز رہے - اُن میں ڈاکٹر ناشط صدیقی ، نذیر احمد شیخ ، صمصام ، رفیق ضیا ، نذر ، فاروق ، امانت ، مذاق العیشی ، قیوم راشد ، ش ضحیٰ ، جعفر طاہر ، افضل کوٹلوی ، ثریا فخری ، رشید نثار ، صادق نسیم ، شعیب حزیں ، عین سلام ، کامل القادری ، صادق شاذ اور نشتر جالندھری وغیرہ شامل ہیں[1] - ممکن ہے کچھ اور شعرا بھی بلوچستان میں آئے ہوں لیکن چونکہ ان کا قیام مختصر تھا اور وہ نہ تو مقامی ماحول کو متأثر کر سکے ، نہ مقامی ماحول سے متأثر ہو سکے اور جس ذہنی ماحول سے وہ آئے تھے اُسی میں وہ یہاں سے واپس بھی چلے گئے لٰہذا ان کا ذکر خواہ مخواہ طوالت ہی کا باعث ہو سکتا تھا - بلوچستان میں اُردو شاعری کا نقش اُبھارنے میں جن شعرا نے کام کیا اُن میں سے ہماری معلومات و دانست کے مطابق کوئی بھی شاعر نظر انداز نہیں ہؤا -

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اُردو شاعری کو بلوچستان میں لانے والے دوسرے یا تیسرے زمرے کے شعرا تھے - ہمارے مذکورہ بالا جائزے سے یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ مقامی شعرا بذاتِ خود ہی اُردو شاعری کی طرف مائل ہوئے - اُنھوں نے براہِ راست فارسی شاعری سے اپنی عنانِ تخیل اُردو کی طرف موڑی اور بلا واسطہ اُردو کے اولین شعرا کا مطالعہ کیا - یہاں شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ بر صغیر میں مرکز اسلام سے مربوط ہونے والا اولین خطہ یہی بلوچستان تھا - پنجگور (عربی فنزبور) ، خضدار (عربی قصدار) وغیرہ سب سے پہلے اسلامی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئے - یہیں سب سے پہلے عرب اور ایرانی علما ، فضلا ، تاجر ، کشوری عمال اور لشکریوں کا رابطہ مقامی آبادی سے ہؤا اور باہمی اظہار خیالات کی ضروریات نے غالباً سب سے پہلے یہیں کسی ایسی زبان کے ہیولے کا روپ

۱- ان کے علاوہ تینوں قسم کے کئی شعرا کا ذکر ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' میں بھی آ چکا ہے -

دھارنا شروع کیا جو ان مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے لیے مشترکہ ذریعۂ اظہار کا کام دے سکتی - بلوچی منظومات میں اُردو الفاظ و تراکیب اور مصرعے اور بلوچستانی اُردو شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب اور خیالات و جذبات کا استعمال غالباً اسی تاریخی تقاضے کا پیدا کردہ تھا -

لیکن گل و بلبل اور زلف و رخسار کی بلوچستانی شاعری اگر فارسی شاعری کے تتّبع کا نتیجہ تھی تو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ صرف آغاز اُردو تک ہی محدود رہی - مقامی اُردو شعرا نے بہت جلد اُردو کو اپنی قومی خودی کا ہم آہنگ بنا لیا اور اُن کے نغمات و نگارشات اُن کی اپنی تاریخی روایات کے حامل اور عکاس ہو گئے - بلوچستان کے بوقلموں جغرافیائی ماحول میں پروان چڑھنے والے متنوع تمدنوں میں بعض مشترک ذہنی اوصاف و تاریخی روایات نسلاً بعد نسل اور سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں : مثلاً آزادی پسندی ، انفرادی خودی ، جانبازی اور جنگ جوئی ، دلیری ودلاوری ، ہر قسم کے تسلط و استیلا سے بے زاری اور اس کے خلاف ایک ان تھک جذبۂ مقاومت وغیرہ -

انگریزی اقتدار کی آمد پر بلوچستان کے اطراف و اکناف میں انگریزوں کے خلاف جو طویل جد و جہد شروع ہوئی اُس میں یہ تمام اوصاف و اقدار بر سرِ کار رہے - انگریزی ظلم و تشدد کے خلاف مسلسل صف آرائی اور جنگ آزمائی سے اہل بلوچستان میں اپنے معاشرے اور گرد و پیش میں بھی ظلم و تشدد کے مظاہرات دیکھنے کی توفیق پیدا ہوئی اور وہ اپنے معاشرے کو معاشی ناہمواریوں اور معاشرتی عدم مساوات سے بچانے کی تگ و دو میں بھی مصروف ہوئے - چنانچہ مقامی شعرا میں نہ صرف ہمیں مقامی رنگ ملتا ہے ، نہ صرف ان کی منظومات کی فضا مقامی ہے ، نہ صرف اُن کی روایاتِ کہنہ ملتی ہیں ، نہ صرف دیو استبداد سے ٹکرانے کا عزم ملتا ہے ، بلکہ خود اپنے قبائلی معاشرے میں اونچ نیچ کو ختم کرنے کا شعور بھی نظر آتا ہے ، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو بلوچستانی اُردو شاعری نے اُردو ادب کو دی ہیں اور جن کی وجہ سے اس شاعری کا اُردو شاعری میں اپنا ایک مخصوص مقام ہے اور رہے گا - یوسف عزیز مگسی ، عبدالحق زہور ، عنقا ، نسیم تلوی ،

اشرف ، آزاز ، میر مٹھا خاں ، غور ، میر گل خاں نصیر اور عطا شاد وغیرہم کی اُردو شاعری اگر ایک طرف بلوچستانی روایات و مزاج کے عین مطابق ہے ، تو دوسری طرف مجموعی اُردو شاعری میں اس کی جانداری ، جاں بازی ، تشدد ، بیزاری ، مساوات پسندی اور آزادی خواہی ایک منفرد مقام رکھتی ہیں اور خود بخود اس شاعری کو اُردو کی عظیم شاعری کے ہم پلہ لے آتی ہیں ۔

اگرچہ دوسرے اور تیسرے زمرے کے شعرا کا بلوچستان سے رابطہ اتنا گہرا اور قدیم تو نہیں ، تاہم ان میں سے بعض نے بلوچستانی فضائیت ، روایات اور نہجِ حیات سے اتنی راز دارانہ قربت حاصل کر لی ہے کہ انھوں نے بھی روحِ بلوچستان کے زمزمے بگوشِ خود سنے ہیں اور بلوچستان کے طول و عرض میں جو دھڑکنیں پوشیدہ ہیں ، وہ جذب کرلی ہیں ۔ ان میں سید کامل القادری سر برآوردہ ہیں اور بہت معنی خیز امکانات کو آشکار کرتے ہیں ۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلوچستان میں ظہور پذیر ہونے والی اُردو شاعری مجموعی اُردو شاعری سے الگ تھلگ ہے ۔ درحقیقت وہ تمام موضوعات جو اب تک اُردو شاعری کی غذا رہے ہیں ، بلوچستانی شاعری میں بھی موجود ہیں ۔ شاعری گل و بلبل کی ہو یا مزاحیہ ، متصوفانہ مضامین کی آئینہ دار ہو یا رندانہ مضامین کی ، جمالیاتی اور رومانوی طرز کی ہو یا حقیقت پسندانہ ، برائے شاعری ہو یا برائے زندگی ، ہر قسم کا مضمون اور انداز فکر و نظر اس میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ گل و بلبل کی شاعری میں اگر ملا محمد حسن میر کارواں ہیں تو مزاحیہ شاعری میں سید غلام علی الماس اور نذیر احمد شیخ سر فہرست ہیں ۔ زبور کی طرز اگر جمالیاتی اور رومانوی ہے تو ملک رمضان کا انداز حقیقت پسندانہ ہے ۔ اگر اُردو شاعری کے روایتی مضامین یوسف پوپلزئی اور عابد بلوچستانی کے یہاں اپنی بہار دکھلاتے ہیں تو قدیم و جدید دونوں قسم کے مضامین آغا صادق کے یہاں آب و تاب سے جلوہ گر ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر ناشط صدیقی اپنی ہنگامیت کے باوجود بسا اوقات دور کی کوڑی لاتے ہیں تو زیب صاحب اُردو شاعری کے اساتذہ پر تضمینات میں اچھوتے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ قیوم راشد اگر کوزۂ رباعی میں دریائے معانی بند کر سکتے ہیں تو ضحیٰ صاحب بلوچستان کے حسنِ مخفی کو الفاظ

کے شیشے میں اُتار سکتے ہیں - مذہبی صداقتیں اگر محشر رسول نگری کے قلم سے مترشح ہوتی ہیں ، تو موجودہ زندگی کی حقیقتیں عین سلام کے کلام سے عکس انداز ہیں - غرض نظر کا ہر زاویہ ، خیال کی ہر پرچھائیں ، تصور کی ہر اُڑان ، فکر کا ہر پہلو بلوچستانی اُردو شاعری میں جلوہ گر ہے اور اُس کی یہی وسیع دامنی اُس کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے اور یوسف عزیز مگسی کی روایت اُسے کبھی محض تخیل پرست نہیں ہونے دے گی -

نثر نگاری

بلوچی نامہ : ۱۸۷۵ع میں رائے بہادر منشی ہتو رام سی آئی ای چیف نیٹو اسسٹنٹ ایجنٹ گورنر جنرل بہادر بلوچستان نے تصنیف کیا تھا ۔ یہ دوسری بار ۱۸۹۶ع میں مطبع مفید عام لاہور میں منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز کے اہتمام سے چھپا ۔ ضخامت ۲۰۱ صفحات ہے۔ اس کے چار حصے ہیں :

بحر اول : در باب تفصیل و تشریح اسماء و حروف ۔

بحر دوم : متضمن بتفصیل و ترتیب فاعلات (بلوچی کے ساتھ ساتھ فارسی بھی دی گئی ہے) ۔

بحر سوم : مشعر گفتگو و حالات معمولی و رسمیہ اہل زبان ۔

بحر چہارم : در بیان لغات ۔

بلوچی کے ساتھ ساتھ اُردو ترجمے بھی دیے گئے ہیں ۔ دیباچے میں کتاب کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی گئی ہے :

''بلوچی نامہ'' اظہر من الشمس ہے کہ اسم با مسمٰی ہے ۔ سبب تصنیف و سہارت کا یہ کہ سال ۱۸۶۷ع سے آمد و رفت بلوچان کوہستانی از قوم مری و بگٹی بعلاقہ ہذا شروع ہوئی ۔ راقم کو بسبب ملازمی پیشی محکمہ اسسٹنٹی سب ڈویژن راجن پور اقوام مذکورہ سے ہر وقت تعلق گفتگو و ملاقات کا تھا ۔ اُن دنوں میں مردمان مذکور زبان دیسی سے بالکل لا علم ۔ اس باعث واقف ہونا زبان بلوچی کا امر ضروری متصور ہو کر استعمال ہوتا رہا ۔ بعد چندے جب راقم کچھ ماہر ہو گیا ، اشتیاق ترتیب قواعد زبان ہذا کا پیدا ہؤا ۔ چنانچہ سال ۱۸۷۱ع میں بر وقت تصنیف کتاب ''گل بہار'' متضمن تواریخ ضلع ہذا و سرحد بلوچستان در باب

تالیف ''بلوچی نامہ'' ہذا وعدہ دیا گیا تھا لیکن بسبب نہ دیکھنے چندان شوق باحدے بندہ خاموش رہا ۔ سال ۱۸۷۲ع سے رزولیوشن گورنمنٹ عالیہ ہند متضمن تاکید تلقین زبان سرحدی بنام حکام اضلاع سرحدات صادر ہوا ، تب سے حکام سول ضلع ہذا دریافت و حصول ماہیت زبان ہذا کے مشتاق و مجاہد ہوئے ۔ گویا کہ تب سے اس زبان کا قدر و منزلت بڑھا ۔ اب بہت لوگ مشتاق اس زبان کے پائے جاتے ہیں ۔

اول مسٹر بروس صاحب بہادر سابق اسسٹنٹ کمشنر راجن پور نے اس میدان میں قدم اُٹھایا لیکن صاحب ممدوح بعرصہ جلدی بتقریب تبدیلی تشریف لے گئے ، بجائے اُن کے مسٹر گلیڈ سٹون صاحب بہادر تعینات ہوئے کہ صاحب موصوف بموجب محنت خود امتحان میں بخوبی کامیاب ہو کر ایک کتاب قواعد بلوچی بخط انگریزی تصنیف کی جو صاحبان انگریز کے واسطے نہایت مفید و رہبر ہے ، بلکہ صاحب محتشم الیہ ممتحن زبان بلوچی کے ہیں ۔ ازاں بعد مسٹر جنکسن صاحب بہادر واسطے عرصۂ قلیل اس سب ڈویژن پر تعینات ہو کر دریافت زبان ہذا میں کوشش کمال کیا کہ بموجب فراست و علو طبعی خود امتحان میں نہایت تعریف کے ساتھ پاس ہوئے ہیں ۔

نیز مسٹر رائے بنسن صاحب بہادر تھوڑا عرصہ اس سب ڈویژن پر رہے اور آموخت زبان ہذا میں جہد کرکے امتحان پاس کیا ۔ یہ کمترین بخدمت ہر چہار صاحبان مقدم الوصف دریافت ماہیت و انکشاف اصلیت زبان ہذا میں شامل حال رہا ۔ اس بحر بے کنار سے جیسا گوہر مقصود کا ہاتھ لگتا گیا ، بطور یاد داشت جمع کرتا گیا ، کیونکہ زمانۂ قدیم کی کوئی کتاب اس زبان میں نہیں تھی ' اور بسبب ناخواندہ ہونے اہل زبان کے سخن مطلوبہ کا مطلب نہایت مشکل سے برآمد ہوتا تھا ۔ اب حسب الارشاد مسٹر گلیڈ سٹون صاحب بہادر و بفرمایش پُر زیبایش صاحب سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب اُن اجزائے مختلفہ کو حسب ناقص عقل خود بقرینہ موافق

ترتیب دے کر یہ بلوچی نامہ تصنیف کیا۔''

متذکرہ بالا عبارت اُجاگر کرتی ہے کہ ایک صدی قبل سر زمین بلوچستان میں اُردو لکھنے کے کیا رنگ ڈھنگ تھے۔ اُن دنوں اظہار میں پیچیدگی اور ژولیدگی پائی جاتی تھی۔ ہماری اب تک کی تحقیق کے بموجب یہ پہلی نثری طبع شدہ کتاب کا نمونہ ہے جو اس خطے میں تحریر کی گئی اور جس کا مصنف بھی یہیں کا باسی تھا۔

تاریخ بلوچستان: ہتو رام، رائے بہادر سی آئی ای کا وطن راجن پور سب ڈویژن ضلع ڈیرہ غازی خاں تھا۔ یہ علاقہ اُن دنوں بلوچستان کا ایک جزو تھا۔ اُس نے ۱۸۵۹ع سے ۱۸۷۵ع تک ضلع مذکور اور بعد ازاں ۱۸۹۶ع تک بلوچستان میں ملازمت کی اور بلوچوں، بلوچ علاقوں نیز براہوئیوں پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اُن میں سے اہم ترین ''تاریخ بلوچستان'' ہے جو ۱۹۰۷ع میں لاہور میں چھپی۔ ۷۶۳ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی معیاری اور جلد مضبوط ہے، ان دنوں نایاب ہے۔

جہاں تک ہتو رام کے واقعاتی پہلو کا تعلق ہے، بلوچستان وغیرہ میں انگریزی دور کا وہ نہ صرف عینی شاہد ہے بلکہ اس حکومت کا ایک پرزہ بھی تھا، لہذا اس میں صداقت موجود ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے ''آقاے نامدار'' کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر اس کے مبالغہ و غلو کو نکال دیا جائے تو وہ بحیثیت مورخ قابل اعتماد ہے۔

جہاں تک انگریزوں سے پہلے کے براہوئی اور بلوچ ادوار و تواریخ کا تعلق ہے، اُس نے اپنی تاریخ کی بنیاد اخوند زادہ محمد صدیق اور میرزا احمد علی کی ہنوز غیر مطبوعہ فارسی تواریخ پر رکھی ہے اور ان حضرات کے بہت طویل و بسیط اقتباسات دے دیے ہیں۔

علاوہ بریں اس نے بلوچستان کے سردار خیلوں سے شجرات نسب اور دیگر معلومات بھی حاصل کرنے میں بہت کاوش کی ہے۔ گو کہیں کہیں محض عوامی افواہوں اور لوک قصوں کو بھی اپنی تاریخ میں شامل کر دیا ہے، تاہم مجموعی طور پر اُس کی تاریخی عظمت سے انکار ناممکن ہے۔

وہ پہلا مقامی شخص ہے (ڈیرہ غازی خاں کا) جس نے بلوچوں، براہویوں کی تاریخ لکھنے کی طرف توجہ کی۔

طرز تحریر سادہ ہے لیکن جملے کچھ پیچیدہ و ژولیدہ اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ تاہم وہ بلوچ علاقوں میں اُس اُردو زبان کا بہترین و اولین نمونہ پیش کرتے ہیں جو اُس زمانے میں لکھی جاتی تھی۔ مثلاً :

سپاس نامہ بصورت نطق

باظہارِ ممنونیتِ احسانات بیکراں و اقرار مشکوریتِ تفقدات و موہباتِ بے پایان جناب فیض مآب، معلیٰ القاب، معدلت گستر فیض رساں داد گر کرنل سر رابرٹ سنڈیمن صاحب بہادر نجم الہند کے سی ایس ای ایجنٹ جناب مستطاب نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ماسور بلوچستان از جانب اخلاص جوانب سردار جام عالیخاں بتقریب تحصیل ریاست موروثی لس :

اے میرے محسن، کرم فرما، جناب کرنل سنڈیمن صاحب بہادر! نایٹ کمانڈر افدی سٹار آف انڈیا ملک بلوچستان کے دانا اور عاقل منتظم اور سرکار معدلت آثار قونیہ مخیمہ برطانیہ کے فرماں فرمائے ہند کے عاقل ہوشیار نائب مناب و اے حضرات حاضرین! میں آپ کے روبرو اس دربار متبرکہ میں اپنے بادشاہ فخر سلاطینِ دہر و صدر خواقین عصر، رافع الویۂ عدل و داد، قامع بنیانِ ظلم و فساد، خورشید آسمانِ ابہت و بختیاری، اختر اوجِ سلطنتِ شہر یاری، اعلیٰ حضرت، ہمایوں قدر قدرت کوین وکٹوریا یابدے گریس آف گاڈ ملکہ معظمہ سائر جزائر گریٹ برٹن و ائرلنڈ و قیصرۂ محترمۂ ہندوستان لا زالت اعلام سلطنتہا و دامت شوکتہا و حشمتہا کی عدالت گستری و نصفت پژوہی کا کیا بیان کروں کہ اُس کے فیض و داد کا شہرہ قاف سے قاف تک پہنچا اور اُن کے عہدِ حکومت اور سلطنت میں ہزاراں امراء و روسا و والیانِ ملک تو ایک طرف بلکہ ہر صغیر و کبیر و امیر و فقیر اپنے اپنے حقوق

اور مطالب کو پہنچتے آئے ہیں ۔ کوئی اپنے حق سے آج دن تک محروم و مایوس نہ رہا ۔ غرض تمام خلق اللہ اس عادل و باذل دولت مخیمۂ عالیۂ انگلشیہ کے عہد میں علی الخصوص اس ملکۂ مخدرۂ محترمہ کے دور سلطنت میں من کل الوجوہ مرفہ الحال بڑی آسائش اور چین سے بسر کرتے ہیں ۔ اور بحکم ''الناس علیٰ دین ملوکہم'' جو جو فرمان روا اور حکام ملک ہندوستان کے انتظام پر مامور ہو کر آتے ہیں ، وہی اپنے عدل و انصاف سے ہر ایک مستغیث و داد خواہ کے داد کو پہنچ کر وہ داد دیتے ہیں کہ کسی اور دارالسلطنتِ روئے زمین کے حکام کے ایسے اوصاف سنے نہیں جاتے ہیں ۔ چودہ پندرہ سال کے عرصہ کے اول ملک بلوچستان میں عجب بے اعتدالی پھیلی ہوئی تھی ۔ بہت شریف اور بڑے بڑے سردار بے انصافی کی ظلمت میں پڑ کر اپنے حقوق سے محروم اور ملک سے دور ہو گئے تھے ۔ اس زمانے کے فرمان فرما جناب نواب لارڈ لٹن صاحب بہادر گورنر جنرل ہندوستان کے عمدہ تجویز اور تشخیص سے ہمارے یہ ہر دل عزیز و مدبر وافر تمیز جناب کرنل سنڈیمن صاحب بہادر نجم الہند گورنمنٹ ہند کے نائب یعنی ایجنٹ ہو کر ملک بلوچستان رتق و فتق و نظم و نسق پر مامور ہو کر جب اس ملک میں رونق افروز ہوئے ، پہلے اپنی رسائیِ عقل و وفور ذہن سے سرداروں میں سلوک اور محبت پیدا کیا اور پھر بتدریج سب سرداروں کے رائیوں کو اپنی رائے محسنہ و بے ریا کے ساتھ متفق کر کے ہر ایک منصوب الحق کو اپنے حق پر پہنچایا کہ وہ سب حالات اُس زمانے کے اخبارات انگریزی و فارسی و ہندی میں شرح وار مندرج ہو کر عالم پر ظاہر و ہویدا ہوئے تھے کہ جن کی تشریح و تفصیل اس وقت موجب طول کلام ہیں ۔ مگر بصورت تمثیل ایک روئداد تازہ بیان کرتا ہوں ۔ خیال فرماویں کہ عرصہ ایک سال ہوا ہے کہ جب میرے والد بزرگوار قبلۂ کونین کعبۂ دارین المرحوم المغفور المبرور فردوس آشیان جناب جام صاحب

سردار جام میر خانصاحب بہادر طاب اللہ ثراہ و حوی الحسنہ مثواہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے تو بعد اُن کے انصاف و حق کے رو سے میں جو اکبر اولاد اس مرحوم کا ہوں ، اُن کا جانشیں اور وارث اس ملک موروثی کا تھا ۔ مگر افسوس ہے کہ حاسدوں اور نمک حراموں نے از روئے حسد و حقد کے چاہا کہ میری حق تلفی کر کے مجھے اپنے حقوق سے بالکل محروم کر دیویں ۔ مگر الحمدللہ اس عادل اور باذل ، فیاض و داد گستر حکومت بہیۂ برطانیہ کے عہد میں کوئی اپنے حق سے محروم نہیں رہتا ۔

پس حکام معدلت فرجام دولت عالیہ کے غور و انصاف کی طفیل سے اور میرے قدیم محسن جناب کرنل سر رابرٹ سنڈیمن صاحب بہادر کے منصفانہ سفارشات و مدبرانہ تحریرات کے وسیلے سے میں اپنے حقوق موروثی کو پہنچ کر آج بہ تحصیل مسند ریاست ممتاز و فائز ہؤا ہوں ۔ فی الحقیقت میں کسی زبان سے اپنی اس میرے محسن کرم فرما اور مہربان کے عنایات و تفقدات کے شکریہ کے عہدے سے بر نہیں آ سکتا ۔ مگر میں اپنے صدق دل سے اس مربی و محسن کی تسلی اس اقرار سے کرتا ہوں کہ مادام العمر میں ممنون احسان و مرہون تشکر و امتنان دولت مخیمۂ عالیۂ برطانیہ کا رہ کر ہمیشہ اس کے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن رہوں گا اور میں کسی حالت اور وقت میں اپنے اس ناصح مشفق و محسن مہربان یعنی جناب کرنل سنڈیمن صاحب بہادر کی صلاح اور صواب دید کے سوا کسی امر میں اقدام نہ کروں گا ۔ جو صلاح میرے خوبی کے اور ملک کی بہبودی اور میری رعایا کی رفاہیت اور آسودگی کے باب میں مجھے دیں گے ہرگز اُس سے تخلف نہ کروں گا ۔

اب التماس کرتا ہوں اور امید وار ہوں کہ ایجنٹ صاحب بہادر میرے اس اخلاص اور جذویت کو اعلیٰ حضرت ہمایوں ملکۂ معظمہ و قیصرۂ محترمہ کے حضور فیض معمور میں معروض رکھیں گے اور گورنمنٹ ہند پر بھی میرے اس اخلاص کو ظاہر فرماویں گے اور

آپ بھی مجھ سے ہر طرح مطمئن خاطر ہو کر ہمیشہ اپنے توجہاتِ محسنانہ مجھ پر فرماتے رہیں ۔ لیکن اس کلام کو اس دوسرے شکریہ پر پورا کرتا ہوں ، یعنے میں نہایت سرافراز اور مفتخر ہؤا ہوں کہ جناب کرنیل سر رابرٹ سنڈیمن صاحب بہادر بمعہ اپنی لیڈی صاحبہ علیا مخدرہ محترمہ سفر کی مشقت اور محنت کو اپنے پر اختیار کر کے میری کمال سرافرازی کے لیے آج اس دربار میں جس کو اگر میں رشک گلزار جناں کہوں تو بجا ہے ، قدم رنجہ فرما کر میری مسند نشینی کے جلسے میں شامل و شریک ہوئے ہیں ۔ میں اپنے دل سے چاہتا ہوں کہ اللہ جناب علیا لیڈی صاحبہ اور اس میرے محسن صاحب بہادر کو اُن کے عزیزوں اور رفیقوں کے ساتھ دیر گاہ سلامت رکھے ، میں اپنے دوست صادق الاتحاد فخامت مآب رائے صاحب جناب لالہ ہتھو رام صاحب سی ۔ آئی ۔ ای فرسٹ نیٹو اسسٹنٹ ایجنٹ متعین لس کا نہایت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس عرصہ ایک سال تک اس ملک میں اپنے انتظامات عمدہ اور اہتمامات عمدہ سے ہر ایک قسم کی درستی و آراستگی فرمائی اور رعایا پر اُن کی بے کسی کی حالت میں نہایت اچھی سرپرستی کے تمام طرق و شوارع کو ہر طور سے مامون و محفوظ رکھا ۔ نئے نئے رستے نکالے ہیں ، شہروں کی صفائی کی تجویزیں کی ہیں اور ہر ایک داد خواہ کو اپنے عدل و انصاف سے اپنے حق پر پہنچاتے رہے ہیں ۔ اے سرداران و امیران و حاضرین مجلس ! میں آپ صاحبوں کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ تکلیف کر کے اس جلسے میں تشریف لائے ہو ۔ فی الحقیقت صداقتِ محبت و کمالِ سودت آپ صاحبوں میں دیکھتا ہوں ۔ جیسے آپ نے میری اس خوشی کے مجمع میں آ کر مجھے مسرور اور خوش کیا ہے ، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنی مرادات کو پہنچا کر خوش اور مسرور رکھے ۔"[1]

۱- تاریخ بلوچستان ، ہتورام ، صفحات ۶۰۶ - ۸۰۸ -

اس ''سپاس نامے'' کے بعد سردار حاجی جام علی خاں صاحب بہادر کی مسند نشینی کے شکریے میں سرداران و عمائد و سائر رعایائے ملک لس کی جانب سے ''خطابہ باظہار تشکر و امتنان'' بحضور کرنل رابرٹ سنڈیمن بھی اُردو میں پیش کیا گیا جس میں یہ دو قطعے بھی درج کیے گئے ہیں :

روز و شب ہم مانگتے ہیں باحضور دل دعا
رکھتے ہیں در گاہ ایزد سے اجابت کی رجا
خوش رہے دایم ابھی سڈیمنِ منصف مزاج
اور رہے آفاتِ ارضی و سماوی سے بچا

ہو مبارک تجھ کو اے سرکار جام عالی وقار
سروری لس کی ، رہے دایم تو اُس پر پائدار
سب ترے احباب کو ہووے نشاط جاوداں
دشمن و حاسد رہیں تیرے سدا مقہور و زار

یہ تقریب ۲۱ جنوری ۱۸۸۹ع کو منعقد ہوئی تھی[۲]۔ اُردو تحریر کا یہ انداز قریباً ایک صدی (۸۰ سال) پہلے کا ہے جو بلوچستان میں جاری و ساری تھا ۔

علم و عمل طب : لفٹیننٹ کرنل بھولاناتھ انڈین میڈیکل سروس کی تصنیف ہے ۔ یہ ۱۹۱۵ع میں مفید عام پریس لاہور میں باہتمام رائے بہادر لالہ موہن لال چھپی ۔ اُن دنوں کرنل بھولا ناتھ لور الائی (کوئٹہ ڈویژن) میں مقیم تھے ۔ پہلے صفحے پر یہ رباعی درج ہے :

اسرار وجود جملہ نہفتہ بماند
واں گوہر بس شریف ناسفتہ بماند
ہر کس بدلیل عقل چیزے گفتند
آں نکتہ کہ اصل بود نا گفتہ بماند

۱- تاریخ بلوچستان ، ہتورام ، صفحات ۶۰۹ - ۶۱۱ -
۲- بلوچستان ، صالح محمد ، صفحہ ۱۷۱ -

انتساب، حکیم اجمل خاں کے نام ہے۔ دیباچے میں لکھا گیا ہے:
''مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۱۵ء مقام لورالائی، بلوچستان۔
بھولا ناتھ نے لکھا ہے:

''مجھے اس شریف پیشہ اور علم طب تحصیل کرتے ہوئے پینتیس سال کا عرصہ گزرتا ہے۔ اس عرصۂ دراز میں دنیا کے مختلف ملک دیکھنے میں آئے، بقول سعدی:

در اقصائے عالم بگشتم بسے
بسر بردم ایام با ہر کسے
تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم''

یہ کتاب اُن یونانی طبیبوں کے استفادے کے لیے لکھی گئی جو عموماً انگریزی سے ناواقف اور جدید معلومات سے بے بہرہ تھے۔ مصنف نے نفس مضمون کو احسن طریق سے پیش کیا ہے۔ جا بجا اُردو اور فارسی کے اشعار مندرج ہیں جن سے کسی قسم کا تکدر نہیں ہوتا۔

نصف صدی پیشتر ایسے اہم موضوع پر لورا لائی (بلوچستان) سے اُردو میں ایسی کتاب کا منظر عام پر آنا یقیناً قابل تحسین ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے لورا لائی میں ادبی سرگرمیوں کا جو دور دورہ تھا، اس کا ذکر ''ادبی انجمنیں اور مشاعرے'' کے تحت آ چکا ہے۔

۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۰ء کے مابین لورا لائی ہی میں ایک ناول بنام ''محبت کا دیوتا عرف برابر کی چوٹ'' جناب جگن ناتھ سیٹھی ایک ہندو نوجوان تاجر نے شائع کرایا جسے لورا لائی کے اکثر اہل ذوق حضرات نے پڑھا۔ افسوس کہ اب یہ ناول نایاب ہے۔

میر یوسف علی خاں عزیز مگسی مرحوم کی جدو جہد کا آغاز ان کے ایک مقالے سے ہوا تھا جو ''مساوات'' لاہور کی اشاعت مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء میں چھپا تھا۔

''آج ساری دنیا شاہراہ ترقی پر گامزن ہے مگر بلوچستانی کچھ ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ جاگنا حشر کو معلوم ہوتا ہے۔

بلوچستانیوں سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ خدا کے لیے ساری دنیا کو ہنسنے کا موقع نہ دیجیے - یہی وقت ہے اگر اسلاف کا خون آپ میں اب تک موجود ہے تو اٹھیے اور اس طرح اُٹھیے جس طرح آپ کے اسلاف اُٹھا کرتے تھے - سیاسی غلامی کی زنجیروں کو ایک نعرۂ حریت لگا کر توڑ ڈالیے اور قوموں کے لیے مشعل راہ بن جائیے - باہمی حسد و رقابت اور ان لغویات کی بیخ کنی کیجیے اور صرف اس آتش رقابت سے اپنے سینوں کو مشتعل کیجیے کہ جنگ آزادی میں تم سے زیادہ کوئی بہادر نہ نکلے اور تم سے پہلے وہ جام شہادت نوش نہ کرے - خدا کے لیے بزدلانہ اور رجعت پسندانہ ذہنیت کو مٹا دیجیے اور دیکھیے تاریخ کیا کہتی ہے - مادر وطن کی قربانیوں سے سبق لیجیے -''

شمس گردی : شائع کردہ انجمن اتحاد بلوچاں ، از لاہور ، ۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء ، صفحات ۶۴ -

اس کا ذکر ''تحریکات آزادی'' میں آ چکا ہے - میر یوسف علی خان عزیز مگسی نے اس کتابچے کا دیباچہ لکھا تھا - فرماتے ہیں :

''یہ ایک قوم کی داستان بربادی ہے اور اس کا احساس بیداری ہے - بیسویں صدی کے ایک فرعون (شمس شاہ) کے لیے عصائے موسوی ہے - برادران وطن کی بے حسی اور تن آسانی کے لیے ایک تازیانۂ بیداری ہے اور "فمن اُعتدٰی علیکم "فاعتدوا علیہ بمثل ما اُعتدوا پر کاربند ہے -''

یوسف عزیز اسی دیباچے میں شمس شاہ وزیر اعظم کی مستبدانہ حکومت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے قلات کے حکمران کے بارے میں ایسے وضاحت کرتے ہیں —— یہ بلوچستان میں قریباً چالیس سال پہلے لکھی جانے والی اُردو کا نمونہ ہے :

''قدیم رواج ملک کی رو سے یہ عام جمہوری رعایا کا مسلمۂ حق ہے کہ اپنا فرمانروا خود منتخب کرے - ہم بلوچ اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتے ، اس لیے برٹش حکومت کی توجہ اس طرف

خاص طور پر مبذول کراتے ہوئے اپیل کی جاتی ہے کہ براہ مہربانی رعایا کے اس واجبی حق کو سر شمس شاہ کی ذاتی خواہشات پر قربان نہ کیا جائے - ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انتخاب جانشینی تخت قلات کا مسئلہ حل کرنے کے واسطے چند سرداروں کے سامنے پیش کیا جائے گا - لیکن یہ واضح حقیقت ہے کہ جب تک سر شمس شاہ بر سر اقتدار ہے اُس وقت تک سردار اُس سے ڈرتے ہیں اور اُس سے بیزار اور تنگ ہونے کے باوجود اس کی مخالفت نہیں کر سکتے لیکن ہم واضح کیے دیتے ہیں کہ سرداروں کا ایسا کوئی انتخاب صحیح انتخاب تسلیم نہیں کیا جائے گا جو اپنے ملک کی قدیمی روایات کو پس پشت ڈال کر اپنے ان قبائل کے صلاح و مشورہ کے بغیر کریں گے جن کی وہ نمایندگی کر رہے ہیں -"

محراب گردی : الحنیف پریس ، جیکب آباد میں باہتمام مولوی محمد حسین ولد مولوی گل محمد کھاوڑ طبع ہوئی - ضخامت (میگزین سائز) ۲۵ صفحات، ٹائپ میں چھپی تھی - سال اشاعت ۱۹۳۳ع -

اس میں نواب صاحب سردار محراب خان بگٹی کے مظالم کی سرگزشت بیان کی گئی تھی - سرورق پر یہ آیت درج تھی :

"ان اللہ لایحب الظالمین -"

مظلوم بگٹی قوم کی فریاد اور انسان ذات سے انسانیت کے نام پر درد مندانہ اپیل

مظلوم میر خاوند بخش ولد سردار نظر خان عمزادہ نواب بگٹی نے بغرض حصول انصاف و تحصیل نجات از مظالم بگٹی چھپوا کر شائع کیا -"

فقیر بخش بگٹی نواب محراب خان کے بیٹے میر عبدالرحمٰن خان بگٹی کے حالات لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں[1] :

"میر عبدالرحمٰن خان نے نواب محمد محراب خان کے مظالم کو

۱- ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع -

طشت از بام کرنے کی خاطر ''محراب گردی'' لکھی - یہ کتابچہ علمی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے ایک بے مثال شاہکار ہے - چونکہ میر صاحب موصوف ملازمت میں تھے اس لیے اس کتابچے کو انھوں نے میر خاوند بخش خان بگٹی کے نام پر شائع کرایا تھا - اس کو شائع کر کے اس کی مفت تقسیم کی گئی - جس سے میر صاحب موصوف کی علمی شہرت اپنے بام عروج تک پہنچی - اور نواب محراب خان کے اثر و رسوخ کو کافی سے زیادہ دھچکا لگا اور بالآخر ۱۹۳۹ع میں مشہور بگٹی انقلاب آیا - نواب محمد محراب خان شہر بدری کی حالت میں جیکب آباد میں وفات پا گئے (۶ دسمبر[1] ۱۹۳۹ع) میر عبدالرحمٰن خان گرفتار ہو کر نظر بند کیے گئے اور علاقے کا نظم و نسق انگریزی حکومت نے سنبھالا -''

الفاروق کوئٹہ[2] میں میر عبدالرحمٰن خان کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی جبکہ وہ رانچی صوبۂ بہار میں قید تھے :

''فخر بلوچستان سردار میر عبدالرحمٰن خان بگٹی اُن چند افراد میں سے ایک ہیں، جن کا دل اپنی قوم کے بے پناہ مصائب پر ہمیشہ خون کے آنسو بہاتا ہے -''

بقول فقیر بخش بگٹی[3] -

''بگٹی قوم ان کی صلاحیتوں کے فوائد سے محروم ہوئی - ان کو قومی خدمت کا کوئی موقعہ نہ ملا اور ان کی زندگی ایسے غربت و افلاس کا شکار ہوئی، جو بالآخر مالی پریشانیوں اور ذہنی رنج و و کرب کے باعث اُن کی دائم المریضی پر منتج ہوئے اور مارچ ۱۹۵۸ع میں اُنھوں نے داعیٔ اجل کو جیکب آباد میں لبیک کہا -''

۱- الحق ، سبی ، ۸ دسمبر ۱۹۳۹ع -
۲- الفاروق ، کوئٹہ ، ۷ اگست ۱۹۴۱ع -
۳- ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع -

''محراب گردی'' میں مسلمانوں سے جو اپیل کی گئی ہے[۱] اُس کا پہلا حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ آج سے قریباً پینتیس سال پہلے کی تحریر ہے :

''مسلمانو ! آنکھیں کھول کر ہماری اوپر کی اپیل کو پڑھ لو اور کان کھول کر سنو کہ ہم کیا کہ رہے ہیں اور پھر نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی ۔ جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب اپنے جسیات میں برطانیہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

نہ ڈر خدا سے اور اُس کے عتاب سے لیکن
نبیؐ کی غصے میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے ڈر

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک مسیحی حکومت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غصیلی نگاہ سے ڈرایا جا سکتا ہے تو کیا ہم سب سے پہلے خود مولانا ظفر علی خاں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غصے میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے ڈرانے میں حق بجانب نہیں ہیں ؟ یقیناً ہیں ! تو پھر ہم بجا طور پر حضرت مولانا صاحب سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے اخبار کے کالموں کو ہم مظلوموں کی حمایت کے لیے وقف فرماویں اور اس کے بعد ہم سارے مسلمانوں کے ممبران اسمبلی و کونسل ، جمعیت احرار پنجاب ، جمعیت العلماء ، جمعیت تبلیغ انبالہ ، مسلم لیگ ، مسلم کانفرنس ، اخبار زمیندار ، سیاست ، انقلاب ، مدینہ ، الجمعیت اور آخر میں پیران عظام و سجادہ نشینان کرام سے اپیل کرتے ہیں کہ نبیؐ کی غصے میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے ڈریں اور ہم کو ظلم سے رہائی دلاویں ۔''

تکمیل انسانیت : (طبع زاد افسانہ) از محمد یوسف علی عزیز مگسی (چار قسطیں) مطبوعہ ''بلوچستان جدید'' کراچی ، شمارے یکم مئی ۱۹۳۴ع ، ۸ مئی ۱۹۳۴ع ، ۱۶ مئی ۱۹۳۴ع ، ۲۴ مئی ۱۹۳۴ع ۔

اس میں عزیز احمد کا کردار پیش کیا ہے جو ایک نواب کا لخت جگر تھا ۔ بڑے بھائی نے نواب صاحب کی وفات کے بعد عزیز احمد اور اس کے

۱۔ محراب گردی ، صفحات ۱۹ ، ۲۰ ۔

چھوٹے بھائی سے جائداد کے معاملے میں انصاف نہ کیا ۔ لیکن عزیز احمد اور رشید احمد نے غیر منصفانہ تقسیم مان لی ۔ عزیز احمد اپنے اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ کے باعث عوام میں بہت زیادہ مقبول تھا ۔ اُسے مطالعے کا بہت شوق تھا ۔ اُس نے اقبال اور حالی کی تصنیفات پڑھیں ۔

عزیز احمد اپنے زمانے میں چلنے والی آزادی کی تحریک سے متاثر ہؤا اور ایک مضمون لکھا جس میں قوم کو ہدایت تھی کہ نعرۂ اللہ اکبر سے استعمار پسندی کی زنجیریں جھٹک کر پھینک دو اور میدان جہاد میں سر بکف ہو کر نکلو ۔ باقی حصہ ایک اہم عہدے دار کے خلاف تھا ۔ اسی مضمون کی بنا پر عزیز احمد کو جیل بھیج دیا گیا ۔ وہاں اُس کا واحد مشغلہ نماز اور تلاوت قرآن شریف تھا جو پانچ ترجموں والا تھا اور حاشیے پر تفسیر تھی ۔ وہ ایک نڈر توحید پرست تھا اور گنگنایا کرتا تھا :

تیرو سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزوست

اُدھر اُس کے بڑے بھائی اور اُس کے مخالف افسر نے باہم مل کر عزیز احمد کے بھائی رشید احمد اور اُن کے دوسرے عزیزوں کو خوب تنگ کیا اور اُن کی جاگیر تا حکم ثانی کورٹ آف وارڈ میں داخل کی گئی ۔ عزیز احمد ان سختیوں کو سن کر خاموش رہتا اور اُس کی زبان سے حرف شکایت نہ نکلتا ۔

عزیز احمد قید و بند کی صعوبتوں کو تقریباً ایک سال تک برداشت کرتا رہا حتیٰ کہ ایک روز اُسے دو فرشتوں نے خبر دی کہ آس نے حق بندگی کو خوب نبھایا ہے ۔ اب تکالیف ختم ہو جائیں گی اور اُس کے دونوں مخالف کیفر کردار کو پہنچیں گے عنداللہ تو ان کا شمار ظالموں میں کبھی سے قرار دیا گیا ہے مگر اب عندالناس انھیں اصل رنگ میں پیش کرکے اُن کی فرعونیت کا خمیازہ انھیں یہاں بھی بھگتنا ہے ۔

یہ سن کر عزیز احمد خوش ہونے کی بجائے غمناک ہو گیا ۔ فرشتوں کے اصرار پر کہنے لگا کہ میری بندگی جزا کے لالچ سے بے نیاز ہے ۔ وہ بنی آدم کی حیثیت سے میرے بھائی ہیں ۔ مجھے اُن کے ساتھ کسی قسم کی

کدورت نہیں اور نہ ہی میں اُن کی بربادی کا خواہاں ہوں بلکہ اصلاح کا خواستگار ہوں -

عزیز احمد آخر میں یوں دعا کرتا ہے : یوسف عزیز کے الفاظ میں سنیے اور انجام ملاحظہ فرمائیے :

''اے میرے خالق ارض و سما ! اے قسام ازل ! اے رحیموں کے رحیم ! اے دنیا کے آقا ! کھلانے والے بندوں کے آقا ! مرزا آفتاب احمد پر رحم کر - سزا دینے کے بجائے اُسے ہدایت عطا فرما - اُس کے ساتھ میری رنجش سوائے اس ایک امر کے کچھ اور نہیں کہ وہ اپنی بے بصری سے تیرے بنائے ہوئے احکام پر چلنے سے گریز کرتا ہے - پھر تو کیوں نہ اُس کو نور و ہدایت سے منور کرتا ہے - میرے مولا ! تو منصف حقیقی ہے مگر تیرے انصاف پر تیرے رحم کو تقویت ہے - پھر کیوں بے چارہ آفتاب احمد تیرے رحم سے محروم ہے - اسی طرح بیچارہ نواب اشفاق احمد میرا بزرگ بھائی ، وہ بھی چاہ ضلالت میں غلطاں ہے - آپ کے دریائے رحمت کی ایک موج اسے راہ راست پر لانے کو کافی ہے - مولا رحم کر ! جب تک کہ رحمت کی سطح تک موجیں حرکت میں نہ آئیں گی ، میں الحاح و زاری کا چپو چلاتا رہوں گا -''

یہاں پہنچ کر عزیز احمد کی ہچکی بندھ گئی - آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا کہ دو چھوٹے چشموں سے امنڈتا ہوا نکل رہا تھا - ایک دو لمحے میں عزیز احمد بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا - دونوں فرشتوں نے عزیز احمد ، کے بے ہوش جسم کو اُٹھا کر تعظیم و تکریم سے فرش پر لٹا دیا اور خود غائب ہو گئے -

فضا میں ہلچل مچی ہوئی ہے ، فرشتوں میں ایک ایسی خوشی کا سماں بندھا ہؤا ہے جیسے آج اُن کا کوئی سالانہ جشن ہے - ہر ایک مقام پر بیس بیس چالیس چالیس فرشتوں کا مجمع ہے اور ہر ایک کی زبان پر یہی گیت جاری ہے :

مکمل ہو گئی انسان پر تعلیم قرآنی
ہوئی ہے آج کی شب جیل میں تکمیل انسانی

اسی شب پچھلے آسمان پر جلی حروف میں یہ لکھا ہوًا پایا گیا :
''تکمیل انسانیت''

قاضی داد محمد آف سیوی (سبی) کا مختصر ذکر پہلے بھی آیا ہے ۔ اُنھوں نے محنت کش طبقے کی قیادت کا بار اُٹھایا[1] ، لیبر یونین کی تشکیل کی اور سبی و کوئٹہ میں لیبر یونین کا دفتر قائم کر کے اس پر مزدوروں کا سرخ پرچم لہرایا ۔ وہ اسی طبقے کی نمایندگی کرتے ہوئے جیل گئے ، ریل کے سامنے لیٹے ، پیٹ پر پتھر باندھے مگر اُف تک نہ کی ۔ دوسروں کے سامنے چندے کے لیے ہاتھ نہ پھیلائے ۔ اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر جو کچھ پس انداز کیا ، اُسے بھی ملک و ملت کی عظمت پر قربان کر دیا ۔

آپ نے اپنی صعوبتوں کا ثمر پاکستان کی صورت میں ملاحظہ کیا ۔ زندگی کے آخری سال آزاد وطن کی آزاد فضا میں گزار کر اللہ کو پیارے ہوئے ۔ مرض الموت کے دوران سول ہسپتال کوئٹہ میں اپنے دوستوں کو وصیت کی کہ ''مرنے کے بعد اُنھیں بلوچستان کے مرد قلندر میر یوسف علی خاں عزیز مگسی کے پہلو میں دفن کیا جائے ۔''

آپ کا قلم اُردو مضامین لکھنے میں ہمیشہ رواں رہا ۔ موقع و محل کے مطابق قرآن مجید اور احادیث کے حوالے بھی دیتے ہیں ۔ ان کے ایک مضمون کا عنوان ہے ! ''ترقی کا[2] سنگ اساس جماعتی زندگی ہے ، تباہی انفرادی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے ۔'' اس میں سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے یہ تحریر تہائی صدی پہلے کی ہے :

''اقوام عالم کی موت و حیات ، ترقی و تنزل اور سعادت و شقاوت کے جو اصول اسباب و مراتب ہیں ، اُن میں سے اہم و اعظم ترین اتحاد و اشتراک عمل ہے ۔ قوم کے تمام افراد اپنے آپ کو ایک ہی جسم کے اجزا متصور کریں ۔ سب کا مقصد ایک ہی

۱۔ ایلم مستونگ ، بلوچستان میں تحریک آزادی ، قاضی داد محمد مرحوم کا کردار از ملک محمد رمضان بلوچ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع ۔
۲۔ بلوچستان جدید ، ۸ مئی ۱۹۳۴ع ۔

ہو - اسی کا عشق دامن گیر ہو اور اسی کی محبت کی زنجیریں سب کے پاؤں میں ہوں - مریں تو اس کے لیے اور زندہ ہوں تو اس کے لیے :

پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم
ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

قرآن حکیم نے جا بجا اتحاد و اجتماع کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اصل قرار دیا ہے - ارشاد ہوتا ہے ''سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو -''

الحاج مولانا عبدالصمد سربازی کا وطن مالوف سرباز (ایران)[۱] ہے - آپ نے محض علم کے حصول کی خاطر سرزمین پاک و ہند کا رخ کیا - متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے اسلامی اداروں میں تعلیم پائی اور علوم متداولہ شرعیہ میں درجۂ اختصاص حاصل کیا - جب واپس ہونے لگے تو قلات ٹھہرے اور ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو رہے - خان قلات نے آپ کی دیانت اور لیاقت سے متاثر ہو کر آپ کو ریاست کا قاضی القضاۃ تعینات کیا - چنانچہ آپ نے یہ منصب قبول کر کے حزم و احتیاط سے اپنے فرائض ادا کیے - برسوں تک آپ کی نگرانی میں دیوانی مقدمات کے فیصلے ہوئے - آج کل محکمۂ شرعیہ مجلس شورئ قلات کے رکن ہیں - فارسی میں اچھے شعر کہتے ہیں - اُردو اور بلوچی میں عمدہ نثر لکھتے ہیں - آپ کے رشحاتِ قلم عرصہ تک ترجمانِ بلوچ ، البلوچ ، اومان کراچی اور بلوچی دنیا ملتان کے صفحات کی زینت بنتے رہے ہیں - آپ چونتیس پینتیس سال سے اُردو میں لکھ رہے ہیں - آپ کا ایک گراں قدر مقالہ بعنوان ''بلوچ اور بلوچستان'' (۲۴ صفحات) ''بلوچی دنیا'' ملتان (ستمبر ۱۹۶۶ع) میں چھپ چکا ہے - آپ اپنی تحریر میں جا بجا برمحل آیاتِ قرآنی اور فرموداتِ آنحضرت صلعم کے حوالے دیتے ہیں اور بر موقع اُردو و فارسی کے اشعار بھی استعمال کرتے ہیں - ایک

۱- بلوچی دنیا ، ملتان ، جولائی ۱۹۶۴ع -

اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

''انسان کے لیے قابل افتخار چیز قومیت نہیں بلکہ بفحوائے ''ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم'' خدا شناسی اور خدا پرستی ہے اور قومیت کو انسان کے مقصدِ زندگی میں کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ نجات کا ذریعہ ہے :

چوکنعاں را طبیعت بد گہر بود — پیمبرزادگی قدرش نیفزود
ہنر بنما اگر داری ، نہ گوہر — گل از خارست و ابراہیم از آزر

اور بفحوائے ''وجعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا'' قومیت محض ایک تعارفی چیز ہے ۔ البتہ اپنے اسلاف کے اچھے کارناموں پر فخر کیا جا سکتا ہے اور ان کی تقلید میں اچھے کارناموں کا شوق پیدا ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح وطنیت کو بھی انسان کے مقصدِ حیات میں کوئی دخل نہیں اور نہ ہی وہ ذریعۂ رستگاری بن سکتی ہے :

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
زخاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است''

محمد حسین عنقا بلوچ کا ذکر ''شعر و شاعری'' کے حصے میں گزر چکا ہے ۔ آپ چونتیس پینتیس سال سے اُردو نثر لکھ رہے ہیں ۔ چند مطبوعہ مضامین یہ ہیں :

۱۔ جام درک : بلوچی دنیا ، ملتان ، دسمبر ۱۹۵۷ع ۔
۲۔ بلوچی ادب : بلوچی دنیا ، ملتان ، اپریل ۱۹۵۸ع ۔
۳۔ بلوچی زبان کی تاریخ اور طرز نوشت : بلوچی دنیا ، ملتان ، (دو قسطیں) اگست ، ستمبر ۱۹۶۰ع ۔
۴۔ امیر تیمور کا حسب نسب اور زاد بوم (تاریخ و ادب) : بلوچی دنیا ، ملتان ، اپریل ۱۹۶۶ع ۔
۵۔ بولان (تاریخ و جغرافیہ) : بلوچی دنیا ، ملتان ، جون و جولائی ۱۹۶۶ع ۔
۶۔ مکران کی تاریخ کا خاکہ (تاریخ و جغرافیہ) ، بلوچی دنیا ، اکتوبر ۱۹۶۷ع ۔

مُلا محمد حسن کے پوتے میر شیر علی خاں آغا علی زئی متخلص بہ علی از مستونگ اُردو میں شعر کہنے کے علاوہ نثر بھی لکھتے رہے ہیں - پینتیس سال پہلے کے تحریر کردہ ایک مضمون ''زکٰوۃ اور بیت المال'' میں سے چند سطور ملاحظہ فرمائیے [1] - اس مضمون پر یہ نوٹ بھی درج ہے ''عزیز مگسی توجہ فرمائیں'' :

''یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ جہاں اُس نے عبادات و معاملات کے دیگر شعبہ ہائے زندگی کے اصول و قوانین وضع کیے، غربا و مساکین کی امداد کو بھی ایک تنظیمی صورت دے دی - یہ وہ تنظیمی صورت ہے جو نہ ابتدائی صورت میں ندامت کا پسینہ لاتی ہے اور نہ انجام کار احساس ندامت کے زوال کا اندیشہ رکھتی ہے -''

دوسرے مضمون ''کیا ہم تنزل سے ترقی کے پایۂ پر نہیں چڑھ سکتے؟'' [2] میں لکھتے ہیں :

''قارئین کرام خیال فرماویں کہ اگر ہم اتفاق و ہمت کرتے تو پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا سکتے تھے، تو انسان کا ہٹانا کیا مشکل ہے'' -

اس کے بعد ایک کہانی بیان کی ہے جو اتفاق کی برکتوں کو اُجاگر کرتی ہے - آخر میں درج ہے :

''نتیجہ یہ نکلا کہ یک جہتی اور سلوک سے دشوار اور سخت سے سخت مہم بھی آسان ہو جاتی ہے اور دشمن ہمیشہ ذلیل رہتا ہے اور زندگی بے فکری سے بسر ہوتی ہے - دوسرا ہمیں علم با عمل ہوتا تو کیوں ہم تنزل میں گرتے -

محمد اسلم خاں اچکزئی (عنایت اللہ کاریز) ۱۹۱۵ع میں قصبۂ گلستان کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے - سترہ سال کی عمر میں ۱۹۳۲ع میں آزادی کی تحریک میں شامل ہونے پر حکومت نے ایک غلط مقدمے میں

۱- البلوچ، کراچی، ۴ مارچ ۱۹۳۴ع -
۲- البلوچ، کراچی، ۱۳ اگست ۱۹۳۳ع -

پھنسایا اور اپنے آبائی ضلع یعنی کوئٹہ پشین سے عمر بھر کے لیے خارج کر دیا ۔ آپ کچھ عرصے تک 'مچھ' میں رہے ، پھر جیکب آباد کے اخبار ''الحنیف'' کے فرائض ادارت انجام دیے ۔ جیکب آباد ہی سے آپ نے اپنا ذاتی اخبار ''کہال ہند'' جاری کیا جس نے بلوچستان اور سندھ کی صحافت میں ایک نمایاں مقام پایا ۔ آپ نا انصافی اور سامراجیت کے خلاف صف آرا ہوئے ۔ ان مقاصد کے باعث آپ ہمیشہ ہنگاموں اور تکالیف سے دو چار رہے ۔ یہ اخبار انھی ہنگاموں ، بھاری جرمانوں ، ضمانتوں اور ہر جگہ داخلے کی پابندیوں کے سبب بند ہو گیا ۔

اس کے بند ہوتے ہی اسلم اچکزئی نے ''نوجوان'' کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا ۔

۱۹۴۲ء میں قید و بند کی صعوبتوں سے واسطہ پڑا ۔ ۱۹۴۴ء میں اُس وقت رہا کیے گئے جبکہ صحت کا دیوالہ نکل چکا تھا ۔ چنانچہ اکتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے (۱۹۴۶ء)[1] ۔

آپ کے قلم نے اور آپ کے اخبارات نے بلوچستان میں اُردو کی ترویج کو تقویت پہنچائی ۔ آپ کا انداز تحریر سادہ اور دلنشیں ہے ۔ ایک اداریے کا پہلا حصہ ملاحظہ فرمائیے[2] ۔ عنوان ہے ''گزارشِ احوال'' :

''منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

جون کا مہینہ تھا ، جیکب آباد کی گرمی اپنی انتہائی زوروں کے ساتھ باہر کے لوگوں خصوصاً بلوچستانیوں کو ''دعوت سوختن'' دے رہی تھی جبکہ میں نے اپنے ناتواں کندھے الحنیف کی ادارت کے بار گراں کے لیے پیش کیے ، اُس وقت نہ مجھے اپنی ادبی مہارت پر غرہ ، نہ علمی واقفیت پر فخر ، نہ سیاستدانی پر ناز اور نہ اپنی ہیچمدانی سے گھبراہٹ تھی ، میرے سامنے ایک مقصد تھا خدمتِ وطن

۱۔ ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ء ، صفحہ ۱۳ ۔
۲۔ سالنامہ ''الحنیف'' جیکب آباد ، ۲۰ اگست ، ۱۹۳۷ء ۔

جس کو میں دوزخ سے بھی خطرناک خطہ زمین پر رہ کر انجام دینا اپنا فرض اولین خیال کرتا تھا ۔

میں اس بات سے قطعی نہ گھبرایا کہ ہمارے بلوچستانی ادیب و مفکر اپنی پالیسی اور کم علمی کا مضحکہ اُڑائیں گے اور مجھے ڈر بھی کاہے کا جبکہ خدمت وطنی کا پاک جذبہ ہر طرح میرے تمام جذبات اور ہر قسم کی خواہشات پر غالب آ چکا تھا ۔ اس لیے میں اُس ایزدِ بے چوں کا ہزار ہزار شکر بجا لانے پر بھی شکرانہ ادا نہیں کر سکتا جس نے آج مجھے اس قابل بنا دیا کہ اپنے بھائیوں کی خدمت میں الحنیف کا سالنامہ پیش کر کے داد چاہوں ۔''

آغا سلطان ابراہیم جان خان قلات میر احمد یار خان (آپ خود بھی اُردو میں بطریق احسن خطاب فرماتے ہیں) کے چچا اُردو میں خوب لکھتے تھے ۔ اُن کے تیس سال پہلے کے چند تحریر کردہ اور مطبوعہ مضامین یہ ہیں :

۱۔ خان محمد نصیر خان ثانی : سالنامہ الحنیف ، اُردو ایڈیشن ، جیکب آباد ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء ۔
۲۔ خان خدا داد خان : سالنامہ الحنیف ، اُردو ایڈیشن ، جیکب آباد ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء ۔
۳۔ نواب محمد خان وکیل : سالنامہ الحنیف ، اُردو ایڈیشن ، جیکب آباد ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء ۔
۴۔ شاہ غاسی ولی محمد خان : سالنامہ الحنیف ، اُردو ایڈیشن ، جیکب آباد ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء ۔
۵۔ مستوفی مرزا احمد علی شاعر کبیر : سالنامہ الحنیف ، اُردو ایڈیشن ، جیکب آباد ، ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء ۔
۶۔ میر محراب خان شہید : سالنامہ الحنیف ، اُردو ایڈیشن ، جیکب آباد ، ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء ۔

ان مضامین کو زیر نظر لائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلطان ابراہیم جہاں سیدھی سادھی زبان میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں ، وہاں اُن کا انداز متاثر کن ضرور ہے ۔

اُنھی ایام میں (یعنی تیس سال قبل) اور جو اصحاب اُردو میں لکھ رہے تھے ، ان کے نام اور مضامین کی اشاعت کا اتا پتا یہ ہے :

عروس عجم (فسانہ) : علامہ ناصر بلوچستانی ، سالنامہ الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء -

فلسفی اور پیمبر : (محمد حسن نظامی) سالنامہ الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء -

سرداران بلوچستان توجہ فرمائیں : محمد حسن نظامی ، الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

بلوچستان کے جیل خانے : خان عبدالصمد خان[۱] ، الحنیف ، جیکب آباد ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء -

بے بسی کی انتہا : خان عبدالصمد خان ، الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

ریاست قلات کے جیل خانے : صغیر بلوچستانی ، الحنیف ، جیکب آباد ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

سرداریت : صغیر بلوچستانی ، الحنیف جیکب آباد ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

ذکری : مولانا عبداللہ ، الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

زر ولور : مولانا عبداللہ ، الحنیف ، جیکب آباد ، ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

بلوچستان طبی نقطۂ نظر سے : حکیم قائم الدین ، الحنیف ، جیکب آباد ۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء -

ریاست قلات میں آئینی حکومت کے سلسلے میں ایک اہم تجویز : میر عبدالعزیز خاں ، مطبوعہ پاسبان ، کوئٹہ (دو قسطیں) ۴ مئی ، ۲۰ مئی ۱۹۴۵ء -

---

۱- بقول عبدالصمد درانی : ''میر عبدالعزیز خاں ، خان عبدالصمد خاں اور میر محمد امین کھوسہ اُردو نثر میں دور اول کے بزرگوں میں سے ہیں ان سب کی تحریر نہایت شستہ اور ٹھوس ہے'' -

(''مشعل'' کوئٹہ ، صفحہ ۸ ، 'بلوچستان اور اُردو')

عبدالصمد درانی یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء کے زلزلے سے پہلے اسلامیہ سکول کوئٹہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ زلزلے کے باعث کچھ دنوں کے لیے دلی میں اپنے ماموں کے ہاں بھی رہے۔ پھر واپس آ کر مڈل سکول کرانی متصل کوئٹہ میں زیرتعلیم رہے۔ ۱۹۴۰ء میں خالصہ ہائی سکول کوئٹہ سے میٹرک پاس کیا اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اسی زمانے میں آپ نے اُردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں:

"میں اسلامیہ سکول کوئٹہ میں درجہ ششم میں پڑھتا تھا کہ تذکیر و تانیث کی غلطی ہو گئی جس پر مجھے بنچ پر کھڑے ہونا پڑا۔ اس سے اتنا متاثر ہؤا کہ گرائمر بڑی احتیاط سے سیکھی۔"

اس کا یہ اثر ہؤا کہ اُس کے بعد درانی صاحب اپنی کلاس میں اُردو میں اول آنے لگے۔ خالصہ کالج امرتسر میں بھی پڑھتے رہے۔ کالج میگزین کے ایڈیٹر کے انتخاب میں حصہ لیا اور اول رہے۔ مقابلے کا عنوان تھا: "ہندوستان کی قومی زبان کیا ہونی چاہیے؟" کالج میگزین "دربار" میں فیض احمد فیض کی غزل گوئی پر پہلا مضمون لکھا۔

آپ ہوائی فوج میں ملازم رہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں ملازمت چھوڑ دی اور کوئٹہ کے کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ بلوچستان میں مختلف اخباروں کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ پھر ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے متعلق ہو گئے۔ ان دنوں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ آپ زیادہ تر اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ پشتو بولنے والوں کے ساتھ بھی اُردو میں گفتگو کرنا پسند فرماتے ہیں۔ "ماہ نو" کراچی، "استقلال" لاہور، "نوائے وقت" لاہور، "جنگ" کراچی اور "حریت" کراچی میں متعدد مضامین لکھ چکے ہیں۔ آپ کے مضامین کے موضوعات میں تنوع ہے، جیسے بلوچستان کا کلچر، سیاسی تحریکیں، ادارے اور شخصیات وغیرہ۔ برصغیر کے مسلمان موسیقاروں کی سوانح عمریاں، کنیڈا اور برطانیہ کے سفرنامے وغیرہ۔

عبد الصمد درانی بلوچستان کے ایک کہنہ مشق صحافی اور ادیب ہیں۔ اُن کے قلم میں بے پناہ روانی اور خلوص ہے۔ اُن کے ایک مضمون

''آزادی کی عید''[1] میں سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :

''ایک دن میں برطانوی شاہی فضائیہ کی جیپ میں چٹاگانگ کے ہوائی اڈے سے شہر جا رہا تھا ۔ جیپ کا ڈرائیور ایک گورا سارجنٹ تھا ۔ میرے ہمراہ بہت سے دوسرے دیسی بھائی بھی جیپ میں سوار تھے ۔ ایک بوڑھا پوربی پاکستانی کسان اپنی بیل گاڑی کو ہانکے سڑک کے کنارے کنارے جا رہا تھا ۔ بیل گاڑی پر بھوسہ لدا ہؤا تھا ۔ اڑیل بیل بدکے اور سڑک کے بیچوں بیچ آ گئے ۔ اس میں بوڑھے کسان کا قصور نہ تھا ۔ ہماری جیپ کے گورے ڈرائیور نے بریک لگائی ، گئیر بدلا اور بوڑھے کسان کو ''کالے کمینے'' کی بھر پور گالی دیتے ہوئے ایکسیلیٹر دبایا اور فراٹے بھرتا ہؤا آگے نکل گیا ۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ میرے کالے دیسی ساتھیوں کا رنگ بھی فک ہؤا ۔ اس دن اپنی بے بسی اور بیچارگی پر بہت دکھ ہؤا ۔ اتحادی فوجوں میں امریکی نیگرو بھی تھے مگر میرے اہل وطن اُنھیں بھی ''صاب'' کہتے تھے اور انگریز فوجی بھی ان کے رعب داب اور قیمتی وردیوں سے دبتے تھے ۔ اُس دن محسوس ہؤا کہ اگر ہم بھی نیگرو کی طرح کسی آزاد اور جمہوری ملک کے شہری ہوتے تو گورے سارجنٹ کو ہمارے سامنے ، ہمارے ہم وطن کو ''کالے کمینے'' کی گالی دینے کی جرأت نہ ہوتی ۔

چند روز بعد ہم چند دیسی لوگ ریکری ایشن روم میں بیٹھے ریڈیو پر اُستاد عبدالکریم خاں کا گانا سن رہے تھے ۔ اس وقت ریکری ایشن روم میں کوئی ''آقا'' نہ تھا ، ہمیں بڑا اطمینان تھا ۔ معاً ایک گورا ریکری ایشن ہال میں داخل ہؤا اور بآواز بلند کہا ''بند کرو اس بکواس کو'' اُس روز بھی ہم نے لہو کا گھونٹ پی لینے پر اکتفا کی اور میں نے اس توہین کو یونہی ہضم کر لینے پر

۱- ایلم ، مستونگ ۱۷ اگست ۱۹۶۶ء ،

اپنے آپ کو کوسا مگر پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ ”غلام بزدل ہی ہوتے ہیں ۔“

غلامی کے اس شدید احساس نے دل میں آزادی کا صحیح معنی اور مفہوم اُجاگر کیا ۔ پھر تو یہ خیال بھی پیدا ہؤا کہ غلام قوم کتنی ہی قدیم تاریخ کی حامل کیوں نہ ہو ، اُس کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو ، اُس کا وطن چاہے سونا اُگلتا ہو ، اس کی قدیم تاریخ شاندار کارناموں سے بھر پور سہی ، اُس کی ثقافت دنیا بھر کی قوموں کے لیے مشعل راہ ہو ، مگر جب تک وہ قوم اپنی قسمت کی مالک نہیں بن جاتی ، جب تک وہ اپنے وطن کے لیے حصار کا کام نہیں دیتی اور جب تک اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے اسے خود ٹھوکروں اور تجربوں سے دوچار ہونا نہیں پڑتا ، وہ قوم کی توہین ہے ۔ وہ چوپایوں کے ریوڑ سے بھی بدتر ہے جنھیں چند چرواہے لاٹھی کے زور سے جدھر چاہیں ہانک سکتے ہیں ۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نئی اور حسین صبح طلوع ہوئی ۔ اُس روز میں نے سوچا کہ آج کسی کو میری موسیقی کے بارے میں توہین آمیز کلمات استعمال کرنے کی جرأت نہ ہوگی ۔ کوئی بدیشی اپنی جلد کی سفیدی پر نازاں میرے بوڑھے ہم وطن کسان کے خلاف بد زبانی کا مرتکب نہیں ہو سکے گا ۔ میں اپنے وطن میں اپنا گانا سننے میں آزاد ہوں گا ۔

۱۴ اگست کو ہم ہر سال اسی آزادی کی عید مناتے ہیں ۔ جس کی قدر و قیمت وہ لوگ زیادہ جانتے ہیں جنھوں نے دلوں پر عہد غلامی میں سینکڑوں چرکے کھائے ہیں ۔ کاش ! میرے نوجوان اہل وطن دلوں کی اس چوٹ کی حقیقت کو سمجھ لیں اور بڑی کاوشوں اور قربانیوں سے حاصل کی گئی اس آزادی کی حفاظت کے لیے وہ طرز عمل اختیار کریں جو آزاد رہنے کی متمنی قوموں کا شعار ہوتا ہے ۔“

فضل احمد غازی تقسیم ملک سے پہلے سے پشتو کے علاوہ اُردو میں اپنے خیالات پیش کر رہے ہیں - وہ کوئٹہ کے کئی اخباروں میں بھی کام کر چکے ہیں - اُن کے بعض اُردو میں تحریر کردہ پمفلٹوں کا ذکر کیا جا چکا ہے - وہ علاقائی زبان و ادب سے متعلق مضامین لکھتے ہیں جو مغربی پاکستان کے اخبارات اور رسائل میں چھپتے ہیں - اُن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱- اقبال کا فلسفہٗ شاہین : مطبوعہ ماہنامہ کوہسار ، کوئٹہ دسمبر ۱۹۵۱ع -
۲- پہاڑوں کے الاؤ : مطبوعہ لیل و نہار ، لاہور ، ۳۰ نومبر ۱۹۵۸ع -
۳- شاہ ولی ایک جواں سال رقاص : مطبوعہ لیل و نہار ، لاہور ، ۱۸ دسمبر ۱۹۵۸ع -
۴- پشتو شعری ادب اور خواتین : مطبوعہ لیل و نہار ، لاہور ، ۱۸ جنوری ۱۹۵۹ع -
۵- رحمان بابا (محبت کا پیامی) : مطبوعہ ماہنامہ ماہ نو ، کراچی ، نومبر ۱۹۶۵ع -
۶- ملکیار غرشین (صاحب سیف شاعر) : مطبوعہ ماہنامہ ماہ نو ، کراچی ، جنوری ۱۹۶۶ع -

''پہاڑوں کے الاؤ'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے[۱] :

''کاکڑی غاڑی'' شاعری کا تعلق کاکڑی پشتون خواتین سے ہے - شاید ہی کوئی کاکڑ خاتون ایسی ہو جو ''کاکڑی غاڑی'' نہ کہہ سکتی ہو - شاعری کی یہ صنف زندگی کے تمام مجلسی ، عاشقانہ اور سیاسی مسائل پر محیط ہے - انگریزی دور میں جب کہ کاکڑستان پر غیر ملکی حکمرانوں نے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی اور تمام کاکڑ مرد خاموش ہو گئے تو بہادر کاکڑ خواتین نے صدائے احتجاج بلند کی اور کاکڑی غاڑی جو صرف عشق و محبت تک ہی محدود تھی ،

۱- لیل و نہار صفحہ ، ۲۶ -

فکری اور ہیئتی طور پر ایک انقلاب سے دو چار ہوئی ۔ ''

ذیل میں کچھ ترجمے پیش خدمت ہیں :

''شین نمر (ایک پہاڑی خطہ) نیک لوگوں کی ملکیت تھی ۔ اب انگریزوں نے وہاں بنگلے تعمیر کیے ۔ منزر بابا (کاکڑوں کا جد امجد) کی زمین پر انگریزوں نے ناچ گھر تعمیر کیے ۔ وطن تو میرا ہے لیکن اس سے دوسرے فائدہ حاصل کر رہے ہیں ۔ اس غم کو بہ مشکل برداشت کر سکوں گی ۔ شین نمر میری ملکیت ہے، کسی غیر کے ہرگز حوالے نہ کروں گی ۔ میرے عزیز کہاں گئے ۔ انگریز کی گاڑی ژوب کی فضاؤں کو آلودہ کر رہی ہے ۔ اے میرے بھائی منزر بابا کی زمین پر گاڑی کو نہیں دیکھ رہے ہو ؟ ''

ملکیار غرشین تقریباً نو سو سال قبل کوئٹہ ڈویژن میں پشین کے نزدیک ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جہاں زیادہ تر آبادی سادات قبیلے کے پشتونوں کی ہے ۔ گاؤں کا نام (ملکیار) آپ کے نام پر منسوب ہوا ۔ فضل احمد غازی لکھتے ہیں[1] : آپ نے پشتو میں کچھ رجزیہ کلام بھی تخلیق کیا ۔ یہ ایک نظم ہے جس میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے اور ایسا کہا کہ سپاہیوں کے دلوں اور دماغوں میں اتر گیا اور یہ ایسا تاثر تھا کہ عمل اور نتیجہ کی صورت میں زندۂ جاوید بن کر سامنے آ گیا ۔ مذکورہ نظم میں ملکیار فرماتے ہیں :

''غازیو دیکھو ! اللہ ہمارے ساتھ ہے ۔ اپنی تلواروں کو تیز کر دو ، اپنے دشمن کو برباد کر دو ، اپنی انگلیوں کو سرخ کر دو ۔ ہم کیوں بھاگیں ؟ خدا ہمارے ساتھ ہے ۔ اگر ہم اپنے دل مضبوط کر لیں تو ہم فاتح ہوں گے کیونکہ ہم شیر ہیں ، ہم مسلمان ہیں ۔ خدا ہمارے ساتھ ہے ۔ غازیو آؤ ! سب متحد ہو جاؤ ۔ شہاب الدین غوری کے دست و بازو بنو ۔ دشمن کو تباہ کر دو ۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے ۔''

۱- ماہ نو ، صفحہ ۴۳ ۔

جاندار علاقائی ادب کو اردو دان طبقوں میں روشناس کرانے سے حتمی طور پر اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔

مشعل : مرتب عبدالرحمٰن غور، ادارۂ ادب سبی کی تالیف ہے۔ سالِ اشاعت ۱۹۴۸ع ، ضخامت ۸۰، صفحات قیمت ایک روپیہ۔

یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ظہور پاکستان کے بعد بلوچستان میں چھپنے والی کتب میں سر فہرست ہے۔ یہ جدید فن کاروں کا ادبی مجموعہ ہے۔ اس میں چار مقالے، تیرہ منظومات (شعر و شاعری کے حصہ میں ذکر آ گیا ہے) پانچ افسانے اور چار متفرقات موجود ہیں۔

عبدالرحمٰن غور کا ''کچھ سنو گے؟'' گویا تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد خان بارو زئی کا ''حرفِ آغاز'' ہمارے نئے ادب کو عوامی ادب بنانے پر زور دیتا ہے۔ عبدالصمد درانی نے ''بلوچستان اور اُردو'' میں بلوچستان میں اُردو زبان و ادب کی دلچسپ لیکن مختصر داستان پیش کی ہے اور غازی نے ''ہمارے فنکار'' میں اس مجموعہ میں چوبیس نگارندوں میں سے دس کا جیتا جاگتا تعارف کرایا ہے۔

افسانوں میں پروفیسر انور روسان کا ''غیر فانی'' اُردو افسانوی ادب میں غالباً پاکستانیت کا اولین ظہور ہے۔ ایک ریلیف کمپ میں سسکتے ہوئے انسان کس طرح خوفِ اعدا اور بھوک اور پیاس کی وجہ سے موت کے مہیب غار میں لڑھکتے جا رہے ہیں؟ اور کس طرح اس گھمبیر یورش ظلمت کے باوجود ایک انسان اس اُمنڈتی ہوئی موت کو بھگاتے اور پچھاڑتے ہوئے بالآخر خود بھی اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اس افسانے کا موضوع! عبدالحمید زاہد نے ''ہنی مون'' میں ایک شوہر (ظفر) اپنی پہلی مرحوم بیوی (نسیمہ) کے فراق میں دوسری بیوی (عابدہ) کی محبت اور امیدوں کو بھی سوگوار بنا دیتا ہے لیکن پھر عابدہ کے خلوص اور نفسیاتی تدبر کی وجہ سے وہ دونوں از سر نو راہ حیات پر ہشاش بشاش چل پڑتے ہیں۔

مسافر سینی کا افسانہ ''طاہرہ'' ۱۹۴۷ع کے فسادات کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں پر یکساں طنز ہے۔

سیکش قادری ''بیتے لمحے'' میں محبت کی ایک یادِ گزشتہ کے چکر

میں ہیں ۔ محترمہ زینت حیا نے ''ادھوری تمنا'' میں اس لڑکی کو مرکزی کردار بنایا ہے جس نے اپنے مستحکم ، بے داغ کردار سے ایک اوباش نوجوان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عورت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا ۔ پیر محمد عطارد نے فارسی میں افسانہ ''شکاری'' لکھا ہے ۔

متفرقات میں آغا صادق کا ''دنیا سے'' تسکین کا ''انسان'' انسان کو اُبھارنے اور نکھارنے کی اچھی کوششیں ہیں ۔ گل خان مینگل کا محشر رسول نگری کی کتاب ''تیغ و قرآن''، پر تبصرہ قومی و ملی نقطۂ نظر سے متصادم ہے اور خدا بخش مینگل نے مظلوم و مقہور انسانیت کے حق میں صف آرا ہونے پر زور دیا ہے ۔

مجموعی طور پر افسانوی اور منظوماتی حصہ کافی اچھے ہیں لیکن مقالاتی حصہ کمزور ہے ۔ بہرحال ''مشعل'' بلوچستان میں بیس سال پیشتر کے اُردو ادب کے ارتقا کو سمجھنے میں ممد و معاون ہے ۔

بلوچستان میں قائداعظم کی تقریریں : شائع کردہ محکمۂ نشر و اشاعت بلوچستان ۔ سال اشاعت ۱۹۴۸ء ، ضخامت ۔ ۲۸ صفحے سرورق پر قائداعظم کا فوٹو ہے ۔

ایک صفحے پر ارشادات قائداعظم درج ہیں ۔ پھر آپ کی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے :

۱۔ **قائداعظم کا خطاب بلوچستان کے افسروں سے :** دیانت ، وفاداری اور خلوص اُس تقریر کے مرکزی نقاط ہیں جو قائداعظم نے ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی میں قریباً چار سو افسران کے سامنے ارشاد فرمائی ۔

۲۔ **سبی دربار منعقدہ ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کی تقریر :** آپ نے بلوچستان کی سابقہ اور حالیہ سیاسی صورتِ حال پر ایک جامع تبصرہ کرتے ہوئے بلوچستان کے مختلف طبقوں کے نمائندوں پر مشتمل گورنر جنرل کی ایک مشاورتی کونسل کے قیام کی تجویز کا اعلان فرمایا ۔ اس تقریر سے اس امر کی بڑی وضاحت ہوتی ہے کہ قائداعظم بلوچستان کی ترقی و بہبودی کے کتنے خواہاں تھے اور اس کے لیے کیا کچھ کرنا چاہتے تھے ۔

۳۔ **کوئٹہ کے پارسیوں سے ۱۳ جون ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کا خطاب :**

یہ تقریر پارسیوں کے ایک وفد کی جانب سے پیش کردہ سپاس نامے کے جواب میں تھی -

۴- ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے ایک تقریب پر مختصر تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستانی فوج کے سپاہی اور افسر مملکتِ پاکستان سے وفاداری کا جو حلف اُٹھاتے ہیں ، اُس کا صحیح مطلب کیا ہے؟

۵- ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کی شام کو ٹاؤن ہال کوئٹہ کے وسیع پارک میں پچاس ہزار کے عظیم اجتماع میں کوئٹہ میونسپلٹی کی جانب سے قائداعظم کی خدمت میں جو سپاس نامہ پیش کیا گیا ، اُس کے جواب میں قائداعظم نے اہلِ بلوچستان کو نصیحت فرمائی کہ وہ صوبائی عصبیت سے اجتناب برتیں اور صرف پاکستانی کہلائیں -

نسیم حجازی قیام پاکستان سے پیشتر اور کچھ عرصہ بعد تک بلوچستان میں رہے - انھوں نے ''تنظیم'' اخبار کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے - انھوں نے اپنا مشہور ناول ''شاہین'' جو ۶۲۴ صفحات پر مشتمل ہے ، اسی ماحول میں بیٹھ کر لکھا - 'پیش لفظ' کے آخر میں درج ہے :

''کوئٹہ ۱۵ نومبر ۱۹۴۸ء

اس ناول میں مسلمانانِ اندلس کی تاریخ کا آخری باب پیش کیا گیا ہے جبکہ وہ انتشار میں مبتلا تھے اور اُن کے مقابلے پر قسطلہ اور اراغون کے عیسائی متحد ہو چکے تھے - اور یہ ٹکر دو مختلف قوموں ، دو مختلف نظریوں اور دو مختلف تہذیبوں میں تھی -''

نسیم حجازی قیام پاکستان پر رونما ہونے والے حالات سے متاثر ہوکر پاکستانیوں کو اندلس کے مسلمانوں کا انجام بتا کر اُنھیں جگا رہے ہیں - متحد و منظم ہونے کا پیغام دے رہے ہیں -

نسیم حجازی کے ہاں عمل کی جو گرج ہے ، جد و جہد کی جو للکار ہے اور جبر و استبداد کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا عزم بالجزم پایا جاتا ہے - اُس میں بلوچستان کی فضاؤں اور روایات کا عطیہ موجود ہے -

پروفیسر انور رومان کا اس خطے سے تعلق ۱۹۴۶ء میں ہوا - بعد میں وہ یہیں سکونت پذیر ہو گئے - اُنھوں نے یہاں بیٹھ کر تخلیقی کام (یعنی

افسانے ، ڈرامے اور ادبی مضامین) کے علاوہ تحقیق و تدقیق کی مشعل روشن کی - یہ ما قبل پاکستان دور سے پہلے ہی اُن کا محبوب مشغلہ تھا - اُنھوں نے متعدد صاحبان کو متاثر کیا اور اُن کو اس کٹھن راہ پر گامزن کیا - وہ اب تک اُردو زبان و ادب اور تاریخی و تہذیبی تحقیق کے سلسلے میں ناقابل فراموش خدمت سرانجام دے رہے ہیں -

اُن کا اہم ترین ادبی مقالہ تھا : ''پاکستانی ادب'' (اس کا ماضیٔ قریب اور اُس کی ذمہ داریاں) مطبوعہ ''مخزن'' لاہور شمارے جولائی و اگست ۱۹۴۹ع (دو قسطیں) ضخامت ۳۵ صفحات -

جب ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو موت کے پسینے آ رہے تھے اور پاکستان کا وجود بری طرح ڈگمگا رہا تھا اور پاکستان کے لاکھوں نام لیوا پاکستان کی تلاش میں بے گور و کفن موت کے جام نوش کر رہے تھے اور ہمارے ادیب اور شاعر نام نہاد ترقی پسندی ، متحدہ قومیت ، فحاشی ، عریانی ، رجعت پسندی ، ذات پرستی اور اسی قسم کے دیگر گھروندوں میں مقیم اس خون چکاں ماحول کا منظر دیکھ رہے تھے ، اُس وقت پروفیسر انور رومان نے کوئٹے میں بیٹھ کر یہ مقالہ لکھا - اُنھوں نے ایک طرف ما قبل پاکستان ادب کو پاکستانیت کی کسوٹی پر پہلی دفعہ پرکھا ، نظریۂ پاکستان سے متصادم تمام رائج الوقت نظریات و افکار کا بخیہ ادھیڑا اور دوسری جانب ایسی مشعل روشن کی جس کی روشنی ہمارے ادبا و شعرا ظلمتوں اور خلاؤں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد دیکھنے لگے - انور رومان صاحب کے قلم میں طاقت تھی ، اُن کی نگاہ مستقبل پر جمی ہوئی تھی اور اُن کا تصور پاکستان کے نظریے کا حامل اور علمبردار تھا لہٰذا وہ تنقید میں نشتر ، تجویز میں دور رس اور تحقیق میں ان تھک تھے -

مصنف نے مقالے کے پہلے حصے میں ترقی پسند تحریک کے صالح اور جاندار عناصر کی بجا تعریف کی اور اس کے فاسد حصوں کو اپنے نشتر تنقید سے صاف کر دیا - دوسرے حصے میں اُنھوں نے پاکستانی قومیت کے پیش نظر پاکستانی ادیب و شاعر اور فنکار و دانشور کے سامنے کچھ ٹھوس

تجاویز پیش کیں جنھیں پاکستانی ادب کا مقدر بننا ہے ؛ مثلاً :
۱۔ اقبال شناسی
۲۔ ماضی کے ساتھ ہمارے ادب کو لازماً رابطہ رکھنا چاہیے ۔
۳۔ اُن موضوعات کو اپنانا جو پاکستانی قومیت اور ہماری پیش رفت کے لیے ضروری ہیں ۔
مصنف کی زبان سے سنیے :

''ان قوی ہیکل پہاڑوں کے اندر ہماری صنعت ، ہماری معیشت اور ہماری مسرت چھپی ہوئی ہے اور ان بھاری بھرکم سلوں میں ہمارے لاکھوں قہقہے ، مسکراہٹیں اور شاد کام زندگیاں مستور ہیں ۔ اُن کے اندر جائیے اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیے ۔ آپ افسانے لکھیں گے اور ہم پہاڑ کھودیں گے ۔ آپ اپنا شاہکار مکمل کریں گے اور ہم پہاڑوں کے خزانوں کو اجالیں گے ۔ اشتراک حسین ہے لیکن ادب اور جرأت کا امتزاج حسین تریں ۔''

۴۔ ادب کو پاکستان کا حقیقی نمایندہ اور رہبر ہونا چاہیے اور یہاں کے لوگ ادب سے مستفید ہونا چاہیے ۔
۵۔ انسانی عظمت کا تحفظ و بقا ۔
خود مصنف کے الفاظ میں پڑھیے :

''اس سے آگے اس کی نظر انسانیت پر ہونی چاہیے تاکہ وہ انسانی تہذیب کو بے روح ہونے سے بچا سکے اور پاکستانیوں کو اس قابل کر سکے کہ وہ انسانی و تہذیبی میدان میں اپنے اُن خیالات کی ترویج کر سکیں جنھیں ان کے مذہب ، تمدن اور تاریخ نے نہایت جامع طور پر پیش کیا ہے اور جنھیں وقت نے برحق ثابت کیا ہے ۔''

ضرورت ہے کہ ہمارا پاکستانی ادب پروفیسر انور رومان کے اس مضمون کو حرز جان اور وظیفۂ حیات بنا لے ۔
بطور نمونہ پروفیسر انور رومان کے تین نہایت اہم افسانوں کا ذکر ملاحظہ فرمائیے :
ویری ناگ : یہ ہفتہ وار 'زمانہ' کوئٹہ کی اشاعت بابت ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء

میں چھپا - اس میں انور رومان نے ایک کشمیری مجاہد کی نفسیاتی نقشہ کشی کی ہے جو بھارتی جبر و تشدد کے خلاف نبرد آزمائی کے دوران پہاڑ کی سل پر بیٹھا ہوا کشمیریوں کی مظلومیت ، مہاراجہ کی آہنی گرفت اور اس آہنی گرفت کو سنبھالا دیتی ہوئی بھارتی مداخلت اور پھر مظلوم انسانوں اور ان کے عزم جہاد پر غور کرتا ہے - وہ اپنے آبائی گاؤں سنگنور اور اس جیسے سینکڑوں گاؤں کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے - وہ کشمیر جنت نظیر کو ظالموں کے چنگل سے بچانا چاہتا ہے اور ہر دم اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے پتھروں کی اوٹ سے اُن بھارتی حملہ آوروں کو اپنی رائفل کی گولیوں سے ہلاک کر دیتا ہے یا پتھر لڑھکا کر مار ڈالتا ہے جو اس پہاڑ کو پار کر کے آگے جانا چاہتے ہیں -

تحریک آزادیٔ کشمیر کے مجاہد کا عزم ان جاندار الفاظ میں ملفوف ہے :

"میں کشیری ہوں ، میری زندگی ایک دلفریب تشبیہ ہے لیکن جب تم گولوں اور بموں سے اس تشبیہ کو چکنا چور کرنا چاہتے ہو تو وہی کشمیری چوٹیوں سے لڑھکتا ہوا وہ پتھر ہے جو دندناتا ہوا تمھیں اور تمھارے ان بزدل اوزاروں کو روند ڈالتا ہے - ان بکھرے ہوئے پرزوں کو دیکھو جن میں تم سسک سسک کر مر رہے ہو ، ان پہاڑوں کو دیکھو جو بھڑوں کی طرح گونج گونج کر تمھیں ڈستے جا رہے ہیں ! ! وہی کشمیری تمھاری فوجوں کی موت ہے ، تمھارے وقار کی لاش ، تمھارے سامراج کا جنازہ -"

کشمیر کی روحِ آزادی کو اس سے بہتر لفظی پیرہن اور کون سا مل سکتا ہے ؟

میں کبھی نہیں بھولوں گا (م ک ن ب) : ایک "نشترین" افسانہ جو انور رومان کے بہاریں قلم نے لکھا اور کراچی کے رسالہ 'گرد و پیش' میں چھپا -

بلوچستان میں دو طبقے ہیں امیر اور غریب - اس میں متوسط طبقے کا وجود ہی نہیں - جو امیر ہیں وہ بہترین زمینوں ، مکانوں ، خور و نوش ، پوشاک ، مواقع اور ذرائع کے مالک ہیں - اور جو غریب ہیں اُن کے لیے

زندگی کا ایک ایک دن بھی قیامت سے کم نہیں - نہ صرف یہ بلکہ بالائی طبقے کو بسا اوقات ایسے اختیارات میسر ہیں کہ وہ زندگی اور موت کا مالک ہے اور اس کے حکم کے خلاف نہ داد ہے نہ فریاد ، نہ وکیل ، نہ اپیل ، نہ دلیل - اس بے پناہ بے بسی و بے کسی اور بے کراں فلاکت کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک قبائلی دوشیزہ کو محض اپنا تن ڈھانکنے کے لیے بھی کپڑا نصیب نہیں اور وہ اپنی بے پردگی کو یوں چھپاتی ہے کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے منہ اندھیرے ہی اپنا ریوڑ لے کر پہاڑوں میں غائب ہو جاتی ہے اور غروبِ آفتاب کے بعد تیرگیِ شب میں واپس لوٹتی ہے - وہی دوشیزہ اس افسانے کا موضوع ہے -

کیا وہ دوشیزہ جو اپنی برہنگی کے باوجود حوروں سے زیادہ معصوم اور پاک ہے ، پورے بلوچستان کا مجسمہ نہیں ؟ پوری صنفِ نازک کی مظہر نہیں ؟ پورے انسانی معاشرے کے لیے ایک چیلنج نہیں ؟ یہ افسانہ انھی سوالوں کے جاں گداز تیر قاری کے قلب و ذہن میں پیوست کرتا ہے -

سانس : فضل الٰہی سیالکوٹ میں ایک سکول کا طالب علم تھا لیکن کتابیں پڑھنے کا بے حد شوقین - سکول کی لائبریری اور والدین جب اس کے بے اندازہ ذوقِ کتاب خوانی کا ساتھ نہ دے سکے تو وہ ۱۹۰۶ء میں کوئٹہ بھاگ آیا - وہ سارا سارا دن کوئٹہ چھاؤنی کے انگریز افسروں کے بنگلوں کا طواف محض اس لیے کرتا کہ وہ اسے اپنی پڑھی ہوئی کتابیں دے دیں اور وہ کتابوں کے اس دھنی کو کبھی مایوس نہ کرتے - آہستہ آہستہ اس کے پاس سینکڑوں کتابیں جمع ہو گئیں جنھیں اُس نے سورج گنج بازار میں ایک کرایے کی دوکان میں بے ترتیبی سے رکھ لیا لیکن وہ کتاب فروش نہ تھا ، کتابوں کا پرستار تھا ؟ وہ اپنے گاہکوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر بھگا دیتا اور لکھے پڑھوں کو بھی خاطر میں نہ لاتا ! جب اسے بھوک ستاتی تو وہ گاہک کو کوئی درمیانے سے درجے کی کتاب دے کر چند پیسے لیتا اور پیٹ کی آگ کو بجھا لیتا بلکہ گاہک کو بھی ساتھ چائے پلاتا -

وہ اتنا دنیا فراموش اور خود مست تھا کہ ۱۹۳۵ء کے قیامت خیز

زلزلۂ کوئٹہ کا بھی اسے پتا نہ چلا ۔ صبح کو جب وہ حسبِ معمول چائے پینے کے لیے اپنا ہوٹل ڈھونڈ رہا تھا تو فوجیوں نے اسے رات کی قیامت کا حال بتایا ۔

پاکستان بننے کے دو تین سال بعد تک وہ زندہ تھا ، پھر ایک شب بے ترتیب پڑی ہوئی کتابوں کا انبار یکبارگی اُس کے اُوپر جا گرا اور وہ اسی کے نیچے دب کر رہ گیا ۔

انور رومان کے افسانہ ''سانس'' کا موضوع یہی کتابی کیڑا مجذوب کوئٹہ فضل الٰہی ہے جس میں موصوف نے اُس کی شخصیت و حیات کے تینوں پہلو بخوبی اُجاگر کیے ہیں ۔

یہ افسانہ ماہانہ ''نو روز'' سیالکوٹ ستمبر ۱۹۴۸ء میں چھپا تھا ۔

علاوہ ازیں پروفیسر انور رومان نے متعدد ایسے افسانے اور مضامین تحریر فرمائے ہیں جو بلوچستانی ماحول اور طرز حیات کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں ۔ مثلاً :

۱۔ زلزلہ : مختصر مضمون ، بابت زلزلہ ۱۹۵۵ء ، مطبوعہ ماہنامہ ارتقا ، کوئٹہ ، مئی ۱۹۵۵ء ۔

۲۔ پاکستانی قومیت کا ایک تقاضا ، مطبوعہ ایلم ، مستونگ ، ۱۶ مارچ ۱۹۶۰ء ۔

۳۔ بروہیوں کی تاریخی اجنبیت : مطبوعہ امروز ، لاہور ، استقلال نمبر ، اگست ۱۹۶۰ء ۔

۴۔ پروفیسر ٹائن بی سے کوئٹہ میں ایک ملاقات : مطبوعہ امروز ، لاہور ، ۶ نومبر ۱۹۶۰ء ۔

۵۔ ہماری ثقافت کیا ہے اور کہاں ہے : مطبوعہ امروز لاہور ، ۹ جولائی ۱۹۶۱ء ۔

۶۔ مہمان (ڈرامہ) : مطبوعہ لیل و نہار ، لاہور ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ء ۔

۷۔ کچھ اپنی ثقافت کے بارے میں : مطبوعہ لیل و نہار ، لاہور ، ۱۳ اگست ۱۹۶۱ء ۔

۸- داغِ فراق (ایک طویل خط) : انتخاب نو ، کراچی ، سالنامہ ۱۹۶۳ع -
۹- ہمراز (ڈرامہ) : بلوچی دنیا ، ملتان ، جنوری ۱۹۶۷ع -
۱۰- الفاظ–آئینۂ تاریخ : مطبوعہ نوائے وقت ، لاہور ، یکم ستمبر ۱۹۶۶ع -

آپ نے اپریل ۱۹۶۷ع میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی انسائیکلو پیڈ آف اسلام کے لیے اُردو میں ''براہوئی تہذیب و تمدن'' ایک مقالہ لکھا ہے -

حال ہی میں ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے لیے بھی ایک طویل مقالہ بعنوان ''براہوئی'' قلم بند فرمایا ہے -

نثر میں ش ضحیٰ کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ، بلوچستان پر تین مضامین (بلوچستان کے باشندے ، ہمارا بلوچستان اور بلوچستان قدیم کی ایک جھلک) ہیں - یہ مضامین ''ماہ نو'' کراچی میں چھپے - تیسرا مضمون بعد میں ''روح ادب'' کراچی میں بھی شایع ہوا - پہلا اور تیسرا مضمون معلومات افزا ہونے کے علاوہ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہیں لیکن دوسرا طبعی حالات کو ایسے پیارے انداز میں پیش کرتا ہے کہ سارا مضمون شاعری میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے - بقول نیاز احمد[1] :

> ''مضمون نگار کا انداز عجیب سحر انگیز ہے کہ ہم بلوچستان کو دیکھے بغیر یوں محسوس کرتے ہیں ، گویا ہم نے اسے دیکھا ہے - ہم اس کی زندگی اور فضا کو جانتے ہیں - ش ضحیٰ نے اس کی تمام طبعی زندگی ، جاڑے ، گرمی ، بہار و خزاں کو ایک ڈراما ایک ناطق فلم بنا دیا ہے اور ہم بلوچستان کو ایک جامد علاقہ نہیں بلکہ جیتی جاگتی ہستی خیال کرتے ہیں -''

نمونے کے طور پرچند سطور ملاحظہ کیجیے :

> ''بلوچستان کے باشندوں کی طرح اس کے دریا بھی اپنی نظیر آپ ہیں - ان میں سے اکثر موسمی دریا ہیں اور جو غیر موسمی ہیں

۱- ماہ نو ، کراچی 'نئی آوازیں' مارچ ۱۹۵۳ع -

وہ ہم آپ سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں - پہاڑ کی چوٹیوں پر برف پگھلی تو پانی کی ایک ننھی سی دھار بہہ نکلی - دامن کوہ تک آتے آتے یہ دھار سنگریزوں کے فرش میں گم ہو گئی اور اندر ہی اندر بہنے لگی - کچھ دور جا کر یہ دھار دریا کی شکل میں پھر سطح پر نمودار ہو گئی اور لہرا لہرا کر بہنے لگی اور جی چاہا تو پھر رو پوش ہو گئی - بلوچستان میں ایسے زمین دوز دریا اور ندی نالے بکثرت پائے جاتے ہیں - دریاؤں کے زمین دوز ہو جانے سے پہاڑوں کے دامن اور دوسرے مقامات میں زمین کے نیچے پانی کا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے - قدرت کی ستم ظریفی یا بلوچستان کے اس دلچسپ مذاق کو دیکھیے کہ سطح پر کھیت اور باغات تو پانی کو ترس رہے ہیں اور پانی زمین کی تہ میں خلوت بنا بنا کر ہنس رہا ہے - اس کے ساتھ ہی بلوچستان کے باشندوں کی یہ ہمت بھی ملاحظہ کیجیے کہ وہ زمین کا سنگ لاخ سینہ کھود کر ان تہ خانوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اندر ہی اِندر ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں - اس طرح زمین دوز نہروں کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے جس کو ''کاریز'' کہتے ہیں - کاریزوں کی مدد سے زمین کی تہ کا آبی ذخیرہ سطح تک لے آیا جاتا ہے اور پھر اسے کھیتوں تک پہنچا دیا جاتا ہے - فرہاد کا جوئے شیر لانا تو ایک افسانہ ہے لیکن بلوچستان کے یہ کاریز حقیقی معنوں میں جوئے شیر ہیں -

قدرت نے اس سرزمین کے سینے پر اُونچے پہاڑوں کا بوجھ لاد رکھا ہے لیکن اس کے باوجود بلوچستان کا سینہ ہر دم دھڑکتا رہتا ہے - بلوچستان کی یہ دھڑکنیں زلزلہ کہلاتی ہیں -''

میر عطا محمد خان بلوچستانی علاقہ سبی کی ایک بستی[۱] ''ولہاری خان'' میں ۱۸۹۲ع میں پیدا ہوئے - آپ کے والد محترم حاجی ولہاری خان ضلع سبی کے ایک معزز زمیندار مرغزانی قبیلے سے متعلق تھے - آپ نے ابتدائی

۱- ایلم مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع ، صفحہ ۲۲ -

تعلیم بستی کی مسجد میں حاصل کی - یہاں سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول سبی میں داخل ہوئے - میٹرک کی مزید تعلیم کی خاطر لاہور گئے - وہاں سے لوٹنے کے بعد گورنمنٹ سروس میں آ گئے اور کچھ عرصہ بعد ترقی پا کر آپ مجسٹریٹ درجہ اول کے عہدے پر فائز ہوئے - وہ خود اپنے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں[1] :

''سال ۱۹۲۵ع میں جب کہ میں بلوچستان میں تحصیلدار تھا اور جب کہ میری عمر تینتیس برس کی تھی ، الحمد للہ میرے حالات نے پلٹا کھایا اور میں نے باوجود سرکاری ملازمت کی آلودگیوں ، فرائض منصبی کی مصروفیتوں کے مثنوی مولانا روم کا مطالعہ شروع کیا - مثنوی کے مطالعے کا شوق رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور حالت بہ اینجا رسید کہ سال ۱۹۲۹ع میں جب کہ میں بلوچستان میں (ای - اے - سی) فرسٹ کلاس مجسٹریٹ تھا ، میں نے بحمد اللہ اس ملازمت کو بغیر پنشن لینے کے ٹھکرا دیا اور مستعفی ہو گیا -''

آپ کے اپنے خیال کے مطابق آپ نے اپنی زندگی کا پہلا دور (بچپن سے لے کر ۱۹۲۵ع تک) جہالت ، ظلمت اور کلوروفارم کے نشے کے عالم میں گزارا - دوسرا دور(۱۹۲۵ع لغایت ۱۹۴۹ع) ان کے الفاظ میں ''خواب و بیداری ، غفلت و ہشیاری ، علم و جہل کے متضاد عناصر کا مجموعہ بنا رہا -'' تیسرا دور ۱۹۴۹ع سے شروع ہوا - اسی اثنا میں آپ حج بیت اللہ شریف کی زیات سے مستفیض ہوئے اور آئندہ زندگی کو علم و عمل میں صرف کرنے کی ٹھان لی - آپ نے یکم جولائی ۱۹۵۸ع کو وفات پائی -

میر عطاء محمد مرغزانی آزادی و حریت کے پروانے تھے -[2] اُنھوں نے بلوچستانیوں کی دامے درمے سخنے خدمت کی - انگریزوں سے بر سر پیکار رہے - صحافت کو خدمت کا ذریعہ بنایا - سبی سے ''الحق'' اور ''کلمۃ الحق'' جاری کیے - انگریزی استبداد نے ''الحق'' کو بند کرایا اور پریس بھی

۱- نفسیات عادات انسانی ، صفحات ۶ تا ۹ -

۲- ایلم ، مستونگ ، ۱۷ اگست ۱۹۶۶ع ، صفحہ ۲۲ -

ضبط کر لیا ۔ جرم صرف حق گوئی تھا ۔ ''کلمۃالحق'' آپ کی وفات تک جاری رہا ۔

میر موصوف پہلے شخص ہیں جنھوں نے سبی میں مسلم لیگ کو مستحکم کیا اور اس کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا ۔ مسلم لیگ ان کے دور میں یہاں خوب پھلی پھولی ۔

میر عطا محمد خان جہاں ایک اچھے صحافی تھے ، وہاں قابل قدر مصنف بھی تھے انھوں نے اپنی زندگی میں تین کتابیں، تحریر کیں دو طباعت کے زیور سے آراستہ ہوئیں ۔ تیسری ''علمائے ربانی'' پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی کیوں کہ میر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

نفسیات عادات انسانی : آپ کے اپنے قول کے مطابق اولین تالیف ہے مطبوعہ اسلامیہ پریس کوئٹہ ، قیمت پانچ روپے ۔ کتاب اٹھارہ ابواب اور ۳۴۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔

بنیادی طور پر یہ کتاب امام احمد غزالی اور مولانا جلال الدین رومی کے افکار ، اخلاق اور فلسفۂ حیات پر مشتمل ہے ۔ مؤلف اسلامی دنیا کے ان ہی دو مایۂ ناز فرزندوں کی نگارشات و خیالات کی تشریح و توضیح کرتا ہے ۔ اس اعتبار سے کتاب نفسیاتی کم اور اخلاقی زیادہ ہے ۔ اس میں نہ تو کرک گارڈ اور جین پال سارتر کے فلسفہ وجودیت پر کوئی بحث مل سکتی ہے ، نہ کارل مارکس کے اشتراکی فلسفہ کی موشگافیاں اور نہ فرائیڈ کے خیالات کی تنگی تصویریں جو آج کے قاری کے ذہن پر پوری طرح مسلط ہیں ۔ یہ تو ایک پکے ، سچے اور محب وطن پاکستانی مسلمان کے درد مند دل کی آواز ہے جو اس کے تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں سے پیدا ہوئی ہے ۔ مؤلف مذہب سے والہانہ عشق رکھتا ہے ۔ وہ نئی پود کی جنسی اور تصوراتی بے راہ روی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ اس کے نزدیک قوم کی فلاح و نجات اسی میں ہے کہ وہ مغربی مفکرین کے مادی اور جنسی نظریات کی الجھنوں سے نکل کر دین فطرت (اسلام) کی طرف لوٹ آئے ۔ نوع انسانی کے مرض کا علاج فرائیڈ کے فلسفۂ جنسیت ، ڈارون اور ہربرٹ اسپنسر کے نظریات ارتقائے حیات انسانی میں نہیں بلکہ اسلام کے فلسفۂ روحانیت میں

ہے - نئی پاکستانی نسل کو اعمال و کردار کے ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ غیروں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہ سکے اور وہ سانچہ تعلیمات قرآنی کا احیا ہے - اس مقصد کے لیے اسلام کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے موٹے موٹے اصولوں کی وضاحت جابجا احادیث نبوی سے کی گئی ہے - ساتھ ہی اُن کا صاف اور شستہ ترجمہ موجود ہے -

مؤلف کی رائے میں مفکرین اسلام کے دامن میں وہ سب کچھ صدیوں پہلے سے موجود ہے جو مغرب کے فلاسفروں نے دور جدید میں بگاڑ کر پیش کیا ہے - چنانچہ ان مفکرین کے فلسفے کو مولانا رومی کے ارتقائے حیات انسانی کے فلسفے کی خوشہ چینی گردانا ہے - جنسی بے راہ روی اور بیہودہ خیالات سے جو نفسیاتی اُلجھنیں اور بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں ، ان کے نفسیاتی علاج بھی لکھ دیے ہیں - عادات بد ، تفکرات اور غم و اندوہ سے نجات پانے کے راستوں کی طرف سے راہنمائی کر دی ہے - گویا مؤلف نے فارسی اخلاقی ادب کو کسی حد تک اُردو میں منتقل کرنے کی سعی بلیغ کی ہے ، اس لحاظ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے -

دو سو چھیاسی عنوانات کے تحت مختلف نفسیاتی ، اخلاقی ، قومی اور معاشرتی مسائل پر بحث کی گئی ہے - بعض مسائل پر میر عطا محمد کی دقت نظر قابل ستائش ہے اور انداز تحریر نہایت مؤثر اور سلجھا ہؤا ، زبان سہل ، شستہ و رفتہ ہے - کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی نظر آ جاتی ہیں - اقبال کے ایک اُردو شعر کو عرفی کا لکھا گیا ہے - تاہم بلوچستان کے ذخیرۂ زبان اُردو میں اس کتاب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - والدین ، اساتذہ اور عام پڑھے لکھے بالغ قاری کے لیے خاصے کی چیز ہے - اصلاح عادات اور تشکیل کردار کے لیے کار آمد ہے - مجموعی طور پر کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا -

عطا محمد خان مرغزانی کی دوسری مطبوعہ کتاب ہے ''ملا ازم'' ضخامت ۳۸۲ صفحات - ملنے کا پتہ : بنگلہ ولہاری خاں - سبی -

مصنف تعصب سے ہٹ کر صرف اپنے خاندان ، علاقہ اور ملک کے مفاد کے پیش نظر ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے تمام مسلمانوں کی اصلاح کا

بیڑا اُٹھاتا ہے ۔ وہ قوم کی دکھتی ہوئی رگ پر اپنا دست شفقت رکھ کر اُسے بیدار کرنے کی سعی کرتا ہے ۔ اُن تمام فاسد مادوں کو جو ناسور بن کر مسلم معاشرے کے رگ و ریشہ میں اثر انداز ہو چکے ہیں ، خارج کرنے کی تدابیر سوچتا ہے ۔

مصنف نے امام غزالیؒ اور مولانا جلال الدین رومی کی تصنیفات کا مطالعہ کرتے کرتے بیس تیس سال کا عرصہ طویل صرف کر دیا ہے اور اُن سے اس تصنیف میں کما حقہ فائدہ اُٹھایا ہے ۔ طرز تحریر محض جاذب نظر ہی نہیں بلکہ جاذب قلب بھی ہے ۔ اپنے بیان کو ڈراماائی انداز میں خواب کی شکل میں شروع کیا ہے اور قوم مسلم کے جذبات پر چرکے پر چرکے لگائے ہیں ۔ بقول مصنف[1] :

”فی زمانہ ہمارے ناول پسند نوجوانوں کو طویل علمی مضامین چنداں مرغوب خاطر نہیں ہؤا کرتے ہیں ، اس لیے میں نے کتاب زیر تصنیف میں اس چیز کا خاص خیال رکھا ہے اور میں باوجود افسانہ نگاری کے کوچے سے سرا سر نابلد ہونے کے بھی اس کتاب کو افسانوی رنگ میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ بقول انیس :

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو“

مصنف نے کتاب میں علمائے سؤ کے خلاف ایک بیباک مصلح کی حیثیت سے آواز آٹھائی ہے اور ایک درد مند معالج کی طرح بے دریغ ہو کر معاشرے کے ناسور کو تیز نشتر کے ذریعے چیرنے اور فاسد مواد کو خارج کرنے کی جسارت کی ہے ۔ علماء سؤ سے ہمدردانہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ ان باتوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کی بجائے فراخدلانہ رویہ اختیار کریں اور ٹھنڈے دل سے اپنی کوتاہیوں پر غور و خوض کرکے قوم کو قصر مذلت میں گرنے سے بچائیں کیونکہ علما کی اصلاح مقتدیوں کی اصلاح ہے اور مقتدیوں کی اصلاح کا راز قوم و ملت کی اصلاح میں مضمر ہے ۔

۱۔ مُلا ازم ، صفحہ ۱۶ ۔

مصنف کن لوگوں کی اصلاح چاہتا ہے ؟ خود اُس کی زبان سے سنیے[۱]:

''مجھے خود علماء کی ذات سے کوئی بیر نہیں ہے بلکہ مجھے اگر بیر ہے تو ہے :

ا۔ دھڑے بندیوں سے ۔ شیعہ سنی کے اندر خلیج افتراق وسیع کرنے سے

ب۔ تحریف اور تاویل سے

ج۔ مکر و دجل اور حیلہ جوئی سے

د۔ رسمی جدل اور مناظروں سے

ہ۔ روایتی زر طلبی اور زر پرستی سے

و۔ نمایشی وعظ و نصیحت سے ۔ فرضی رونے رلانے سے

ز۔ انگریز پرستی اور جاسوسیت سے ۔ ورنہ مجھے ایک اچھے ملا اور مولوی سے کیوں کر بیر ہو سکتا ہے'' ۔

کتاب کا بین السطور اگرچہ سخت ہے لیکن اُن کے لیے جن کی نیتیں فاسد ہیں ۔ مصنف کے خیال کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتری کی تمام تر ذمہ داری علماء سؤ پر ہے ۔ اگر عہد اکبری میں مخدوم الملک اور عبدالغنی صدر الصدور جیسے علماء سؤ کے درمیان چپقلش نہ ہوتی اور وہ اپنے اپنے وقار کی نگہداشت کی خاطر قوم و ملت کے مفاد کو تباہ و برباد نہ کرتے تو نہ ہی اکبر ملحدانہ رویہ اختیار کرتا اور نہ مسلمانوں کا شمار اقلیت کے زمرے میں آتا ۔ علاوہ ازیں ان علمائے سؤ کی مشق تکفیر نے جس کو بعد ازاں انگریز نے مزید ہوا دی قوم میں انتشار پیدا کر دیا ۔

مصنف نے مسلم قوم کی صرف مرض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ اس کا علاج بھی بتا دیا ہے۔ عامۃ الناس سے پر زور اپیل کی گئی ہے کہ وہ ان علماء سوء کی مشق تکفیر کو در خور اعتنا نہ سمجھیں ۔ اُن کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں تا کہ قوم کی گرتی ہوئی عمارت کو مزید تباہ ہونے سے بچایا جا سکے ۔

۱۔ ملا ازم ، صفحہ ۱۵ ۔

غالباً سہواً ایک مقام پر ابوسعید ابو الخیر کی مشہور رباعی کا یہ مصرعہ (این درگہ مادرگہ نومیدی نیست) مولانا رومی کے نام منسوب ہو گیا۔[1] بہر حال ''ملا ازم'' سراپا قومی اصلاح کے اصول سے پر ہے اور علماے سوء کی مرض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

میر گل خان نصیر ذگر مینگل نے جو سابقہ بلوچستان کا ایک صحافی، شاعر اور سیاسی کارکن ہے ''تاریخ بلوچستان'' دو حصوں میں شائع کرائی۔ پہلا حصہ ۱۹۵۲ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۵۷ء میں چھپا۔ صلاح الدین اقبال سٹیشنری مارٹ شارع لیاقت کوئٹہ اور ملک محمد پناہ قومی کتاب گھر قندھاری بازار کوئٹہ علی الترتیب پبلشر ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت موزوں۔ حصہ اول کی قیمت پانچ روپے اور حصہ دوم کی آٹھ روپے۔ پہلے حصے کے صفحات ۳۴۰ اور دوسرے کے صفحات ۶۴۰ ہیں۔

یہ براہوئیوں کی تاریخ نویسی پر پہلی مقامی کوشش ہے جو ایک براہوئی نے کی ہے۔ میر نصیر خان اول اور میر محراب خان شہید کے دور پر بہت اچھا مواد جمع کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ریاست قلات کی سیاسی جد و جہد اور اُتار چڑھاؤ پر مواد ملتا ہے۔ اس میں تاریخ قلات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور بادشاہوں، اُن کے درباروں اور فتوحات کے حالات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ معاشی، سماجی اور نظری پس منظر کو زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے کیونکہ ماحول ہی تاریخ کی حرکی قوت ہے۔ اس خطے میں اُردو میں تاریخ نویسی کی یہ دوسری کوشش ہے۔ زبان و اندازِ بیان جاندار ہیں۔

ہمارا کارواں: از عبدالرحمٰن کرد۔ سنہ اشاعت ۱۹۵۴ء۔ مقام اشاعت سریاب بلوچستان۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ، سر ورق سر زمین بلوچستان کے منظر کو پیش کرتا ہے۔

پیش حرف پروفیسر آغا صادق نے لکھا ہے اور خوب ہے۔ تعارف دو حضرات نے تحریر فرمایا ہے، ملک محمد رمضان بلوچ اور عبدالرحمٰن غور۔

۱۔ ''ملا ازم''، صفحہ ۲۷۔

ملک صاحب نے اس کتاب کو اس سے دو سال پہلے چھپنے والی تاریخ بلوچستان از قلم میر گل خان نصیر سے بہتر قرار دیا ہے -

کتاب کا مقصد بلوچوں کی تاریخی عظمت کے میناروں کو قارئین سے روشناس کرانا ہے - کتاب بلوچوں کی نقل وطن سے لے کر نورا مینگل تک محیط ہے اور ڈھائی تین ہزار سال کے عرصے میں اُن کی بوقلموں تاریخ کے چیدہ چیدہ واقعات اور شوخ نقوش کو عظیم ترین بلوچ ہستیوں میر چاکر رند، میر احمد خان ، میر عبداللہ خان ، میر نصیر خان نوری ، میر محراب خان شہید ، میر خدا داد خان ، سردار دودہ خان مری ، میر نصیر خان دوئم اور نورا مینگل کے سیاق و سباق میں پیش کرتی ہے - گو میر جلال خان جیسی مرکزی شخصیت کو نظر انداز کر دینا کھٹکتا ہے -

زبان اور انداز بیان شستہ ہیں - مصنف کا مقصد تحقیق نہیں بلکہ صرف اہم ترین واقعات و شخصیات کو تاریخی ترتیب سے پیش کرنا ہے اور اس مقصد میں یہ ایک نہایت کامیاب کوشش ہے ، گو علمی و تحقیقی لحاظ سے میر گل خان نصیر، میر خدا بخش خان مری ، محمد سردار خان گشکوری پروفیسر انور رومان کی تصنیفات اس سے بہت بہتر ہیں -

ہماری جد و جہد : از عبدالرحمٰن غور - ناشر اداره ادب بلوچستان کوئٹہ - تاریخ اشاعت ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء ، قیمت اڑھائی روپے ؛ ضخامت ۱۷۴ صفحات -

یہ کتاب کوئٹہ قلات ریجن کے افراد کی جد و جہد آزادی کی داستان ہے - اس کا تانا بانا تاریخی دستاویزات ، اقتباسات ، مضامین اور چند بلوچی و اُردو نظموں سے بُنا گیا ہے - سر زمین بلوچستان میں تحریک آزادی کی ابتدا انگریزوں کے دور اقتدار میں ہوئی - محراب خان شہید ، نورا مینگل اور شاہ جہان جوگیزئی سے یوسف عزیز مگسی اور اُن کے بعد تک اس تحریک نے کئی پہلو بدلے - مولف نے بعض ایسی شخصیتوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو انگریزی دور سے پہلے کی ہیں - مثلاً مائی بیبو اور پیر محمد کاکڑ وغیرہ -

مولف نے اس کتاب میں جو مضامین ، نظمیں ، تقاریر، بیانات اور افکار یکجا کیے ہیں ، وہ کسی خاص نقطۂ نظر رکھنے والے مکتبۂ فکر کے

نہیں بلکہ مختلف خیال و فکر اور نقطۂ نظر کے لوگوں کے افکار ہیں اور سابقہ بلوچستان میں جد و جہد آزادی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں ۔

مؤلف نے غلام حسین مسوری بگٹی (بلوچ ہیرو) کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ اس سے بہت پہلے پروفیسر انور رومان اسے تاریخ کے منتشر اوراق میں سے ڈھونڈ کر پیش کر چکے تھے ۔

ملک صالح محمد خان لہڑی ایم اے ایل ایل بی (علیگ) کوئٹہ نے ''بلوچستان (ون یونٹ سے پہلے)'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو ۱۹۵۵ع میں شائع ہوئی ۔ اس کے ناشر تھے فیض اللہ خان بلوچ مدیر ہفتہ وار باغ و بہار کوئٹہ ـــــ لکھائی ، چھپائی اور کاغذ بہتر ۔ قیمت چھ روپے ۔ کل صفحات ۳۰۳ ہیں ۔

یہ تاریخ زمانۂ قدیم سے بلوچوں کے حالات ، بلوچ و دیگر قبائل کی طرز معاشرت کے علاوہ بلوچستان میں انگریزی دور کے نظام کا مرقع اور قیام پاکستان کے حالات پر مشتمل ہے ۔

یہ کتاب مختصر ہے اور انگریزی دور کے جمع شدہ تحقیقی سرمائے کا ہی نچوڑ ہے ۔ موصوف چونکہ خود حکومت وقت کا پرزہ رہے ہیں اس لیے معلوماتی لحاظ سے یہ کتاب کافی مفید ہے ۔ اس میں براہوئیوں اور بلوچوں کا یکساں جائزہ لیا گیا ہے اور پٹھانوں کا ذکر بھی گاہے بگاہے ملتا ہے ۔ ہر بیان کے لیے مستند شواہد موجود ہیں ۔ مصنف کا مطمع نظر وسیع تر ہے اور اُس نے پاکستان کے وسیع دائرہ میں اس خطہ کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ میر نصیر خان اول (۱۷۵۰ع - ۱۷۹۴ع) کے حالات محض پانچ صفحات پر مبنی ہیں ۔ مشتاق طالب علم تشنگی محسوس کرتا ہے کیونکہ میر نصیر خان اول اس خطے کا عظیم حکمران تھا ۔

لہڑی صاحب کا انداز سیدھا سادہ اور دل نشین ہے ۔ زبان سادہ اور عام فہم استعمال کی گئی ہے ۔

التبیان فی التنقید علی دو قرآن : مولف میر مولا بخش خان ، ملا زائی بلوچ سابق نائب وزیر و ناظم الحکومت ریاست قلات ، پبلیشرز اقبال سٹیشنری مارٹ ، جناح روڈ کوئٹہ ، اشاعت ۱۹۵۵ع ، قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ

ضخامت ۹۶ صفحات -
اس میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب دو قرآن پر ناقدانہ تبصرہ ہے - مولف نے تنقیدی اصول کی پابندی کی ہے اور جو کچھ کہا ہے اس کے لیے دلائل پیش کیے ہیں -
صدائے آخر (ناولٹ) : مترجم ایم ممتاز ، ناشر ادارۂ ادب بلوچستان ، کوئٹہ ، ضخامت ۹۶ صفحات ، قیمت ڈیڑھ روپیہ ، تاریخ اشاعت ۷ فروری ۱۹۵۵ء مطبوعہ البرٹ پریس کوئٹہ ، حرفِ آغاز از عبدالرحمٰن غور -
یہ ناولٹ مشہور جرمن ناول نگار ''سٹیفان زویگ'' کے ایک طویل شاہکار افسانہ کا ترجمہ ہے جو سچی محبت کی ایک دردناک اور انوکھی داستان پر مشتمل ہے - اس میں اختصار کے باوجود ہر زندہ دل کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہے - ایک نو عمر دوشیزہ کی محبت جو اس کی زندگی پر محیط ہو جاتی ہے اور وہ بالآخر موت کی کشمکش میں شکار ہوتے وقت اپنے محبوب سے مخاطب ہے یقیناً انسانی فطرت کے سوز و گداز کی آئینہ دار ہے - اس کے پڑوس میں رہنے والا عظیم فن کار اپنی محبوبہ کی والہانہ محبت سے بے خبر تھا اور وہ اُس سے انتہائی محبت کرتی تھی - وہ رات بھر اس کا انتظار کرتی اور روزن دیوار سے اس کے کاخ و کو جھانکتی تاکہ اسے اپنے محبوب کی شکل نظر آ جائے - مترجم نے اس وقت کے جذبات کی گھما گھمی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے[۱] :

''میں وہاں کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی جھانکتی رہتی ــــ ستار کے تار کی طرح جوش سے پُر اور تنی ہوئی بیٹھی رہتی اور آپ کے قریب کے ہر لمس سے اسی تار کی طرح مرتعش ہو جاتی ، لرز اُٹھتی''

یہ عورت محبوب کو زندگی کا مخفی راز خیال کرتی ہے - اس کی ماں اسے کسی غرض سے بلاتی ہے تو اُسے تشویش ہوتی ہے - وہ یُوں سوچتی ہے ''کیا میں کسی طرح اپنے راز کا انکشاف کر بیٹھی تھی ؟ مجھے سب سے پہلے آپ کا خیال آیا ، اپنے راز کا ــــ اس کا جو

۱- صدائے آخر صفحہ ۲۹ -

مجھے زندگی سے وابستہ کیے ہوئے تھا''۱

ایک مدت جدائی کے ناگوار لمحات گزارنے کے بعد جب اُن کی ملاقات کا وقت قریب آتا ہے تو بھی وہ دوشیزہ اپنے محبوب پر اپنی حقیقی محبت کا انکشاف نہیں ہونے دیتی بلکہ وہ اسے ایک راز اور وہ بھی سر بستہ ـــــہی رہنے دیتی ہے ۔ اُس وقت وہ اپنے آپ کو ایک عام سوسائٹی گرل کی صورت میں پیش کرتی ہے ۔ اس بھروپ میں اس کے الفاظ بڑے پُر معنی ہیں اور جذبہ شدید قسم کے احساسات اور معنی خیز تجربے پر مشتمل ہے ۔

''بہر حال میں تھی کیا ۔ ایسی سینکڑوں عورتوں میں سے ایک تفریحی مشغلہ ، غیر مختتم زنجیر کی ایک کڑی''ـــــ۲

اس نقشے سے ہمیں اُس ملک کے معاشی طریق کار کا علم ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اُس معاشرے میں آزادی کا عنصر عریانی کی حد تک تجاوز کر چکا ہے ۔

مترجم نے ترجمہ کرتے وقت جس چیز کا خاص خیال رکھا ہے وہ یہ کہ ناول کی روح کو جو ترجمے کے سلسلے میں انتہائی نزاکتوں کا مظہر ہوتی ہے مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ ناول پڑھنے کے بعد وہ مجموعی تاثر قاری کو بھر پور طریقے سے متاثر کرتا ہے ۔ اس سلسلے میں داستان کے انجام سے ایک عبارت ملاحظہ ہو :

''غالباً اس مرتبہ تقدیر مجھ پر بہت مہربان ہوگی اور مجھے اپنے بچے کا جنازہ نکلتے ہوئے دیکھنا نہ پڑے گا ۔ میں بے حد مسرور ہوں کہ میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ـــــــــ کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی ہوں ۔ میں سوائے آپ کے اور کسی سے محبت نہیں کرتی ۔ میں صرف آپ ہی میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ۔ مجھے آپ سے محبت ہے ، مجھے آپ سے محبت ہے ـــــــــ الوداع۳

۱۔ صدائے آخر صفحہ ۳۴ ۔

۲۔ صدائے آخر صفحہ ۵۳ ۔

۳۔ صدائے آخر صفحہ ۹۴ ۔

ناول کا انجام اتنا حسرت ناک اور سبق آموز ہے کہ نہ صرف ہیرو پر ان ابدی حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے جو فنا کی صورت میں اٹل ہیں بلکہ قاری کی روح بھی کانپ اُٹھتی ہے اور ایک معصوم ، بھولی بھالی لڑکی کی پاکیزہ محبت کا تاثر قاری کے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ ساتھ ہی معاشرے کا ایک گھناؤنا پہلو بھی اُجاگر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مترجم کو سب سے زیادہ دشوار اور جس نازک صورت حال کا سامنا تھا وہ اس ناولٹ کی خارجی ہیئت تھی کیونکہ پورا ناول ایک طویل خط کی شکل میں پیش کیا گیا ہے ، جس میں حالات کی فلم چلنا شروع ہو جاتی ہے تو مختلف سین اور پارٹ قاری کی نظر کے سامنے آتے ہیں جس میں ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ دیگر کئی کردار ہیں مثلاً ہیرو کا نوکر ''جان'' ہیروئن کی رقیب ''عورت'' ہیروئن کے والدین اور اس کا نومولود و کم سن بچہ وغیرہ۔

مصنف نے موقعے کی نزاکت کے مطابق ان حالات کے بیان کو خط کی صورت دی ہے کیونکہ تحریر کنندہ کو یہ آسانی رہتی ہے کہ وہ اُن باتوں کا بھی اظہار کر سکتا ہے جنھیں وہ ویسے لب پر نہیں لاتا۔ مترجم بھی اپنی محنت سے خاصا کامیاب رہا ہے۔

ناقابل فراموش ہستیاں : از عبدالرحمان غور ، ناشر ادارۂ ادب بلوچستان ، کوئٹہ۔ تاریخ اشاعت ۱۳ فروری ۱۹۵۵ع ، ضخامت ۱۱۲ صفحات ، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ اس کا تعارف م س نوشیروانی بدہ کوئٹہ نے لکھا ہے۔

اس کتاب میں سترہ افسانے ہیں۔ غور کا فن اہمیت کے لحاظ سے افادیت کا حامل ہے۔ ان کے مختصر ناول ہوں یا افسانے زیادہ تر مقامی کردار اور ماحول پیش کرنے کے علاوہ سیاسی اور سماجی مسائل کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ابتدا میں تعارف نویس نے لکھا ہے کہ ''اس مجموعے کے افسانے فرضی نہیں حقیقی ہیں'' یہ درست سہی مگر یہ ضروری نہیں کہ کوئی ادیب محض سچی تصاویر ہی اپنے فن پارے میں پیش کرے۔ ادیب تو جو کچھ پیش کرتا ہے اس کی بنیادیں گرد و نواح کے معاشرے کی روزمرہ

زندگی سے اُٹھائی جاتی ہیں - ضروری نہیں یہ واقعہ وقوع پذیر ہی ہُوا ہو - ایسے واقعات کے پیش آنے کا امکان بھی ہو سکتا ہے -

زندگی کا پل : افسانے میں ممتاز نامی ایک دوشیزہ جو سٹیشن ماسٹر کی لڑکی ہے ، ہیروئن ہے جس کے دل میں انسانی محبت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے - سیلاب کے باعث پل ٹوٹ جاتا ہے وہ گینگ کی رہنمائی کرتی ہے اور پل تو تیار ہو جاتا ہے ، مگر وہ اس کی تیاری کے فکر میں ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے - لڑکھڑا کر ندی میں گر جاتی ہے اور ابدی نیند سو جاتی ہے -

ممتاز کا کردار ایثار و محبت اور شجاعت کا مثالی کردار ہے - وہ انسان دوست تھی - اس نے اپنی جان دے کر ہزاروں مسافروں کی جان بچا ڈالی - گویا اس افسانے کا موضوع ہمہ گیر قسم کے انسانی خلوص اور درد مندی پر مشتمل جذبات کا آئینہ دار ہے -

وہ کون تھی : اور ''ایک شہر ایک محبت'' ایسے افسانے ہیں جو معاشرتی درجہ بندی پر مشتمل رسم و رواج کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہیں - ''وہ کون تھی'' قصہ گو اس معاملے میں خود آشنا نہیں کہ وہ کون تھی جب کہ وہ کسی خوش خو اور تنو مند انسان سے شادی کرنے کی خواہش رکھتی تھی - اُس کے والد نے اُسے ایک بوڑھے سرمایہ دار کے ساتھ بیاہ دیا - وہ روتی چیختی رہی مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے - اسی طرح ''ایک شہر ایک محبت'' کی ہیروئن ''رضیہ'' اپنے آئیڈیل سے محبت کرنا چاہتی ہے مگر والدہ اس کی مخالفت کرتی ہے ، وہ تپ دق کا شکار ہو جاتی ہے - مرتے وقت وہ اپنے محبوب کو بلاتی ہے اور اسے کہتی ہے ''کیا میرے مرنے کے بعد مجھے یاد رکھو گے ؟''

''میری روح'' میں راشد ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتا ہے جو مغرور اور گستاخ ہے - وہ راشد کی محبت کا جواب بے نیازی سے دیتی ہے - راشد میڈیکل سکول چھوڑ دیتا ہے ، گھر چلا جاتا ہے اور بیمار ہو جاتا ہے - وہ زندہ تو ہے لیکن زندہ لاش کے مشابہ ہے -

ان تینوں افسانچوں میں غور نے نازک ترین معاشرتی صورت حال کی

تصویر کھینچی ہے۔ بظاہر وہ کون تھی کی ہیروئن ایک ایسی عورت ہے جس کو اس کا دل پسند شوہر نہ مل سکا لیکن دراصل یہ سب عورتوں کی نمایندگی کرتی ہے۔ نہ جانے کتنی روحیں اس طرح اپنی آرزوؤں کے محل مسمار ہوتے دیکھتی ہیں تو وہ نفسیاتی طور پر کئی امراض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح راشد بھی ایک ایسے ہی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ''طاہرہ خانم'' کو زندہ رہنے کا شوق ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے پیار ہے۔ بیمار لوگوں کی تیمارداری کا جذبہ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے لیکن وہ گھر کو آگ لگنے سے جان بحق ہو جاتی ہے۔

''**تین ساتھی ، ایک محبت ایک مقصد ، ایک سو سال بعد ؛ ڈھکا ہؤا آنسو ؛ مورچھل ، وہ بھوکا ہی رہا** ، ''دُرناز'' بھی معاشرتی اُلجھنوں کے آئینہ دار ہیں۔

عبدالرحمٰن غور نے ان افسانوں میں گرد و پیش کی زندگی کی تصویریں ہی پیش نہیں کیں بلکہ انھوں نے ان تخلیقات میں اپنے مثالی نظریات کو بھی اُجاگر کیا ہے ، جن سے ایک اچھا معاشرہ معرض وجود میں آ سکتا ہے۔ غور نے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے جو مرض تشخیص ہؤا اس کا علاج بھی فنکارانہ طور پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

عالیہ : از عبدالرحمٰن غور ، ناشر ادارۂ ادب بلوچستان کوئٹہ ، تاریخ اشاعت ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء ، قیمت سوا روپیہ ، ضخامت ۸۰ صفحات ، مطبوعہ البرٹ پریس کوئٹہ۔

''وطن کی درد ناک حالت اور تمہاری سسکتی ہوئی معذور زندگی کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے صاف صاف کہہ دیا''۔

بظاہر یہ ایک جملہ ہے جو اس ناولٹ کے آخری صفحات میں مصنف کے قلم سے ٹپکا ہے مگر در اصل یہی جملہ اس ناولٹ کی اصل روح ہے۔ مصنف نے اس ناولٹ میں جو ایک خط کی صورت میں ہے حقیقتاً اپنے علاقے کے سیاسی اور معاشرتی مسائل کی تصویر کھینچی ہے۔ اُس نے جنگ آزادی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے پیش منظر کو بھی سامنے رکھا ہے۔ انسان کے فطری اور ازلی جذبۂ آزادی پر قیود کو ناپسند کیا ہے۔ مصنف

نے فنکاروں اور ادیبوں کی مشکلات کا جو نقشہ کھینچا ہے نہ صرف مصنف کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا عکاس ہے بلکہ حساس انسانوں کے لیے سوچ بچار کے دریچے وا کرتا ہے ۔

یہ خط در اصل ایک حسینہ کی درد ناک داستان پر مشتمل ہے جس کا لکھنے والا ایک گمنام ادیب ہے اور اس کی منگنی ایک لڑکی 'عالیہ' سے ہو جاتی ہے ، لیکن شادی کا موقع دیکھنا اسے نصیب نہیں ہوتا اور وہ مایوس ہو کر بھاگ جاتا ہے ۔ تاہم جاتے وقت یہ خط اس محبوبہ کے سرہانے رکھ جاتا ہے جو شادی نہ ہونے کے باعث محبت میں گھل گھل کر جان دینے کے قریب ہوتی ہے ۔ وہ مجبور ہے کیونکہ اس کی والدہ بہت تلخ مزاج اور سخت طبیعت واقع ہوئی ہے ۔ 'عالیہ' کے ماموں کی شادی کے سلسلے میں عائد کردہ شرائط عاشق کے لیے سوہان روح ہیں ۔ ان شرائط کا ذکر خود مصنف کی زبان سے سنیے :

''مجھے پہلے سے زیادہ مجبور و پابند کر دیا گیا، ایک ہزار روپے کا زیور اور پانچ صد روپے اخراجات شادی کے لیے فراہم کرنا میرے ذمے ڈالا گیا ۔ تمھاری والدہ اور تمھارے اخراجات کے لیے اسّی روپیہ ماہوار ادا کرنا ان کے علاوہ تھا'' ۔

شادی کے سلسلے میں بھاری رقوم ادا کرنا تو کجا ، مصنف تو ماہوار رقم بھی بصد مشکل ادا کر سکتا تھا ۔ وہ کہاں سے دیگر رقم پس انداز کرتا اور دوسری طرف محبت کی کشش جب کہ عاشق و محبوب دونوں ایک ہی مکان میں مقیم ہوں اور سخت طبیعت والدہ دونوں کو ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہ دیتی ہو ۔ عالیہ اندر ہی اندر گھلنے لگی اور اسے تپ دق کے مہلک مرض نے گھیر لیا ۔ مصنف بالآخر مایوس ہو گیا ۔ عالیہ اور اس کی والدہ نے ماموں کے گھر کا رخ کیا لیکن ماہانہ کفالت کا ذمہ مصنف ہی کے کندھوں پر رہا ۔ جس کی ادائیگی میں اُسے بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ عالیہ کی خدمت اس کے مقصد کی تکمیل اور محبت کا مقدس فریضہ تھا ۔

غرض یہ ناول محبت ، محرومی اور اخلاص کی ایسی دلگداز حکایت کا

حامل ہے جس سے قاری گرد و نواح کے ماحول کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ مصنف نے ایسے مسائل کی وجہ معاشرتی جہالت بتائی ہے ۔ ممکن ہے درست ہو مگر خواندہ معاشرہ بھی گوناگوں مسائل سے دو چار ہو جاتا ہے ۔

جہاں تک اس ناولٹ کے مرکزی خیال کا تعلق ہے وہ ایک طرف تو بظاہر مصنف کا ذاتی مسئلہ ہے مگر دراصل وہ بلوچستان کا اجتماعی مسئلہ ہے ۔ یہاں کے رسم و رواج میں چند چیزیں جہاں مردانگی اور شرافت کا مظہر ہیں وہاں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو حساس دل انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں ۔ گویا مصنف کا یہ طویل خط انھی بعض نا مناسب رسوم اور سماج کے فرسودہ نظام کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے ۔

حکمت کے موتی : مرتبہ عبدالرحمٰن غور ، شائع کردہ ادارۂ ادب سبی (کوئٹہ) ، مطبوعہ اسلامیہ پریس کوئٹہ ، قیمت چار آنے ۔

سولہ صفحے کا یہ پمفلٹ قرآن حکیم کی یک صد آیات حکمت بمعہ اُردو ترجمہ پر مبنی ہے ۔ ان آیات میں معاشرت دینوی اور حکمت عملی کے اصول و قواعد بیان ہوئے ہیں ۔ مثلاً :

دشمن کی پہچان : تمھاری راحت کے وقت جس سے آثار کدورت ظاہر ہوں اور مصیبت کے وقت آثار مسرت ، اُس کو دشمن جانو ۔

اُمید اور عمل : ہر مطلب کی کامیابی کی امید اس وقت ہوگی جب وہ سلسلہ اختیار کیا جائے جو اُس کے حصول کے لیے بنایا گیا ہے ۔

شریف کی پہچان : انسان کے اندر شعوب اور قبائل صرف تعارف کے لیے بنائے گئے ہیں ۔ حقیقت میں شریف وہ ہے جس کے افعال شریفانہ ہیں ۔

عالم بے عمل : بے عمل عالم کے سینہ میں علم کا ذخیرہ ہونا ایسا ہے جیسا گدھے کی پیٹھ پر کتابوں کا لدا ہونا ۔

احسان کا بدلہ : احسان کا بدلہ احسان ہی ہونا چاہیے ۔

عاقل کا رویہ : عاقل ہر طرح کی بات سنتا ہے مگر اختیار اسی

کو کرتا ہے جو اُن میں اچھی ہوتی ہے''۔

آیات کے ساتھ مرتب نے قرآن مجید سے حوالے دے کر پمفلٹ کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں دینی اور دنیوی مسائل کا حل بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کاش! ایسے مفید پمفلٹوں کا سلسلہ جاری رہتا!

سچی کہانیاں: مرتبہ عبدالرحمٰن غور، ناشر ادارۂ ادب، سبی (کوئٹہ)، قیمت دو آنے۔

سولہ صفحے کا یہ پمفلٹ بچوں کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں دنیائے اسلام کی بزرگ ہستیوں کے سچے اخلاقی کارناموں کو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان سچی کہانیوں سے بچے صحیح اسلامی اخلاق اور تعلیم سے واقف ہو سکتے ہیں۔ ''خدا رازق ہے'' کے تحت درج ہے:

''ایک مرتبہ حضرت با یزید بسطامی نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ بعد نماز امام نے پوچھا کہ آپ کا کھانا پینا کہاں سے چلتا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ذرا صبر کرو۔ میں نماز دوبارہ پڑھ لوں پھر تمھاری بات کا جواب دوں گا'' اس نے پوچھا یہ کیونکر؟''

آپ نے فرمایا ''جو شخص روزی دینے والے کو نہ جانے، اس کے پیچھے نماز روا نہیں ہے''۔

کلیاں: از اے سلیم، شائع کردہ مکتبہ نونہال۔ پیر ابو الخیر روڈ۔ کوئٹہ۔ کل صفحات ۹۶۔ سن اشاعت ۱۹۵۸ء۔

یہ چار نظموں اور اُنیس مضمونوں پر مشتمل ہے۔ لکھنے والوں میں شامل ہیں: یاسمین صوفی، عذرا افتخار حقی، گل رخ اور مرزا محمد طاہر خان وغیرہ۔ مضامین ہلکے پھلکے اور سبق آموز ہیں۔ اسی مکتبہ نے بچوں کے لیے دو اور کتابیں ''غنچہ'' اور ''پھول'' بھی شائع کی تھیں۔

وادیٔ بولان میں: اس کے ترتیب دینے والے ہیں: اختر واحد قاضی، گلزار حسین گلزار، افضل کوٹلوی۔ اسے محمد جمیل بھٹی نے اسلامیہ پریس

کوئٹہ سے چھپوایا، ملنے کا پتہ: جے جی سٹیشنرز بک سیلرز، شارع لیاقت علی، کوئٹہ، کل صفحات ۱۵۸، قیمت دو روپے، سنہ اشاعت ۱۹۵۵ع -

پیشِ لفظ اور تعارف کے علاوہ یہ مجموعہ سات مقالات و مضامین، تئیس منظومات (اُن کا ذکر شعر و شاعری میں آ چکا) اور چار افسانوں پر مشتمل ہے لیکن مرتب اختر واحد قاضی کا یہ کہنا کہ ''یہ بلوچستان کی پہلی کتاب ہے'' صحیح نہیں - اس لیے کہ جنوری ۱۹۵۵ع سے پہلے بلوچستان میں بہت سی کتب چھپ چکی تھیں - اگر ان کا مقصود یہ تھا کہ یہ پہلا تذکرہ ہے تو بھی ادارۂ ادب سبی کی شائع کردہ ''مشعل'' مطبوعہ ۱۹۴۸ع کے پیشِ نظر یہ دعویٰ درست نہیں - بہرحال یہ بیس لکھنے والوں کے شعری و نثری کارناموں کا مجموعہ ہے اور افسوس ہے کہ ''مشعل'' کے متعدد لکھنے والے نظر انداز ہو گئے جنھوں نے انتہائی تاریک اور مخدوش ملکی حالات میں واقعی ایک ایسی مشعل روشن کر دی تھی جس میں مختلف اور متنوع فکر و خیال کے انوار و تجلیات سمٹ آئے تھے -

مقالات میں آغا صادق کا مضمون ''موسیقی و شعر کی مشترک اقدار'' کافی پُر مغز اور معلومات افزا ہے - انھوں نے فن لطیف کی ماہیت، موسیقی و شعر کے باہمی ربط، شعر اور وزن کے تعلق اور ترنم اور تحت اللفظ پر ایک ماہر کی حیثیت سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے -

اختر واحد قاضی نے فیض کے مجموعۂ کلام ''دستِ صبا'' پر ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے اور فیض کے فن و فکر پر خامہ فرسائی کی ہے -

طاہرہ نقوی نے اپنے قابل قدر مضمون ''انسانی قدریں'' میں انسانی وحدت و عظمت کو عظیم ترین قدر قرار دیا ہے -

سید ناظم علی دریا بادی نے ''تیلی تمبولی'' میں پیدایشی اور اکتسابی شعور میں حدّ فاصل قائم کی ہے اور ہمارے ہاں غلط تقسیم کار اور گمراہ کن نظام تعلیم کا نہایت کامیاب تجزیہ کیا ہے اور اپنا مضمون ان خیال انگیز

الفاظ پر ختم کیا ہے[1] :

''فرشتہ ، انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے یہ سوچنے کی اجازت ہمارا تمدن نہیں دیتا ۔ بھلا شعور بیدار ہو تو کیوں کر ؟ ان حالات میں تیلی تمبولی انسانیت کا بازار سنبھالے ہوئے ہیں ۔ جنس انسانیت کا آگے آگے کیا حشر ہوتا ہے ۔ یہ تمدن جانے یا خدا سمجھے ۔''

غلام محمد شاہوانی نے اپنے مختصر مضمون ''بلوچستان کے خانہ بدوش'' میں خانہ بدوشوں کی حالت زار کی طرف توجہ دلائی ہے اور سید فصیح اقبال نے اپنے مضمون ''سندھ کے ہاری'' میں ہاریوں کو محور مطالعہ بنایا ہے ۔ اُن کا حاصل مضمون یہ ہے ''سندھ کے کئی ہزار وڈیرے چالیس لاکھ ہاریوں پر زندہ ہیں ۔''

رفیق چوہان نے اپنے مضمون ''جو ہو ذوقِ یقیں پیدا'' میں کہا ہے کہ ملت اسلامیہ اُن افراد کی بدولت زندہ رہی ہے اور رہیگی جو ذوقِ یقین سے بہرہ ور تھے مثلاً مصطفیٰ کمال ، جمال الدین افغانی ، مولانا محمد علی جوہر ، علامہ اقبال وغیرہم ۔

افسانوں میں عبدالمنان شیخ کا افسانہ ''بیٹی'' ایک کامیاب کوشش ہے جو ہمارے اس پُر فریب ماحول پر ایک بھر پُور طنز ہے جس میں بنات القوم عصمت فروشی پر مجبور ہیں ۔

سید اختر شمسی نے اپنے افسانہ ''فنکار'' میں ایک ایسے کردار کا نقشہ کھینچا ہے جو اپنی مرحوم محبوبہ کے فراق میں فنکار بن جاتا ہے ۔ فضل الٰہی حلیم نے ''ادب برائے ؟'' میں ادب برائے شہرت پر قلم اُٹھایا ہے ۔

آخری افسانہ ''نوکری'' ملک محمد صادق خاں ناظر کی تصنیف ہے ۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مقالاتی اور منظوماتی حصے اچھے ہیں اور افسانوی حصہ خاصا کمزور ہے ۔

اسلامی نظامِ تعلیم : از پروفیسر سعید احمد رفیق ، مطبوعہ ادارہ

۱۔ وادیٔ بولان میں ۔ صفحہ ۷۸ ۔

تصنیف و تالیف (اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، کراچی ، سال اشاعت ۱۹۵۶ع ، ضخامت ۳۰۲ صفحات -

یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اور برصغیر میں مسلمان حکومتوں کے نظام تعلیم سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچاتی ہے - موضوع کے متعلق مصنف کا ذہن واضح اور رسا ہے -

آغازِ کتاب میں مصنف نے اسلامی تعلیم اور اُس کے مقاصد پر فاضلانہ خیالات کا اظہار فرمایا ہے - یہ تعلیم نہ صرف عوام کے شعور کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ تھی بلکہ آزاد قوم کے مقاصدِ اعلیٰ سے بھی شناسائی بہم پہنچاتی تھی اور اس سلسلے میں قرآنِ مجید اور اُس کی تعلیمات کی پیروی کی جاتی تھی - اسلام میں تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے - چنانچہ جب آنحضرت صلعم پر قرآن کریم نازل ہونا شروع ہؤا تو جس لفظ سے اس کی ابتدا ہوئی وہ ہے اقرأ (پڑھ) گویا سب سے پہلے جس چیز کی تاکید فرمائی گئی ہے ، وہ ہے پڑھنا -

اسی فرمانِ خداوندی پر عمل کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمان کسی ملک کو فتح کرتے تو بقول مصنف ''تلوار میان میں چلی جاتی تھی اور صرف قلم اپنی جولانیاں دکھاتا تھا -''

اس کتاب میں مسلم دور کے اشاعتِ تعلیم کے وسائل اور ذرائع کے بارے میں بڑے پتے کی باتیں کی گئی ہیں - عہد بعہد کی ارتقائی منازل کی بطریقِ احسن نشان دہی کی گئی ہے - ہر بادشاہ کے عہد حکومت کی علمی ، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں ، نصاب اور تدوین نصاب کے مقاصد پر الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے - ان کی ذاتی بیش بہا لائبریریوں سے متعلق معلومات افزا تفصیلات ملتی ہیں -

اشاعت و ترویج تعلیم کے لیے ان کی مساعی ، فراخدلی اور فیاضی کے ریکارڈ پیش کیے گئے ہیں - اکثر و بیشتر مسلمان شہنشاہ ، ان کے شہزادے اور شہزادیاں زیور علم و ادب سے آراستہ ہوتے تھے - اکثر بادشاہ عالم بھی تھے اور معلم بھی ، بلند پایہ شاعر بھی اور بے نظیر انشا پرداز بھی ، مسلمان غالب اور مغلوب دونوں صورتوں میں علم و ادب کے جھنڈے کو

تھا۔ پہلے رہے ۔ تاریخی شواہد سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے ۔ بادشاہ اور ان کے امرا ، علما اور طلبہ پر زر کثیر صرف کرتے تھے ۔ تعلیم ارزاں تھی اور عوام کے دروازوں تک پہنچ چکی تھی ۔ تعلیم حکومت کی پالیسی کا جزو نہ تھی لیکن بادشاہوں ، امرا اور عمال حکومت اور معاشرے کے مہذب طبقے میں تمدن و شائستگی کا معیار ضرور سمجھی جاتی تھی اور اس کا اجرا ، طریقۂ تعلیم ، نصاب تعلیم اور طریقۂ امتحان وغیرہ سراسر علما و فضلا پر منحصر تھا ۔ تعلیم کا مقصد خدا شناسی ، خود شناسی ، اصلاح معاشرہ اور تہذیب اخلاق تھا ۔ مصنف ہمیں ان مقاصدِ تعلیم سے روشناس کرانا چاہتا ہے جنھیں ہم دورِ غلامی میں طاقِ نسیاں پر رکھ چکے تھے لیکن قوم کی تعمیر و تشکیل کے لیے ان مقاصد کو اپنانا نہایت ضروری ہے ۔

ایک مقام پر مصنف نے لکھا[1] ہے :

''یہ (یعنی عربوں) کی سلطنت باوجود اتنی مختصر ہونے کے اس قدر مستحکم تھی کہ تین سو سال تک قائم رہی اور آخر محمود غزنوی نے آ کر اسے ختم کیا ۔''

اصل واقعہ یہ ہے کہ محمود غزنوی کی عربوں کے ساتھ براہِ راست مٹھ بھیڑ نہیں ہوئی ، البتہ ملتان کے قرامطہ سے اس کا مقابلہ ضرور ہوا ۔

موضوع کے اعتبار سے کتاب میں ابنِ خلدون اور امام احمد غزالی کے تعلیمی نظریات پر مقالات ہوتے تو جدید ذہنِ قاری کو ماضی کے دریچے میں سے جھانکنے کی تشویق دلاتے کیونکہ یہی وہ مفکر ہیں جنھیں ہم تعلیمی میدان میں مغربی مفکرین کے سامنے لا سکتے ہیں ۔

اس کتاب میں تاریخ تعلیم کے طالب علموں ، اساتذہ اور عام قاری کے لیے بڑی افادیت کی حامل باتیں لکھی گئی ہیں ۔ تاریخی کڑیوں کی ترتیب میں التزام مضمون اور موضوع کو خاص انداز سے ذہن نشین کرتا چلا جاتا ہے ۔ برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کے دور اقتدار کے تعلیمی مسائل پر یہ ایک مستحسن اور قابلِ قدر کوشش ہے ۔ البتہ اگر کتاب کا نام ''اسلامی

۱- صفحہ ۱۵ ۔

نظام تعلیم'' کی بجائے ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم'' ہوتا تو نام اور کتاب کے نفس مضمون میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ۔

تجدید الاسلام : مصنفہ دین محمد افغانی ، مطبوعہ بلوچستان پریس کوئٹہ ، سنہ اشاعت ۱۹۵۷ع ، کل صفحات ۵۱۲ ، قیمت ساڑھے پانچ روپے۔

اس کتاب کے مقصد کو ظاہر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے :

''عہد بنو اُمیہ سے لے کر آج تک مسلمان جن جن مقامات پر ''قرآنی صراط المستقیم'' سے پھسل کر خود ساختہ طور طریقوں پر گامزن ہو گئے ہیں وہ انھیں صاف صاف بتلا دئے جائیں اور پھر ان کے سامنے وہ لائحہ عمل بھی رکھ دیا جائے جس پر چل کر قرنِ اول (عہد رسالت مآبؐ) کے صحیح اسلام پر گامزن ہو سکیں ۔''

افغانی صاحب ایک اور کتاب ''تجدید عہد'' بھی لکھ رہے ہیں ۔ آپ پشین (ضلع کوئٹہ) کے باشندے ہیں ۔ اپنے مطالب کو اُردو میں اچھی طرح پیش کر سکتے ہیں ۔

میر غلام محمد شاہوانی اکتوبر ۱۹۳۰ع میں پیدا ہوئے[1] اور پانچ سال کی عمر میں قلات کے سکول میں داخل کر دیے گئے ۔ وہ سات سال کے تھے کہ شفیق اور بہادر باپ (ڈاکٹر فیض محمد شاہوانی) کے سایہ سے محروم ہو گئے ۔ ان کے بعد آپ کی تربیت اور پرورش آپ کے نانا علی محمد اور والدہ محترمہ نے کی ۔ غلام محمد نے قلات میں مڈل تک تعلیم حاصل کی اور مڈل کے امتحان میں قلات بھر میں اول آئے ۔ پھر خالصہ ہائی سکول کوئٹہ میں ۱۹۴۳ع میں داخلہ لیا اور میٹرک پاس کرکے ۱۹۴۵ع میں علی گڑھ کالج

۱- ''غلام محمد شاہوانی'' ۔ کمال الدین احمد ۔ بلوچی دنیا ملتان اکتوبر ۱۹۶۶ع ، اداریہ بلوچی دنیا ملتان اکتوبر ۱۹۶۶ع ، شاہوانی مرحوم نے ایک کتابچہ بھی تیار کیا تھا جس کی مدد سے اُردو دان طبقہ ایک ہی وقت میں براہوئی اور بلوچی سیکھ سکتا ہے ۔ اسے مکمل کرکے ۱۹۶۸ع کے شروع میں براہوئی اکیڈیمی کوئٹہ نے شائع کیا ہے ۔

میں داخل ہوئے ، وہاں ایف ایس سی میں تعلیم پا رہے تھے کہ قیام پاکستان پر انھیں واپس آنا پڑا ۔

آپ نے میزان کوئٹہ اور اتحاد کوئٹہ کے ادارۂ تحریر میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کیے ۔ روزنامہ ''اتحاد'' کوئٹہ اور قلات کے عوام میں پسند کیا جانے لگا اور اس کی تعدادِ اشاعت آخر میں دو ہزار تین سو تک پہنچ گئی ۔ اتنی تعداد میں اس وقت تک یہاں سے کوئی روزانہ اخبار شائع نہیں ہؤا تھا ۔

انھوں نے اپنا ہفتہ وار اخبار ''نوائے وطن'' بھی کوئٹہ سے جاری کیا ۔ وہ ایک معیاری پرچہ تھا ۔ روز بروز مقبولیت حاصل کرتا گیا ۔ آپ نے قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا ۔ آپ زندگی کے نصف النہار ہی میں ۲ ستمبر ۱۹۵۷ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔ اس بلند کردار عظیم صحافی نے اپنے کم عمر چھوٹے بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''عزیز ! والد کی شہادت کے بعد ہماری والدہ اور سارے خاندان نے ایک غیرت مندوں کے خاندان کی مانند زندگی گزاری ہے اور ہم میں سے کسی نے کبھی بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا ۔ میری روح کو اگر خوش رکھنا چاہتے ہو تو کسی کے سامنے مدد کے لیے کبھی ہاتھ نہ پھیلانا اور اپنے قوت بازو سے کام لینا ۔ بس میری یہی وصیت ہے ۔''

بلوچستان کے گوشے گوشے میں لالہ ، غلام جان اور شاہوانی کا نام زبان زد خاص و عام ہے ۔ آپ کو عزت و احترام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ آپ کی شوخیٔ تحریر ''نوائے وطن'' کوئٹہ اور اتحاد کوئٹہ کی فائلوں میں آج بھی موجود ہے ۔ آپ کا تحریر کردہ ایک اداریہ[1] بطور نمونہ نذرِ قارئین ہے ۔ دیکھیے وادیٔ بولان کے ایک قابل قدر فرزند کا قلم اُردو لکھنے میں کیسے رواں ہے ۔ خیالات اُس پر مستزاد ہیں :

''اس شمارے کے ساتھ 'نوائے وطن' اپنی زندگی کے چوتھے

۱۔ نوائے وطن : کوئٹہ ۱۶ جون ۱۹۵۵ء

سال میں قدم رکھ رہا ہے ۔ اس موقع پر ہم کسی مسرت کا اظہار کرنے کی بجائے نئے سال میں نئی مشکلات ، مصائب اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کے لیے قارئین کی دعاؤں کے متمنی ہیں ۔ 'نوائے وطن' کی ان روایات کو جو بے باک ترجمانی اور بے لوث خدمت سے متعلق ہیں ، نہ صرف قائم رہنے بلکہ ترقی دینے کا یقین دلاتے ہوئے 'نوائے وطن' کی بنیادی پالیسی کا ایک بار پھر اعلان کرکے ہم یہ واضح کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارا مقصد ملک و ملت کی خدمت ، ہمارا مسلک برائیوں کی اصلاح اور ہمارا نصب العین انسانیت کا عروج ہے ، لیکن اس فردوسِ خیال اور جنتِ تصور تک پہنچنے کے لیے اپنے محدود ذرائع کو ناکافی سمجھ کر ہم اپنی کوششوں کو ترک کرنے کی بجائے محدود دائرے میں ہی مقدور بھر جد و جہد کو جاری رکھنا فرض خیال کرتے ہیں ۔ لہٰذا اعلیٰ وارفع مقاصد کے باوجود روزمرہ زندگی کے واقعات ، ان کی وجوہات اور نتائج کو نظر انداز کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے ۔ اس لیے ان معاملوں میں انسانی جبلت سے ماورا حیثیت کا دعویٰ انتہائی مضحکہ خیز ہوگا ۔ بعض اوقات زندگی کو خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی ہو یا کسی اور عنوان سے متعلق ہو خطرے سے بچانے کے لیے ہمیں نشتر جیسے سفاک مسیحا کا بھی محتاج ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن ہر صورت میں صحافتی وقار و تقدس مجلسی آداب اور اخلاق اقدار سے نہ پھسلنے اور سرکنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں ۔ اس لیے ہماری رائے ، ہمارا تبصرہ اور ہماری تنقید کسی کے نزدیک صحیح ہو یا غلط ، اسے یہ یقین کرنا چاہیے کہ ہماری طرف سے یہ سب کچھ ایمان داری پر مبنی ہے ۔

ظلم قابلِ نفرت سہی مگر ظالم ہمارے نزدیک قابلِ رحم ہوتا ہے کیونکہ بزدلی اسے ظلم کی ترغیب دیتی ہے ۔ خوف اسے انصاف سے بھٹکنے پر مجبور کرتا ہے ۔ غرض اسے اندھا بنا دیتی ہے ، اس لیے مظلوم کی حمایت کے ساتھ ساتھ ہم خوف کا علاج

خوف سے کرنے کے لیے ظالم کو سخت تنقید اور کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنانے کو روا سمجھتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں ہماری نیت و دیانت کا معاوضہ بعض اوقات ہمیں عتاب کی صورت میں ملتا ہے - پُر شکن جبینیں ، شعلہ فشاں آنکھیں اور آتش فشاں دماغ ، حق گوئی و بیباک وقائع نگاری کے لیے ہمارے ہاتھ قلم کرنے اور زبان کھینچنے کے لیے حرکت میں آ جاتے ہیں لیکن ایسی آزمایشوں میں ہمارا دل نہیں کانپتا ، ہمارے قدم نہیں لڑکھڑاتے کیونکہ ہم صداقت پر ہوتے ہیں -''

مسلمانوں کے سیاسی افکار: اس کے مصنف پروفیسر رشید احمد ہیں جو اس خطے میں ۱۹۵۰ع سے سکونت پذیر ہیں ، ناشر ہے ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، لاہور ، سال اشاعت ۱۹٦۰ع -

یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں قرآنی نظریۂ اسلامی سلطنت کی توضیح کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ انسان کی ملکیت ہے ، وہ خدا کی ایک امانت ہے اور اس کی ملکیت محض عارضی نوعیت کی ہے - قرآنی تعلیم کے بموجب سروری صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان ، جو اس کا نائب اور خلیفہ ہے ، اس پر حقوق العباد اور حقوق اللہ واجب ہیں -

باقی ابواب میں بارہ مسلمان مفکرین کے حالات زندگی ، ان کی کتابوں اور سیاسی نظریات کے متعلق مختصر جائزے ہیں ، مثلاً فارابی ، ماوردی ، نظام الملک طوسی ، عنصرالمعالی کیکاؤس ، غزالی ، ابن تیمیہ ، ابن خلدون ، شاہ ولی اللہ ، سید احمد خاں ، جمال الدین افغانی اور اقبال - کم و بیش ان سب کا نظریۂ سلطنت قرآن پر مبنی ہے -

موجودہ دنیا مختلف سیاسی طبقوں میں بٹ گئی ہے اور ہر گروہ اقتصادی اور سیاسی برتری کا خواہاں ہے جس کی وجہ سے امن عالم خطرے میں پڑ گیا ہے ، لیکن جو مملکت قرآنی اصول پر بنائی جائے گی وہ یقیناً جنگ اور اقتصادی عدم استحکام کو روکنے کی پوری سعی کرے گی - ان سیاسی مفکرین کے بغور مطالعے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ خیال درست

ہے ۔ اس کتاب میں اسلامی تاریخ کا بھی ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے سیاسی اور سماجی انحطاط کے اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں ۔ اس زوال کا اصل سبب یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کو چھوڑ دیا ۔

ان مفکرین میں نظام الملک ، جو ملک شاہ سلجوقی کا وزیر اور کیکاؤس ، جو طبرستان کا والی تھا ، زیادہ نمایاں ہیں ۔ ان کی تصنیف ''سیاست نامہ' اور 'قابوس نامہ' بہت اہم ہیں ۔ 'سیاست نامہ' کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور یہ بین الاقوامی شہرت پا چکی ہے ۔ اُس میں سفیر کے جو فرائض بیان ہوئے ہیں ، وہ بالکل جدید تقاضوں کے مطابق ہیں ۔

مصنف نے برصغیر ہند و پاک سے صرف تین مفکرین کو منتخب کیا ہے ۔ حضرت مجدد الف ثانی کو ضرور شامل کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ ایک اہم دور کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ کتاب میں اہم حوالہ جات کا اضافہ کر کے اس کی افادیت کو بڑھایا جا سکتا تھا ۔ ناشرین کی ذرا سی توجہ کتاب کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بن سکتی تھی ۔

پروفیسر رشید احمد کا اسلوب بیان ابہام سے مبرا ہے ۔ وہ سادگی کے دلدادہ ہیں اور قارئین کے لیے مضمون میں دلچسپی پیدا کرنے میں کافی کامیاب نظر آتے ہیں ۔ اُردو کو ذریعہ اظہار بنا کر اُنھوں نے نہ صرف اس خطے میں بلکہ پورے ملک میں قومی زبان کی خدمت کی ہے ۔ یہ کتاب طالب علموں کی ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کرنے کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوگی ۔ یہ اس خاص صنف ادب میں ایک قابل تعریف اضافہ ہے ۔

اقبال کا نظریۂ اخلاق : اس کے مصنف پروفیسر سعید احمد رفیق ہیں ۔ وہ اس خطے میں ۱۹۴۹ء سے سکونت پذیر ہیں اور یہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں گرمجوشی سے حصہ لیتے ہیں ۔ اسے ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، لاہور نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ہے ۔ ضخامت ۲۱۴ صفحات ۔ اگر کاغذ کے انتخاب میں ذرا سی احتیاط برتی جاتی تو کتاب کی جاذبیت کافی بڑھ جاتی ۔

یہ کتاب علامہ اقبال کے اخلاقی نظریات کو منظم شکل میں پیش کرنے

کی ایک کوشش ہے ۔ مصنف کو اُردو کے ایک معروف صحافی اور علامہ اقبال کے ایک ذاتی دوست مولانا عبد المجید سالک مرحوم کی رہنمائی حاصل تھی ۔ مولانا سالک صرف کتاب کے پہلے تین باب ہی پڑھ سکے ۔
کتاب آٹھ ابواب میں منقسم ہے جو تصور خودی ، عمل کی مثبت اور منفی اقدار ، فرد اور ملت اور اخلاقیات و ما بعد الطبیعات کے باہمی رشتہ سے متعلق ہیں ۔ مصنف محض اقبال کے بنیادی ، اخلاقی نظریات کو واضح کرنے میں ہی کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اقبال کو مسلم مفکرین کے جھرمٹ میں رکھ کر تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے ۔
علامہ اقبال کا نظریۂ اخلاقیات اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے ۔ ان پر مولانا روسی کا بہت زیادہ اثر ہے ۔ ان کا نظریہ ''فوق البشر'' نطشے سے بالکل مختلف ہے ۔ نطشے کے نزدیک بلند ترین اخلاقی اصول طاقت تھا ، خواہ اس کا استعمال صحیح طریقے سے ہو یا غلط طریقے سے ۔ علامہ اقبال عجمی تصوف کے سخت خلاف تھے کیونکہ وہ رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے ۔ وہ ایک متحرک زندگی کے خواہاں تھے جس کی رہنمائی عشق کرے ۔
ما بعد الطبیعیات کسی بھی اخلاقی نظام کے لیے ایک لازمی چیز ہے ۔ اسلامی ضابطۂ اخلاق کی بنیاد بھی اسی قسم کا ایک ما بعد الطبیعیاتی اصول ہے ، یعنی توحید ، نبوت ، آزادی ، قوت ارادی اور حیات بعد الممات میں یقین رکھنا ۔
مصنف کا طرز بیان سادہ اور رواں ہے ۔ انھوں نے اپنے دلائل کے ساتھ اقبال کے اُردو اور فارسی شعر بکثرت پیش کیے ہیں ۔ کتاب ان لوگوں کے لیے بہت مفید ہے جو اقبال کے خیالات سے واقفیت چاہتے ہیں ۔
کوئٹہ قلات کے براہوئی : از پروفیسر انور رومان ۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ، سال اشاعت ١٩٦٠ع ، قیمت دو روپے ، بزبانِ انگریزی) ۔
مترجم : ڈاکٹر انعام الحق کوثر ۔ ترجمہ مطبوعہ ''ثقافت'' لاہور ، (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور) شمارے جنوری ١٩٦٤ع تا مئی ١٩٦٤ع ۔

انگریزی دور کے بلوچستان کے ساتھ ابتدائی تعلقات سے لے کر اس دور کی انتہا تک جو کچھ یورپی علما و فضلا نے براہوئیوں کے متعلق لکھا ہے ، اسے مصنف نے اپنے مطالعے و مشاہدات کی روشنی میں پرکھا ہے اور پھر وہ اصول دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو براہوئی ہیئتِ اجتماعیہ میں برسرکار تھے ۔ یہ اصول مصنف کے مطابق مندرجہ ذیل تھے :

وطن ، یعنی سرزمین قلات سے وفاداری‘ براہوئی زبان و تمدن سے وفاداری ، براہوئی دستور سے وفاداری اور براہوئی جنگ و دفاع میں بھر پور شرکت ۔

مرورِ زمان میں براہوئی سٹیٹ کی توسیع کے ساتھ ان اصول میں جو ترمیم ہوئی ، وہ بھی مصنف نے اُجاگر کر دی ہے ۔ اس کے بعد براہوئی تاریخ کا جائزہ لے کر اُن نظریات کو واضح کیا گیا ہے جو براہوئیوں کے مافی الضمیر میں نہاں ہیں اور جو نہ صرف ماضی میں اُن کے امتیازی اوصاف رہے ہیں بلکہ اُن کے مستقبل کی راہیں بھی متعین کرتے ہیں ۔ یہ نظریات مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ لچک اور وسعت پسندی
۲۔ سیاسی نقطۂ نظر
۳۔ اپنی سر زمین سے لگاؤ
۴۔ اُن کی مثالیت

مصنف کے خیال میں براہوئیت کے پہلے دونوں اجزا اُنھیں ایک جمہوری نظام کا اہل بناتے ہیں ۔ چوتھا جزو اُنھیں طبقۂ انسانیت کا اہم حصہ ہونے کی توفیق عطا کرتا ہے ۔ اگر وہ تیسرے نظریے میں وسعت پیدا کر کے قلات کی چار دیواری سے باہر جھانک سکیں اور ربطِ ملّتی کی لذت سے آشنا ہو سکیں تو نہ صرف براہوئیت ہمارے قومی آدرش سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے بلکہ براہوئی خود بھی اس آدرش کی پیش رفت کے لیے بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں ۔

بلوچ قبائل : تصنیف مسٹر ایل ڈیمز ، ترجمہ سید کامل القادری ، ناشر قصرالادب ، جگو والا براہ لودھران ضلع ملتان ، سالِ اشاعت ۱۹۶۱ع ،

قیمت ڈیڑھ روپیہ ، ضخامت (سیگزین سائز) ۹۵ صفحات ۔

لانگ ورتھ ڈیمز اُن معدودے چند انگریز افسروں میں سے تھے جو برصغیر ، خصوصاً بلوچستان میں محض حکمرانی کے لیے ہی وقف نہ رہے بلکہ اُنھوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنی محنت و مشقت اور تحقیق و تدقیق کے کچھ ایسے نقوش چھوڑے جو ان کے بعد بھی اثر خیز ہیں اور رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے ۔ مسٹر ڈیمز (اُن کی قبر فورٹ منرو میں سرکاری ریسٹ ہاؤس کے سامنے اب تک موجود ہے) نے نہایت جانفشانی اور دقتِ نظر سے بلوچوں کی روایتی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا تھا ۔ یہ کتاب جب نایاب ہوگئی تو میر خدا بخش مری بار ایٹ لا نے کوئٹہ سے اس کے بلوچی متن کو اُردو ترجمے کے ساتھ ۱۹٦۳ع میں دوبارہ شائع کروا دیا ۔

مسٹر ڈیمز کی دوسری معرکۃ الآرا تصنیف "دی بلوچ ریس" کو پہلی دفعہ اُردو کا جامہ پہنانے کی سعادت سید کامل القادری کے حصے میں آئی ۔

سید کامل القادری ایک پُر نویس صاحبِ قلم ہیں ۔ اُنھوں نے بلوچستان کے تہذیب و تمدن اور یہاں کے باسیوں کے عادات و اطوار اور بود و باش پر کئی دفعہ قلم اُٹھایا ہے اور اس بحر معانی سے متعدد گوہر ہائے رخشندہ برآمد کیے ہیں ، لہٰذا ڈیمز کی اس تصنیف کے مترجم ہونے کے لیے وہ بہت موزوں تھے ۔

ترجمہ صاحبِ تصنیف کی تحریر کے بالکل قریب رہ کر کیا گیا ہے ۔ مسٹر ڈیمز نے اس کتاب میں اپنی تحقیق کا سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ بلوچ نہ عرب ہیں ، نہ منگول اور نہ ترک بلکہ ایرانی ہیں ۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے علم بشر پیمائی ، بلوچی زبان ، فارسی تحریرات اور عربی تحقیقات و مشاہدات سے استفادہ بھی کیا ہے ۔ آخر میں دو ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں ۔ ضمیمۂ اول پرانی نظموں میں مذکور قبائل سے متعلق ہے اور ضمیمۂ دوم میں اُن قبائل کا ذکر ہے جو موجودہ دور میں تمنّات میں منظم ہیں ۔

بلوچ ماخذ کے اس نظریے کو اس موضوع پر حرفِ آخر نہیں سمجھا

جا سکتا - تاریخ عالم میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ ایک مختلف النسل قوم یا جمعیت کسی دوسرے جغرافیائی ماحول میں پہنچ کر نہ صرف اپنی اصلی زبان کھو کر وہیں کی زبان اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی بلکہ بشری خصوصیات میں بھی اپنی اصلی نسل سے مختلف ہو گئی - مسٹر ڈیمز کو خود بھی اس تحوّل صورت کا اعتراف ہے :

''مسٹر ریسلے کی تحقیق کے مطابق صوبۂ سرحد کی ۲۳ ذاتیں اوسطاً ۸۔۲ء۷ اور پنجاب کی ذاتیں اوسطاً ۱ء۳ء۷ کے زمرے میں آتی ہیں - مسٹر ریسلے نے بلوچوں کا انڈکس ۸۰ بتایا ہے لیکن ان کا یہ تخمینہ درست نہیں ہے کیونکہ انھوں نے اپنے اعداد و شمار میں لاہور اور اس کے مضافات کے بلوچوں کو بھی شامل کیا ہے - یہ بلوچ چونکہ ایک عرصے سے اس علاقے میں آباد ہیں اس لیے اُن میں ان کے قومی خصائص نہیں ملتے اور اُنھوں نے اپنے ماحول کے اثرات قبول کر لیے ہیں -''[1]

ظاہر ہے کہ اگر تین چار سو سال کے عرصے میں ایسا تغیر رونما ہو سکتا ہے تو اس سے عظیم تر زمانی فاصلوں کا نتیجہ عظیم تر تغیرات کی صورت یقیناً اختیار کر سکتا ہے -

بہرحال بلوچ ماخذ پر ممکنہ نظریات میں سے ایک نظریہ ڈیمز صاحب کا بھی ہے جسے مترجم کی وساطت سے اب خالص اُردو دان طبقہ بھی بالتفصیل زیر مطالعہ لا سکتا ہے -

اس کے علاوہ سید کامل القادری نے جو مضامین قلمبند فرمائے ہیں ، اُن میں سے چند ایک یہ ہیں :

۱- بلوچی ادب : مطبوعہ 'افکار' کراچی ، 'دس سالہ نمبر' ۱۹۵۴ء -

۲- براہوئی قبیلہ اور اُس کی زبان : امروز ، لاہور ، ۱۹۵۷ء -

۳- براہوئی ضرب الامثال : ایلم ، مستونگ ، ۱۹۶۱ء -

۱- بلوچ قبائل صفحہ ۲۳ -

۴۔ براہوئی زبان و ادب : اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ع ۔

۵۔ براہوئی اور اُردو : اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، نومبر ۱۹۶۲ع ۔

۶۔ بلوچ ثقافت : بلوچی دنیا ، ملتان ، ثقافت نمبر ، جنوری فروری ۱۹۶۰ع ۔

۷۔ نواب میر چاکر خاں رند : بلوچی دنیا ، ملتان ، ثقافت نمبر ، جنوری فروری ۱۹۶۰ع ۔

۸۔ جلوہ ہائے رنگ رنگ : بلوچی دنیا ، ملتان ، ثقافت نمبر ، جنوری فروری ۱۹۶۰ع ۔

۹۔ قدیم بلوچستان نمبر : بلوچ دنیا ، ملتان ، جنوری فروری ۱۹۶۱ع ۔

۱۰۔ قحطانی (بلوچوں کا ایک معروف قبیلہ) : بلوچی دنیا ، ملتان ، اکتوبر ۱۹۶۶ع ۔

بیگم خورشید مرزا مولانا شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز کالج کی صاحبزادی ہیں ۔ ادبی ذوق انھیں ورثہ میں ملا ہے ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے ۔ آپ کے شوہر اکبر مرزا ریٹائرڈ پولیس آفیسر ہیں ۔ آپ کوئٹے میں سکونت پذیر ہیں ۔ لکھنے کا ایک خاص سلیقہ رکھتی ہیں مگر ایک گرہستی خاتون ہونے کی وجہ سے گھر کی مصروفیات اور ذمہ داریاں زیادہ لکھنے کی مہلت نہیں دیتیں ۔ اس کے باوجود آپ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے باقاعدہ بزم خواتین کے پروگرام کو ترتیب دیتی ہیں اور خود بھی باقاعدہ اس میں حصہ لیتی ہیں ۔ اپوا کی روح و رواں ہیں اور اس کے تحت تعلیمی ادارے ، مینا بازار اور رفاہی کاموں میں مصروف رہتی ہیں ۔ ریڈیو فیچر اور ڈرامے لکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے ۔ انگریزی اور اُردو ادب کا مطالعہ خاصا ہے ۔

بیگم خورشید مرزا بھی اپنی بڑی بہن ڈاکٹر رشید جہاں کی طرح نکھرے ہوئے اسلوب بیان کی مالک ہیں ۔ آپ کے افسانوں کا موضوع معاشرے کے مسائل ہیں جنھیں آپ خوش اسلوبی سے بیان کرتی ہیں ۔ آپ کے

افسانوں کے کردار بے جان ٹائپ نہیں ہوتے بلکہ گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان ہوتے ہیں جنھیں ہم روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں۔

جین آسٹن اور چارلس ڈکنس کی طرح معاشرے کے چھوٹے اور غیر معروف انسانوں کو آپ نے اپنے افسانوں میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ وہ ان کے انسانی پہلوؤں کو بھانپ لیتی ہیں اور پھر ان کرداروں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتی ہیں۔ فیض محمد کا کردار اسی قسم کا ایک علاقائی کردار ہے جو اسی خطے کی پیداوار ہے۔

افسانہ ''رواج'' میں انھوں نے بلوچستان کے معاشرے کی ایک[1] زندہ تصویر پیش کی ہے جس میں سماجی مسائل پر نشتر لگایا گیا ہے۔

چوڑی والے[2] کا کردار بھی اسی خوش اسلوبی سے ابھارا گیا ہے۔ افسانہ چوڑی والے کی قلمی تصویر سے شروع ہوتا ہے جس میں ایک کالے کلوٹے لنگڑے لنجے کبڑے چوڑی والے کا حلیہ بیان کیا ہے۔ میلے کچیلے دانت، پھٹے جوتوں میں سے انگوٹھے کے ناخن جھانکتے اور سر پر میلی ترکی ٹوپی اس کی تصویر پیش کر دیتے تھے مگر اس کے میلے جسم کے اندر ایک مجاہد کا دل دھڑکتا تھا۔ سعادت علی کا کردار اس وقت بلندی پر پہنچتا ہے جب کہانی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

''آپی''[3] آپ کا شاہکار ہے۔ آپی ایک جگت آپی بن کر رہ گئی ہیں جن کی ذات میں بچوں اور بڑوں سب کے درد کی دوا ہے۔ آپی زندگی کے آئینہ میں تقریباً ہر عورت اپنی زندگی کے کسی نہ کسی رخ کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔

''روبی''[4] آپ کا طویل مختصر افسانہ ہے جس کی ساری کہانی جہاز پر بیان کی گئی ہے۔ ڈرامہ کی وحدت مکانی کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔

۱۔ ''ساقی'' کراچی افسانہ نمبر ۱۹۶۱

۲۔ ساقی، کراچی، سالنامہ ۱۹۶۱۔

۳۔ ساقی، کراچی، سالنامہ ۱۹۶۰۔

۴۔ ساقی، کراچی، ناولٹ نمبر ۱۹۶۲۔

"عورت نوری بھی ہے ناری[1] بھی" کامیاب افسانہ ہے جس میں ہزاری کا کردار کامیابی سے پیش کیا گیا اور سماج کے ایک اہم مسئلہ کی عکاسی کی گئی ہے۔

"رپٹ[2]" میں ایک گھناؤنے ماحول اور مجرمانہ ذہنیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

بیگم خورشید مرزا اپنی گھریلو اور دیگر مصروفیات کے باعث کم لکھتی ہیں مگر جو کچھ لکھتی ہیں اس میں پختگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ آپ نے شاہد احمد دہلوی مرحوم کے اصرار پر ایک ناولٹ "ناز بی بی" بھی لکھا ہے جس میں بلوچستان کے قبائل کی زندگی اور اُن کے سماجی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ ناولٹ بیگم شاہد احمد کے پاس ہے، توقع ہے کہ جلد چھپ جائے گا۔

بلوچوں کے رومان: (لوک کہانیاں اور شخصیات) اس کے مصنف ہیں انجم قزلباش۔ سال اشاعت ۱۹۶۲ء، ناشر قلات پبلیشرز، مستونگ، ضخامت ۱۵۷ صفحات، قیمت ساڑھے تین روپے، لکھائی چھپائی اور کاغذ موزوں، سرورق بلوچستانی فضا کی نمائندگی کرتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ میر امان اللہ گچکی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد آٹھ بلوچی رومان، چار لوک کہانیاں، پانچ شخصیات اور دو بلوچ قبائل مری اور بگٹی کے حالات درج کیے گئے ہیں۔

آٹھ بلوچی رومانوں میں سے حانی شہ مرید، شیریں اور دوستین، شہداد و ماہناز، اور بیبرگ و گرا ناز، میر چاکر خان اعظم کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دور ایک طرف اگر بلوچی شجاعت کی معراج تھا تو دوسری طرف بلوچوں کی رومانوی اُفتاد کا بابِ عالی بھی۔ محبت خان و سامری کا رومان اٹھارویں صدی سے متعلق ہے۔ عزت و مہرک ایرانی بلوچستان کا رومان ہے۔ سمّو و مست توکلی اور درویش و بیگم اُنیسویں

۱- ساقی، کراچی، نومبر ۱۹۶۶ -

۲- ساقی، کراچی، اپریل ۱۹۶۵ -

صدی سے منسوب ہیں - یہ رومان لوک گیتوں کی صورت میں بلوچوں میں صدیوں سے گائے اور سنے جاتے ہیں اور انجم قزلباش نے اُنھیں ان روائتی منظومات کے بہت قریب رہ کر اُردو کا جامہ پہنا دیا ہے - ۱

چاروں لوک کہانیوں میں سے 'چلتن' اور 'ادریس' تو خالص بلوچستانی ماحول کی کہانی ہے - 'احمق کون' ؟ 'شرط' اور 'دانش کا امتحان' ایسی کہانیاں ہیں جو مغربی پاکستان میں بلوچوں کے نفوذ کے ساتھ ساتھ دیگر حصص میں بھی غالباً پہنچ گئی ہیں -

شخصیات میں سر فہرست 'بیبرگ' ہے جو عظیم ترین بلوچ دانا بھی تھا ، مجسم شعلۂ عشق و محبت بھی اور ایک رجائیت پسند شاعر بھی - رحم علی مری بجار کا بیٹا تھا اور انیسویں بیسویں صدی کا عوامی شاعر جو سرداروں کا نڈر نقاد اور انگریزوں کا اٹل دشمن تھا - میر اشرف اور رمی مکران کی سرزمین کے دو زندۂ جاوید موسیقار تھے - آزاد جمالدینی سردار زادہ ہونے کے باوجود عوام دوست اور سحر آشنا شاعر ہیں اور شاعر گل خان نصیر گویا ایک شمشیر برہنہ ہیں جو اندھیروں کو کاٹتی چلی جاتی ہے - آخر میں مری اور بگٹی قبائل کی جد و جہد آزادی خصوصاً انگریزوں کے خلاف ان کی نبرد آزمائیاں مختصراً بیان کی گئی ہیں -

مجموعی طور پر یہ کتاب بلوچوں کی اہم ثقافتی و معاشرتی اقدار کو نہایت صحت اور حسن کے ساتھ پیش کرتی ہے -

آغا صادق کی کتاب ''بردوش ہوا'' اگست ۱۹۶۲ع میں اشاعت ادب ، انار کلی لاہور کے زیر اہتمام طبع ہوئی - ضخامت ۱۹۰ صفحات ، قیمت چار روپے ، لکھائی چھپائی اور کاغذ سوزوں -

یہ دس نثری تقریروں اور دو غیر نثری مقالوں کا مجموعہ ہے - کتاب کا نام تجویز کرتے وقت اس کے غالب حصے کی نوعیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے - تعارف اقبال سلمان نے رقم کیا ہے - اُنھوں نے نثری تقاریر کی تشنگی کا جواز بھی پیش کیا ہے - آغا صاحب کا مضمون ''اُردو شاعری میں ہیئت کا ارتقا'' اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اُنھیں فن عروض پر خاصا عبور حاصل ہے -

محمد اقبال سلطان ۱۰ مئی ۱۹۱۴ع کو ضلع گجرات کے ایک دور اُفتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ مطالعے کا شوق ہمیشہ سے رہا ہے ۔ مضمون نویسی کا مشغلہ ابتدائی جماعتوں ہی میں اختیار کر لیا تھا چنانچہ ''غنچہ'' بجنور ، تحریک سیرت کے اخبار ''ایمان'' اور روز نامہ ''انقلاب'' میں کئی مضمون ان کے زمانۂ طالب علمی ہی میں شائع ہوئے ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تحریک سیرت سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۳۳ع تا ۱۹۳۵ع اخبار 'ایمان' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا ۔ اس کے بعد امرت سر کے مشہور دینی رسالے ''بلاغ'' سے وابستہ ہوئے ۔ وہیں تفسیر ، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیا ۔

قیام پاکستان کے بعد کوئٹے آ گئے اور یہاں محکمہ نشر و اشاعت میں مترجم اور اخبار 'بلوچستان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے ۔ یہ اخبار وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے بعد بند ہو گیا ۔ آپ کو ''مقالہ نگار'' کی اسامی پر متعین کر دیا گیا اور اب تک وہیں کام کر رہے ہیں ۔

آپ ترجمے کے فن میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ۱۹۴۰ع میں ہربرٹ این کیسن کی کتاب Climbing up کا اُردو ترجمہ کیا جس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں ۔

زبان کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔ مطالعہ مشغلہ (Hobby) ہے ۔ بے شمار کتابیں پڑھی ہیں ، اب تک ہزاروں صفحے لکھے ہیں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوئی ۔

نہ حسنش غایتے دارد ، نہ سعدی را سخن پایاں

یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں ۔

آپ کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں ، دو (نکات اُردو اور فرہنگ اُردو) زیر ترتیب ہیں ۔ چھپی ہوئی کتابوں پر مختصر تبصرہ یہ ہے ۔ یہ کتابیں کوئٹہ میں لکھی گئیں ۔

آداب زندگی : ناشر مکتبۂ جدید لاہور ، ضخامت ۳۰۸ صفحات ، سال اشاعت ۱۹۶۳ع ۔

سموئل سمائلز کا کہنا ہے :

''زندگی بسر کرنے کا فن اس قابل ہے کہ اسے عمدہ فنون میں شمار کیا جائے ۔ علم و ادب کی طرح اسے بھی انسانی فضائل میں سے ایک فضیلت سمجھنا چاہیے ۔ یہ فن معاشرتی وسائل سے بہترین طور پر فائدہ اُٹھانے ، زندگی کی بلند تریں مسرتوں سے لطف اندوز ہونے اور اس کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے ۔''

محمد اقبال سلمان کی یہ کتاب سموئل سمائلز کے اس ارشاد کی بہت اچھی ترجمانی کرتی ہے ۔ اس میں انسانی زندگی سے متعلق اٹھارہ موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ چند ایک یہ ہیں : فنِ گفتگو ، دوستی ، مہمان داری ، پیشے کا انتخاب ، بڑھاپا ، ازدواجی زندگی ، حافظے کی تربیت ، مصیبتوں کا علاج ۔

مصنف نے ذاتی تجربات کے پہلو بہ پہلو دوسرے مفکرین کے برمحل اقوال بھی پیش کیے ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مطالعے کا نچوڑ ہیں ۔ ایک جگہ آتا ہے[1] :

''گفتگو جتنی طویل ہوگی ، مطلب اتنا ہی کم ہوگا ۔ شکسپیئر کا قول ہے ''اختصار ذہانت کی روح ہے'' اور پوپ کا یہ مقولہ بھی ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے : ''الفاظ مثل پتیوں کے اور مطلب مثل پھل کے ۔'' جب کسی درخت میں پتیاں زیادہ ہوں تو اس کے پھل کمزور ہوتے ہیں ۔ ضرورت سے زیادہ گفتگو کرنے والوں کو یہ گمان ہو جاتا ہے کہ لوگ ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں ، حالانکہ یہ دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح کی وضع داری ہوتی ہے کہ کوئی انھیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھتا ۔ نہ جانے لوگ دل ہی دل میں انھیں کیسا بیوقوف سمجھتے ہیں اور کتنی نفرت کرتے ہیں ۔''

۲- نفسیات سب کے لیے : ناشر مکتبہ جدید لاہور ، ضخامت ۱۳۳

۱- آدابِ زندگی ، صفحہ ۱۳ ۔

صفحات ، سالِ اشاعت ۱۹۶۵ء -

محمد اقبال سلطان نے کتابِ زندگی کے چند نہایت ضروری اوراق نفسیات کی روشنی میں زیر مطالعہ لانے کی سعی فرمائی ہے - اُن کی اس سعیِ بلیغ سے یقیناً وہ لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو خدا داد صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہوں - اس سلسلے میں یہ امر بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ شخصیت کا بناؤ سنگار ایک دن میں ممکن نہیں اور تنہا مطالعہ ہی کافی نہیں - جو بقول مصنف : ''اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو جاننے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کا نام ہے'' فقط نفسیات رہنما بن سکتی ہے - اس سے عملی طور پر بہرہ یاب ہونا ہمارا اپنا فرض ہے -

اس کتاب کے پندرہ مضامین ہماری زندگی سے منشعب ہوئے ہیں - اُن میں سے چند ایک یہ ہیں : لاشعور ، احساسِ کمتری ، قوتِ ارادی ، ذہنی تھکن ، خیرات ، ڈراؤنے خواب ، شادی ، مذہب -

مصنف نے برمحل مثالوں سے موضوعات کو زیادہ قابل عمل بنا دیا ہے - ایک مقام ملاحظہ فرمائیے[۱] :

''خیرات کے بارے میں ایک روشن اور سبق آموز مثال ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیمتی رہنمائی سے ملتی ہے - حضور کی خدمت میں ایک سائل آیا - آپؐ نے فرمایا ''جو کچھ تمھارے گھر میں ہے لے آؤ''- وہ ایک کمبل اور لکڑی کا ایک پیالہ لے آیا - حضورؐ کے ایما پر یہ دونوں چیزیں حاضرینِ مجلس میں سے کسی نے خرید لیں - اس طرح جو رقم حاصل ہوئی اس میں سے نصف فوری ضرورتوں کے لیے سائل کو دے دی گئی اور باقی نصف سے ایک کلہاڑی بنوا دی گئی - فرمایا : جنگل میں جا کر لکڑی کاٹو اور شہر میں لا کر بیچا کرو - آپؐ کی اس نصیحت پر عمل کرنے سے وہ شخص اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا -''

ان دونوں کتابوں میں محمد اقبال سلطان کا اسلوب نگارش سادہ لیکن

۱- نفسیات سب کے لیے ، صفحہ ۷۸ -

دلنشین اور اثر پذیر ہے ۔ مطالعہ کے وقت قاری کا دل چاہنے لگتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ایک ہی نشست میں پڑھ جائے اور ہضم کر سکے ۔

زبان کا مطالعہ : مصنفہ پروفیسر خلیل صدیقی ، ناشر زمرد حسین بھٹہ ، قلات پبلیشرز مستونگ ، مطبوعہ قلات پریس مستونگ ، نفیس ٹائپ میں چھپی ہے ، سالِ اشاعت ۱۹۶۴ع ، ضخامت ۲۷۹ صفحات ۔

پروفیسر خلیل صدیقی ۱۹۴۸ع میں کوئٹہ آئے اور یہیں اقامت گزیں ہو گئے ۔ اُنھوں نے یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ جو حضرات لسانیات سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔ اُن کے لیے 'زبان کا مطالعہ' ایک مفید معلوماتی اثاثہ ہے ۔ کتاب میں چار ابواب کے علاوہ حواشی بھی ہیں ۔

پہلے باب میں لسانیات کی تعریف اور مباحث لسانیات پر بحث کی گئی ہے ۔ زبان کے مطالعے کے لیے الفاظ کی تحریری اور صوتی صورتوں کے علاوہ قائل اور سامع کے ذہنی پس منظر پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ زبان کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے تقابلی مطالعے کی اہمیت واضح کی گئی ہے ۔

دوسرے باب میں گریمر نویسی کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سنسکرت ، فارسی ، جرمن ، لاطینی اور یونانی زبانیں کسی ایک ہی چشمہ سے سیراب ہوئی ہیں ۔ ہندو یورپی زبانوں کی گروہی تقسیم کا ذکر ہے ۔ مختلف زبانوں کے ہم خاندان ہونے کی اساس پر بحث کی گئی ہے ۔ صوتیات اور تقابلی گرامر پر دسترس رکھنے والے مشہور زمانہ علما کی فکر انگیز خیال آرائی سے کتاب کو مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شلیگل ، ریسک ، بوپ ، گرم ، فک پاٹ ، کے ایم اِپ ، ڈورف ، جارج کرٹی اس ، جسپرسن ، میکس ملر ، وھٹنے ، کارل ورنر ، بروگ مین ، ہر مین پال ، اور فرڈیننڈدا ساسر نے لسانیات کے مباحث پر جو بحثیں کی ہیں ، ان کا لب لباب پیش کیا گیا ہے ۔

مصنف نے ماہرین لسانیات کی بحثوں پر موزوں مقامات پر تنقید بھی کی ہے ۔ اگر مزید مثالیں دی جاتیں تو یقیناً اہمیت بڑھ جاتی ۔

تیسرے باب میں زبانوں کے مختلف خاندانوں کے لحاظ سے لسانیات کی تقسیم کا ذکر ہے - عام لسانیات ، تقابلی لسانیات ، گریمر اور ان مباحث کا ذکر ہے جو اس تقسیم کے سبب پیدا ہوتے ہیں - علم الاصوات ، صوتیات ، نحو ، فرہنگ اور علم ہجا پر مفصل بحث کی گئی ہے - بیانیہ لسانیات کے تحت زبان کی ان تین قسم کی علامتوں کا ذکر ہے جن سے زبان ترکیب پاتی ہے :

۱- عضلاتی حرکات
۲- بسیط آوازیں
۳- تصویری یا تحریری علامتیں

نیز لسانیات کے ان مسائل کا ذکر ہے جن کا تعلق اظہار کی کیفیات سے ہے یا تفہیم سے متعلق ہیں - صوتی تجزیے کا ارتقا ، سماعتی نقطۂ نظر اور نطقی نقطۂ نظر پر تفصیلی بحث ہے - عربی اور اُردو میں رسم‌الخط ، ہجا اور حرکات کی ایجاد نیز ان کی گریمر (صرف اور نحو) پر خیال آرائی ہوئی ہے - اشتقاقی تقابل کے ضمن میں چند اہم اصول منضبط ہوئے ہیں -

چوتھے باب میں لسانیات اور دیگر سائنسی علوم کے باہمی تعلقات کو ظاہر کیا گیا ہے - مصنف اس بات پر متوجہ کرتے ہیں کہ لسانیات عام علم بشریات کا ایک حصہ ہے - زبانیں چونکہ نسلوں کے متعلق وہ کچھ بتاتی ہیں جو کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کے ذریعہ بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں اور قبیلوں کے باہمی رشتوں ، ان کی نوعیت اور حقیقت کا پتا چلتا ہے نیز عمرانی مسائل حل کرنے اور معاملات پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے ، اس لیے ماہرین عمرانیات اور بشریات کو لسانیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے -

ایک اور پہلو یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ زبانوں کے مطالعے سے ثقافتی اور معاشرتی اقدار کا تعین ممکن ہو گیا ہے لہٰذا لسانیات کے ڈانڈے نفسیات اور فلسفہ سے بھی جا ملتے ہیں ، یوں لسانیات کو ایک سائنسی علم کا درجہ حاصل ہو گیا ہے -

آخر میں حواشی کے تحت ماہرین لسانیات پر مختصر نوٹ ، اصطلاحات

اور کتابیات کے علاوہ صحت نامہ بھی درج کیا گیا ہے - مصنف کی محنت قابل ستایش ہے -

تاریخ مذاہب : مؤلفہ پروفیسر رشید احمد - سال اشاعت ۱۹۶۳ء ، پبلشرز زمرد حسین بھٹہ ، قلات پبلشرز ، مستونگ (قلات ڈویژن) ، ضخامت ۵۰۱ صفحات -

یہ کتاب اُردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے - مؤلف نے مذاہب ِ عالم پر لکھی گئی بہت سی کتب سے استفادہ کیا ہے - جو مواد دوسری کتابوں سے اس کتاب میں درج کیا گیا ہے اس کی نشان دہی صفحہ وار کی گئی ہے - مؤلف نے اس کتاب میں مستشرقین یورپ کی کتابوں کے مواد کو معتدبہ جگہ عطا فرمائی ہے اور تمام مذاہب کو زیادہ تر انھی مستشرقین کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے -

اس کتاب میں دو قسم کے مذاہب کا تذکرہ ہے :

۱- علاقائی مذاہب

۲- بین الاقوامی مذاہب

علاقائی مذاہب کے زمرے میں قدیم آسٹریلیا اور قدیم عراق کے مذاہب کا ذکر ہے - علاوہ ازیں قدیم مصری ، چینی ، ہندی ، ایرانی ، یونانی ، روسی ، کیلٹی ، ٹیوٹانی ، سانوی ، جاپانی اور عربی مذاہب زیر بحث آئے ہیں - چونکہ ان قدیم مذاہب کے بارے میں معلومات کا سرچشمہ صرف وہی کتب ہیں جو یورپ کے علمائے تاریخ و ادب کے ذہن کی پیداوار ہیں لہٰذا مؤلف ان پر کُلی بھروسا کرنے میں حق بجانب ہیں - ان مذاہب کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے - اُردو زبان میں یہ مواد مذاہب عالم کا مطالعہ کرنے والے اُردو دان حضرات کے لیے دلچسپ ہے -

بین الاقوامی مذاہب کے زمرے میں فاضل مؤلف نے صرف یہودی مذہب ، بدھ مت ، عیسائیت اور اسلام کو جگہ دی ہے - یہودیت ، عیسائیت اور بدھ مت کے تاریخی حالات تحریر کرنے میں رشید احمد صاحب نے فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے - اس کے برعکس مذہب اسلام کی تاریخ لکھنے کی

بجائے تاریخ خلفا پر صرف چند صفحے لکھے ہیں البتہ اسلامی تعلیمات کے عنوان کے تحت عقائد ، عبادات ، اخلاق ، سیاسی نظام اور حقوق و آداب کے متعلق مفید معلومات درج کی ہیں -

حضرت عیسیٰ کی حیات طیبہ پر جو مواد پیش کیا گیا ہے ، وہ اناجیل پر منحصر ہے - اگر اس سلسلے میں دوسری اقوام کی الہامی اور غیر الہامی کتابوں کی تعلیمات سے بھی استفادہ کیا جاتا تو حیاتِ مسیح زیادہ صحت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی -

عیسائیوں کی مقدس کتب کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے - مختلف زمانوں میں جو اناجیل عیسائیوں میں مروج رہی ہیں ، ان کے نام دیے گئے ہیں - موجودہ اناجیل اربعہ کے وجود میں آنے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور عیسائیوں کے باطل عقائد سے پردہ ہٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے -

بدھ مت اور یہودیت کے متعلق خاصی معلومات مہیا کی گئی ہیں - گوتم بدھ (جو بدھ مت کے بانی تھے) کے حالات زندگی دیے گئے ہیں لیکن حضرت موسیٰ کے حالات زندگی تشنۂ تکمیل ہی رہے حالانکہ انھیں اسرائیلی تاریخ میں سب نبیوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے - یہودیوں کے مذہبی عہدیدار ، تہوار ، عبادات اور قوانین کا ذکر زیر تبصرہ کتاب میں کافی ہے -

پروفیسر رشید احمد نے بین الاقوامی مذاہب کی تاریخ اور تعلیمات اُردو زبان میں پیش کر کے اس زبان کی بیش قیمت خدمت کی ہے -

آئینۂ بلوچ : مصنف پروفیسر انور رومان ہیں ، سالِ اشاعت ۱۹۶۴ء ، ناشر قصرالادب ، جگو والا براہ شجاع آباد ضلع ملتان ، ضخامت ۹۵ صفحات -

یہ کتاب تمہید ، بلوچ ماحول ، بلوچ سردار ، بلوچ اثاثہ اور لائحۂ عمل پر مشتمل ہے اور مصنف کے اٹھارہ سالہ مطالعات و تجربات کا نچوڑ ہے -

مصنف کا مقصد بلوچوں کی نژادِ نو کو قطار آشنائی اور باہمی ربط ضبط پر مرکوز کرنا ہے - اس مقصد کے حصول کے لیے وہ علمی و تحقیقی کاوش کو بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں چنانچہ اُنھوں نے اس کے لیے ایک واضح لائحۂ عمل کتاب میں شامل کر دیا ہے -

مصنف نے خود بھی بلوچوں کے روایتی اور صدری ادب کے بعض

اہم اقتباسات اپنی کتاب میں شامل کر کے اُن کی تشریح کی ہے اور کہیں کہیں ہم موضوع انگریزی اور فارسی اشعار کے ساتھ موازنہ کر کے بلوچی شعر کی معنویت اور مخصوص رنگ کو اُجاگر کیا ہے۔

''پیری و برنائی'' پر دو شاعروں کے افکار ملاحظہ ہوں۔ جیوا سزاری کہتا ہے۔ (اُردو ترجمہ):

''کاش بڑھاپے پر ہمارا بس چلے!
تو وفادار جاسوس اُس کے ٹوہ میں بھیجوں
کاش مجھے نوجوانوں کی صحبت نصیب ہوتی!
تو میں اصیل عربی گھوڑیوں کے مالکوں کو بلاتا!
تب ہم نوجوان انتقاماً بڑھاپے کی گردن
مروڑ کر پیچھے کی طرف ڈالتے اور بڑھاپے
کا سر اس کے تن سے جدا کر دیتے!''

اسی موضوع پر ولیم شیکسپیئر کی خیال آرائی اُس کے ایک چھوٹے سے گیت میں ملاحظہ کیجیے:

''اے پیری! میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں
اے جوانی! میں تجھے پوجتا ہوں
اوہ میرے محبوب! میری محبوب جوان ہے
اے پیری! میں تجھے للکارتا ہوں!

اس گیت میں شیکسپیئر نے دل آویز جوانی اور دل آزار بڑھاپے کا خوب مقابلہ کیا ہے اور اس کی روح جیوا کی طرح بڑھاپے کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ گو شیکسپیئر کے یہاں بغاوت ایک دھیمی دھیمی آنچ ہے اور جیوا کے ہاں جنگل کی آگ!''[1]

باہمی اتحاد کے لیے صرف علم و ادب ہی ذریعہ نہیں بلکہ تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیتیں بھی بہت ممد و معاون ہوتی ہیں چنانچہ مصنف نے میر گہرام لاشاری، میر چاکر خاں رند کا مناسب ذکر کرنے کے بعد

۱۔ آئینۂ بلوچ، صفحات ۴۶—۵۰۔

میر جلال خان کی ہمہ گیر اور اتحاد پرور شخصیت کو محور توجہ بنایا ہے اور بار بار اُن کے اس اتحادی کردار پر زور دیا ہے بقولِ مصنف[1] :

''اگر بلوچوں کو زندہ رہنا سیکھنا ہے اور اُنھیں زندہ رہنا ہے تو اُنھیں میر جلال خان تک رسائی حاصل کرنا ہوگی ۔ اُسے تاریخ کے صفحات میں ڈھونڈنا ہوگا ۔ اُس کے قدموں کے نشانات کو مکران کے صحراؤں میں کھنگالنا ہوگا ۔ وہ دماغ پیدا کرنے ہوں گے جو اس کے کوہ پیکر عزم اور سمندر کی طرح عمیق فراست کے مالک ہوں ، وہ کان پیدا کرنے ہوں گے جو اس کی دلنشین آواز کو پکڑ لیں اور وہ دل پیدا کرنے ہوں گے جو اس کی آہِ سحر گاہی کی تخلیق کر سکیں ۔ کرنوں کو پکڑنے کا کیا فائدہ ؟ اگر آفتاب تک ہی رسائی نہ ہو سکے ۔''

زبان شستہ اور انداز بیان ترغیبی ہے ۔

ازمنۂ بلوچ : تاریخ اور روایات از میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ (بزبان انگریزی) ، مترجم ذکاء اللہ خان لودھی ، ناشر ، میر خدا بخش اپر فلور ، سعید منزل ، سرکار روڈ ، کوئٹہ ، ملنے کا پتہ : قلات پبلیشرز ، مستونگ برانچ ، قلات پبلیشرز رستم جی لین ، جناح روڈ ، کوئٹہ ، سن اشاعت ۱۹۶۸ع ، ضخامت (سیگزین سائز) ۱۰۵ صفحات ، قیمت ساڑھے تین روپے ۔

میر خدا بخش مری نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ پسماندہ لوگ جب ترقی پذیر ماحول اور معاشرے میں محصور ہو جائیں تو اُن کی نشاۃ ثانیہ کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی غیر صحت مند روایات و اقدار کہنہ کا جؤا اُتار کر آگے بڑھیں ۔ یہ نفسیاتی لمحہ اُن کے لیے ایسی قیادت و رہنمائی کا طلب گار ہوتا ہے جو انھیں سلامتی سے منزلِ ترقی کی طرف لے جا سکے ۔ بلوچ اس وقت اسی نفسیاتی لمحے سے گزر رہے ہیں اور اُن کو اس قیادت کی اشد ضرورت ہے ۔ یہ کام ایشیائی خصوصاً بلوچ علما و فضلا کو کرنا ہے ۔ میر موصوف کی یہ کتاب اسی عظیم ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ہے ۔

۱- آئینہ بلوچ ۔ صفحہ ۱۸ ۔

پہلے باب میں اُنھوں نے تاریخ کے سیاق و سباق میں عظیم ترین بلوچ شخصیتوں جیسے میر چاکر، میر بجار، میر بیورغ : میر نور بندغ، میر گوہرام وغیرہ کا ذکر کیا ہے جن کے بزمیہ و رزمیہ کارنامے آج بھی بلوچ اشتیاق و عقیدت سے سن کر اپنی روح کو گرماتے ہیں، لیکن اس کا ایک مسموم نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ وہ حال کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر ماضی پرست ہو گئے ہیں جو کسی صورت میں مستحسن نہیں۔

دوسرے باب میں مصنف نے بلوچوں کے مآخذ پر تحقیق کی ہے۔ انھوں نے روایتی بلوچی نظم ''د پتر شئر'' اور شاہنامۂ فردوسی کی روشنی میں اس مسئلے پر غور کیا ہے۔ دپتر کے مطابق سامی سرزمین سے اُن کی ہجرت ۶۸۰ع کے واقعہ کربلا کے بعد ہوئی۔ فردوسی کے یہاں اُن کا پہلا ذکر چھٹی صدی ق م میں افراسیاب کے وقت ملتا ہے اور پھر ایک ہزار سال کے وقفے کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں نوشیروان کے وقت۔ اس کے بعد چار سو سال کے دور میں وہ پھر نظرِ تاریخ سے اوجھل ہیں اور ۹۰۰ع کے قریب پھر عرب واقعہ نگاروں کی تحریرات میں اُبھرتے ہیں۔

تیسرے باب میں ابو جعفر بن جریر الطبری اور مسکویہ نے بلوچوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ابنِ حوقل کے مشاہدات بیان ہوئے ہیں۔

پانچویں باب میں مکران کا حال عرب جغرافیہ دانوں اور تاریخ نگاروں سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے، یہاں بلوچ نویں دسویں صدی عیسوی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ اس کے بعد بلوچوں کی عسکری قوت کا ذکر ہے جو مکران سے ملتان تک اور پھر ملتان سے دہلی تک موثر و نتیجہ خیز رہی۔ مصنف نے اسی باب میں نہایت محنت سے موجودہ شمال مغربی سرحد سے لے کر دلی تک ان کی آبادی کے ضلع وار اعداد و شمار دیے ہیں۔ اسی باب میں ہمایوں کی بحالی میں بلوچ کردار، اور رندوں اور دو دائیوں کی جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخر میں اُن کی سیرت و کردار پر اہل یورپ کی آرا جمع کی گئی ہیں۔ اس کے بعد بلوچی ادب، خصوصاً شعری ادب پر ایک مختصر باب لکھا گیا ہے اور اُن جدید اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو

پہلی جنگ عظیم کے بعد بلوچی ادب پر پڑ رہے ہیں -

مرد صحرائی پر ایک مختصر سے مضمون میں بلوچوں کی قبائلی تنظیم ، ان کے لباس اور معیار وغیرہ پر تبصرہ ہے -

آخر میں مصنف نے نہایت عرق ریزی سے ماخذ کی فہرست دی ہے - مجموعی طور پر کتاب بلوچیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے -

کوئٹہ ریجن کے مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کا جائزہ اور اُن کی اصلاح : تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اسلامیات (قلمی) (۱۹۶۴) مرتبہ محمد شیث سلیم ، سالم صفحات ۴۸ -

مقالہ تین ابواب پر مبنی ہے - پہلے باب میں معاشرتی خرابیوں کے اسباب (جغرافیائی اسباب ، ہندو سوسائٹی کا اثر ، معاشی ناہمواریاں ، تعلیمی اسباب ، غلط قیادت ، علما کی تبلیغ سے غفلت ، پریس سے محرومی وغیرہ) پر بحث کی گئی ہے -

دوسرے باب میں معاشرتی خرابیوں (مثلاً ولور ، سر میں چوٹی رکھنا ، بانجھ عورت کا سایہ ، بچے کی پیدائش پر رسومات ، نام رکھنے کے موقع پر رسومات سودی کاروبار ، رسوم میت ، قومی تعصب وغیرہ) کا جائزہ لیا گیا ہے -

تیسرے باب میں معاشرتی برایوں کی اصلاح کی خاطر تعلیمی اداروں کا قیام ، معاشی ناہمواریوں کا حل ، سماجی انجمنیں ، دینی مکاتیب کا قیام ، قائدین کا ذاتی کردار اور قانونی کارروائیاں وغیرہ تجویز کی گئی ہیں -

مقالہ نگار کا مقصد محض تنقید کرنا نہیں بلکہ مخلصانہ اصلاح کرنا ہے تاکہ غلط فہمی اور جہالت کی وجہ سے جو معاشرتی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور ہو جائیں اور یہاں کے مسلمان جن میں باقی علاقوں کی نسبت زیادہ مذہبی حس موجود ہے ، اپنی اصلاح کر کے دوسرے علاقے کے مسلمانوں کے لیے عملی نمونہ بن سکیں -

بلوچی بوسیا : (بلوچی گائیڈ) از میر عبد القیوم بلوچ ، مطبوعہ بولان اکیڈیمی کوئٹہ ، سن اشاعت ۱۹۶۴ع ، ضخامت (میگزین سائز) ۱۴۴ صفحات -

یہ کتاب بلوچی زبان سیکھنے اور سمجھنے کا باعث بنتی ہے - اور اُردو دان حضرات کے لیے بلوچی سیکھنے کی خاطر بہت مفید ہے -

ڈاکٹر حفیظ اللہ نے مستونگ (قلات ڈویژن) میں قیام کر کے معیاری نباتات (حصہ اول و دوم) لکھی - اسے علمی کتاب خانہ ، اُردو بازار ، لاہور نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ، ضخامت (دونوں حصے) ۳۹۵ صفحات ، قیمت ہر حصہ چار روپے ، ٹائپ میں طبع ہوئی ہے -

''معیاری نباتات'' ایف ایس سی کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے - زبان سلیس ہے - اردو اصطلاحات کے ساتھ انگریزی اصطلاحات بھی دی ہوئی ہیں جو مستحسن اقدام ہے - کتاب سلیبس کے مطابق ہے - اور طلبہ کی ضروریات کو پورا کرتی ہے - اشکال معیاری ہیں جن سے کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہؤا ہے -

ڈاکٹر حفیظ اللہ نے باٹنی کے مضمون کو بہت آسان بنا دیا ہے - ویسے اُردو میں طبعی سائنس کے مختلف شعبوں پر تصنیف و تالیف کی روایت پرانی ہے ، پھر بھی جب سے اُردو ذریعۂ تعلیم پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے اس روایت میں جان پڑ گئی ہے - مصنف اس قومی خدمت میں حصہ لے کر اس خطے کی سر بلندی کا باعث بنا ہے -

محمد رمضان مرزا ، ایم ایس سی نے کوئٹے میں بیٹھ کر حیوانیات (حصہ اول) اپنی نوعیت کی پہلی کتاب لکھی - اسے مغربی پاکستان اُردو اکیڈیمی ، لاہور نے مارچ ۱۹۶۵ء میں چھاپا - ضخامت ۲۴۸ صفحات ، قیمت ساڑھے چار روپے ، ٹائپ میں شائع ہوئی ہے - سرورق خیال افروز ہے اور نفس مضمون کی وضاحت کرتا ہے -

یہ کتاب بی ایس سی کا معیار سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے - مصنف نے عام فہم اصطلاحیں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگریزی میں رائج متبادل اصطلاحیں بھی دی ہیں تا کہ طلبہ کو سمجھنے میں آسانی ہو - اس کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں حیوانی نمونے (Animal Types) وہی استعمال کیے گئے ہیں جو اس ملک میں پائے جاتے ہیں - بقول ڈاکٹر نذیر احمد '' مجموعی طور پر یہ کتاب نصاب کے مطابق ہے اور طلبہ کی ضروریات کو پورا کرتی ہے - مصنف نے ادق مضمون کے مطالب کو جس آسان انداز میں پیش کیا ہے ، اس کے باعث

طالبان علم کے لیے یہ مضمون بہت آسان ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ جنرل سیکرٹری مغربی پاکستان اُردو ایکڈیمی لاہور لکھتے ہیں:

"پروفیسر رمضان مرزا بہت مستقل مزاج آدمی ہیں، انھوں نے لاہور سے دور بیٹھ کر اس کتاب کی تکمیل کی ہے اور ایک اور کتاب بھی لکھ رہے ہیں۔ اس قسم کی اولوالعزم کی مساعی کو دیکھ کر ہم تیقن سے کہتے پھرتے ہیں کہ اُردو علوم جدیدہ کی زبان بن چکی ہے۔"

مرزا رمضان نے کوئٹے میں بیٹھ کر حسب ذیل مضامین بھی اُردو میں لکھے ہیں:

۱۔ کاغان کی مچھلیاں: اُردو ڈائجسٹ، دسمبر ۱۹۶۳ع، صفحات ۹۷ تا ۱۰۰۔

۲۔ پہاڑی مچھلیوں کی ساحول سے ہم آہنگی: کاروان سائنس، کراچی، جولائی ۱۹۶۵ع، صفحات ۳۲ تا ۳۸۔

۳۔ کوئٹہ ڈویژن کی مچھلیاں اور جغرافیائی حیوانیات: جدید سائنس، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ع، صفحات ۲۳، ۲۸۔

بروہی کی لوک کہانیاں: از پروفیسر انور رومان۔ ناشر: زمرد حسین بھٹہ، قلات پبلیشرز، مستونگ، مطبوعہ قلات پریس مستونگ، سال اشاعت ۱۹۶۵ع، قیمت پونے تین روپے، نفیس ٹائپ میں چھپی ہے، سرورق حنیف رامے کا تیار کردہ ہے جو سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج لیے ہوئے ہے۔ ستانوے صفحے کی اس مجلد کتاب کی گٹ اپ ستھری ہے۔

کتاب کا انتساب "اُس نا معلوم بروہی لڑکی کے نام" ایک خوبصورت اور بر محل انتساب ہے جو ان کہانیوں کی دنیا میں داخل ہونے والے قاری کو متاثر کرتا ہے اور وہ اپنے خیال میں ایک رومانی دنیا بسائے ان کہانیوں کی ولایت میں قدم رکھتا ہے۔[1]

۱۔ 'فنون لاہور' جولائی۔ اگست ۱۹۶۶ع۔

یہ کتاب مصنف کے پیش لفظ اور پروفیسر سعید الحسن کے تعارف کے علاوہ مندرجہ ذیل براہوئی لوک کہانیوں پر مبنی ہے :

جگ بیتی ، انتقام ، بہادر خاں کی سرگزشت ، آپ بیتی اور واپسی ۔ ان کے علاوہ لوک گیتوں پر ایک مضمون ''براہوئی کے چار گیت'' ''چار دریچے'' بھی درج ہے ۔

مصنف نے یہ لوک کہانیاں اور گیت لیفٹیننٹ لیچ اور ریورینڈ ٹی جے ایل میئر کی کتب سے ماخوذ کیے ہیں اور اُن کا آزاد ترجمہ کیا ہے ۔

جگ بیتی ، انتقام اور بہادر خاں کی سر گزشت میں مصنف نے شروع میں اصل کہانیاں دی ہیں اور پھر اپنے گہرے مطالعات و مشاہدات کی روشنی میں براہوئی ذہن و ماحول کے مطابق اُنھیں طویل اُردو کہانیوں کا رنگ دے دیا ہے تا کہ ہر براہوئی لوک کہانی کا تاثر قاری کے ذہن و قلب کو گرما سکے ۔

'آپ بیتی' اور 'واپسی' میں مصنف نے ابتدا میں لوک کہانی یا اس کا مرکزی خیال دیے بغیر آزاد ترجمے اس طرح کر دیے ہیں کہ لوک کہانی بھی واضح ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے گویا وہ اُردو ادب کا ہی کوئی افسانہ پڑھ رہا ہو ۔

مختصراً یہ کہانیاں ایک طرف تو اُردو کے قالب میں آئی ہوئی براہوئی لوک کہانیاں ہیں اور دوسری طرف طبعزاد کہانیاں معلوم ہوتی ہیں اور ان کا اُردو افسانوی ادب میں اپنا بھی ایک مخصوص مقام ہے ۔

غالباً ان کہانیوں کے اسی حُسن دوگونہ کی وجہ سے ہی ۱۹۶۷ء میں ان کو یونیسکو کا ایک انعام بھی دیا گیا ہے ۔

مضمون میں مصنف نے چند براہوئی لوک گیتوں کو ایک لڑی میں منسلک کر دیا ہے ۔

بہ ہیئت مجموعی اسلوب نگارش ایسا توانا ، شگفتہ اور دل نشین ہے اور اس کی دلکشی اور تاثیر سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف فنی تقاضوں سے آگاہ ہی نہیں بلکہ اُنھیں نباہنے کا بھی اہل ہے ۔

بولان نامہ: شائع کردہ ورنا واننده گل، کوئٹہ، سال اشاعت ۱۹۶۶ء
ضخامت ۲۳۴ صفحات۔

سیدہاشمی نے پیش لفظ میں ورنا واننده گل، کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کتاب سالانہ جلسے کے موقع پر پیش کی جا رہی ہے۔ بقول اُن کے ''پندرہ دنوں کے مختصر عرصے میں بلوچ ادب کے جملہ اصناف کے سلسلے میں ایسی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں۔''

اس کتاب میں سولہ مضامین (صرف دو بلوچی زبان میں ہیں) اور چار نظمیں (محمد حسین عنقا اور عطا شاد کی تخلیقات کے ساتھ اُردو ترجمے بھی ہیں جو نثر کی بجائے شعر کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں) ہیں۔ اُردو مضامین کی تفصیل یہ ہے:

رحم علی مری (میر مٹھا خان مری)، بلوچی نثر کا تدریجی ارتقا (غوث بخش صابر)، بلوچ فارسی گو شعرا (ڈاکٹر انعام الحق کوثر)، براہوئی زبان اور ادب (عبدالرحمٰن براہوئی)، بی برگ (میر عبدالقیوم بلوچ)، بلوچ۔ ایک تاریخی جائزہ (ملک محمد سعید)، بلوچی لوک گیت کے اوصاف (عین سلام)، بلوچی افسانہ (مرزا طاہر[1])، بلوچی رسوم (عبدالغفار ندیم[2])، قول مردان (بشیر احمد بلوچ) بلوچی خواتین کی شاعری (صورت خان مری)، بلوچی شاعری ''رجحانات'' (عطا شاد[3])، بلوچی سرزمین کا اولین مجاہد (محمد حسن نظامی بلوچ)، بلوچی لوک کہانیاں (نصیر احمد)۔

۱۔ مرزا طاہر ایم اے کا ایک اور مضمون ''ضلع چاغی کا تاریخی پس منظر'' بولان کوئٹہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں چھپ چکا ہے۔

۲۔ غفار ندیم ایم اے کے چند دوسرے مطبوعہ مضامین یہ ہیں:

۱۔ ذکری بلوچوں کے فارسی شعرا (دو قسطیں) بلوچی دنیا ملتان شمارے اپریل اور اگست ۱۹۶۵ء۔

۲۔ میر کنبر بلوچ (بلوچی کردار کا پیکر جمیل) بلوچی دنیا ملتان فروری ۱۹۶۷ء۔

۳۔ عطا شاد کا ایک اہم مضمون ''بلوچی شعری ادب پر ایک نظر'' بولان کوئٹہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔

''بولان نامہ'' میں سرزمین بلوچستان کے ادیبوں اور دانشوروں کے ہمدوش طلبہ نے بھی اپنی نگارشات پیش کی ہیں جو قابل قدر ہیں - ورنا وانندہ گل کوئٹہ کی یہ پیش کش داد کی مستحق ہے -

فانوس ادب : مصنفہ یاسمین صوفی کوئٹے کی ایک جواں سال اور کہنہ مشق ادیبہ ہیں - وہ مضامین بھی لکھتی ہیں اور افسانے بھی - ان کے دل پسند موضوعات حب وطن ، اصلاح معاشرہ اور تحفّظ انسانیت ہیں - وہ زندگی سے فرار کی قائل نہیں بلکہ اس غم و الم اور ظلمت و صعوبت میں براہ راست شریک رہ کر اسے گذارنے کی قائل ہیں - چنانچہ اُن کی تخلیقات میں جہاں ہمیں موجودہ ماحول پر تنقید اور کہیں کہیں اس سے بیزاری ملتی ہے ، وہاں زندگی کو سنوارنے اور اس کا سامنا کرنے کی دھن بھی ملتی ہے - انھوں نے اپنی زندگی میں غم و الم کے ایک بے پناہ لشکر کو پچھاڑا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ غم زندگی کا جزو لاینفک ہی نہیں بلکہ جزوِ ناگریز ہے لہٰذا اُن کا قلم غم نصیب ، مفلوک الحال اور سوختہ سامان انسانیت کا اَن تھک ترجمان ہے -

''فانوس ادب'' ۱۹۶۶ع میں چھپی ہے - اس کے پبلیشر نیازی پبلیشرز ، انارکلی ، لاہور ہیں ، ضخامت ۱۱۱ صفحات اور قیمت ایک روپیہ ہے -

اس میں ۱۸ تخلیقات ہیں - شروع میں ایک نظم 'پیغام' ہے پھر دس کہانیاں اور سات مضامین ہیں - یہ کتاب ویسے تو بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن بڑے بھی اس سے یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں - ''مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں'' بہت کامیاب کوشش ہے - بیلی کا اشتیاق اور مایوسی دونوں بے کراں ہیں - کہانی کی پوری فضا ایک پاکیزہ جذبۂ وطنیت سے مملو ہے اور قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا -

''کاش اُس کے بے خبر بابا کو کوئی اطلاع دے دیتا تو وہ اپنی معصوم بچی کی ایک جھلک دیکھ کر یہ اندازہ تو کر لیتے کہ پاکستان کا بچہ بچہ اُنھیں کتنی شدت سے چاہتا ہے - وہ اُس شہر میں ہوتے ہوئے بھی ہم سے کتنے دور تھے - کاش یہ 'دوریاں ، یہ دیواریں حائل نہ ہوتیں تو میں خون سے لت پت اُن کی

منتظر ببلی کو اُن کے قدموں میں جا ڈالتی - کاش !''

''مجاہد بھیا کے نام'' ۱۹۶۵ع کی جنگ میں ہمارے عسکری جوانوں کی صحیح ، سچی اور جیتی جاگتی تصویر ہے - زبان سلیس ، عام فہم اور انداز بیان دلنشین ہے -

یاسمین ایک ہونہار ، پُر امکان ادیبہ ہیں اور بلوچستان میں اُردو کے مستقبل کی اُن سے بہت توقعات وابستہ ہیں !

ثقافت اور ادب وادیٔ بولان میں : شائع کنندہ بزم ثقافت کوئٹہ ، سال اشاعت ۱۹۶۶ع ، ضخامت ۳۷۰ صفحات - لکھائی ، چھپائی ، کاغذ اور جلد بندی موزوں ، قیمت پانچ روپے -

کتاب کا دیباچہ امیر عثمان نے لکھا ہے جس میں انھوں نے اختصار کے ساتھ اس مجموعے کا تعارف کرایا ہے -

یہ کتاب مجموعہ ہے سات مقالوں کا جو سات ہی ادیبوں نے لکھے ہیں - پہلے مقالے کا عنوان ہے ''پشتو ادب - بلوچستان کے ادیب و شاعر'' اسے عبدالصمد درانی نے تحریر فرمایا ہے اور قریباً پچاس صفحوں میں پھیلا ہؤا ہے - مصنف نے پشتو ادب اور شاعری کے تین دور مقرر کیے ہیں - پہلے دور کا آغاز تیسری صدی ہجری سے ہؤا اور نویں صدی ہجری پر اس کا خاتمہ ہو گیا - دوسرے دَور میں دسویں صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا تک کے پشتو ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے - تیسرا دَور انگریزوں کی سابقہ بلوچستان میں آمد سے شروع ہو کر اب تک چل رہا ہے -

پشتو ادب کے تدریجی ارتقا کو جاننے کی خاطر پشتونوں کے ذہنی اور جذباتی سرمایے کو بہت نزدیک ہو کر دیکھنے کے لیے اس مقالے سے بڑی مدد مل سکتی ہے -

دوسرا مقالہ پشتون کلچر پر ہے جسے سلطان محمد صابر نے لکھا ہے - اس میں پشتونوں کی تاریخ ، زبان ، ادب ، رہن سہن ، رسم و رواج اور ان کے قبائلی خصائص کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے - یہ دلچسپ ہونے

کے ساتھ ساتھ معلومات افزا بھی ہے جو پینتالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا مقالہ 'بلوچی ادب' از میر مٹھا خاں[1] مری ہے۔ اس میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے ابتدا سے لے کر اب تک کے بلوچی زبان کے مختلف اصناف سخن زیر بحث لائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بلوچوں کے اخلاق و کردار، طرز حیات اور انداز فکر پر بلوچی شاعری سے داخلی شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ مقالہ نگار نے بہت محنت سے کام لیا ہے۔ کل اکیاون صفحات ہیں۔ بلوچی نثر کو غالباً خوف طوالت سے زیر بحث نہیں لایا گیا۔

چوتھا مقالہ ملک محمد رمضان بلوچ[2] نے "بلوچ ثقافت" کے عنوان سے رقم کیا ہے جو قریباً پچاس صفحوں پر مشتمل ہے۔ بلوچوں کے قبائلی خصائص اور اُن کے عادات و اطوار شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جیسے بلوچوں کی بادیہ پیمائی، حال احوال کی رسم، ہمسائیگی کے حقوق و فرائض، بلوچ معاشرے میں عورت کے درجے اور مقام، نابالغوں کے حقوق، امداد باہمی کے طور طریقے، قول و اقرار کی پابندی، انتقام جوئی، شادی بیاہ کی رسمیں، بچوں کی پیدائش، بیمار پُرسی اور تعزیت وغیرہ۔

پانچواں مقالہ عبدالرحمٰن کُرد کا "براہوئی ادب" پر ہے جس کا پھیلاؤ پچاس صفحات پر ہے۔ اس میں براہویوں کے لوک گیتوں، رزمیہ اور عشقیہ شاعری کو سمویا گیا ہے۔ جدید براہوئی شعرا کے کلام کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ براہوئی نثر کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔

چھٹا مقالہ براہوئی ثقافت از نور محمد[3] پروانہ بھی پچاس صفحوں پر

۱- میر صاحب کا ایک گراں قدر مقالہ بعنوان "بلوچ ثقافت" (۱۹ صفحے) بلوچی دنیا ملتان (مارچ ۱۹۶۵ء) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

۲- ملک صاحب نے ایک کتابچہ بعنوان "بلوچی شاعری" لکھا تھا۔ جسے محکمۂ اطلاعات کوئٹہ نے ۱۹۶۳ء میں شائع کرایا۔ یہ کتابچہ بتیس صفحات پر مشتمل ہے اور خوب ہے۔

۳- پروانہ صاحب کا ایک اور اہم مضمون امروز لاہور ۷ مئی ۱۹۵۹ء میں چھپا تھا بعنوان "وادیٔ سندھ کی تہذیب اور اُس کے وارث"۔

مبنی ہے - بہت مفصل ، دلچسپ اور کافی متوازن ہے - اس میں براہوئی قبیلے کے خد و خال نہایت کامرانی سے اُجاگر کیے گئے ہیں - اسلامی اور جدید اثرات کو فراموش نہیں کیا گیا -

ساتواں مقالہ ''کوئٹہ و قلات ریجن کے فارسی شعرا'' سے متعلق ہے جو ساٹھ سے زائد صفحات کو گھیرے ہوئے ہے - یہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے - بقول اقبال سلطان[۱] :

''شاید یہ رائے غلط نہ ہوگی کہ اس مقالے کے بغیر یہ مجموعہ نامکمل رہتا - مصنف نے رابعہ ، ناطق ، ملا حسن ، تائب ، مرزا احمد علی ، پیر محمد کاکڑ ، اخوندزادہ عبدالعلی ، علیم ، رہی ، خاکی ، فیض اور زیب مگسی کی فارسی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے - بعض شعرا کے کلام کا موازنہ ایرانی شعرا کے کلام سے بھی کیا ہے - ساتھ ساتھ مختصر طور پر ان شاعروں کے حالات زندگی بھی بیان کر دیے ہیں - اس طرح اس خطے کے فارسی گو شعرا کا ایک مستند اور جامع تذکرہ تیار ہو گیا ہے -''

بہ ہیئت مجموعی ''ثقافت اور ادب وادیٔ بولان میں'' اہل بلوچستان کو اُن کے تمدن سمیت اہل پاکستان سے متعارف کرا دیتی ہے - مضامین مقامی ماہرین علم و ادب نے لکھے ہیں - اُن کا مطمح نظر قصیدہ گوئی نہیں بلکہ محاسن کے ساتھ ساتھ مصائب کی نشان دہی بھی کی ہے - اس کی اشاعت سے یقیناً اُردو ادب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہؤا ہے اور اُس کے لیے ''بزمِ ثقافت'' کوئٹہ داد کی مستحق ہے -

عنبرین : مصنفہ حمیدہ جبین[۲] ، ناشر آئینہ ادب ، چوک مینار ، انارکلی ،

۱- کوئٹہ ریڈیو سے نئی اُردو کتابوں پر تبصرہ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۶ع-
۲- حمیدہ جبین کوئٹے میں رہتی ہیں - چار پانچ سال سے ناول لکھ رہی ہیں - عنبرین سے پہلے جو ناول چھپے ہیں اُن میں یہ شامل ہیں : دیبا ، روبی ، حنا اور پتھر ، گیت یہ میرے ، شاخِ بُریدہ ، ناشر مکتبۂ چودھویں صدی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لاہور، سنہ اشاعت ۱۹۶۷ء، قیمت آٹھ روپے جو یقیناً زیادہ ہے، ضخامت ۲۹۱ صفحات۔

یہ ناول ہمارے معاشرتی نظام کے نقائص اور ان مہلک امراض کے علاج کی تدابیر بھی لیے ہوئے ہے جو ہمارے معاشرے کو لاحق ہیں۔ تنویر ایک مغرب زدہ آزاد خیال نوجوان ہے۔ اسے ایک ایسی لڑکی (فریدہ) سے پیار ہے جو ''سوسائٹی گرل'' ہے۔ وہ اپنے والد سے لندن میں کھلے بندوں اپنے پسندیدہ اور آئیڈیل شوہر کا ذکر کرتے ذرا بھی نہیں شرماتی۔ اُس کے مقابلے میں ''عنبرین'' ایک مشرقی قسم کی شریف اور سادہ لڑکی ہے جو ان تمام بندھنوں کو اپنی لاج خیال کرتی ہے صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے پورے قبیلے کی روح اور عزت۔ اس میں پاکیزگی ہے وہ اجنبی اور نامحرم لوگوں سے گفتگو کرنا خلاف تہذیب ہی نہیں بلکہ اپنی توہین خیال کرتی ہے۔

تنویر عنبرین کی بجائے فریدہ کو اپنانا چاہتا ہے۔ اس لیے عنبرین سے شادی ہو جانے کے باوجود اُس کے قریب نہیں آتا۔ عنبرین اُس کی خالہ کی لڑکی ہے اور اُس کا باپ دوسری شادی کر چکا ہے۔ شادی کے بعد زینت (عنبرین کی والدہ) فوت ہو جاتی ہے۔ اُس کی بہن سعیدہ (تنویر کی والدہ) کی کوششوں کے باوجود تنویر عنبرین کو ''خیرباد'' کہہ کر لندن چلا جاتا ہے اور فریدہ سے شادی رچا لیتا ہے۔ عنبرین میڈیکل کالج میں پڑھنے لگتی ہے اور ایک کامیاب ڈاکٹر بن جاتی ہے۔

زینت کا کردار ایک ناقابل بیان عظمت کا حامل ہے۔ وہ غیور اور

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

دہلی گیٹ ملتان، ۱۹۶۸ء: ناشر ادارہ فروغ ادب، کندن سٹریٹ، کراچی۔ ''عنبرین'' سب سے اہم ہے اس لیے اُسی پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ حمیدہ جبین کے علاوہ شیریں ناز (مصنفہ بے قرار) رفعت زیبا (مصنفہ 'رواج') قاضی سعید (رشیدہ) یاسمین صوفی (پجارن) اور قیصر شاہین (پیپل تلے) وغیرہ بھی اس میدان میں آ رہی ہیں۔

پاکیزہ خیالات کی عورت ہے - سعیدہ کے کردار میں بھی اسی قسم کی جھلکیاں ملتی ہیں مگر زینت ایک دوسری عظمت کی حامل ہے جس میں شجاعت اور جسارت کو بھی دخل ہے - وہ آج بھی اپنے شوہر کی وفادار ہے اور اپنے منہ سے اس کے خلاف ایک کلمہ تک نہیں نکالتی - اس کی فرمانبردار بیٹی بھی بالآخر اپنے جفاکار باپ کو معاف کر دیتی ہے اور معاف کر دینا ایک عظیم شجاعت کا مظہر ہے - اس شجاعت اور جسارت کی دوسری مثال عنبرین کا تنویر سے پانچ سال تک گہرا تعلق ہے - باوجود اس کے لاکھ تغافل کے وہ اسی کا دم بھرتی نظر آتی ہے اور اپنی زندگی میں کسی دوسرے آدمی کو داخل نہیں ہونے دیتی حالانکہ وہ ابتدا سے ہی محبت اور پیار کی پیاسی ہے اور جب اس کو رشدی جیسا ہونہار انسان اپنی محبت کی آغوش میں لینا چاہتا ہے تو وہ کسی قسم کے غلط تعلقات استوار کرنا جائز خیال نہیں کرتی اور اس کا انتباہ رشدی کے کان کھول دیتا ہے - وہ ہمیشہ مرعوب اور محتاط رہتا ہے اور اُس کی عظمت کا قائل نظر آتا ہے - اس جسارت کی تیسری مثال عنبرین کا طلاق حاصل کرنا ہے اور عین اُس وقت جبکہ تنویر اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے (کیونکہ تنویر اور فریدہ کی جذباتی محبت دم توڑ چکی ہوتی ہے - جس طرح آناً فاناً ان کی شادی کا تاج محل تعمیر ہؤا تھا اسی سرعت سے وہ نفرت کے بگولوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور نتیجۃً فریدہ تنویر سے طلاق حاصل کر لیتی ہے) جن لوگوں کی خاطر وہ تنویر کا ساتھ دینے پر مجبور تھی وہ اس دنیا سے جسمانی طور پر جا چکے ہوتے ہیں - آج اگر کسی انسان کا احسان عنبرین کی گردن پر ہے تو وہ ظہیر احمد (تنویر کے والد - مرنجان مرنج قسم کے انسان اور ہر حالت میں مناسب رویہ اختیار کرنے کے قائل) ہیں مگر وہ ظہیر احمد سے کسی قسم کی گستاخی کا مظاہرہ نہیں کرتی - اُسے اپنا وعدہ پورا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اُس کے دلائل اور اقدامات کے سامنے ظہیر احمد کی زبان خاموش ہو جاتی ہے کیونکہ وہ عنبرین پر تنویر کے ظلم اور جبر سے آگاہ ہے - وہ انتہائی جرأت سے طلاق نامہ حاصل کرتی ہے اور رشدی سے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے -

جہاں تک اس قسم کے مہلک امراض کا تعلق ہے جو معاشرے میں جنم لے چکے ہیں ، ان کا حل ہمارے ادیبوں کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے ۔ حمیدہ جبین کے نزدیک جب اس قسم کے بگڑے ہوئے مغرب زدہ نوجوان آزاد خیال خواتین سے تنگ آ کر ہماری سادہ اور شریف گرہستن عورتوں کی طرف رجوع کریں تو اُنھیں بھی بے نیازی اور تغافل سے کام لینا چاہیے اور ان کے چنگل سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے ۔ اگر کوئی معصوم دوشیزہ اس قسم کے جال میں پھنس ہی جائے اور وہ ایک ناکام قسم کی زندگی سے دوچار ہو تو اُسے مجبوراً زندگی بسر کرنے کی بجائے عنبریں کی طرح اپنے آپ کو یا تو قوم و ملک کے لیے وقف کر دینا چاہیے یا پھر جرأت اور جسارت سے کام لے کر کسی کامیاب زندگی کی داغ بیل ڈالنے کی فکر کرنی چاہیے ۔ مگر اس سلسلے میں غلط قسم کے اقدامات اسے دوبارہ ظلم و ستم کے جال کا شکار بھی بنا سکتے ہیں ۔ اس لیے ہر قدم مصلحت آمیز طریق سے اُٹھانا چاہیے ۔

اس ناول میں ایسے مقامات بھی آ جاتے ہیں جہاں قاری رک جاتا ہے اور اُس کا ذہن کریدنے لگتا ہے جیسے ایک کالج کے اندر مینا بازار کا انعقاد — ممکن ہے کسی کالج میں اس قسم کا اہتمام کبھی ہوُا ہو ویسے اس قسم کے بازار صرف گرلز کالجوں کا حصہ ہیں ۔ دوسرے فریدہ کا خواہ مخواہ بند کمرے سے انتہائی دلچسپی کا اظہار کرنا ، اور پھر ظہیر احمد کا انتظار کیے بغیر کھڑکی کے شیشے توڑ کر اندر گھس جانا ۔ مگر اس کی دوسری زندگی میں اس قسم کی کوئی ایسی ناہمواری اور نازیبا حرکت کا مظاہرہ دکھائی نہیں دیتا ۔ تیسرے فریدہ اور تنویر کا تصادم کچھ معقول وجوہات کا آئینہ دار نہیں ۔ اتنی گہری محبت محض چند خیالات کے جنم لینے سے یوں ختم نہیں ہو سکتی جس طرح اس ناول میں وقوع پزیر ہوئی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقصدیت نے فن کو مجروح کر دیا ہے اور فلم کی ریل کچھ تیز چل گئی ہے ۔

بہر حال بحیثیت مجموعی ناول خاصی اہمیت کا حامل ہے ۔

فقیر بخش بگٹی : (آپ کا ذکر حصۂ شعر و شاعری میں بھی گزر چکا ہے)

۱۹ جنوری ۱۹۱۹ع کو ڈیرہ بگٹی میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد کا نام میر علی مراد خان ہے ۔ قبیلہ راہیجہ اور قوم بگٹی ہے ۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ بگٹی میں پائی ، بعد میں نا مساعدت حالات سے دوچار ہوئے ، تاہم ۱۹۴۰ع میں میٹرک پاس کیا ، حالات نے ساتھ نہ دیا اور تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے ۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۴ع کو سرکاری ملازمت اختیار کی جو آج تک جاری ہے ۔ قرآن حکیم سکول کے زمانے سے ہی آپ کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہا ۔ قریباً پچیس سال سے قرآن مجید اور اسلامی لٹریچر کے مطالعے میں مصروف ہیں ۔

ان دنوں قرآنی مطالب پر مشتمل ایک کتاب ''روح القرآن'' لکھنے میں مصروف ہیں ۔ آپ کے مضامین ملک کے ممتاز اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں ۔ چند ایک یہ ہیں :

۱۔ معاشی و معاشرتی انصاف ۔ تین طریقے : بسلسلہ مزدوروں کی فلاح و بہبود ، بحث و نظر ، نوائے وقت ، لاہور ، ۹ جنوری ۱۹۶۷ع ۔

۲۔ جمہوریت اور بہبودیٔ جمہور : فکر و نظر ، نوائے وقت ، لاہور ، ۲۸ جنوری ۱۹۶۷ع ۔

۳۔ گیا دور سرمایہ داری گیا ، بحث و نظر ، نوائے وقت ، لاہور ۷ فروری ۱۹۶۷ع ۔

۴۔ عدل ، انصاف اور قانون کا مفہوم : بحث و نظر ، نوائے وقت ، لاہور ۸ مارچ ۱۹۶۷ع ۔

۵۔ مغربی پاکستان عوامی لیگ کا منشور : نہ اسلام نہ جمہوریت نہ سوشلزم ، بحث و نظر ، نوائے وقت ، لاہور ۲۴ مارچ ۱۹۶۷ع ۔

۶۔ مذاہب عالم پر اسلام کی فوقیت کیوں ؟ : نصرت ، لاہور ، مئی جون ۱۹۶۶ع ۔

۷۔ اسلام کا معاشی نظام : ماہنامہ نصرت ، لاہور ، اسلامی سوشلزم نمبر ، اکتوبر ۱۹۶۶ع ۔

۸۔ پاکستان کدھر ؟ : ماہنامہ نصرت ، لاہور ، دسمبر ۱۹۶۶ع ۔

۹۔ عالم عرب کا المیہ اور عالم اسلام کا چیلنج ، ماہنامہ نصرت ، لاہور ، اگست ، ستمبر ۱۹۶۷ع ۔

"اسلام کا معاشی نظام" ایک طویل اور مبسوط مقالہ ہے اُس کے آخر میں "ساحل تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے" کے تحت لکھتے ہیں[1] :

"انسانی زندگی کی کشتی چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے نیچے اتنا پانی ہو جو اسے خوبی سے تیرا سکے۔ اس سے زیادہ مقدار آب کی کشتی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے نیچے مزید سو پچاس گز گہرا پانی ہو یا پانچ میل گہرا سمندر وہ سب فالتو پانی ہے۔ کشتی کی روانی کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ضرورت سے زیادہ مال کی حرص جب انسان کے دل کے اندر داخل ہو جاتی ہے تو وہ زندگی کی خرابی کا باعث ہوتی ہے۔ بعینہٖ جیسے پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اُسے ڈبو دیتا ہے۔ زندگی کے فطری اور حقیقی مقاصد کے لیے بقدر ضرورت مال لازمی ہے۔ پیغمبروں کو بھی استحکام دین اور اشاعت دین کے لیے کچھ مال کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مال اہل دل کے لیے ذریعہ خیر ہوتا ہے، وہ خود مقصد نہیں بن جاتا۔ دل کے اندر مال کا کوئی مقام نہیں۔ ضرورت کے مطابق مال رحمت ہے اور ضرورت سے زیادہ زحمت اور آفت ہے۔

مال اگر دینی حدود کے اندر ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وہ باعث خیر ہوگا۔ اس سے دنیا و آخرت دونوں ہی سدھر جائیں گے اور اگر دل کے تمام گوشوں میں مال ہی کی محبت سما جائے تو یوں سمجھو کہ دریا کا پانی کشتی کے اندر آ گیا جو اسے لے ڈوبے گا حالانکہ یہی پانی اگر کشتی کے نیچے رہتا تو اہل کشتی کو ساحل تک پہنچانے میں بہترین معاون ہوتا۔"

فقیر بخش بگٹی کے مضامین پر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اُردو میں اظہار بیان کی پوری قدرت رکھتے ہیں اور مطالب کو دل موہ لینے والے انداز میں پیش کرتے جاتے ہیں۔ اُنھیں اپنے وطن عزیز سے بے پناہ

۱- صفحہ ۱۵۲ -

محبت ہے لیکن اصلاح کی خاطر دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑنے میں اجتناب نہیں برتتے اور اُس کا مداوا تجویز کرتے ہوئے اپنی بالغ نظری کا ثبوت بھی بہم پہنچا جاتے ہیں ۔ وہ اپنی تحریر کو موزوں اشعار کے علاوہ بر محل قرآنی آیات اور فرمودات نبوی سے بھی مزین کرتے ہیں ۔ اُن کا قلم صحت مند اور تعمیری خیالات کو اُجاگر کرنے میں رواں نظر آتا ہے ۔

عبدالرحمٰن محمد شہی براہوئی ہدہ کوئٹہ کے رہنے والے ہیں ۔ تعلیم ہدہ اور کوئٹہ میں پائی ۔ لکھنے پڑھنے کا خاصا شوق ہے ۔ ابتدا میں مختلف مقامی اخباروں میں بچوں کے کالموں میں لکھا ۔ پھر مختلف رسائل میں معلوماتی مضامین لکھنے شروع کیے ۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

۱۔ وہمیوں کی کمی نہیں ہے : مطبوعہ نقاد ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۶۰ع ۔

۲۔ دنیا کی عجیب و غریب رسمیں : اُردو ڈائجسٹ ، لاہور ، جون ۱۹۶۳ع ۔

۳۔ جادو گروں کے کرتب : سیارہ ڈائجسٹ ، لاہور ، مئی ۱۹۶۵ع ۔

۴۔ حیوانات میں سمجھ : سیارہ ڈائجسٹ ، لاہور ، اپریل ۱۹۶۶ع ۔

۵۔ کیمیا : اسرار حکمت ، لاہور ، مئی ۱۹۶۳ع ۔

بعد میں براہوئی ادب پر تحقیقی کام شروع کیا ۔ اس سلسلے میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ، اُن میں سے اہم مضمون کا نام ہے ''براہوئی زبان و ادب'' (مطبوعہ ماہ نو کراچی ، مارچ ۱۹۶۶ع) ۔

چند اور مضامین یہ ہیں :

۱۔ شالکوٹ کوئٹہ : مطبوعہ بلوچی دنیا ، ملتان ، جنوری ۱۹۶۶ع ۔

۲۔ کوئٹہ کی تباہی : مطبوعہ بلوچی دنیا ، ملتان ، مئی ۱۹۶۶ع ۔

۳۔ علامہ دین پوری : مطبوعہ بلوچی دنیا ، ملتان ، اکتوبر ۱۹۶۶ع ۔

۴۔ مولانا نبو جان : مطبوعہ بلوچی دنیا ، ملتان ، مئی ۱۹۶۷ع ۔

آپ نے بلوچستان کے اولیائے کرام پر بھی چند مضمون تحریر کیے ہیں جو ''آئینہ'' لاہور میں چھپے ہیں ۔ پہلا مضمون ''حضرت شیخ محمد عمر[۲]'' جنوری ۱۹۶۶ع کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ آپ کی ایک کتاب ''کیمیا گر

اور کیمیا گری،، مکتبۂ رفیق روزگار، پیر مکی شریف، لاہور نمبر ۲ نے چھاپی ہے - سال اشاعت ۱۹۶۸ع، قیمت چھ روپے، ضخامت ۴۳۴ صفحات -

دراصل یہ دو کتابیں ہیں: پہلی کتاب 'دنیا کے مشہور' کامیاب اور ناکام کیمیا گروں کے حالات زندگی پر مبنی ہے - ۱۲۸ صفحوں کے بعد ''رسالۂ ہفت احباب،، مؤلفہ حضرت حمیدالدین ناگوری کا اُردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے جو ۴۳۳ صفحات تک پھیلا ہوا ہے - ''ہفت احباب،، پاک و ہند میں فارسی زبان میں کیمیا کی سب سے پہلی کتاب ہے - مؤلف نے بڑی کاوش سے مواد فراہم کیا ہے - انداز بیان دلچسپ ہے -

اس ۲۸ سالہ مقامی نوجوان کو قلمی مسودات جمع کرنے کا بھی شوق ہے - اس وقت پچاس سے زیادہ قلمی مسودے جمع کیے جا چکے ہیں - بعض یہ ہیں:

۱- مشکٰوۃ شریف عربی: (۷۳۷)[1] -
۲- مشارق الانوار عربی (۱۰۳۰)[2] -
۳- کلام پاک مترجم فارسی (۹۷۸)[3] -
۴- حمائل شریف مترجم فارسی (۱۱۵۰ھ)[4] -

خوشی کا مقام ہے کہ عبدالرحمٰن براہوئی بڑی روانی سے اُردو لکھتے ہیں -

ظفر علی مرزا - اپریل ۱۹۳۵ع میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے - گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے بی اے کیا - آپ اُردو، پشتو، براہوئی اور فارسی میں ادبی اور ثقافتی مضامین لکھتے رہتے ہیں - آپ کا پہلا افسانہ ''سحر ہونے تک،، بولان میگزین کوئٹہ میں شائع ہوا تھا[5] - آپ بولان کے ایڈیٹوریل بورڈ

۱- ۱۳۳۷ع -
۲- ۱۶۲۱ع -
۳- ۱۵۷۰ع -
۴- ۱۷۳۷ع -
۵- بولان کوئٹہ، دسمبر ۱۹۵۵ع -

(حصہ اُردو) کے رکن بھی رہے - آپ کا ایک اور افسانہ ''اور پتے گرتے ہیں''[1] بھی چھپا تھا - آپ چند سال سے ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے متعلق ہیں -

ظفر علی مرزا کے اُردو میں علاقائی زبان و ادب سے متعلق مضامین ماہنامہ''ماہ نو'' کراچی اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں - اُن میں دو یہ ہیں :

۱- قدیم بلوچی شاعری : مطبوعہ ماہ نو ، کراچی اپریل ۱۹۶۶ع -

۲- براہوئی ملی شاعری : مطبوعہ ماہ نو ، کراچی ، دسمبر ۱۹۶۶ع -

ظفر علی مرزا براہوئی اشعار کا منظوم اُردو ترجمہ بھی پیش کرتے ہیں - ان دنوں براہوئیوں سے متعلق ایک کتاب اُردو میں لکھ رہے ہیں جس میں براہوئی ادب ، شاعری ، تاریخ ، زبان ، محاورے ، گریمر ، رسم و رواج غرضیکہ تمام پہلوؤں کا ذکر ہوگا -

صاحبزادہ حمید اللہ : ۱۹۳۷ع میں قریۂ فیض آباد نزد شہر پشین میں پیدا ہوئے - آپ کا تعلق کاکڑ قبیلہ سے ہے - صاحبزادہ آپ کا علمی اور خاندانی نام ہے - آپ کے آبا ؤ اجداد پانچ پشتوں سے عالم دین چلے آئے ہیں - ان کی اس علمی حیثیت کے پیش نظر آپ کے دادا صاحب مولانا محمد عظیم کو ''صاحبزادہ'' کے نام سے پکارا جانے لگا - آپ کے والد بزرگوار صاحبزادہ عبدالرحمٰن آغا صاحب کے نام سے مشہور ہیں - وہ علم و فضل اور تقویٰ کی کان سمجھے جاتے ہیں - اُنھوں نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے علاوہ سکولوں اور کالجوں میں بھی تحصیل علم کی خاطر بھیجا -

حمید اللہ نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے قیام کے دوران اُردو میں لکھنا شروع کیا - کالج میگزین ''بولان'' کے حصہ اُردو کے ایڈیٹر بھی رہے - اس دوران میں اُنھوں نے جو مضامین لکھے اُن میں شامل ہیں : ''حالی کا مقام اُردو شاعری میں'' ، ''اُردو کو بچائیے'' اور اکبر الہ آبادی کی شاعری''

انھی دلوں آپ کی ایک اُردو غزل بھی چھپی جس کا مطلع تھا :

مری ہستی سراپا درد و غم ہے
مگر تو سر بسر لطف و کرم ہے

۱- بولان کوئٹہ ، سالنامہ برائے ۵۷-۱۹۵۶ع -

آپ نے ''میزان'' کوئٹہ میں چند مضامین لکھے - مثلاً سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر سا خاکہ (۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء) -

ہفت روزہ ''آواز پختون'' (اُردو) کراچی میں آپ کے مضامین ، نظمیں اور غزلیں شائع ہو رہی ہیں ، جیسے ''غلغلۂ جہاد'' نظم (شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۵ء) مجاہدینِ ژوب (دو قسطیں) ۱۱ جون و ۱۸ جون ۱۹۶۶ء -

ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور میں بھی مضامین چھپے ہیں - مثلاً : ''جہاد اور تعداد'' (۱۹ نومبر ۱۹۶۵ء) -

آپ نے پانچ کتابیں لکھی ہیں : تین پشتو میں ، ایک اُردو میں (رگِ گل — اُردو کے مشہور شعرا کے منتخب اشعار) اور ایک اُردو اور پشتو میں ہے اُس کا نام ہے پشتو آموز -

آپ پشتو ، اُردو اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں - اُردو میں حال ہی میں ایک طویل نظم (۱۱۲ اشعار) لکھی ہے نام ہے : ''رزمِ عرب - سامانِ عبرت - اشکہائے غم'' آپ نے تین زبانوں (اُردو ، فارسی ، عربی) میں ایم اے پاس کیا ہے - آپ کو مذہب ، ادب اور تاریخ سے دلچسپی ہے - آپ کے مضامین اور کتب زیادہ تر انھی موضوعات سے متعلق ہوتی ہیں - آپ کا مشغلہ مطالعہ اور لکھنا ہے - آپ کی ذاتی لائبریری میں اُردو ، فارسی ، عربی ، انگریزی اور پشتو کی کتابیں موجود ہیں - آپ صاف ستھری اُردو لکھتے ہیں -

محمد مسعود احمد گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں اُردو کے پروفیسر ہیں - دہلی کے رہنے والے ہیں ، قیام پاکستان کے بعد حیدرآباد میں مقیم ہوئے - چند سالوں سے کوئٹہ میں سکونت پذیر ہیں - یہاں آنے سے پہلے بھی علمی اور تحقیقی کام کیا ہے - کوئٹہ آنے کے بعد جو علمی و تحقیقی کام کیا اس کی تفصیل یہ ہے - یہ مضامین و مقالات مختلف جراید میں شائع ہوئے :

۱- اُردو کے مختلف نام اور ان کی تاریخ : سہ ماہی نوائے ادب ، بمبئی ، جولائی و اکتوبر ۱۹۶۶ء

۲- عبدالرشید خاں لائق : قومی زبان ، کراچی ، اکتوبر و نومبر ۱۹۶۷ء

۳۔ آقائے سرہندی : قومی زبان ، کراچی ، ۱۹۶۸ء
۴۔ آداب نبوی : سلسبیل ، لاہور ، نومبر ۱۹۶۷ء
۵۔ شاہ محمد مسعود : ثقافت ، لاہور ، نومبر ۱۹۶۷ء
۶۔ شعر و شاعری : فاران ، کراچی ، اگست ۱۹۶۸ء

ذیل کے مضامین اشاعت کے منتظر ہیں :

۱۔ مکاتیب عبدالواحد یکتا دہلوی
۲۔ اُردو کی ترقی پر تقسیم ہند کے اثرات
۳۔ سعادت

ذیل کی کتابوں کی ترتیب و تحشیہ کا کام کیا ہے :

۱۔ دائمی تقویم : مطبوعہ کوئٹہ ۱۹۶۸ء ۔ یہ رسالہ مولوی محمد منظور احمد دہلوی کی تالیف ہے ۔ کراچی کے اوقات سے متعلق ہے ۔

۲۔ مظہرالاخلاق : مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء ۔ یہ رسالہ حضرت مفتی محمد مظہراللہ شاہ دہلوی کی تالیف ہے ، اخلاقیات سے متعلق ہے ۔

۳۔ ارکان دین : مطبوعہ کوئٹہ ۱۹۶۸ء ۔ یہ بھی حضرت مفتی صاحب ممدوح کی تالیف ہے ، فقہی مسائل سے متعلق ہے ۔

مندرجہ ذیل کتابیں زیر تدوین ہیں :

۱۔ **تذکرۂ مظہر مسعود** : دہلی کے مشہور عالم و مفتی اور بزرگ حضرت شاہ محمد مسعودؒ اور ان کے نامور پوتے حضرت شاہ محمد مظہراللہ شاہی امام مسجد جامع فتح پوری دہلی کے حالات اور علمی کارناموں کا تحقیقی جائزہ ۔

۲۔ **مکاتیب مظہری** ، جلد اول : یہ حضرت مفتی اعظم شاہ محمد مظہراللہ ممدوح کے دو ہزار مکاتیب کا منتخبہ مجموعہ ہے ۔

۳۔ **فتاویٰ مظہری** ، جلد اول : حضرت شاہ مفتی محمد مظہراللہ دہلوی کے علمی اور تحقیقی فتووں کا مجموعہ ہے) ۔

۴۔ **شیخ احمد سرہندی** : حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے حالات ، علمی و ادبی کارناموں کے بالاستیعاب تحقیقی جائزہ جس میں مشرق و مغرب کے جملہ حوالوں سے مدد لی گئی ہے ۔

۵۔ **خطوط مشاہیر** : پروفیسر محمد مسعود احمد کے نام مشرق و مغرب

کے بعض علماء و فضلاء کے علمی خطوط کا مجموعہ -

۶- **مظہر العقائد** : یہ حضرت مفتی محمد مظہراللہؒ کی تالیف ہے -
پروفیسر موصوف ترتیب و تحشیہ کا کام کر رہے ہیں -

بلوچستان کے موجودہ اُردو لکھنے والوں میں سے بعض نوجوانوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے - مزید چند ایک کا مختصر ذکر سنیے :

سلطان محمد : پانی زئی کچھ علاقہ زیارت میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے - گزشتہ تیئیس سال سے کوئٹہ میں مقیم ہیں - ۱۹۵۰ء سے اُردو میں مضامین تحریر کر رہے ہیں جو ماہنامہ معلم کوئٹہ اور امروز لاہور میں چھپتے رہے ہیں - انھی میں سے دو مضمون ''شاہ جہان جوگی زئی'' (۱۹۵۴ء) اور ''پیر محمد کاکڑ'' (۱۹۵۴ء) ''ہماری سیاسی جد و جہد'' (ناشر ادارۂ ادب بلوچستان ، کوئٹہ) میں درج ہیں -

غوث بخش مرغزانی : مولد کچھ ولہاری خان ، متصل سبی ، سالِ پیدایش ۱۹۴۱ء - پہلا افسانہ ''یادِ دوست'' کے نام سے ''حقیقت'' کوئٹہ میں یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپا - مقامی اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں - آپ کا تعلق اس خطے کی معروف علمی شخصیت عطا محمد خاں مرغزانی کے خاندان سے ہے -

ذوالفقار علی رضوی : مقام پیدایش : فورٹ سنڈیمن - ۱۹۵۵ء سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا - گورنمنٹ کالج کوئٹہ اور اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پائی - متعدد کہانیاں لکھی ہیں ، مثلاً ''اُستانی'' مطبوعہ سالنامہ ''شہناز'' کراچی ۱۹۵۷ء -

محمد خان مری : مطبوعہ مضامین یہ ہیں :

۱- قرآنی معاشرہ : بلوچی دنیا ، ملتان ، فروری ۱۹۶۵ء

۲- انسانی آزادی کا حقیقی تصور (اسلام کی روشنی میں) : بلوچی دنیا ، ملتان ، اکتوبر ۱۹۶۶ء

۳- مست توکلی : بلوچی دنیا ، ملتان ، نومبر دسمبر ۱۹۶۶ء

نسیم دشتی : (مستونگ) ''مراد ساحر'' بلوچی دنیا کا ایک رومانی شاعر) بلوچی دنیا ، ملتان ، جنوری ۱۹۶۲ء -

محترمہ کہکشاں بلوچ صاحبہ : مچھ ۔ ''اولین بلوچ قائد'' بلوچی دنیا ، ملتان ، مئی ۱۹۶۵ع ۔

نادر قنبرانی : (سریاب) افسانہ ''سیاہ کار کون ؟'' بلوچی دنیا ، ملتان ، فروری ۱۹۶۶ع ۔

میر محمد ابراہیم شاد بلوچ : ''تمپ'' (تعارف) بلوچی دنیا ، ملتان ، ستمبر ۱۹۶۵ع اور ''مکران'' بلوچی دنیا ، ملتان ، جون و جولائی ۱۹۶۷ع ۔

اسیر عبدالقادر شاہوانی : (خاران) ''بلوچستان کی وادیوں میں'' (خاران کے شمال مغرب میں واقع آثار قدیمہ) بلوچی دنیا ، ملتان جنوری ۱۹۶۷ع ۔

''بلوچستان میں شادی بیاہ کی رسمیں'' (بلوچی رواج) بلوچی دنیا ، ملتان ، جون و جولائی ۱۹۶۷ع ۔

سید محبوب حسین مشہدی ایم اے : کوئٹے کے باشندے تھے ۔ اُردو میں ایک ناول لکھ رہے ہیں ۔ مضامین یہ ہیں ۔ ''مری ، بگٹی دو بستیاں ایک کہانی'' سہ ماہی 'کارکن' کوئٹہ دسمبر ۱۹۶۰ع ۔ ''موجودہ دور کے تعلیمی نظریات'' ۔ روزنامہ کوہستان ، لاہور ۱۳ نومبر ۱۹۶۴ع ۔ ''پراسرار روشنی'' اس میں کوئٹہ کے ۱۹۳۵ع کے ہولناک زلزلہ کی خونی روداد ہے جس میں علاقائی واقعات و واردات درج ہیں ۔

میر محمد ابراهیم جلیس نگوری : ''تمپ سے دبئی تک'' (سفر نامہ) بلوچی دنیا ' ملتان ' نومبر دسمبر ۱۹۶۷ع ۔

عصمت اللہ خاں جمالدینی : (نوشکی) ''بلوچی ثقافت کی چند جھلکیاں'' بلوچی دنیا ، ملتان ، اگست ۱۹۶۶ع ۔

''یوسف عزیز کا ذکر خیر'' بلوچی دنیا ملتان ، مارچ ۱۹۶۷ع ۔

مقبول رانا : آپ ۱۹۶۴ع سے کوئٹے میں روزنامہ 'مشرق' کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم ہیں ۔ آپ نے حال ہی میں مولانا حالی کی ایک گمنام کتاب (مبادی علم جیولوجی) پر ایک قابل داد مضمون لکھا ہے ۔ یہ کتاب تقریباً نوے سال قبل ۱۸۸۳ع میں مطبع انجمن پنجاب نے پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار کی اجازت سے چھاپی تھی ۔ کتاب کے سرورق سے پتہ چلتا ہے کہ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی جس کے عربی ترجمہ کو مولانا

حالی نے اردو میں منتقل کیا ۔ ارضیات کے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے ——— یہ مضمون مشرق کراچی کی ۷ اکتوبر ۱۹۶۷ع کی اشاعت میں شائع ہؤا تھا ۔

قاضی نورالحق : ان کا تولد ۱۱ اگست ۱۹۲۵ع کو فورٹ سنڈیمن (ژوب) کے مقام پر علی خیل قبیلہ کے ایک اعلیٰ اور اہل علم خاندان میں ہؤا ۔ آپ کے والد حاجی الحرمین قاضی حافظ مدثر کئی پشتو، فارسی اور عربی کتب کے مصنف ہیں ۔ آپ کے والد قریباً چالیس سال پیشتر اُردو میں خط و کتابت کرتے رہے ہیں ۔ قاضی نورالحق کئی سالوں سے اُردو میں مضامین لکھ رہے ہیں ۔ مثلاً ''ہماری مزدور تحریک'' (قاصد کوئٹہ ۵ فروری ۱۹۵۹ع) ''کوئٹہ ریجن میں مزدوروں کی بہبود''۔ (روزنامہ اتحاد کوئٹہ عید ایڈیشن ۱۹۵۹ع) ۔ آپ کا ایک اُردو مضمون ''بیٹ نیکہ'' (وادی ژوب کا ہزار سال پہلے کا پشتو زبان کا شاعر) خاصا مقبول ہؤا تھا ۔

سید صفدر حسین صفدر چند سالوں سے اس خطے میں مقیم ہیں ۔ ان کے مضامین قومی رسائل میں چھپ رہے ہیں ۔ بعض یہ ہیں :

۱۔ اقبال اور اس کی ہمہ گیر شخصیت : چٹان، لاہور، ۸ اپریل ۱۹۶۸ع ۔

۲۔ فکر اقبال کی رہنمائی : سیارہ ڈائجسٹ، جون، ۱۹۶۸ع ۔

۳۔ ادیب اور ادب کے تقاضے : قندیل، لاہور، ۱۲ جون ۱۹۶۸ع ۔

شعر بھی کہتے ہیں آپ کو یہ شعر بہت پسند ہے :

جی میں آتا ہے کہ کچھ وقت پہ احسان کر لوں
چاندنی رات میں ماحول غزل خواں کر لوں

مولانا عبداللہ دیرسانی : جائے پیدائش قریہ دیرمان علاقہ دشتیاری بلوچستان، سنہ پیدائش ۱۳۲۷ ہجری، تعلیم قصر قند، کراچی، دہلی اور دیوبند میں پائی ۔

آغا میر محمد نصیر خان احمد زئی : بی اے مولف ''بلوچی اور براہوی زبانوں کی گریمر'' ضخامت ۱۰۷ صفحات، نہایت آسان زبان میں بلوچی،

اور براہوئی زبانوں کی گریمر کا خاکہ پیش کرکے ساتھ ساتھ اردو میں اصطلاحات کی تعریف بھی کی گئی ہے۔

ملک محمد پناہ: (مترجم ''فاضل کے حضور میں''———مطبوعہ نوکین دور، کوئٹہ، مکران نمبر، ۱۶ مارچ ۱۹۶۷ع) کئی سال سے اُردو نثر لکھ رہے ہیں۔

نصیر احمد ناصر: سیکرٹری ادارۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ جنھیں حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی ہے، چند سال تک کوئٹہ میں بھی مقیم رہے۔ وہ ان دنوں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ نے یہاں کی علمی و ادبی محفلوں میں خوب شرکت کی۔ آپ کی ایک کتاب ''جمالیات (قرآن حکیم کی روشنی میں)'' ناشر مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۳۶۷ صفحات، قیمت چار روپے، سنہ اشاعت ۱۹۵۸ع، آپ کے کوئٹہ قیام کے دوران چھپی۔ آپ نے اپنی دوسری اہم کتاب ''تاریخ جمالیات'' جلد اول کا مسودہ وادیِ شال ہی میں مکمل کیا۔

صحافت وادیٔ بولان: از کمال الدین احمد، ۱۹۶۴ع میں مکمل ہوئی ویسے اب تک اضافے ہو رہے ہیں۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ صفحات (عام کاپی سائز) چار سو کے قریب۔

کمال الدین احمد ۳ دسمبر ۱۹۱۶ع کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ع میں سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ سے میٹرک پاس کیا۔ مزید تعلیم کی خاطر کوئٹہ سے باہر گئے۔ پھر محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت چھوڑ کر ۱۹۴۸ع سے صحافتی زندگی شروع کی۔ مختلف مقامی رسائل و اخبارات سے متعلق رہے۔ ۱۹۵۰ع میں روزنامہ جنگ کراچی کے پارٹ ٹائم رپورٹر بنے۔ ۱۹۵۷ع سے ہمہ وقتی نمائندے مقرر ہوئے۔ قومی اخبارات کے سب سے پہلے سٹاف رپورٹر متعین ہوئے۔

''صحافت وادیٔ بولان'' کے اکتالیس باب ہیں۔ پہلے دس ابواب میں کوئٹہ کا مختصر طور پر تاریخی اور جغرافیائی پس منظر دیا گیا ہے۔ اس خطے کی ثقافت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں جن پہلوؤں پر

مواد فراہم کیا گیا ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں :
مختلف اخبارات کب نکلے؟ کب بند ہوئے؟ ان کے ایڈیٹر کون تھے؟ تعداد اشاعت، اخباروں کے مالک، پالیسی، تنخواہ، اشتہارات، موجودہ صورت میں خبروں کو کیسے پیش کیا جاتا ہے؟ آئندہ کے لیے تجاویز درج کی گئی ہیں، چھاپے خانے، مقامی مدیران جرائد کے مختصر حالات مع فوٹو، قومی اخبارات اور ان کے نمائندے اور ان کے مختصر حالات مع فوٹو، صحافیوں کی تنظیمیں، صحافیوں کی تقریبات اور سرگرمیاں نیوز ایجنٹس، محکمہ اطلاعات، محکمۂ نشر و اشاعت قبائلی، ریڈیو، خانہ فرہنگ ایران، اخبارات کا ضابطۂ اخلاق، بلوچستان کے صحافیوں کے دلچسپ واقعات اور یہاں کے صحافیوں کی مشکلات وغیرہ۔

زبان سیدھی سادی اور رواں، انداز نگارش دلنشیں۔

دین و دنیا (خطی) از مولانا عبد الکریم سابق مدیر ہفت روزہ 'الاسلام' کوئٹہ و حال پروپرائٹر روزنامہ 'میزان' کوئٹہ۔ جنہوں نے ۱۹۲۵ع سے آج تک کوئٹہ قلات ریجن کی تعلیمی، علمی و ادبی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں اور ۱۹۳۹ع سے ۱۹۴۷ع تک[1] حصول پاکستان کی تحریک میں بڑی سرگرمی، محنت اور مجاہدانہ تگ و تاز سے حصہ لیا ہے۔

یہ کتاب مولانائے موصوف کی اُن مختلف تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے کوئٹہ میں ریڈیو سٹیشن کے قیام کے آغاز یعنی ۱۹۵۶ع سے لے کر ۶۷-۱۹۶۶ع تک مختلف اوقات میں نشر کیں۔ یہ تقاریر ان موضوعات پر مشتمل ہیں: دین، سیاست، پاکستان اور عالم اسلام کے روابط اور تعلقات۔

مولانا کی اس زیر طبع کتاب کا دیباچہ کے جی علی سابق ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے لکھا ہے۔ جب کہ ''نذرانۂ عقیدت'' کے عنوان سے عبدالصمد درانی اور ''بلوچستان میں تحریک پاکستان کا پہلا نقیب''

۱۔ بائیو گرافیکل انسائیکلو پیڈیا آف پاکستان، لاہور ایڈیشن، ۵۶-۱۹۵۵ع صفحہ ۳۵۶۔

کے تحت فضل احمد غازی نے خامہ فرسائی کی ہے -

بلوچستان میں فارسی شاعری : از ڈاکٹر انعام الحق کوثر مطبوعہ بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ ، ضخامت ٢٦٦ صفحات ، سنہ اشاعت جنوری ١٩٦٨ع قیمت چھ روپے ، سر ورق سہ رنگا ، تیار کردہ پروفیسر سعید الحسن -

اس کتاب میں اس خطے کے چوبیس بلوچ براہوئی اور پشتون شعرا کا تذکرہ ملتا ہے - بقول پروفیسر کرار حسین :

''ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے کوئٹہ قلات ریجن کے فارسی شعرا کا کھوج لگا کر اور ان کی زندگی اور نمونہ کلام کو منظر عام پر لا کر اس سر زمین کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے جہاں کی مرکزی دانشگاہ میں وہ ایک مدت سے فارسی زبان و ادب کی درس و تدریس کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں اور اس بیداری اور خود آگہی کی تحریک سے کچھ پہلو اُجاگر کیے ہیں جو آزادی اور ترقی کے ماحول میں ایک نئی زندگی کی لہر کی طرح اس علاقہ میں پھیلتی جا رہی ہے اور جس کی زندگی کے ہر شعبہ پر گہرے اور دور رس اہم اور دلچسپ نتائج ابھی وقت کے سٹیج پر ظاہر ہونے والے ہیں -''

پروفیسر انور رومان کا ارشاد ہے :

''مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں قومی ثقافت کا جو مرقع ہم ترتیب دے رہے ہیں اُس میں صاحب تحقیق کے توسط سے ان جیالے فنکاروں کی شمولیت اس کے جمال و جلال کے اضافے کا موجب ہوگی -''

چیئرمین بلوچی اکیڈیمی کا کہنا ہے :

''اس کتاب میں فاضل مؤلف نے بلوچستان کے جن نامور شعرا کے شاعرانہ کمالات کو سمویا ہے ان کی شاعری کا رنگ اگرچہ فارسی کی روایتی شاعری سے مختلف نہیں تاہم اس میدان میں اُنھوں نے ندرت فکر اور بلندیٔ خیال کے جو نادر نمونے پیش کیے ہیں اُن میں یقیناً اہل ذوق کے لیے دلچسپی کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں -

اگر اہلِ علم و ادب کو اس کتاب کے مطالعہ سے اس معنی میں کوئی فائدہ ملا تو ایکڈیمی یہ فخر سے کہہ سکے گی کہ اس کی کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں"۔

اس کتاب میں چند عکس بھی موجود ہیں جو اس خطے کے قلمی نسخوں یا چھپی ہوئی نایاب کتابوں سے متعلق ہیں۔

سر زمین بلوچستان سے راقم الحروف کا تعلق قریباً بیس سال سے ہے۔ بندہ یہیں سکونت پذیر ہو چکا ہے۔ اس ناچیز نے کوئٹے میں بیٹھ کر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام کیا اور ڈگری حاصل کی۔ ریڈیو سٹیشن کوئٹہ سے مختلف موضوعات سے متعلق میری متعدد تقریریں نشر ہو چکی ہیں۔ فارسی اور انگریزی کے علاوہ اُردو میں خاصے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ بلوچی اور پشتو میں ترجمے چھپتے ہیں۔ اُردو کے چند مضامین کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ بلوچستان کا دل۔ کوئٹہ: مطبوعہ روزنامہ ملت، لاہور، عیدالضحیٰ نمبر، ۱۹۵۳ع۔

۲۔ بلوچستان اور مکران کی ایک ایک جھلک: (ہمایوں اور ملک خطی۔ مکران کی دولت کجھور): امروز، لاہور، ۲۹ اگست ۱۹۵۴ع۔

۳۔ لال نوٹ: (وادیٔ شال کا ایک کردار) قندیل لاہور، ۳ اکتوبر ۱۹۵۴ع۔

۴۔ غلام حسین مسوری بگٹی: (ایک بلوچ ہیرو) پروفیسر انور رومان کے انگریزی مضمون کا ترجمہ، مطبوعۂ امروز، لاہور، ۲۸ فروری ۱۹۵۵ع اور بلوچی دنیا، ملتان، جنوری ۱۹۶۵ع۔

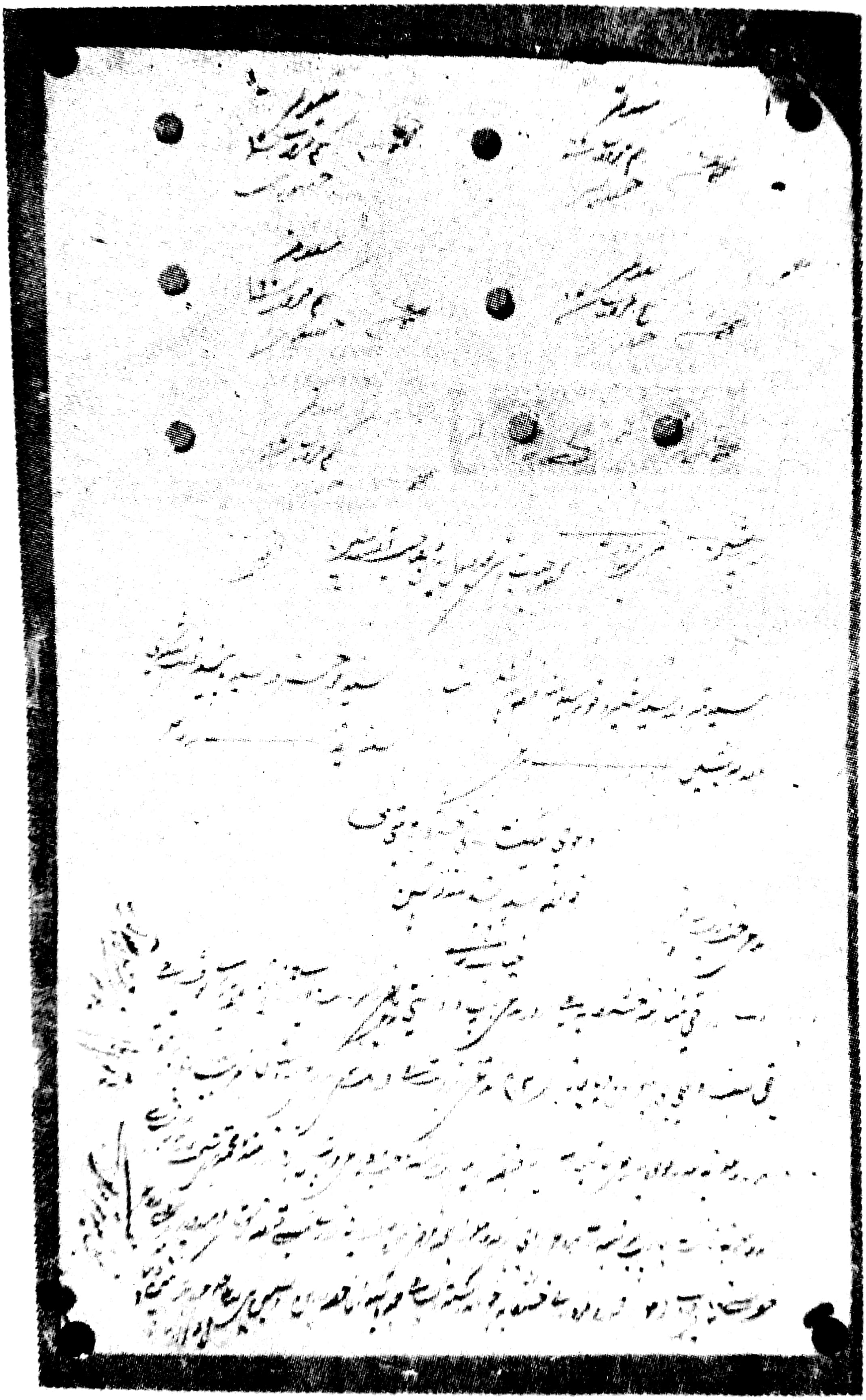
۵۔ کوئٹے اور غالب: امروز، لاہور، ۷ مارچ ۱۹۵۵ع۔

۶۔ نوابزادہ یوسف علی خان مگسی: (پروفیسر انور رومان کے انگریزی مضمون کا ترجمہ)۔ امروز، لاہور، ۲، ۹ فروری ۱۹۵۸ع۔

۷۔ اقبال اور قومیت: سہ ماہی اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ع۔

۸۔ عید (فارسی و اُردو شعرا کی نگاہ میں): عید ایڈیشن، امروز، لاہور، ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ع۔

۹۔ فغانی کی مقبولیت پاک و ہند میں: سہ ماہی اقبال، لاہور، اپریل



۱۸۸۷ء کی ایک دفتری تحریر کا نمونہ

۱۹۶۱ء -

۱۰- فارسی جدید میں قدیم ترین شعر : نیا راہی ، کراچی ، جنوری ۱۹۶۲ء -

۱۱- ایوان مدائن اور خاقانی : سہ ماہی اقبال ، لاہور ، اپریل ۱۹۶۳ء -

۱۲- علامہ اقبال کا ذہنی ارتقا : سہ ماہی الزبیر ، بہاول پور ، مئی ۱۹۶۳ء -

۱۳- بلوچی ادب اور اُردو : پاکستان میں اُردو ، پشاور ۱۹۶۵ء -

۱۴- غالب دل گداختہ : کاروان ، بہاول پور ، اشاعت خاص ، اکتوبر نومبر ۱۹۶۶ -

۱۵- کوئٹہ قلات ریجن کی تاریخی اہمیت : (انگریزی سے ترجمہ اصل مضمون از پروفیسر انور رومان) بلوچی دنیا ، ملتان ، جنوری ۱۹۶۷ء -

آج سے قریباً پندرہ سال پیشتر راقم الحروف نے اپنے مضمونِ بلوچستان کا دل - کوئٹہ'' میں ''مستقبل'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا تھا ، ملاحظہ فرمائیے :

''تاریخی لحاظ سے پروفیسر سٹوارٹ پگٹ (Stuart Piggot) کے حالیہ اثری انکشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب سے بھی پیشتر کوئٹہ میں ایک ایسی دیہاتی تہذیب موجود تھی جس کے آثار آج بھی زنوف کے خوبصورت نمونوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جس جگہ کا ماضی اتنا شاندار تھا اُس کا مستقبل شاندار نہ ہو -

جغرافیائی اعتبار سے یہاں کی آب و ہوا علمی مشاغل ، فن لطیف اور سنجیدہ کاموں کے لیے بیحد موزوں ہے - پاکستان کے دوسرے بڑے بڑے شہروں سے اس کا فاصلہ اس بات کا ضامن ہے کہ لاہور اور کراچی کے بر عکس یہ شہر اپنی انفرادیت بر قرار رکھے - یہ انفرادیت اور بھی مضبوط ہو سکتی ہے جب کہ یہاں کے باشندے فطری طور پر اپنی خودی کے لیے مشہور ہیں - ایک اور اعتبار

سے جیسے پشاور افغانستان اور پاکستان کے درمیان روشنی کے مینار کا کام دے رہا ہے جغرافیائی عوامل وہی مرکزی حیثیت کوئٹہ کو ایران اور پاکستان کے مابین دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔

صنعتی حیثیت سے یہاں بہت آسانی سے پھلوں خاص طور پر انگور، انار، اُون اور معدنیاتی صنعتوں کے کارخانے کھل سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر تھریلیوے (Threllwey) کا تجربہ جو کہ یہاں کی جیوگریفیکل لبارٹری میں ہو رہا ہے اور جس کا منشا بلوچستان میں بارش کو بڑھانا ہے، کامیاب ہو جاتا ہے تو اُس کی ترقی کے امکانات بے شمار ہیں لیکن اگر یہ تجربہ ناکام بھی ہو جائے تو بھی یہاں کے پہاڑ، یہاں کے پھل، یہاں کے ریوڑ انسان کے عزم تسخیر کے لیے ایک مستقل تازیانہ ہیں - تسخیر فطرت کے اصول کو آپ ایک دفعہ ان لوگوں کے ذہن میں بٹھا دیجیے پھر یہی کوئٹہ زندگی اور تمدن کی تمام شوخیوں سے ہنستا ہؤا، کھیلتا ہؤا اور ناچتا ہؤا نظر آئے گا۔''

نغمۂ کوہسار : از عبدالرحمٰن غور، مطبوعہ بلوچی اکیڈیمی، شارع اقبال کوئٹہ، سن اشاعت ۱۹۶۸ع -

اس کتاب میں پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر عصر حاضر کے تئیس بلوچی زبان کے شعرا و ادبا کے حالات درج کیے گئے ہیں ۔ حالات زندگی کے پہلو بہ پہلو شاعر کے کلام سے اس کی فنی صلاحیتوں کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

مصنف نے بعض شعرا کے کلام کو منظوم اُردو ترجمہ کی مدد سے بھی روشناس کرایا ہے ۔ کتاب کے شروع میں ایک جائزہ شامل ہے جس کا عنوان ہے ''بلوچوں کی تاریخ اور اُن کا ادب'' ۔

منابع کے سلسلے میں مؤلف نے لکھا ہے :

''میں نے ''نغمۂ کوہسار'' میں قدیم شعرا و ادبا پر جو کچھ لکھا ہے وہ بلوچی زبان کے پرانے بہی خواہوں اور بڑے بوڑھے بلوچوں سے پوچھ پاچھ کر لکھا ہے ۔''

اس کی مزید توضیح یوں کی ہے :

''بلوچی زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات یہ بخوبی جانتے ہیں کہ قدیم بلوچی ادب کبھی حیطۂ تحریر میں نہ آ سکا کیونکہ اُس وقت بلوچی رسم الخط کا تعین نہ ہو سکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہئیتِ تحریر کا رواج نہ تھا، ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ سینے کا علم ہے جو پشت در پشت اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور آج بھی بلوچی ادب کا گرانقدر سرمایہ یہی ہے''۔

مؤلف کا پیرایۂ بیان دلنشین اور ہموار ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بلوچی ادبیات کے خد و خال سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

خار زہر آلود : از سید خلیل احمد، ناشر زمرد حسین بھٹہ، قلات پبلیشرز، مستونگ، سال اشاعت ۱۹۶۸ع قیمت پونے دس روپے، ضخامت ۵۶ صفحات۔

سید خلیل احمد تقریباً پندرہ سال سے اس خطے میں مقیم ہیں۔ آپ کے افسانے اور ناولٹ ملک کے ممتاز رسائل (جیسے ادب لطیف، ادبی دنیا وغیرہ) میں چھپتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ آپ کی یہ کتاب تین طویل مختصر افسانوں پر مشتمل ہے۔ ''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے''، ''خزاں بدوش بہار'' اور ''درد وہ سنگ گراں ہے''۔ عنوان کے سلسلے میں ''اختر الایمان'' کا یہ شعر پیش نظر ہے :

میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوش بہار و خار زہر آلود

سید خلیل انگریزی کے اُستاد ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں پر انگریزی ادب کا نمایاں اثر ہے۔ آپ کی اپنی ایک تکنیک ہے اور اسلوب بیان نکھرا ہوا۔

سید خلیل کے افسانوں کی خاص خصوصیت وہ شدید اور گراں بار احساس تنہائی ہے جو زہر آلود دھوئیں کی طرح ہر وقت اُن کے کرداروں پر چھایا رہتا ہے۔ اُن کے کردار ایک خاص ذہنی کشمکش کی پیداوار ہیں جو

ہنستے بھی ہیں اور مشاغل حیات میں منہمک بھی رہتے ہیں مگر ایک کربناک کیفیت اُن کی روحوں کو دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہے۔
بیسویں صدی کے اُلجھے ہوئے مسائل اُن کے افسانوں کا پلاٹ بنتے ہیں۔ ایک نفسیاتی اُلجھن یا غیر معمولی نفسیات اُن میں کار فرما رہتی ہے۔ ''درد وہ سنگ گراں ہے'' ان کا طویل ترین افسانہ ہے۔ اس میں ایک بیوہ کو جنسی جذبہ کا شکار دکھایا گیا ہے جو کئی انسانوں کی تباہی کا باعث بنا۔ ''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے'' پر مغربی تکنیک کا گہرا اثر ہے جس میں پھیلاؤ اور شدت احساس کے ساتھ ایک رمزیت پنہاں ہے۔ ''خزاں بدوش بہار و خارِ زہر آلود'' بہت دلکش افسانہ ہے وہ رومانوی دلکشی جو حسن اور موت کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے افسانہ میں محبت کی ازلی مثلث دو عورتوں اور ایک مرد کی صورت میں موجود ہے۔ یہ عورتیں دو بہنیں ہیں ایسے جیسے زندگی اور موت۔ اُن کی محبت کا فرق بڑے فنکارانہ انداز سے دکھایا گیا ہے۔ افسانہ کا ماحول بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک ممتاز اضافے کی حامل ہے اس کا پیش لفظ پروفیسر کرار حسین نے اپنے منفرد انداز میں لکھا ہے اور خوب نبھایا ہے۔

بلوچستان میں اُردو نثر کے اہم ترین سنگھائے میل مذکورہ بالا جائزے سے واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس خطے سے متعلق چھپنے والی پہلی اُردو کتاب بلوچی نامہ (۱۸۷۵ء) سے اب تک جو نثری کارنامے منظر عام پر آئے ہیں، اُن کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: انگریزی دور اور پاکستانی دور۔

انگریزی عہد کا نثری ادب ۱۸۷۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور پر محیط ہے۔ اس عرصے میں جو ارباب قلم ملتے ہیں ان میں رائے بہادر ہتو رام کو شرف اولیت حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں کے کلاسیکی طرز تحریر کے مطابق کبھی کبھار اور کہیں اپنی اُردو عبارتوں کو فارسی اُردو کے حسب موقع اشعار سے سجانے کی کوشش کرتے تھے۔ تاریخی و تمدنی لحاظ سے اُن کی نگارشات خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ بایں ہمہ اُن کی نثر ٹیڑھی میڑھی اور انداز بیان پیچیدہ ہے لیکن دوسرے صاحب قلم لیفٹیننٹ کرنل بھولا ناتھ کے یہاں زبان

اور انداز بیان دونوں بہت صاف اور رواں ہیں - جو اشعار جا بجا درج کیے ہیں وہ برمحل اور برجستہ ہیں - صنفی لحاظ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان صرف تاریخ و سیر ہی کا پیرہن اظہار نہیں بلکہ طبی تجربات و نکات ، سیاسیات ، اور صحافت و معاشرت بھی اس کے احاطۂ اظہار میں آ گئے تھے - ناول ، افسانہ ، مضامین ، اداریوں اور شذرات وغیرہ میں طبع آزمائی کی گئی - اس دور میں میر یوسف علی خاں عزیز کا حصہ بہت اہم ہے - موصوف بوقلموں صلاحتیں لے کر آئے تھے جو اُن کی بے قرار روح کے زیر اثر شعلہ ہائے جوالہ کی طرح کام کرتی تھیں - انھوں نے کمال خود اعتمادی اور دور رس قوت تصور کے ساتھ اُردو زبان کو آزاد زندگی کی ان بیتاب امنگوں سے ہم آہنگ کر دیا جو بلوچستان کے رگ و پے میں رقصاں و فروزاں تھیں اور عمل و بیداری کے پیغام کے لیے اسی زبان کو عصائے موسوی کے طور پر استعمال کیا - اُن کا افسانہ ''تکمیل انسانیت'' نہ صرف اُن کی ذاتی زندگی کے مد و جزر کا مظہر ہے ، نہ صرف اُن کے ساجی شعور پر دال ہے بلکہ بلوچستان کو جس اتحاد و اشتراک کی ضرورت تھی اس کی بھی روح مجسم ہے - یہ مقصدیت ان کی زبان و پیرایۂ بیان کے ساتھ مل کر اُسے اُردو زبان کے موجودہ افسانوں میں سے ایک عظیم افسانہ بنا دیتی ہے جو نہ صرف بلوچستان کی نوخیز نسلوں کے لیے مینار روشنی ہے بلکہ پاکستان بھر کے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے -

اس دور کے دیگر لکھنے والے (میر عبدالرحمٰن بگٹی ، عنقا ، قاضی داد محمد ، میر شیر علی ، نسیم تلوی ، اسلم اچکزئی ، اور محمد حسن نظامی ، وغیرہ) بھی یوسف عزیز کی نگارشات سے صوری و معنوی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے !

اس دور کے مطالعہ سے ایک نہایت اہم حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ ان ارباب قلم میں سے کوئی بھی صاحب حقیقتاً ''اہل زبان'' نہ تھے لیکن اُنھوں نے جس روانی اور قدرت سے اُردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اس سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ ان لوگوں کو یقین تھا کہ اُردو

اور صرف اُردو ہی اس وسیع ملک کی عام زبان ہے - ملت اسلامیہ کے متفرق اجزا کی شیرازہ بند ہے اور اس کے تحفظ و بقا کے لیے وہی اظہار و انداز اختیار کیے جاتے تھے جو زیادہ سے زیادہ مفید اور قدرتی تھے -

پاکستانی دور ۱۹۴۷ع سے اس خطے میں جاری و ساری ہوا - اس میں چند پرانے لکھنے والے بھی موجود ہیں لیکن آزادی کی فضا نے اگر ایک طرف سمند تخلیق و تخیل کو سہمیز لگائی تو دوسری طرف آبادی کے اضافے نیز مواصلات و مطبوعات کی سہولتوں کی بنا پر اصحاب فکر و دانش میں زبردست ربط و ضبط پیدا ہوا - اس سے اس دور میں نثری کارناموں کی رفتار بہت تیز ہو گئی !

اس دور کی ابتدا عبدالرحمٰن غور کی مرتبہ کتاب ''مشعل'' سے ہوئی جس میں اُس وقت کے بلوچستان کے اہم ترین لکھنے والوں کی تخلیقات جمع کر دی گئیں ! یوں تو یہ کتاب مختصر سی ہے لیکن رائجُ الوقت نظریات پر مبنی تحریرات کا نمایندہ عکس ہونے کے علاوہ ادب میں خالص قومی اور پاکستانی نقطۂ نظر کا اولین اظہار بھی ہے - انور رومان کا افسانہ ''غیرفانی'' اس نئے ادب کا نقطۂ آغاز ہے اور اُن کے اسی زمرے کے آیندہ عظیم تر مقالات و تخلیقات کا مظہر ہے -

اس دور میں افسانے ، مقالات ، مضامین ، تاریخ و سیر ، لکھے اور تراجم کیے گئے اور اخلاقیات ، بلوچستانی سیاسیات ، تعلیمات ، بلوچیات ، براہوئیات ، نفسیات ، مذہب ، لسانیات ، نباتیات ، حیوانیات ، عروض ، لوک ادب ، صحافت ، بلوچستان میں فارسی ادب وغیرہ پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جو اس خطے میں اُردو زبان کی ہمہ گیری پر دلالت کرتی ہیں - تاریخ و سیر میں اگر انور رومان ، میر گل خان نصیر ، عبدالرحمٰن کُرد ، عبدالرحمٰن غور ، ملک صالح محمد لہڑی ، کامل القادری ، میر خدا بخش مری ، انعام الحق کوثر ، شیث سلیم ، پروفیسر رشید احمد وغیرہم نے نہایت قابل قدر کام کیا تو اخلاقیات میں میر عطا محمد مرغزانی ، عبدالرحمٰن غور ، پروفیسر سعید احمد رفیق اور محمد اقبال سلہان نے گراں قدر تصنیفات پیش کیں - پروفیسر خلیل صدیقی لسانیات کی پرخار وادی سے ایسے انداز میں

گزرے کہ قارئین کے لیے اسے گلزار بنا گئے ۔ ایسی تالیفات بھی منظر عام پر آئیں جو بیک وقت بہت سے ارباب فکر و دانش کی تخلیقات کا مجموعہ تھیں ۔ 'مشعل' کے بعد وادیٔ بولان میں ، 'بولان نامہ' اور ثقافت و ادب وادیٔ بولان میں ، اس سلسلے کی بہت اہم کڑیاں ہیں ۔ بلوچستان کی شوق انگیز اور خیال افروز فضاؤں نے اگر نسیم حجازی کے ناولوں اور ش ضحیٰ کے حسن تحریر کا روپ دھارا تو ذکیہ بلوچ طاہرہ نقوی ، بیگم خورشید مرزا ، یاسمین صُوفی اور حمیدہ جبین بھی اُن کی تشویق سے بے چین ہو گئیں اور اپنے مشاہدات و ما فی الضمیر کو بطرز احسن صفحۂ قرطاس پر لے آئیں ۔ یہ کاروان تصنیف و تخلیق روز بروز اضافہ پذیر ہے اور کہنہ مشق اصحاب کے دوش بدوش جواں سال سید خلیل احمد ، انعام الحق کوثر ، عطا شاد ، سلطان محمد پانے زئی محمد خاں مری ، غفار ندیم ، ظفر میرزا ، عبدالرحمٰن براہوئی اور صاحبزادہ حمید اللہ وغیرہم ایسی تخلیقات و نگارشات میں مصروف ہیں جو نہ صرف اُردو ادب میں بلوچستان کی قد آور شخصیت اُجاگر کرتی ہیں بلکہ خود اُردو ادب کے لیے بھی باعث صد افتخار ہیں !

کتابیات

انگریزی ماخذ :

Baluchistan District Gazetteer series.

Board of Editors :
A History of the Freedom Movement V0l. II Part II — Karachi 1961.

Bray, Denis, :
The Brahui Language Part — Calcutta 1910.
Part II — Calcutta 1937.

C.M. Sadiq :
A note on the Development of Education in Quetta Region — Quetta 1964.

Imperial Gazetteer of India — Oxford 1908.

Khan, M.S. Baloch :
History of Baloch Race and Baluchistan — Karachi 1958.
The Great Baluch — Karachi 1967.

M. Anwar Rooman :
Journal of the Pakistan Historical society "Baluchi Literature and Language" — Karachi Oct. 67. Jan. 1968.

Mayer :
English Biluchi Dictionary — Lahore 1910.
Proceedings of the First All Pakistan History Conference — Karachi 1951.

قلمی مسودات

جمیل ۔ غلام محمد	نقشِ جمیل	کوئٹہ	
رشید جان ۔ سردار	بیاض	کوئٹہ	
زیب ۔ گل محمد مگسی	مخمسات		
شیت سلیم	کوئٹہ ریجن کے مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کا جائزہ اور اُن کی اصلاح	(دکی ضلع لورالائی)	۱۹۶۴ء
کمال الدین احمد	صحافتِ وادیٔ بولان	کوئٹہ	۱۹۶۴ء
محمد حسن	دیوان		۱۸۴۷ء
مولا داد	غزلیات		
عبیداللہ خاں بلوچ	بلوچستان میں اُردو (غیر مطبوعہ مضمون)	کراچی	۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء

مطبوعہ ماخذ

آزاد جمالدینی	مست ءِ توار (للکار)	کوئٹہ	۱۹۵۴ء
آغا صادق	صبح صادق	کوئٹہ	۱۹۶۶ء
	نوا	کوئٹہ	۱۹۶۶ء
	چشمۂ کوثر	ملتان	۱۹۶۷ء
	طفلستان	کوئٹہ	۱۹۶۷ء
	بردوش ہوا	لاہور	۱۹۶۲ء
احمد الدین مارہروی	جغرافیہ مکران		۱۹۵۱ء
اصغر انبالوی	دستِ سبو	کوئٹہ	۱۹۶۰ء
افغانی دین محمد	تجدید الاسلام	کوئٹہ	۱۹۵۷ء

اقبال سلطان	آدابِ زندگی	لاہور	۱۹۶۳ء
	نفسیات سب کے لیے	لاہور	۱۹۶۵ء
انجمن اتحاد بلوچاں	شمس گردی	لاہور	۱۹۳۱ء
انور رومان	پاکستانی ادب	مخزن	جولائی اگست
		لاہور	۱۹۴۹ء
	کوئٹہ قلات کے براہوئی (مترجم ڈاکٹر انعام الحق کوثر)	لاہور	۱۹۶۴ء
	آئینہ بلوچ	ملتان	۱۹۶۴ء
	گلدستہ اشعار (پیش لفظ)	لاہور	۱۹۵۹ء
	بروہی کی لوک کہانیاں	مستونگ	۱۹۶۵ء
انجم قزلباش	بلوچوں کے رومان	مستونگ	۱۹۶۲ء
انور علی سید	ابتدائی تدریس	کوئٹہ	۱۹۴۴ء
انعام الحق کوثر ۔ ڈاکٹر	بلوچستان میں فارسی شاعری	کوئٹہ	۱۹۶۸ء
ایل ڈیمز	بلوچ قبائل (مترجم کاسل القادری)	ملتان	۱۹۶۱ء
ایم ممتاز	صدائے آخر	کوئٹہ	۱۹۵۵ء
بجنوری ۔ عبدالرحمٰن	باقیات بجنوری	دہلی	۱۹۴۰ء
بزم ثقافت	ثقافت اور ادب وادیٔ بولان میں	کوئٹہ	۱۹۶۶ء
بھولا ناتھ	علم و عمل طب	لاہور	۱۹۱۵ء
بلوچستان میں قائداعظمؒ کی تقریریں		کوئٹہ	۱۹۴۸ء
تابش نگینوی	جوش جہاد (پمفلٹ)	کوئٹہ	۱۹۶۵ء
تذکرہ مسلم شعرائے بہار جلد دوم		کراچی	۱۹۶۷ء
جعفر علی ۔ شیخ	جغرافیہ بلوچستان	کوئٹہ	۱۹۴۹ء
حفیظ اللہ ۔ ڈاکٹر	معیاری نباتیات	لاہور	۱۹۶۴ء

حمیدہ جبیں	عنبرین	لاہور	۱۹۶۷ء
خلیل احمد سید	خار زہر آلود	مستونگ	۱۹۶۸ء
خلیل صدیقی	زبان کا مطالعہ	مستونگ	۱۹۶۴ء
دین محمد مولوی	یادگار تاجپوشی قلات	لاہور	۱۹۳۲ء
ذکیہ سردار خاں بلوچ	سرمست بلوچستان	کوئٹہ	۱۹۶۵ء
رشید احمد	مسلمانوں کے سیاسی افکار	لاہور	۱۹۶۰ء
,, ,,	تاریخ مذاہب	مستونگ	۱۹۶۴ء
رمضان مرزا	حیوانیات	لاہور	۱۹۶۵ء
سعید احمد رفیق	اسلامی نظام تعلیم	کراچی	۱۹۵۶ء
	اقبال کا نظریۂ اخلاق	لاہور	۱۹۶۰ء
سید حبیب	تذکرۂ خاران	لاہور	—
سید سلیمان ندوی	نقوش سلیمانی	کراچی	۱۹۵۱ء
سیماب ۔ غلام حسین حکیم	بلوچستان میں اُردو (تقریر)	ریڈیو سٹیشن کوئٹہ	۴ نومبر ۱۹۶۰ء
صابر ۔ عبدالرحیم قاضی	بلوچستان کی وادیوں میں	کراچی	۱۹۵۹ء
,, ,,	بلوچستان کے جانباز	کراچی	۱۹۶۰ء
,, ,,	دو جہانءِ سردار	کراچی	۱۹۶۶ء
,, ,,	صابرءِ گفتار	کراچی	۱۹۶۶ء
,, ,,	مکران تاریخ کے آئینہ میں	کراچی	۱۹۶۷ء
صالح محمد لہڑی	بلوچستان	کوئٹہ	۱۹۵۵ء
صفدر مرزا پوری	مشاطۂ سخن حصہ دوم	لاہور	۱۹۲۸ء
طاہر فاروقی ۔ خاطر غزنوی	پاکستان میں اُردو	پشاور	۱۹۶۵ء
عابد ۔ عابد شاہ	گلزار عابد	دیو بند	۱۹۱۵ء
عبدالرحمٰن بگٹی	محراب گردی	جیکب آباد	۱۹۳۳ء
عبدالرحمٰن براہوئی	کیمیا گر اور کیمیا گری	لاہور	۱۹۶۸ء
عبدالرحمٰن کرد	ہمارا کارواں	کوئٹہ	۱۹۵۴ء

عطا شاد - عین سلام	بلوچی لوک گیت	مستونگ	١٩٦٥ء
عطا محمد - چودھری	تدریسی کھیل	کوئٹہ	١٩٤٤ء
عطا محمد خاں	نفسیات عادات انسانی	کوئٹہ	—
	ملا ازم	کوئٹہ	—
عنقا - محمد حسین	رحیل کوہ	کراچی	١٩٣٤ء
عین سلام	چکیدہ	مستونگ	١٩٦٦ء
غور - عبدالرحمن	مشعل	کوئٹہ	١٩٤٨ء
" "	پھندے	کوئٹہ	١٩٤٩ء
" "	ہماری جد و جہد	کوئٹہ	١٩٥٤ء
" "	ناقابل فراموش ہستیاں	کوئٹہ	١٩٥٥ء
" "	عالیہ	کوئٹہ	١٩٥٥ء
" "	حکمت کے موتی	کوئٹہ	١٩٥٥ء
" "	سچی کہانیاں (بچوں کے لیے مختصر پمفلٹ)	کوئٹہ	١٩٥٥ء
" "	متاع بردہ	ملتان	١٩٦٧ء
" "	نغمۂ کوہسار	کوئٹہ	١٩٦٨ء
قیصر اللہ آبادی	مکران میں اُردو (مضمون) قومی زبان کراچی		١٦ نومبر ١٩٥١ء
قیوم راشد	بربط ناہید	کوئٹہ	١٩٤٨ء
کامل القادری	جام درک	ملتان	١٩٦٣ء
" "	براہوئی اور اُردو	لاہور	١٩٦٢ء
	کوئٹہ میں پون صدی پہلے کی ثقافتی زندگی (پمفلٹ)	کوئٹہ	١٩٥٩ء
گل خاں نصیر	تاریخ بلوچستان	کوئٹہ حصۂ اول	١٩٥٢ء
" "	" "	حصۂ دوم	١٩٥٧ء
گمی - سلیم خاں	بلوچی ادب	بہاول پور	١٩٦١ء

محشر رسول نگری - نثار احمد	تیغ و قرآن	کوئٹہ	—
,, ,, ,,	نظام نو	کوئٹہ	—
,, ,, ,,	مثنوی صحیفہ فطرت	کوئٹہ	۱۹۵۷ع
,, ,, ,,	فخر کونین حصۂ اول	لاہور (بار دوم)	۱۹۶۲ع
,, ,, ,,	فخر کونین حصۂ دوم	کوئٹہ	۱۹۶۴ع
محمد سرور خاں	کام کی باتیں	کوئٹہ	—
مرکز ادب کوئٹہ	دھنک	مستونگ	۱۹۶۲ع
مرید حسین خاں مگسی	جغرافیہ علاقۂ مگسی	لاہور	۱۹۳۹ع
,, ,, ,,	آل انڈیا بلوچ کانفرنس جیکب آباد کی مکمل روداد (پمفلٹ)	لاہور	۱۹۳۳ع
ملک رمضان	بلوچی شاعری	کوئٹہ	۱۹۶۳ع
مولانا عبدالکریم	جامعۂ اسلامیہ عزیزیہ کا نصاب تعلیم	کراچی	۱۹۳۴ع
مہر - غلام رسول	سید احمد شہید	لاہور	۱۹۵۴ع
میر خدا بخش مری	قدیم بلوچی شاعری (ڈیمز کی کتاب کا ترجمہ)	کوئٹہ	۱۹۶۳ع
,, ,, ,,	از سنۂ بلوچ (مترجم ذکا اللہ خان لودھی)	کوئٹہ	۱۹۶۴ع
میر عبدالقیوم بلوچ	بلوچی بوسیا	کوئٹہ	۱۹۶۴ع
میر مولا بخش خاں مسّلا زائی بلوچ	التبیان فی التنقید علیٰ دو قرآن	کوئٹہ	۱۹۵۵ع
نذیر احمد شیخ	حرف بشاش	لاہور	۱۹۶۵ع
نسیم حجازی	داستان مجاہد	لاہور	۱۹۴۳ع

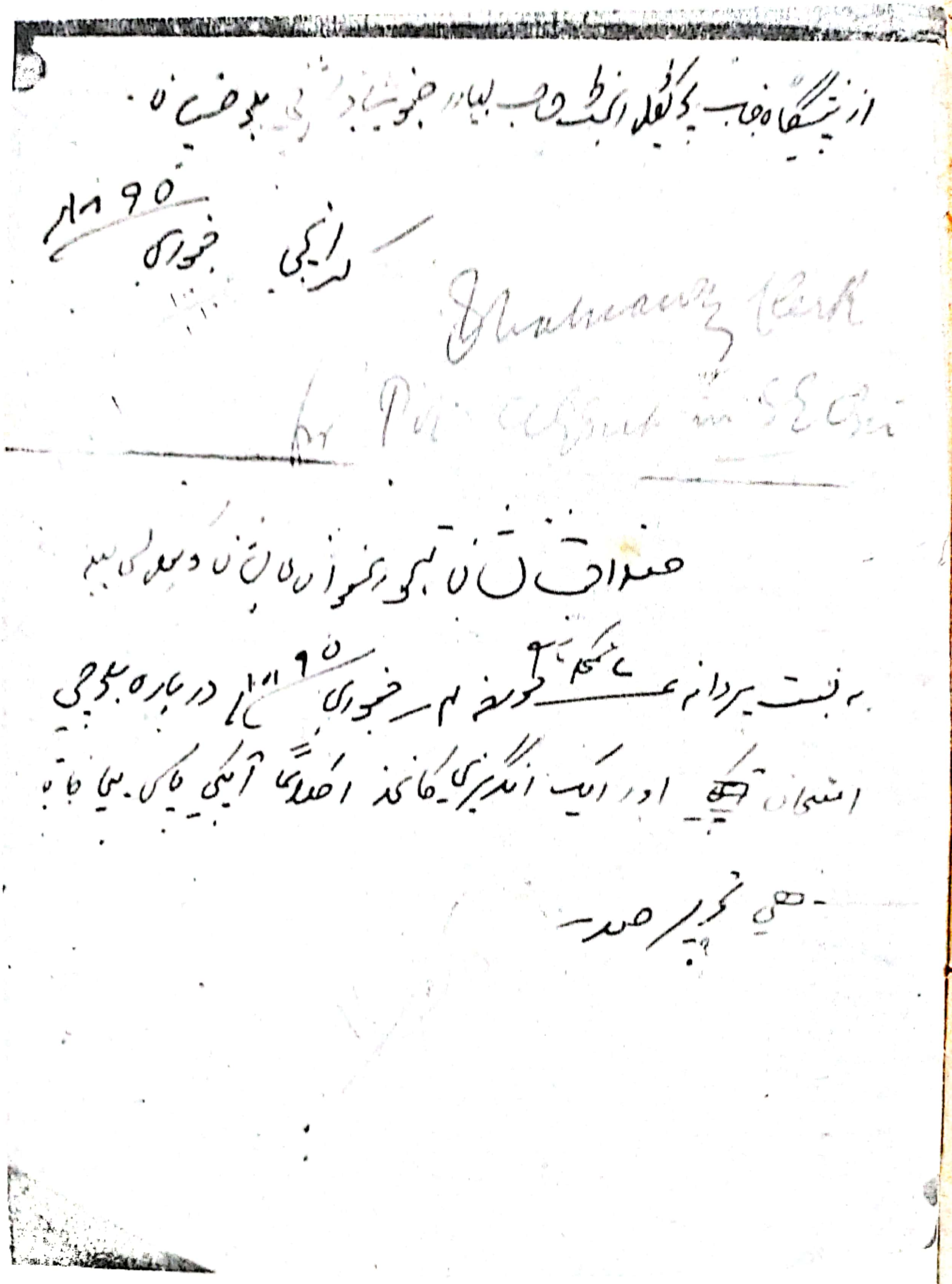
نسیم حجازی	محمد بن قاسم	لاہور	۱۹۴۵ء
نسیم حجازی	شاہین	لاہور	۱۹۴۸ء
نشتر جالندھری	نغمۂ زندگی	لاہور	۱۹۳۳ء
واحد ، گلزار ، افضل	وادی بولان میں	کوئٹہ	۱۹۵۵ء
وارثی ، بشیر احمد	تذکرۂ مگسی	سکھر	۱۹۵۸ء
ورنا وانندہ گل کوئٹہ	بولان نامہ	کوئٹہ	۱۹۶۶ء
ہتو رام	بلوچی نامہ	لاہور	۱۸۹۶ء
ہتو رام	تواریخ بلوچستان	لاہور	۱۹۰۷ء
یاسمین صوفی	فانوس ادب	لاہور	۱۹۶۶ء
یوسف عزیز	فریاد بلوچستان	لاہور	۱۹۲۹ء
،، ،،	تکمیل انسانیت	کراچی	۳۴ ء
یوسف پوپلزئی ۔ سردار	قندیل خیال	دہلی	۱۹۱۶ء

علاوہ ازیں : کمال الدین احمد اور دوسرے مولفین کی درسی کتابوں سے میں نے فائدہ اٹھایا ۔ بعض کتابوں اور مضامین کے مکمل حوالے پاورقی میں مندرج ہیں ۔ بعض انجمنوں کی فائلیں مثلاً شاخ انجمن ترقی اُردو ، ،،مجلس فارسی،، ،،بزم اقبال،، ، اور ،،پنجاب یونیورسٹی پریس کلب کوئٹہ برانچ وغیرہ دیکھیں ۔ متعدد صاحبان سے راقم الحروف نے ملاقاتیں کیں خط و کتابت بھی کرتا رہا ، اُن میں جناب نشتر جالندھری نمبر ۱۰ فردوس پارک سنت نگر لاہور ، اور جناب وقار انبالوی شرق پور ضلع شیخوپورہ بھی شامل ہیں ۔

،،پاسبان،، کوئٹہ ، ،،بولان،، کوئٹہ ، ،،بلوچی دنیا،، ملتان اور ،،معلم کوئٹہ،، وغیرہ کی فائلیں ،،الحنیف،، کے سالنامے (۱۹۳۷ء ، ۱۹۳۸ء) ،،البلوچ،، ، ،،بلوچستان جدید،، ، ،،ینگ بلوچستان،، ، ،،نجات،، ، ،،اتحاد بلوچاں،، (کراچی) ،،ایلم،، (مستونگ) ، ،،الفاروق،، ، ،،نوائے وطن،، ، ،،استقلال،، ، ،،الاسلام،، ، ،،میزان،، ، ،،اتحاد،، ، ،،قاصد،، ، ،،اُولس،، ،

”خورشید“ ، ”جمہور“ ، ”زمانہ“ ، ”کارکن“ ، ”نوکیں دور“ ، (کوئٹہ) ، ”امروز“ ، ”رومان“ ، ”ملت“ ، ”لاہور“ ، ”قندیل“ ، ”لیل و نہار“ ، ”نوائے وقت“ ، ”اقبال“ ، اُردو ڈائجسٹ“ ، ”نصرت“ ، ”آئینہ“ ، ”اسرار حکمت“ ، ”خدام الدین“ ، ”سیارہ ڈائجسٹ“ ، ”کوہستان“ ، ”مشرق“ (لاہور) ، ”ماہِ نو“ ، ”گرد و پیش“ ”انتخاب نو“ ، ”افکار“ ، ”ساقی“ ، ”نیا راہی“ ، ”کاروان سائنس“ ، ”جدید سائنس“ نقاد ، آوازِ پختون“ ، شہناز (کراچی) ”نوروز“ (سیالکوٹ) ”الزبیر“ ، ”کاروان“ (بہاول پور) وغیرہ کے بعض شمارے پیش نظر رہے -

☆ ☆ ☆



۱۸۹۵ء کی ایک دفتری تحریر کا عکس

یورپ میں اردو

مصنفہ : آغا افتخار حسین

قیمت : دو روپے پچیس پیسے

قابل مصنف نے یہ کتاب یورپی ممالک کے ایک طویل دورے
چھ ممالک میں طویل قیام کے بعد تصنیف کی ہے ۔ انہوں نے
بھر کی دانش گاہوں کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ وہاں اردو کی
و تدریس کا کیا انتظام ہے ۔ انہوں نے یورپ کے اکثر بڑے
خانوں کو بھی کھنگالا اور اردو دان مستشرقین سے تبادلۂ
بھی کیا ۔ اس مختصر سی کتاب میں آغا صاحب نے اٹلی ،
ہ ، چیکوسلواکیہ ، فرانس ، جرمنی ، بلجیم ، ڈنمارک اور پرتگال
ردو کی ترقی کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کن درس گاہوں میں
بل علم کے ذریعے کس نوعیت کا علمی و ادبی کام ہو رہا ہے ۔

کتاب نہایت آسان زبان اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہے ۔
احب کی اس کاوش سے اہل اردو کو جہاں یہ طمانیت ہوگی کہ
نے چار دانگ عالم میں جادو جگا رکھا ہے وہاں یہ احساس
و گا کہ دور حاضر میں اردو کی ترقی کے ضمن میں ان کی کیا
اریاں ہیں ۔

مرکزی اردو بورڈ